سندھی زبان و ادب کی تاریخ

تحقیق و تصنیف

ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ

مترجم

شذرہ سکندری

سندھی ادبی بورڈ

سندھی زبان و ادب کی تاریخ

تحقیق و تصنیف

ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ

مترجم

شذرہ سکندری

سندھی ادبی بورڈ

جام شورو

2009ء

عرضِ ناشر

زبان کسی سماجی گروہ کے باہمی رابطے کا واحد ذریعہ، اجتماعی سوچ اور منفرد قومی شناخت ہوتی ہے، یہ اجتماعی سوچ حاصل ہونے میں بنی نوع انسان نے ارتقا کے کئی مراحل طئے کئے ہیں۔ ایک ہی علائقے میں بسنے والے مختلف سماجی گروہوں کی معاشی ہلچل اور سرگرمی کے نتیجے میں انسانی آوازوں کے ایک مربوط سلسلے کی تشکیل آدم ذات کی پہلی کامیابی ہے، یہ انسانی سماجی ارتقا کا دوسرا مرحلہ ہے اور تیسرے مرحلے میں ان انسانی آوازوں کے تصویری نشانات (Pictographic symbols) کا وجود میں آنا اور یوں تصویری رسم الخط (Pictographic script) سے تصوری رسم الخط (Ideographic script) تک کا سفر دنیا کے ہر خطے میں مختلف منتشر سماجی گروہوں نے واحد سماجی شناخت مستقل معاشی مفاد اور ایک رنگا رنگ ثقافت حاصل کرنے تک اور قبائل سے قوم بننے تک، طئے کیا ہے۔ اس طرح سے وادئ سندھ میں سندھی زبان نے ارتقا کے کئی مراحل طئے کئے ہیں۔

سندھو تہذیب (Indus Civilization) نے ۳۰۰۰-۳۵۰۰ ق-م تک ارتقا کے یہ مراحل طئے کرچکی تھی اور ایک مربوط معاشرتی نظام زندگی اختیار کرچکی تھی اور یہ منظم سماج وادئ سندھ سے نکل کر جنوب گجرات اور راجستھان اور شمال میں گنگا جمنا کی وادیوں تک پھیل چکا۔ یہ ایک بڑی تہذیب تھی، مصری اور رومی تہذیب سے بھی بہت بڑی اور ایک وسیع و عریض خطے میں پھیلی ہوئی تہذیب، جس کا ثبوت سندھی زبان کی لسانی جغرافیائی سرحدوں سے واضح ہے۔

سندھو تہذیب اپنے ۵۰۰ سالہ عروج کے دور میں اپنی ہم عصر تہذیبوں سے بھی روابط رکھتی تھی، سمیری تہذیب سے یہ روابط جنوبی عراق کے شہر 'اُر' (حضرت ابراہیمؑ کا آبائی وطن) سے

ملنے والی ۳۰ سندھو مہروں(Indus seals) سے ثابت ہیں۔ سندھو تہذیب کے یہ روابط اقتصادی و کاروباری تھے۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ سندھو تہذیب نے سمیری تہذیب پر اثر چھوڑا اور لیا ہوگا جب کہ سندھو تہذیب کی اس قدیم رسم الخط اور زبان پڑھنے اور سمجھنے میں ابھی کچھ تحقیق کے مراحل اور وقت درکار ہے۔

ادب کسی سماج کے عمومی معاشرتی رویوں کا اظہار ہے، جس قدر کوئی سماج ترقی یافتہ ہوگا اس کے ثقافتی اظہار کے طریقے بھی اتنے ہی طاقتور اور اثر پذیر ہونگے۔ سندھی سماج کی طرح سندھی شعر بھی اپنے قدامت کا ایک تاریخی پس منظر رکھتا ہے، ہندووں کے ویدوں میں دریائے سندھ کی تعریف والے اشلوک کو اس ہی پس منظر میں دیکھنا چاہیے۔

سندھی زبان کے عالمی شہرت یافتہ ممتاز محقق جناب ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ کی یہ کتاب ''سندھی زبان و ادب کی تاریخ'' ان کی نصف صدی کی، کی ہوئی محنت شاقہ کا ماحصل ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے سندھی زبان کی قدامت، اس کی لسانی روابط، سندھی زبان کے پھیلاؤ سے لیکر بعد از آمدِ اسلام، سندھی ادب کے معلوم اور موجود ذخیرے میں سے قدیم سندھی شعر سے لیکر سندھی نثر تک کا ذکر اور نایاب قلمی مخطوطات کے حوالہ جات سے یہ ثابت کیا ہے کہ سندھی زبان دنیا کی قدیم زبانوں میں سے ایک زبان ہے، جو اُس قدیم دور اور اس جدید دور کے علمی تقاضے حل کرتی ہے اور اس زبان کے لسانی تعلقات برصغیر اور دنیا کی تمام تہذیبوں سے ثابت ہیں۔ اس کتاب کا سندھی ترجمہ محترمہ شذرہ سکندری نے کیا ہے جو کہ خود ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں، انہوں نے مترجم کی حیثیت میں اس کتاب میں حوالہ و حاشیہ آرائی میں اضافہ کرکے ایک عظیم علمی کام کا کر زیب و زینت میں اضافہ کیا ہے۔

برصغیر پاک و ہند کے ہندی اور اردو زبان کے ادب سے تعلق رکھنے والے حلقوں میں اس کتاب کی پذیرائی یقینی ہے۔ سندھی ادبی بورڈ کے لئے اس کتاب کا چھپنا باعثِ فخر ہے۔

۲۰ ذوالقعد ۱۴۲۹ھجری
۱۹۔ جولائی ۲۰۰۹ء

پروفیسر سید زوار حسین شاہ نقوی
سیکریٹری
سندھی ادبی بورڈ، جام شورو

پیش لفظ

سندھی اور اردو کے روابط بہت قدیم ہیں دونوں زبانوں نے جہاں ایک دوسرے کے براہِ راست اثرات قبول کئے وہاں دونوں زبانوں کے ادب کی بہترین تخلیقات کے تراجم بھی ہوئے۔ سندھی ادب کے اردو تراجم کا آغاز قیامِ پاکستان سے قبل ہوچکا تھا اور بہت سی شعری و نثری تخلیقات اردو میں منتقل ہوچکی تھیں، جن سے ایک طرف بہت سے سندھی الفاظ اردو زبان میں داخل ہوئے تو دوسری طرف قاری کو سندھی ادب سے واقفیت بھی ہوئی نیز اس عمل کے ذریعے دومختلف زبانیں بولنے والے افراد کے درمیان جہاں قربت بڑھی وہاں ایک دوسرے کے سماج اور سماجی اقدار کو گہرائی و گیرائی میں جاکر سمجھنے اور سماجی وعلمی تاریخ سے آگہی حاصل کرنے کی ضرورت بھی بڑھی۔ اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس تمام سلسلے میں جس قدر کسی زبان کا ادب معاون ہوسکتا ہے محتاجِ تعارف نہیں، اس لئے ہر دو زبانوں کی منتخب اور مفید کتابیں ایک دوسرے کی زبان میں ترجمہ ہونا شروع ہوئیں، خاص طور پر سندھی کتابوں کا اردو میں ترجمہ بڑی تعداد میں ہوا، جس میں کئی اصناف شامل ہیں افسانہ، شاعری، ناول، مذہب، تعلیم اور تاریخ کی بہت سی کتابیں اردو میں ترجمہ کی گئیں، خاص طور پر تاریخ کے حوالے سے نہایت عمدہ کام ہوا، سندھ میں اسلامی دور کی قدیم تاریخ چچ نامہ المعروف ''فتح نامہ''، تاریخ معصومی اور تحفۃ الکرام کا ترجمہ سندھ کی تاریخ کو سمجھنے کے لئے اردو اہلِ زبان کے لئے گراں قدر تحفہ ہے۔

سندھ کی تاریخ کے ساتھ ساتھ سندھی زبان و ادب کی تاریخ کا عہد بعد جائزہ لینے اور اس کے ابتدائی خدو خال سے لے کر ترقی یافتہ صورت اختیار کرنے تک کی تاریخ کے مطالعے کے لئے کسی مستند کتاب کی ضرورت بہر حال آج بھی موجود ہے کیونکہ اردو میں اگرچہ سندھی زبان و ادب کی تاریخ پر کافی مواد موجود ہے لیکن کوئی ایسی کتاب نہیں جس میں سندھی زبان و ادب کی عہد بعد مربوط و مکمل تاریخ بیان کی گئی ہو۔ اس ضرروت کے پیش نظر ضروری ہے کہ سندھی زبان و ادب کی تاریخ اردو میں قلم بند کی جائے، زیرِ نظر ترجمہ اسی ضرورت کو پورا کرنے کی ایک سعی ہے۔

سندھی زبان کی تاریخ کے سلسلے میں مسٹر بھیرومل، مرزا قلیچ بیگ، آخوند عبدالرحیم وفا اور حکیم فتح محمد سیوہانی نے کافی کچھ لکھا ہے جو اپنی جگہ یقیناً اہمیت کا حامل ہے لیکن قدیم دور سے

لے کر سندھی زبان کی سلسلہ وار تاریخ مرتب کرنے میں سب سے اہم کردار محترم جناب ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ صاحب نے ادا کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے سندھی زبان کی عہد بعد تاریخ کو علمی تحقیق کی روشنی میں دلائل اور حوالہ جات کے ساتھ بیان کیا ہے، جس کی بدولت سندھی زبان و ادب کے کئی گمنام گوشے روشن ہوئے ہیں اور بہت سے نئے پہلو اجاگر ہوکر سامنے آئے ہیں۔ اس موضوع پر آپ کی مشہور کتاب ''سنڌي ٻولي ۽ ادب جي تاريخ'' میں زبان کی تاریخ کے ساتھ ساتھ سندھ کی قدیم سیاسی اور سماجی تاریخ بھی موجود ہے، یعنی یہ کتاب اپنے موضوع کے حوالے سے ایک اہم دستاویز ہے۔ ''سنڌي ٻولي ۽ ادب جي تاريخ'' کی اسی جامعیت کی بناء پر اس کا اردو میں ترجمہ کیا گیا ہے تاکہ اردو خواں طبقہ سندھی زبان و ادب کی عہد بعد مربوط و مکمل تاریخ کا مطالعہ کر سکے اور ڈاکٹر صاحب کی تحقیق کی بدولت سندھی زبان و ادب کی تاریخ کے جو گمشدہ گوشے سامنے آئے ہیں ان سے واقفیت حاصل کر سکے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی اس کتاب میں چھ سو سال قبل مسیح سے مغل دور کے خاتمہ، کلہوڑوں، ٹالپوروں اور انگریزوں کے ابتدائی دور ۱۸۶۰ء تک سندھی زبان و ادب کی جامع اور مربوط و مسلسل تاریخ بیان کی ہے، آپ نے سندھی زبان کی تاریخ کا انگریزوں کے دور کے ابتدائی چند سالوں تک کا ذکر کیا ہے اور اسے آگے نہیں بڑھایا اور اس کی وجہ آپ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ انگریز دور سے قبل کا مواد نایاب تھا جسے تلاش کرنا اور پھر یکجا کرنا آسان نہیں تھا جبکہ انگریز دور کا ریکارڈ موجود ہے جسے آسانی سے پیش کیا جاسکتا ہے، اسی لئے آپ نے انگریز دور سے قبل کے مواد کو نہایت محنت سے تلاش کیا اور تحقیق کے بعد اسے پیش کیا۔

''سنڌي ٻولي ۽ ادب جي تاريخ'' کا ترجمہ کرتے وقت میں نے اس کتاب کی اشاعت چہارم کو بنیاد بنایا ہے اور خاص طور پر جن امور کو پیشِ نظر رکھا ہے وہ درج ذیل ہیں:

۱- متن میں دیئے گئے اکثر سندھی اشعار کو اردو رسم الخط میں لکھا گیا ہے تاکہ اردو خواں حضرات ان اشعار کو صحیح طرح سے پڑھ سکیں۔

۲- بعض مقامات پر اصل متن میں کوئی مصرعہ لکھا ہوا ہے، اسے حاشیہ میں اصل ماخذ کی مدد سے مکمل کیا گیا ہے۔

۳- مختلف ذاتوں اور قوموں یا ان کی ذیلی شاخوں اور قبائل کے ناموں کا حاشیہ میں تعارف لکھا گیا ہے۔

۴- متن میں درج کسی شعر کا اگر دوسرا رسم الخط دستیاب ہوا تو اسے بھی حاشیہ میں لکھ دیا گیا ہے۔

۵- متن میں بعض سندھی اصطلاحات بھی استعمال ہوئی ہیں جن کی حاشیہ میں وضاحت کردی گئی ہے۔

۶- متن میں درج کسی شعر یا تاریخی کتبہ کے دوسرے رسم الخط یا اس کے بعض الفاظ کے متعلق کسی دوسری کتاب میں اختلاف پایا گیا تو اس کا بھی حاشیہ میں ذکر کردیا گیا ہے۔

۷- متن میں درج کسی واقعہ کی تاریخ اگر کسی دوسری کتاب میں مختلف لکھی ہوئی نظر آئی تو اس کا بھی حاشیہ میں ذکر کیا گیا ہے۔

۸- متن میں درج سندھی 'راگ' یا 'سروں' کا حاشیہ میں مختصر تعارف لکھا گیا ہے۔

۹- بہت سارے سندھی الفاظ اور جملے اردو رسم الخط میں لکھ کر ان کے اصل تلفظ کو ظاہر کیا گیا ہے۔

۱۰- متن میں درج اگر کوئی شعر ایسا ہے جس کے کسی لفظ کے معنی و مطلب کے حوالے سے کسی لکھنے والے نے اختلاف کیا ہے تو حاشیہ میں اس کا بھی ذکر کردیا ہے اور اس کی غلطی کی نشاندہی بھی کردی گئی ہے۔

۱۱- متن میں مذکور کسی کتاب کا اگر دوسرا نام دستیاب ہوا تو حاشیہ میں اس کا بھی ذکر کردیا گیا ہے۔

۱۲- متن میں مذکور بعض کتابوں کو بعض مصنفین نے غلط طور پر دوسرے لوگوں کی طرف منسوب کردیا ہے، حاشیہ میں ان کی اس غلطی کی نشاندہی کی گئی ہے۔

۱۳- دورانِ ترجمہ بعض مقامات پر میں نے اپنی طرف سے حواشی بھی دیئے ہیں، اس کے علاوہ ان حواشی کی ''کتابیات'' بھی، جن کی جداگانہ فہرست کتاب کے آخر میں درج کردی گئی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی یہ گراں قدر تصنیف جس بہترین اسلوب کی متقاضی تھی ممکن ہے مجھے ترجمہ کے دوران اس میں کما حقہ کامیابی حاصل نہ ہوسکی ہو لیکن میں اتنا ضرور کہوں گی کہ یہ ایک طالب علم کی طالبعلمانہ کوشش ہے لہٰذا امید ہے کہ اہلِ علم حضرات اسے اسی نظر سے دیکھیں گے۔

شذرہ سکندری

۱۸ محرم الحرام ۱۴۲۷ھ
17 فروری 2006ء
اورنگی ٹاؤن، کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ
(اشاعتِ اول)

''سندھی زبان کی مختصر تاریخ'' کے عنوان سے پہلی مرتبہ ایک مضمون ''سندھی ادبی کانفرنس'' (لاڑکانہ،۲۲-۲۳ اکتوبر ۱۹۵۰ء) میں پڑھا گیا؛ جس کا متن (حواشی کے بغیر) بعد میں ''تحفہ لاڑکانہ'' میں شائع ہوا۔ اسی متن کی قدرے اصلاح اور آخر میں سومرہ دور کے متعلق کچھ نئے مواد کا اضافہ کرکے تفصیلی حواشی اور حوالہ جات کے ساتھ سندھی ادبی بورڈ کے رسالہ ''مہران'' کو اشاعت کیلئے دیا گیا جو اس رسالے کی جلد نمبرا، ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد کچھ دوستوں نے اصرار کیا کہ 'سندھی زبان کی تاریخ' پر تفصیلی روشنی ڈالی جائے اور اس مضمون سے ایک قدم اور آگے بڑھاتے ہوئے اس کے متعلق ایک مستقل کتاب لکھی جائے؛ مگر چونکہ یہ مسئلہ گہری علمی تحقیق کا محتاج ہے اور اس کے متعلق بہت سوچ بچار کی ضرورت ہے، جس کے لئے متعدد مصروفیات کے باعث مکمل وقت اور فراغت میسر نہیں، اس لئے فی الحال سندھی زبان کے تاریخی مطالعے کو سمہ دور کے اختتام تک پہنچایا گیا ہے، اور اگر زندگی نے وفا کی تو باقی ابواب مکمل کرکے اس مطالعے کو موجودہ دور تک پورا کیا جائے گا۔

سندھی زبان کے متعلق تاریخی تحقیق آج تک کسی تسلی بخش منزل تک نہیں پہنچی۔ اس تحقیق کے کم از کم دو پہلو ہیں: پہلا 'سندھی زبان کے تاریخی ارتقاء کا جائزہ' اور دوسرا، زبان کی اندرونی ساخت اور ترتیب (صرف ونحو، صوتیات، لغت اور محاورات) کا مطالعہ۔ اِس اولیں پہلو کی تحقیق اور جستجو اب تک بالکل ابتدائی مرحلے میں ہے، بلکہ اس پہلو پر علمی تحقیق حقیقی معنیٰ میں شروع ہی نہیں ہوئی ہے۔ البتہ کچھ یورپی دانشوروں نے سندھی زبان کی بنیاد کے متعلق کچھ نظریات پیش کئے ہیں جنہیں اس وقت تک سندھی علماء اپنی کتابوں میں بطور سند پیش کرتے رہے ہیں۔ بھیرومل کی ''سنڌي ٻوليءَ جي تاريخ'' (سندھی زبان کی تاریخ) اس عنوان پر پہلی کتاب ہے، جس میں ان نظریات کو سندھی ترجمے کی صورت میں دہرایا گیا ہے۔ شمس العلماء ڈاکٹر داؤد پوتہ، مولوی دین محمد وفائی اور دیگر حضرات نے سندھی زبان کی تاریخ پر مضامین لکھے ہیں، ان میں انہی پہلے

والے نظریات کا اظہار کیا گیا۔ دوسرے پہلو، یعنی زبان کی اندرونی ساخت اور ترتیب کے متعلق البتہ کافی کچھ لکھا گیا ہے۔ یورپی دانشوروں میں سے 'واتھن' (Wathen) 'اسٹیک' (Stack) 'ایسٹوک' (Estvick) 'لیچ' (Leech) 'برٹن' (Burton) 'ٹرمپ' (Trumpp) 'گولڈ سمڈ' (Goldsmid) 'گریئرسن' (Grierson) اور دیگر نے اپنے مضامین اور تصانیف میں سندھی زبان کی ترتیب اور صرف ونحو کے متعلق مفید معلومات مہیا کی ہیں۔ سندھی ادیبوں میں سے بطورِ خاص آخوند عبدالرحیم وفا، مرزا قلیچ بیگ، بھیرومل اور حکیم فتح محمد سیوھانی نے سندھی صرف ونحو اور لغت کے متعلق اپنے مضامین اور کتابوں کے ذریعے قابل قدر مواد مہیا کیا ہے۔

سندھی زبان کی تاریخ کے سلسلے میں اگرچہ چند فاضل علماء نے قدیم دور میں زبان کی ابتداء کے متعلق قدرے کچھ لکھا ہے اور اپنی آراء پیش کی ہیں، مگر اس کے بعد آخری ادوار کی سلسلہ وار تاریخ کے متعلق کوئی خاص تحقیق نہیں کی ہے۔ اس کتاب میں قدیم دور سے لے کر سندھی زبان کی سلسلہ وار تاریخ مرتب کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اور سردست اس سلسلہ کو علمی تحقیق کی روشنی میں دلائل اور حوالہ جات کے ساتھ 'سمہ دور' کے آخر تک پہنچایا گیا ہے۔

بابِ اول میں قبل از ۵۰۰ عیسوی دور کی تاریخی علامات و آثار اور ہند، آریائی زبانوں کے متعلق کی گئی تحقیق کی بنیاد پر ایک نیا تحقیقی نظریہ ظاہر کیا گیا ہے: یعنی کہ "سندھی زبان بنیادی طور پر براہ راست سنسکرت سے نہیں نکلی، بلکہ سنسکرت سے پہلے والے دور کی وادئ سندھ کی قدیم زبان ہے۔" سنسکرت، پراکرت، اپ بھرنش اور وراچڈ اپ بھرنش کے متعلق نئی تحقیق قدیم مصنفین کے درج ذیل عام نظریئے کو رد کرتی ہے کہ: "سندھی وراچڈ اپ بھرنش سے نکلی ہے، وراچڈ اپ بھرنش پراکرت سے اور پراکرت سنسکرت سے نکلی ہے۔"

دوسرے باب میں، رائے اور برہمن خاندان اور عرب حکومت کے دور (۵۰۰-۱۰۵۰ء) کا تاریخی دلائل کی روشنی میں تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے اور یہ نتیجہ قائم کیا گیا ہے کہ: "یہ سندھی زبان کی تشکیل کا بنیادی دور تھا جس میں موجودہ سندھی زبان کی نمو ہوئی۔"

تیسرے باب میں سومرہ دور کے متعلق تاریخی آثار اور سندھ کی مشہور مقامی روایات کی بناء پر یہ نتیجہ قائم کیا گیا ہے کہ "یہ 'سندھی زبان' کا تعمیری دور تھا" اس سلسلہ میں اس دور کے بارے میں، سندھ کی تاریخی اور روایتی سرمائے کا از سر نو جائزہ لیا گیا ہے؛ اور اس سے قبل رسالہ 'مہران' میں شائع شدہ کئی روایات کو بھی درست کیا گیا ہے۔ اس طرح نئی ترتیب سے اس دور کے متعلق کافی نیا مواد پیش کیا گیا ہے، جو اس 'رومانی دور' میں سندھی زبان کی تعمیر اور ترقی پر نئی روشنی ڈالتا ہے۔

چوتھے باب میں، سمہ دور کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ درحقیقت سمہ دور تاریخی لحاظ سے

قریبی دور ہے اور اس کے متعلق کافی تاریخی مواد موجود ہے۔ مگر آج تک اس دور کے لسانی اور ادبی سرمائے کا صحیح اندازہ نہیں لگایا گیا ہے۔ اس وقت تک فقط سمہ دور کے آخری شاعر قاضی قادن کے اشعار اور بعض ایک دو مشکوک اشعار، علماء اور ادیبوں کے پیش نظر رہے ہیں۔ ہم نے اپنی مرجودہ تحقیق کی بنیاد پر پہلے، سمہ دور کی زبان اور ادب کے روایتی ذخیرے اور اس کے بعد تاریخی سرمائے کو سلسلہ وار پیش کرنے کی کوشش کی ہے، تاکہ اس دور کی زبان کے مطالعے کیلئے جو روایتی اور تاریخی مواد موجود ہے، وہ مکمل تحقیق کے ساتھ پڑھنے والوں کے سامنے آسکے۔ اس کیلئے ہم نے اس دور کی زبان کے نمونوں اور نشانات - جو کہ 'مُعَمّوں'، 'کہاوتوں'، 'مصرعوں' یا اشعار کی صورت میں موجود ہیں - یا انہیں ظاہر کرنے والے دانا، درویشوں اور شعراء کے سلسلے اور سوانح پر تحقیقی بحث کی ہے تاکہ سمہ دور کی زبان کے تمام معلوم نشان اور آثار تاریخی روشنی میں پوری طرح ظاہر ہوں اور آنے والا محقق ان آثار کے تاریخی وجود اور اہمیت سے مطمئن ہو کر پوری توجہ ان کی ہیئت و ترتیب کو سمجھنے کی طرف مرکوز کر سکے۔

درحقیقت 'زبان کی تاریخ' ملکی، سیاسی و سماجی تاریخ اور زبان کے علم و ادب کی تاریخ سے الگ ایک مضمون ہے، مگر ملکی سیاسی و سماجی پس منظر اور زبان کے ادبی سرمائے کو سمجھے بغیر، زبان کے نمو و ارتقاء کی تاریخ لکھنا مشکل ہے۔ جیسا کہ سندھ کی قدیم سیاسی و سماجی تاریخ اور سندھی ادب کی اوائلی تاریخ - خصوصاً قدیم دور سے لے کر سمہ دور تک - ابھی تک پوری تحقیق کے ساتھ نہیں لکھی گئی ہے اس لئے ان اوائلی ادوار میں سندھی زبان کی تاریخی حیثیت کو سمجھنے کیلئے ملکی تاریخی پس منظر اور سندھی زبان کے ابتدائی آثار پر بھی از سر نو تحقیق کر کے، زبان کے نمو اور ارتقاء کے بارے میں نئے نظریات قائم کئے گئے ہیں۔

اس کتاب میں جن چار تاریخی ادوار پر بحث کی گئی ہے وہ سندھ کی تاریخ اور زبان کے قدیم دور ہیں، جن کا تحقیقی جائزہ لے کر ان کے متعلق علمی نظریات قائم کرنا اور صحیح نتائج اخذ کرنا ایک مشکل مسئلہ تھا، جسے کسی حد تک حل کر لیا گیا ہے اور سندھی زبان کے تاریخی مطالعے کے متعلق آئندہ محققین کے لئے راہ ہموار کی گئی ہے۔ سمہ دور کے بعد مغل دور سے موجودہ دور تک کافی تاریخی اور ادبی سرمایہ موجود ہے، جس کی روشنی میں سندھی زبان کے ان آخری ادوار کی تاریخ قدرے آسانی سے مرتب کی جاسکتی ہے۔

ہر کام ایک مقرر وقت پر مکمل ہوتا ہے، مگر یہ کتاب اس قدر جلد مکمل نہ ہوسکتی، اگر محترم ممتاز مرزا وقتاً فوقتاً اسے لکھ کر پورا کرنے کی تاکید نہ کرتے۔ انہوں نے نہایت سلیقے سے ان ابواب کے مسودہ کو لکھ کر صاف کیا اور پروف پڑھنے اور کتاب کی عمدہ طباعت و اشاعت کا ذمہ

لیا۔ محترم شیخ محمد اسماعیلؔ نے بوقتِ طباعت ابواب وعنوانات کی عمدہ ترتیب قائم کرنے اور آخری پروف پڑھنے میں بہت مدد کی؛ اور پایونیئر پریس کے مینجر اور کارکنوں نے اس کتاب کے عمیق اور مشکل حواشی کو صحیح طرح زیورِ طبع سے آراستہ کرنے میں بہت مدد کی۔ محترم ع۔ق۔ شیخ اور علی اکبر نے سرورق کی تصویر تیار کی۔ کتاب کے بلاک محترم اعجاز محمد صدیقی مینجر سندھ یونیورسٹی پریس کی نظرداری میں طبع ہوئے۔ بندہ تمام مذکورہ بالا اصحاب کا شکرگزار ہے۔

خادم العلم

نبی بخش

سندھ یونیورسٹی، حیدرآباد سندھ

۱۶ نومبر ۱۹۶۲ء

مقدمہ
(اشاعتِ دوم)

اس کتاب کا پہلا خاکہ اٹھارہ سال پہلے سن ۱۹۶۲ء میں ''سنڌي ٻوليءَ جي مختصر تاريخ'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس میں، سندھی زبان کی تاریخ پر، قدیم دور سے لے کر سمہ دور کے اختتام (۱۵۲۰ء) تک دستیاب شدہ مواد کو کل چار ابواب میں مرتب کیا گیا تھا۔

اس پہلی اشاعت کو کافی عرصہ گذر گیا اور اس دوران اس موضوع پر غور کرتے ہوئے مزید معلومات دستیاب ہوئیں جن کی بنیاد پر نہ صرف پہلے مطبوعہ مواد کی اصلاح کی گئی اور اس میں اضافہ کیا گیا بلکہ نئے مواد کے پیشِ نظر نئے ابواب وعنوانات مرتب کئے گئے۔ مثلاً باب سوئم ''سندھی زبان کی انفرادیت اور بین الاقوامی حیثیت کا مسلّم ہونا'' ایک نیا اضافی باب ہے۔ اس کے علاوہ پہلی اشاعت کے تیسرے باب (سومروں کا دور) اور چوتھے باب (سموں کا دور) میں نئے مواد اور نئے عنوانات کا اضافہ کیا گیا ہے، یہاں تک کہ موجودہ طباعت میں یہ دونوں باب کافی حد تک از سرِ نو ترتیب دئے گئے ہیں اور ان میں کچھ نئے نتائج ظاہر کئے گئے ہیں۔ باب ششم خاص طور پر موجودہ اشاعت کیلئے لکھا گیا ہے، اور اس میں ''ارغون، ترخان، مغلیہ دور'' میں سندھی زبان و ادب کی تاریخ اور ارتقائی رجحانات اور خاص خصوصیات کو روشن کیا گیا ہے۔ پہلی اشاعت میں سلسلۂ بیان ۱۵۲۰ء تک تھا، مگر اس میں چھٹے باب کے اضافے سے وہ ۱۶۹۰ء تک پہنچایا گیا ہے: یعنی مدت کے لحاظ سے مزید ۱۷۰ سالہ تاریخ کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔

یہاں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ مغلیہ سلطنت اگرچہ اٹھارویں صدی تک قائم رہی، مگر اورنگزیب کی وفات سے بھی سترہ برس پہلے ۱۶۹۰ء کو سندھی زبان اور ادب کی تاریخ میں ایک دور کی انتہا اور دوسرے کی ابتداء کا سال قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس لحاظ سے اس جلد میں تاریخی سلسلے کو بھی تقریباً سترہویں صدی کے آخر تک پہنچایا گیا ہے اگر زندگی نے وفا کی تو دوسری جلد میں آئندہ آنے والے تاریخی دور کے بارے میں مزید خیالات پیش کئے جائیں گے۔

۱۹۶۲ء میں اشاعتِ اول کے مقدمے میں بتایا گیا تھا کہ: ''ملک کے سیاسی و سماجی پس منظر اور زبان کے ادبی سرمائے کو سمجھے بغیر زبان کی ترقی و ارتقاء کی تاریخ لکھنا مشکل ہے'' ہم نے کوشش کر کے ہر دور کے سیاسی و سماجی ماحول کا زبان کے تاریخی ارتقاء کے لحاظ سے جائزہ لیا ہے، اور خاص طور پر ہر دور کے ادبی ذخیرے کو اجاگر کر کے اس پر زبان کی ترتیب کے لحاظ سے

غور وفکر کیا ہے۔ باوجود اس کے اس علمی تحقیق کے لئے مزید محنت کی ضرورت ہے، جس کے لئے امید ہے کہ اس کتاب کی آئندہ اشاعت کو بہتر بنانے کے لئے کوشش کی جائے گی۔ اس اشاعت میں ادب کے تحریری یا روایتی ذخیرے کو زیادہ زیرِ بحث لایا گیا ہے اور اسی لحاظ سے کتاب کا عنوان بھی ''سندھی زبان اور ادب کی مختصر تاریخ'' تجویز کیا گیا ہے۔

ابتداء میں محترم ممتاز مرزا اور اس کے بعد شیخ محمد اسماعیل نے اس کتاب کی پریس کاپی تیار کرنے اور پروف پڑھنے میں مدد کی اور برادر مراد علی خان نے کتاب کا صحت نامہ تیار کیا میں ان کا مشکور ہوں۔ سندھ پریس کے مالک احمد نبی بخش شیخ نے اس کتاب کی طباعت کی ذمہ داری قبول کی۔

خادم العلم

نبی بخش

حیدرآباد، سندھ

۱۸/شوال ۱۴۰۰ھ

۳۰ اگست ۱۹۸۰ء

مقدمہ
(اشاعتِ سوم)

دس سال میں اس کتاب کی تیسری اشاعت کے لئے راہ ہموار ہوئی ہے۔ اس عرصے میں تحقیق کا سلسلہ جاری رہا اور بہت سا نیا مواد دستیاب ہوا جس کی روشنی میں دوسری اشاعت کے چھ ابواب میں ضروری ترامیم اور اضافے کئے گئے ہے۔ اس اشاعت میں، خاص طور پر دو نئے ابواب، ساتویں اور آٹھویں کا اضافہ کیا گیا ہے، جن کے ذریعے سندھی زبان اور ادب کی تاریخ کو انگریزوں کے ابتدائی سالوں تک پہنچایا گیا ہے۔ انگریز دور کا ریکارڈ موجود ہے اور اسے آسانی سے پیش کیا جاسکتا ہے بشرطیکہ اسے قومی نقطۂ نظر کی تحقیق و تنقید سے پیش کیا جائے۔ البتہ انگریزوں کے دور سے پہلے کا مواد نایاب تھا جسے جمع کر کے پیش کرنا اس قدر آسان نہیں تھا۔ اس لیے باوجود راقم کی مسلسل جستجو کے، ۱۹۵۰ء میں لاڑکانہ ادبی کانفرنس میں سندھی زبان کی تاریخ پر پڑھے گئے مضمون کے آغاز سے لے کر ۱۹۹۰ء میں اس اشاعت تک، تقریباً چالیس برس گزر گئے، کافی محنت و جستجو سے مختلف مقامات و مآخذات سے مواد حاصل کر کے، سندھی زبان اور ادب کی تاریخ کو ''ادوار'' میں تقسیم کر کے تمام تفصیل اور ضروری وضاحت کے ساتھ مکمل کیا گیا ہے۔
اس اشاعت میں شامل آخری دو ابواب نہایت اہم ہیں کہ ان میں صرف نیا اور نایاب مواد پہلی مرتبہ شائع ہو رہا ہے بلکہ ان میں ایک تو سندھی زبان و ادب کے بعض گم نام گوشوں کو روشن کیا گیا ہے، اور دوسرا سندھی زبان میں تعلیم و تصنیف کے دو اہم سلسلوں کے متعلق لکھی گئی کتابوں کے حوالہ جات دستاویزی ثبوت کے طور پر پیش کئے گئے ہیں۔ آٹھویں باب میں جن گیارہ عنوانات پر بنیادی معلومات مہیا کی گئی ہیں انہیں مزید تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت باقی ہے اور اگر زندگی نے وفا کی تو چوتھی اشاعت میں اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا جائے گا۔

اس اشاعت کی تیاری و تعمیل میں عزیزم ڈاکٹر محمد یعقوب مغل، ڈائریکٹر پاکستان اسٹڈی سینٹر، سندھ یونیورسٹی کی ترغیب کا بہت دخل ہے۔ ان کی محبت بھری تاکید ہی کا نتیجہ ہے کہ یہ کتاب شائع ہو رہی ہے۔

میری قلمی کاوشوں میں ابتداء سے میرے ساتھی اور رفیق محمد اسماعیل شیخ نے حسبِ دستور اس کتاب کے مسودہ کو پریس کے لئے تیار کرنے اور آخری طور کمپوز شدہ مواد کو دیکھنے کا ذمہ لیا۔ کتاب کی پروف ریڈنگ محمد بخش لاشاری صاحب نے بہت توجہ سے کی۔ سندھ یونیورسٹی پریس کے مینجر محترم فیض محمد میمن نے باوجود پرانی اور خستہ ٹائپ کے اس کتاب کو بہتر اور نئے انداز میں چھپوایا۔

خادم العلم

نبی بخش

حیدرآباد، سندھ

۱۳ صفر ۱۴۱۱ھ

۳ ستمبر ۱۹۹۰ء

مقدمہ
(اشاعتِ چہارم)

اب اس کتاب ''سندھی زبان اور ادب کی تاریخ'' کی چوتھی اشاعت کے لئے راہ ہموار ہوئی ہے۔ اس عرصے میں ادب کی تحقیق کا سلسلہ جاری و ساری رہا۔ آٹھویں باب میں جن گیارہ عنوانات پر بنیادی معلومات مہیا کی گئی تھیں انہیں مزید تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت باقی ہے لیکن زیادہ مصروفیت کی وجہ سے ان کی تکمیل میں نہیں کرسکا۔ زندگی نے وفا کی تو پانچویں اشاعت میں اس کی تکمیل کی جائے گی۔

اس سے پہلے تیسری اشاعت کی علمی و ادبی خدمت پاکستان اسٹڈی سینٹر کے حوالے کی گئی تھی اور اب یہ چوتھی اشاعت بھی اسی ادارے کے حوالے کر رہا ہوں۔ پاکستان اسٹڈی سینٹر سندھ یونیورسٹی میں سن ۱۹۷۴ء میں قائم ہوا جس دور میں، مَیں سندھ یونیورسٹی کا وائس چانسلر تھا۔ یہ سینٹر تعلیمی ترقی کے لئے کوشاں ہے اور کافی عرصے سے اپنی علمی، ادبی اور تحقیقی روایات قائم کرتا ہوا آرہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایم اے (پاکستان اسٹڈیز) ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں بھی دی جاتی ہیں۔ یہ مرکز اب تک اٹھارہ کتابیں اور سالانہ تحقیقی رسالہ ''گراس روٹس'' کی اُنیس جلدیں شائع کرچکا ہے۔

اس چوتھی اشاعت کی تیاری و تکمیل میں محترمہ چاند بی بی سلطانہ، ڈائریکٹر پاکستان اسٹڈی سینٹر کی ذاتی دلچسپی و کوشش کا بڑا دخل ہے کہ یہ کتاب شائع ہو رہی ہے۔

میری قلمی کاوشوں میں ابتداء سے میرے ساتھیوں محمد اسماعیل شیخ، محترم مرحوم محمد بخش لاشاری اور ڈاکٹر عابد لغاری کی کاوشیں ناقابلِ فراموش ہیں جنھوں نے ہر مرحلے پر ساتھ دیا۔

خادم العلم

نبی بخش

حیدرآباد، سندھ

۱۷ فروری ۱۹۹۹ء

فہرستِ عنوانات

سندھی زبان و ادب کی تاریخ

متن

باب اول

قدیم دور: سندھ کی زبان یا زبانیں

(۶۰۰ سال قبل مسیح سے ۵۰۰ سال بعد مسیح)

تاریخی اعتبار سے سندھی زبان کی ابتداء اور ارتقاء کو بطورِ سہولت چار اہم ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: [۱] قدیم دور، جس میں کوئی نہ کوئی ''سندھ کی زبان'' یا ''سندھ کی زبانیں'' رائج تھیں لیکن موجودہ ''سندھی زبان'' کے خاکے کا ابھی کوئی نام ونشان ہی نہ تھا [۲] بنیادی دور، جس میں موجودہ سندھی زبان کے خاکہ کی تشکیل ہوئی [۳] تعمیری دور، جس میں سندھی زبان نے ترقی کر کے اپنی لغوی اور ادبی منزل متعین کی اور [۴] علمی دور جس میں علماء، شعراء، مؤرخین، مصنفین اور محققین کے کارناموں اور کوششوں سے سندھی زبان کا سرمایہ ہر اعتبار سے پھلا پھولا۔ اس باب میں ''قدیم دور'' پر کچھ روشنی ڈالی جا رہی ہے۔

(الف) ۶۰۰ سال قبل مسیح:

سندھ کی اوائلی زبان اور موجودہ سندھی زبان: قدیم دور تقریباً چوتھی صدی عیسوی اور اس سے قبل کا زمانہ ہے جس کو ''سندھ کی زبان یا زبانوں کا دور'' کہا جاسکتا ہے۔ اُس وقت سندھ کی زبان یا زبانیں ضرور تھیں مگر ''سندھی زبان'' جس کی ہمیں علمی معلومات ہے، وہ ابھی ناپید تھی۔ اس عرصہ میں سندھ کی بولی یا بولیوں پر سامی، دراوڑی اور آریائی زبانوں کا اثر ہوا۔

''موئن جو دڑو'' کے آثار قدیمہ سے دستیاب مواد اور معلومات کی بناء پر کہا جاسکتا ہے کہ ''سندھ کی قدیم زبان'' شاید سامی زبانوں کے گروہ میں سے تھی جس پر دراوڑی اور پھر آریائی زبانوں کا اثر پڑا۔ ان آریائی زبانوں میں سے، اس قدیم زمانہ میں ''سندھ کی زبان'' پر زیادہ اثر ایرانی اور داردی زبانوں کا پڑا، اور اس کے بعد پالی پراکرت کے ذریعے سنسکرت کا۔ ہماری تحقیق

کے مطابق یہ صحیح نہیں ہے کہ سندھی زبان براہ راست ''سنسکرت'' سے نکلی ہے۔ اس غلط فہمی کی چند وجوہات ہیں، اول تو لسانیات کے یورپی عالم اپنی ابتدائی اور اجنبی تربیت کے سبب اس خیال کے زیرِ اثر رہے کہ ہندوستان کی تمام زبانیں سنسکرت سے نکلی ہیں ان کا یہ گمان ہندوستانی زبانوں کے متعلق ان کی تحقیق پر اثر انداز ہوا۔ اور انہوں نے ہر زبان میں سنسکرت کے عکس کو دیکھنے کی کوشش کی اور سندھی زبان میں موجود سنسکرت سے نکلے ہوئے الفاظ کی بناء پر انہوں نے سندھی کو بھی سنسکرت سے نکلی ہوئی زبان قرار دیا۔ سندھی صرف ونحو کی منفرد اور مشکل ترکیب - جو اس زبان کو سنسکرت یا اس کی پوتیوں اور نواسیوں سب سے ممتاز کرتی ہے اور سندھی زبان کو ایک الگ اصلیت اور مستقل حیثیت دیتی ہے-اور زبان کی دیگر انفرادی خصوصیات کو بھی ان یورپی محققین نے مستثنیات کا نام دے کر ٹال دیا۔ اس کے علاوہ ان محققین نے جو دلائل سندھی کے سنسکرت سے نسلی نسبت کے متعلق دئے ہیں ان میں سے اکثر محض قیاسی ہیں اور اس بارے میں جو علمی دلائل ہیں وہ بھی تنقید کے محتاج اور مزید تحقیق طلب ہیں۔ سندھی کے سنسکرتی نسل سے ہونے کے نظریئے کا دوسرا سبب ہندو مصنفین کی تحریریں ہیں جن کی اکثریت نے اس خیال کی بہت تائید کی؛ حالانکہ ان تحریروں کی حیثیت تبلیغی کہی جاسکتی ہے علمی اور حقیقی نہیں۔ سندھی زبان کو سنسکرتی نسل سے شمار کرنے کا تیسرا سبب یہ عام غلط فہمی ہے کہ سندھی زبان یا تو سنسکرت سے نکلی ہے یا عربی سے: حالانکہ عربی زبان تو باہر سے آئی تھی اس لیے سندھی زبان یقیناً سنسکرت سے ہی نکلی ہوگی؛ اور اکثر مسلمانوں کو تو یہ حسنِ ظن بھی ہے کہ سندھی زبان عربی سے نکلی ہے۔

''موئن جو دڑو'' کی زبان: سرزمینِ سندھ کو سب سے پہلے جن لوگوں نے آکر آباد کیا وہ مغربی ممالک کے لوگ تھے اور انہوں نے دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر اپنی بستیاں قائم کیں۔ ان کے تمدن کی انتہائی ترقی نے ''موئن جو دڑو'' کی تہذیب کی صورت اختیار کی۔ موئن جو دڑو کے قدیمی آثار کے انکشافات سے یہ قطعی ثبوت ملتا ہے کہ سندھ کا یہ قدیم تمدن مغربی 'دریائی تمدن' یعنی دجلہ اور فرات دریاؤں کے سمیری اور بابلی تمدن کا ہمعصر ہے۔ سر جان مارشل کی تحقیق کے مطابق سندھ، سمیر اور بابل کی تہذیبوں کے مابین کافی حد تک یکسانیت تھی: خصوصاً سندھ اور عراق کے درمیان گہری آمد و رفت تھی، جو سمندر یا سیستان اور ایران سے خشکی کے ذریعے جاری تھی۔[۱] اس کے علاوہ سندھ کا یہ قدیم تمدن ایک طرح سے غیر آریائی تمدن ہے۔[۲] اس وجہ سے کہا جاسکتا ہے کہ قدیم سندھی تمدن کی زبان بھی کوئی غیر آریائی یا

(۱) سر جان مارشل، محکمہ آثار قدیمہ ہند، سالانہ رپورٹ، ۱۹۲۷-۱۹۳۶ء

(۲) ''غیر آریائی تمدن'' (A Non-Aryan Civilization) دیکھئے اسٹار رچرڈ کی کتاب ''انڈس ویلی پوٹری'' مطبوعہ پرنسٹن یونیورسٹی، پرنسٹن امریکہ، ۱۹۴۱ء

سامی صفت[1] زبان ہی تھی، جو سندھ کی اولین زبانوں میں سے تھی۔ اس زبان کے مسخ شدہ نشانات ''موئن جو دڑو'' سے ملنے والی مہروں پر موجود ہیں۔ بعض مصنفین کے خیال میں ''منْ'' (من-وزن) ''کنجھو'' (کانسی) اور ''ھنجھ'' (ہنس) بابلی زبان کے الفاظ ہیں، اگر یہ صحیح ہے تو پھر غالباً یہ الفاظ سندھی میں اس اوائلی دور میں ہی داخل ہوئے۔ جدید تحقیق کے مطابق قدیم عراق کے سمیری تمدن کے قدیم نوشتوں میں لفظ ''ادا'' بمعنیٰ باپ ملتا ہے اور یہی لفظ صرف سندھی زبان ہی میں آج تک بھائی کے معنی میں رائج ہے۔ اُس دور کی اِس 'سامی صفت' سندھ کی زبان کے تعلق کا امکان ایک طرف دراوڑی زبانوں سے، دوسری طرف ایرانی زبانوں سے اور تیسری طرف 'ملتان سے کشمیر' کی ''وادیٔ سندھ کی زبانوں'' سے ہوسکتا ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستان کی شمال مغربی پہاڑی گھاٹیوں میں سے بھی وہاں کی داردی اقوام کا کشمیر سے ملتان تک کے باشندوں کے ساتھ، اصل - آریائی قرابت نیز مسلسل ہجرت اور آمد و رفت کی وجہ سے تعلق برقرار رہا جس کی وجہ سے اس تمام شمالی مغربی خطہ پر داردی زبانوں کا بھی اثر پڑا۔ اس لئے کشمیری، ملتانی اور سندھی زبانوں کا رنگ ڈھنگ دیگر ہندی - آریائی زبانوں سے مختلف ہوا اور ان تینوں زبانوں میں ایک بنیادی تعلق پیدا ہوا۔

دراوڑی زبانیں اور سندھی زبان:

آریاؤں کی آمد سے قبل دراوڑی زبانیں اس برصغیر کے اکثر حصے میں رائج تھیں۔ سندھ سے متصل بلوچستان کے علاقہ میں براہوی زبان، دراوڑی زبانوں کے قبیلے سے تعلق رکھتی ہے اسی مناسبت سے بعض کا گمان ہے کہ شاید موئن جو دڑو کی زبان بھی دراوڑی قبیل کی ہو۔ ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ موئن جو دڑو کی زبان شاید سامی گروہ سے تھی اور ممکن ہے کہ اس دور کی پڑوسی دراوڑی زبانوں سے اس کا تعلق ہو۔ دراوڑی اصلیت والے الفاظ جس طرح دیگر موجودہ عوامی زبانوں میں ملتے ہیں اسی طرح سندھی میں بھی موجود ہیں۔ جارج شرٹ نے سندھی زبان کی بنیاد کے بارے میں ۱۸۷۸ء میں ایک مضمون لکھا جس میں سندھی کے مستقل لغوی ذخیرے اور دیگر جداگانہ نحوی خصوصیات سے متاثر ہوکر اس نے سندھی کے سنسکرت سے نکلنے کے نظریہ سے انکار کیا اور اس کے بجائے ''سندھی کی دراوڑی بنیاد'' کے نظریہ کی تائید کی۔ اس کا یہ مضمون 'سندھی میں دراوڑی جز کی علامات' کے عنوان سے ''انڈین اینٹیکری'' میں شائع ہوا۔[۲] جس میں اس نے یہ نیا نظریہ پیش کیا۔ ذیل میں ہم اس کے نظریئے اور دلائل کا اختصار سے تجزیہ پیش کرتے ہیں۔

---

(۱) سریانی، عبرانی اور حبشی عربی کو علم لغات کی اصطلاح میں ''سامی زبانیں'' کہا گیا ہے۔ ''سامی صفت'' یعنی ان زبانوں جیسی۔

(2) Shirt George: "Traces of a Dravidian Elements in Sindh" The Indian Antiquary voll-II, 1878 (Issue of December 1878)

سندھی کے سنسکرت سے نکلنے کے نظریئے میں شک: سندھی زبان کی کچھ مستقل خصوصیات کے پیش نظر جارج شرٹ نے سندھی کے سنسکرت سے نکلنے کے نظریئے کو شک کی نگاہ سے دیکھا اور گویا دبی زبان میں اس بات کا اعتراف کیا کہ سندھی زبان کی بنیاد خالصا سنسکرت نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ: یہ بالکل سچ ہے کہ سندھی سنسکرت زبان کی بیٹی ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ سنسکرت کا خالص خون سندھی میں نہیں ہے اس کے گرامر کے اہم حصوں کی بنیاد سنسکرت ہے، مگر ایک اہم اور خاص خصوصیت یعنی ضمیری اواخر کا استعمال، سندھی کو ایرانی زبانوں سے ملاتا ہے حالانکہ اس استعمال میں ان (ایرانی زبانوں) سے یہ (سندھی) بہت آگے ہے۔" (ص۲۹۳)

سندھی لغت کا اپنا خالص ذخیرہ کہاں سے آیا: عربی اور فارسی الفاظ کے علاوہ سندھی میں کئی الفاظ ایسے بھی ہیں جن کا سنسکرت سے کوئی تعلق نہیں (مثلاً 'اسان' یا 'اسین' کے لفظ سنسکرت میں ہیں ہی نہیں) جارج شرٹ سوال اٹھاتا ہے کہ لغت کا یہ ذاتی ذخیرہ کہاں سے آیا؟ اس کے خیال کے مطابق یہ الفاظ یقینی طور پر اس زبان کے ہیں جو سنسکرت سے پہلے تھی۔ اس نظریئے کے مطابق یہ الفاظ کسی دراوڑی زبان کے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ: "جب (سندھی سے) تمام سنسکرت، عربی و فارسی الفاظ خارج کئے جاتے ہیں تو بھی ایک بڑا ذخیرہ ایسے الفاظ کا باقی رہتا ہے جنہیں مسٹر بیمس (Beames) اپنے تقابلی گرامر (Comparatave Grammar) میں "دیسی" کہتا ہے۔ (سندھی میں) درحقیقت یہ ذخیرہ اتنا زیادہ ہے کہ فقط ایسے الفاظ کو استعمال کرتے ہوئے پورا مکالمہ مرتب کیا جاسکتا ہے۔ یہ الفاظ کہاں سے آئے؟ میرے خیال میں بلاشک وشبہ یہ الفاظ اسی زبان کی باقیات ہیں جو آریاؤں کی آمد سے پہلے سندھ میں بولی جاتی تھی: آریاؤں نے غالبًا ان دراوڑی نسل کے کچھ قبائل کو- جو موجودہ بروہیوں کے آباء و اجداد تھے- پہاڑوں کی طرف ہانک دیا۔ اور سندھ کے باقی باشندوں کو نیچ ذات کے طبقہ میں ملادیا۔ اگر سندھی لغت میں اتنے سارے سنسکرت سے پہلے کے دیسی الفاظ ملتے ہیں تو یہ اہم اور دلچسپ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا سندھی گرامر میں بھی ایسے اثرات کی علامات موجود ہیں؟ مجھے یقین ہے کہ ایسی علامات موجود ہیں" (ص۲۹۳) جارج شرٹ نے یہ مسئلہ اٹھایا ہے کہ آریاؤں سے پہلے سندھ میں دراوڑی قبائل آباد تھے جن میں سے کچھ کو، جو بروہیوں کے آباء و اجداد تھے، آریاؤں نے مغرب میں کوہستان کی طرف ہانک دیا تھا اور باقی جو سندھ میں بچ گئے انہیں "کم ذات طبقہ" میں شامل کردیا۔ یہ محض شرٹ کا اپنا خیال ہے، جس کے لئے کوئی بھی تاریخی ثبوت موجود نہیں: البتہ اس تصور کو پیش کرنے سے وہ اپنے نظریات کی تائید کرنا چاہتا ہے کہ سندھی زبان کے الفاظ کا اپنا خالص ذخیرہ

خواہ اس کے گرامر کے کچھ آثار دراوڑی نسل کی کسی زبان سے تعلق رکھتے ہیں: اس سے نتیجہ کے طور پر اس نظریے کو تقویت ملتی ہے کہ سندھی زبان کی اصل بنیاد کوئی دراوڑی زبان ہے۔

سندھی زبان کی دراوڑی بنیاد کے لئے شرٹ کے دلائل: اپنے اس نظریہ کی تائید میں جارج شرٹ نے چھ اہم دلائل دیئے ہیں جو قدرے توضیح و تجزیہ کے ساتھ ذیل میں دیئے جاتے ہیں:

۱- الفاظ کے آخری حرف پر حرکت کا اصول سندھی اور دراوڑی زبانوں میں ایک ہی ہے۔ شرٹ کی اس دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ: ہر سندھی لفظ کی آخر (یعنی انتہا)، **حرکت یا نون غنہ** سے ہے۔ ''بشپ کالڈ ویل'' بھی اپنی تصنیف ''دراوڑی زبانوں کی تقابلی **گرامر'' میں کہتا** ہے کہ تیلگو بولی کے ہر لفظ کا آخری حرف لازمی طور پر حرف صحیح متحرک ہوتا ہے؛ **اگر** بنیادی طور پر حرف صحیح متحرک نہیں ہوتا تو پھر اس پر **پیش دیا جاتا ہے، اگرچہ** اس کا تلفظ نہیں کیا جاتا۔ یہی قاعدہ سنسکرت سے نکلے ہوئے الفاظ **پر بھی لاگو ہوتا ہے**۔ موجودہ 'کینر ی' زبان میں بھی یہ قاعدہ رائج ہے۔ تامل زبان میں الفاظ کے آخری **'حرف صحیح'** پر پیش **دیا جاتا** ہے، جو قدیم 'کینر ی' زبان کے قاعدہ کے مطابق ہے۔ بقول 'کالڈویل' ان دراوڑی **زبانوں میں** یہ **آخری** حرکت نہایت ہلکی ہوتی ہے، جیسا کہ سندھی زبان میں ہے: جس کے معنی یہ ہیں کہ سندھی **اور** دراوڑی زبانوں میں بھی یہی اصول کارفرما ہے۔ مگر تعجب یہ ہے کہ سندھی پر آریائی، ایرانی اور سامی زبانوں کے اثر کے باوجود یہ اصول برقرار ہے!

اس دلیل پر تنقید: اول تو خود 'کالڈویل' کے بقول تیلگو، تامل یا کینری زبانوں **میں** الفاظ کے آخری حرف پر چھوٹا سا خفیف پیش ہوتا ہے جو لکھا تو جاتا ہے لیکن بولا نہیں جاتا۔ اس کے برعکس **سندھی میں** نہ صرف اسماء کے **آخر میں** زیر، زبر، **پیش یا 'الف'، 'واؤ'** اور 'ی' آتے ہیں، بلکہ یہ حرکات مختلف حالات (فاعلی، مفعولی، اضافی اور جری) میں تبدیل ہوتی ہیں۔ یعنی سندھی میں 'اعراب' کا وسیع نظام موجود ہے، جو یقینی طور پر عربی اثر کا نتیجہ ہے۔ مگر اس مشترک خصوصیت کی بنا پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ سندھی زبان عربی سے نکلی ہے۔ شرٹ کی دلیل کی بنیاد پر سندھی زبان کا دروااڑی زبانوں کے بجائے عربی سے نکلنا زیادہ مناسب ہوگا۔

۲- سندھی کے بعض مجہول افعال کی ترتیب میں 'ب' کا تلفظ موجود ہے جو دراوڑی زبانوں کا ''پو'' (Po) ہے جس کے معنی ہے 'جانا'۔

شرٹ کی اس دلیل کا اختصار اس طرح ہے:

سندھی میں بعض غیر جانبدار (Neuter) افعال ہیں جو 'فعل مجہول' کا کام دیتے ہیں حالانکہ وہ مجہول افعال کی طرح نہیں بنتے، سندھی میں فعل مجہول بالکل اسی طرح بنتا ہے جس طرح سنسکرت میں، سوائے اس کے کہ سنسکرت میں فعل مجہول کی نشانی 'ی' سندھی میں 'ج' میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ (جیسا کہ مارجڻ، کائجڻ، گھتجڻ وغیرہ) مگر درج ذیل سندھی افعال اس قاعدہ سے مستثنیٰ (Exception) ہیں: ڍاپڻ، چيڻ (=لگڻ، پليت ٿيڻ)، ڌاپڻ، پرپڻ (=پلئه پوڻ، ملڻ)، جاپڻ، ڏوپڻ، ماپڻ ۽ کپڻ (ص۲۹۳) ان میں مصدر کی 'ڻ' سے پہلے 'ج' کے بجائے 'پ' حرف صحیح کے طور پر موجود ہے۔

میرے خیال میں اس 'پ' کا تعلق دراوڑی 'پو' (Po) بمعنی 'جانا' سے ہے، جو ان بولیوں میں فعل مجہول بنانے کے کام آتا ہے۔ یہ 'پو' سنسکرت کی 'ی' اور فارسی کے 'شدن' کے معنی میں ہے۔ 'شدن' بھی قدیم فارسی میں 'جانا' کے معنی میں تھا، جیسا کہ فارسی کی قدیم بہن 'بلوچی' میں (شتغ = جانا) ہے۔ ہندوستانی میں تو فعل 'جانا' (= وڃڻ) کے لاحقہ کے ساتھ ہی بنتے ہیں۔ (ص۲۹۴)

اس دلیل پر تنقید: اس دلیل کے آخر میں دی گئی مثالیں خود ثابت کرتی ہیں کہ 'وڃڻ' (جانا) **کے** لاحقہ سے مجہول فعل کی ترتیب دراوڑی زبانوں تک محدود نہیں بلکہ یہ خصوصیت ایرانی، **ہندوستانی اور دیگر زبانوں** میں بھی موجود ہے۔ نیز یہ بات بھی غور طلب ہے کہ کیا ان سندھی **افعال** میں **'پ' کا تلفظ** 'وڃڻ' (جانا) کا قائم مقام ہے، کیونکہ 'وڃڻ' (جانا) کا لاحقہ لگانے **کے** باوجود **ان افعال** کے اکثر صیغوں میں 'پ' باقی رہتا ہے مثلاً 'ڍاپڻ' (ڈھاپن = سیر ہونا) ڍاپي وڃڻ (سیر ہوجانا) کے معنی میں ہے اور اس طرح ڌاپڻ (دھاپن = گائے یا بھینس وغیرہ کی وہ حالت جس میں بچھڑا دودھ پی جاتا ہے) ڌاپي وڃڻ، جاپڻ (پیدا ہونا) = جاپي وڃڻ (پیدا ہوجانا) ڏوپڻ (دھلنا) = ڏوپي وڃڻ (دھل جانا) کپڻ (ختم ہونا) = کپي وڃڻ (ختم ہوجانا)۔ اگر 'پ' 'وڃڻ' کا قائم مقام ہوتی تو 'وڃڻ' کا لاحقہ لگانے سے 'پ' یا تو حذف ہوجاتا یا تبدیل ہوجاتا۔

۳- سندھی میں دو حرف صحیح ایک ساتھ نہیں آتے اور یہ خصوصیت دراوڑی زبانوں میں بھی ہے:

سندھی الفاظ میں ایک جیسا حرف صحیح تشدید کی صورت میں آسکتا ہے یا پھر جب دو حرف صحیح ایک ساتھ آئیں گے تو ایک یقیناً ہلکا (Liquid) ہوگا، ان دونوں صورتوں کے علاوہ سندھی میں کسی بھی لفظ میں حرف صحیح (بغیر حرکت کے) ایک ساتھ نہیں آئیں گے۔ یہ خصوصیت دراوڑی زبانوں میں بالکل نمایاں ہے۔ (ص۲۹۴)

اس دلیل پر تنقید: یہ صرف دراوڑی زبانوں کی ہی خصوصیت نہیں۔ کیونکہ ٹرمپ خود اعتراف کرتا ہے اور کہتا ہے کہ: ''البتہ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ خصوصیت صرف دراوڑی زبانوں تک محدود نہیں، حالانکہ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ خصوصیت غیر سنسکرتی ہے۔'' (۲۹۴)

۴- سندھی کے لفظ 'کي ' (کھے) اور 'آن' سنسکرت کے بجائے دراوڑی زبانوں سے نکلے ہیں۔

سندھی کی 'کي ' (کھے) سنسکرت 'کرت' کے بجائے دراوڑی 'کو' سے تعلق رکھتی ہے۔

دو لفظوں 'آن' اور 'کان ' سے ہوسکتا ہے کہ 'آن' سنسکرت سے نکلا ہو۔ 'آن' یا 'اکان' براہوی زبان میں موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آریاؤں کے آنے سے پہلے دراوڑی زبانوں میں 'آن' یا 'اکان' کے الفاظ موجود تھے۔ آریاؤں نے ان سے پہلے کوئی لاحقہ (Affix) موجود دیکھا جو ان کی 'آت' کی 'ت' بدل کر 'آن' کا 'ن' بن گیا۔ (ص۲۹۴)

اس دلیل پر تنقید: اس دلیل کا پس منظر اس دور کے مغربی دانشوروں کا یہ عام خیال ہے کہ سندھی اور دیگر ہند- آریائی زبانیں سنسکرت سے بنیں، اور اس وجہ سے ان زبانوں کا ہر لفظ کسی نہ کسی سنسکرت لفظ کا عکس ہے۔ ایسے ہی خیال کی وجہ سے ٹرمپ نے بھی کھینچ کھانچ کر سندھی 'آن' کو سنسکرت 'آت' سے تبدیل ہونے کا جواز پیش کیا ہے، حالانکہ دوسری طرف ٹرمپ یہ بتانا چاہتا ہے کہ 'آن' سندھ میں پہلے ہی سے موجود تھی، مگر وہ دراوڑی زبانوں کی تھی، کیونکہ اب تک وہ براہوی زبان میں موجود ہے۔ اسے غالبًا یہ معلوم نہیں تھا کہ سندھی کے کئی الفاظ براہوی میں رائج ہو چکے ہیں۔

۵- سندھی میں بعض الفاظ ایسے بھی ہیں جو اصل میں دراوڑی ہیں: ٹرمپ کہتا ہے کہ: میرے خیال میں (اگر تحقیق کی جائے تو) درج ذیل سندھی الفاظ میں سے 'کئی' کی اصل نسل یقیناً دراوڑی ثابت ہوگی۔

سندھی	اردو	دراوڑی[1]
پرائڻ	حاصل کرنا/سیکھنا	پیڑ
نِرڙُ	پیشانی	نبڑِ
سلڻ	سنانا	شول
وائي	بول، کلمہ، بات	واي (=وات)
ڪراڙو	بوڑھا	ڪيڙو

(۱) ٹرمپ نے یہ الفاظ انگریزی رسم الخط میں لکھے ہیں۔ ہم نے کوشش کر کے وہی تلفظ سندھی رسم الخط میں پیش کیا ہے۔

سوڑھو	تنگ	شُرَک
کوڑو	کڑوا	کارو
پڑ (چنب جو)	چاند کا ہالہ	پیرایئہ
کڈڻ	کودنا	کودي
منڍ	آغاز	منڊ
کوٽڻ	کھودنا	کوت
اوڍڻ	اوڑھنا، پہننا	اُڍَ
منجي	پلنگڑی، کھٹیا	مانري
کرندي	کرَونڈَا	کارَندي
تڙي	منتشر ہونا	تاڙي
تڙڻ	منتشر ہونا، کھِلنا	تیڙاپو
کَٽ	چارپائی	کَٽ
اوڙاھ (۱)	دوزخ/آگ کا الاؤ	آڙ

اس دلیل پر تنقید: ہوسکتا ہے کہ ان میں 'کئی' الفاظ اصل میں دراوڑی ہوں۔ اس طرح عربی اور فارسی بلکہ انگریزی کے بھی 'کئی الفاظ' سندھی میں رائج ہیں لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ یہ زبانیں سندھی کی بنیاد ہیں۔ اوپر دیۓ گئے لفظ 'کٹ' کی مثال سے (جو کہ سندھی، ہندی بلکہ انگریزی میں رائج ہے) یہ کیوں نہ کہا جائے کہ مندرجہ بالا الفاظ میں سے کئی اصل میں 'آریائی' یا 'ہند آریائی' الفاظ ہیں، جو بعد میں دراوڑی زبانوں (تامل وغیرہ) میں رائج ہوئے۔

٦- بعض الفاظ سنسکرت میں نہ ہی ایرانی یا سامی زبانوں میں ہیں لیکن سندھی اور براہوی دونوں میں یکساں موجود ہیں۔ شرٹ کے خیال میں درج ذیل اور دیگر الفاظ سندھی اور براہوی میں موجود ہیں، مگر وہ سنسکرت اور نہ ہی ایرانی یا سامی زبانوں میں موجود ہیں۔

سندھی	اردو	براہوی
منجھند	دوپہر	منجن
کَکڙا	بگولے	ککڑآ

(۱) اصل میں یہ لفظ آڑاھ ہے

کوپري (مٿي جي)	کھوپڑی	کوپري
رنبي	کھرپی	رنبي
پِني (جنگهه جي)	پنڈلی	پني
جُهڙ	بادل	جر (ڪوهيرو)
ڪُڙي	ایڑی	ڪُري
لڪ	درّہ	لڪ
ٽونٽ	کہنی	توٹ
ارمان	افسوس	ارمان
ٿوم	لہسن	ٿوم
تنوار	آواز، بولی، گنگنانا	توار
ڪارِي (ڪاريندڙ)	بگاڑنے والا، خراب کرنے والا	ڪارِي
ڪبڙ	پیلو کا درخت	ڪبر
ڳوٿري	کپڑے کی تھیلی	گوٿري
ٻولڙو	بندر، لنگور	بولُو
ڏڳي	گائے	ڏگِي
اوجهري	اوجھ، اوجھڑی	اوجرنڪ
ڳُنگو	گونگا	گنگ

اس دلیل پر تنقید: براہوی سندھ کی ہمسایہ زبان ہے اور صدیوں سے ہر سال موسم سرما میں بروہی-بلوچ قبائل سندھ میں مزدوری کیلئے آتے ہیں جس وجہ سے سندھی کے سیکڑوں الفاظ براہوی زبان میں رائج ہوگئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کئی ایک جیسے الفاظ سندھی یا براہوی میں موجود ہیں۔ لیکن شرٹ اس قسم کے دلائل کو رد کرنے کیلئے کہتا ہے کہ: ''انگریزی اور ویاشی دونوں ہمسایہ زبانیں ہیں لیکن دونوں کی لغت میں اتنے مشترک الفاظ نہیں ہیں جتنے کہ براہوی اور سندھی میں۔ دوسرا یہ کہ صدیوں سے بروہیوں اور سندھیوں میں میل جول نہیں رہا ہے، کیونکہ بروہی-بلوچ خانہ بدوش اور تیز خُو ہیں، سندھی صلح پسند اور بردبار (حلیم طبع، خاموش طبع)، تاجر اور زراعت پیشہ ہیں۔'' شرٹ کے یہ دونوں دلائل کمزور ہیں۔ غالبًا اسے بروہی-بلوچ قبائل اور سندھیوں کے

صدیوں تک ایک دوسرے کے ساتھ میل جول کا علم ہی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ مندرجہ بالا الفاظ میں 'ثوم' (لہسن) لفظ عربی اور 'ارمان' اور 'گونگو' (گنگ) فارسی ہیں۔ یعنی کہ براہوی اور سندھی میں جو مشترک الفاظ ہیں وہ شرٹ کے کہنے کے برعکس ایرانی اور سامی زبانوں میں بھی موجود ہیں۔

آخر میں شرٹ نتیجہ کے طور پر کہتا ہے کہ: بالفرض سندھی کی اوپر بیان کی گئی نحوی خصوصیات دراصل ''دراوڑی'' ہیں اور پیش کئے گئے الفاظ کا سلسلہ بھی اسی سرچشمہ سے تعلق رکھتا ہے اس کے باوجود بھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ سندھی کو یہ سرمایہ براہوی سے ملا، کیونکہ یہ نحوی اور لغوی خصوصیات براہوی میں ہیں ہی نہیں.......... یہ تمام سرمایہ اہل سندھ کو مقامی طور پر ورثہ میں ملا ہے، جو کہ میرے خیال میں اس طرف رہنمائی کرتا ہے کہ آریاؤں کے آنے سے پہلے سندھ کی وادی دراوڑی نسل کے لوگوں کا گھر تھی۔ (ص۲۹۵)

مندرجہ بالا تنقید کے باوجود اس امکان سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ قدیم دور میں منڈا اور دراوڑی زبانیں یا موجودہ دور کی پڑوسی 'براہوی زبان' کے بعض الفاظ سندھی میں رائج ہوچکے ہیں۔

سندھی میں منڈا اور دراوڑی زبانوں کے الفاظ: بنیادی طور پر سندھی زبان کا خمیر سندھ کے اپنے مقامی لسانی ماحول کا پیدا کردہ ہے اسے دراوڑی زبان یا زبانوں سے نکلا ہوا یا مستعار سمجھنا صحیح نہیں ہوگا۔ البتہ اس میں کوئی شک نہیں کہ دیگر عوامی زبانوں کی طرح سندھی میں بھی قدیم 'منڈا'[1] اور دراوڑی زبانوں کے بعض الفاظ بطور یادگار باقی ہیں، مگر ایسے الفاظ کی صحیح شناخت کرنا آسان نہیں ہے۔ بعض مصنفین نے موجودہ دراوڑی زبانوں (کیڑی، تامل، تیلگو، ملایالم، تولو، کوٹا، ٹوڈا، گڈیا، پارجی، کوئی وغیرہ) میں رائج الفاظ کو آنکھیں بند کرکے 'دراوڑی' سمجھا ہے، حالانکہ ان میں کئی الفاظ سنسکرت، پراکرتوں اور عربی فارسی سے لئے گئے ہیں۔ اس لئے یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ فلاں لفظ 'دراوڑی' ہے کیونکہ وہ کسی دراوڑی زبان میں رائج ہے۔ اس سلسلہ میں تحقیق کی تکمیل تک یہ تو کہا جاسکتا ہے کہ درج ذیل قسم کے بعض الفاظ جو کہ سندھی، پنجابی، اردو یا دیگر زبانوں میں رائج ہیں وہ شاید بنیادی طور پر 'منڈا' یا 'دراوڑی' ہوں۔[2]

---

(۱) دراوڑوں سے پہلے اس برصغیر کے بعض حصوں میں 'منڈا قبائل' آباد تھے۔ بھیل، کول، سنتھال، ساورا، ھو، کوروا، جانگ، کورکو وغیرہ 'منڈا گروہ' کے قبائل ہیں۔

(۲) انگریزی میں شائع شدہ تحقیقی کتابوں، گرامر اور لغات کے علاوہ اس سلسلے میں آسانی کیلئے درج ذیل اقسام کی اشاعتوں میں بھی موجود دراوڑی اور دیگر عوامی زبانوں میں مشترک طور پر رائج الفاظ کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ ا- جے-وی ددیگر کا مضمون ''کنڑی زبان میں رائج ہندوستانی الفاظ اور محاورے'' (سہ ماہی رسالہ ''نوائے ادب'' انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹیٹیوٹ، بمبئی اشاعت اپریل اور اشاعت جولائی ۱۹۶۶ء) ۲- عین الحق فریدکوٹی ''اردو زبان کی قدیم تاریخ'' مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۲ء، ص: ۹۶-۱۲۵ اور ۱۴۲-۴۲

منڈا گروہ کے الفاظ: پاڻي (پانی) ڪپھہ (کپاس) ڪوڙي (= ویھہ یعنی کوڑی)، مُنڍي (سر)، جنگھہ (ٹانگ)، جھنڊ (بالوں کی لٹ)، ليجڻ (شادی کے وقت کپڑے دینا) لِڏ (لید)، مُگري (لکڑی کا موٹا ڈنڈا) مُھانڊو (نقش، چہرہ، صورت، شکل، حلیہ) وغیرہ۔

دراوڑی گروہ کے الفاظ: الاچي (الاچی)، ڪوتمير (کوتمیر = ہرا دھنیا)، ڪاٻار یا ڪاٻاڙو (ناریل کے ریشہ کا رسہ) دراوڑی الفاظ تسلیم کئے گئے ہیں اس قسم کے دیگر الفاظ درج ذیل کہے جاسکتے ہیں:

لفظ کی سندھی صورت	دراوڑی زبانوں میں رائج صورت
ڪُڏي، ڪُڏو (گھروندا، جھونپڑا)	ڪُٽِي
ڏنڊ (جرمانہ، تاوان)	تنتو، ڊنڊ
سُنگ (محصول)	سنَڪم
چُونگي (محصول)	چنُگمْ
ابڙ، ايل (جنگلی، وحشی)	ابڙ، ايڙو
نيرُ (پانی)	نير
ڪَڙھي (سالن)	ڪَڙي
ڪِڙڪي (کھڑکی)	ڪِڙڪ، ڪِتڪي
منڊري (انگوٹھی)	موديرا
گِنڊ (خوشبو، مہک)	گنڊ
وِرلو، وِرلي (بہت کم، گاہے گاہے)	ورل

سنسکرت اور سندھی زبان:

اس قدیم دور کے علمی مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت آریائی قبائل اول اول ہندوستان میں داخل ہوئے اس وقت ہمارے موجودہ سندھ کا زیریں جنوبی حصہ (لاڑ اور تھر) شاید سمندر کے نیچے تھا؛ اور دریائے سندھ کا دوآبہ (ڈیلٹا) بھی اوپر کی طرف درمیان میں تھا۔ اس لئے غالبًا اوائلی آریاؤں کی جو نو آبادیات قائم ہوئیں وہ موجودہ سندھ کے خطہ میں نہیں بلکہ سِندھو ندی کے بالائی حصے میں پنجاب والے کنارے کے آس پاس تھیں۔ اس کے بعد وہ آریائی قومیں مشرق کی طرف بڑھیں۔ گنگا، جمنا، دوآبہ میں ان کے مستقل قیام کے

دور میں ہی سنسکرت زبان آہستہ آہستہ بنتے ہوئے مکمل ہوئی جبکہ ملتان سے کشمیر تک کے علاقے کی اپنی وہی اصلی زبانیں رہیں، بعد میں اس علاقہ میں مسلسل نقل مکانی کی وجہ سے (ایرانی آریاؤں کی ہندوستان کی طرف ہجرت ایک اہم واقعہ تھا جس کی وجہ سے) یہاں کی زبانوں پر قدیم ایرانی زبان کا بھی اثر ہوا۔ توجہ طلب بات یہ ہے کہ اس قدیم دور میں، جس وقت گنگا، جمنا دوآبہ کے گرد سنسکرت اپنی ابتدائی اور آخری منزلیں طے کر رہی تھی، اور وہاں کی پراکرت زبانیں اس کے زیرِ اثر پھل پھول رہی تھیں، اس وقت 'کشمیر تا سندھ' کے خطہ کی لسانی نوعیت جداگانہ تھی۔ یہ خطہ شروع میں 'ہند-ایرانی' اور بعد میں 'ہند- آریائی' اور 'داردی' زبانوں کے زیرِ اثر رہا۔

سنسکرت اپنے کلاسیکی قالب میں بند ہوچکی تھی اور اس کے زیرِ اثر عوام کی زبانیں اپنا اوائلی پراکرتی دور ختم کرنے والی تھیں۔ سندھ میں اس کلاسیکی سنسکرت خواہ اوائلی پراکرت کے اثر کی پہنچ تھی اور نہ ہی گنجائش؛ کیونکہ اس وقت سندھ کے 'موئن جو دڑو' کے دریائی تمدن کی 'سامی-صفت' زبان سندھ میں رائج تھی۔ اس کے بعد سندھ پر تقریباً ۶۰۰ سال قبل مسیح تک جو اثر پڑتا رہا وہ کشمیر- ملتان کے خطہ سے داردی زبانوں اور سنسکرت کا تھا اسی لیے بنیادی طور پر سندھی زبان داردی زبانوں کے قریب تر رہی۔[1]

داردی زبانوں میں دو حرفِ علت کے درمیان میں آنے والی 'ت' تبدیل نہیں ہوتی؛ یہ 'داردی' خصوصیت اب تک ''وادی سندھ کی قدیم زبانوں'' [سندھی، لہندا، پنجابی (لہندا کے زیر اثر) اور کوہستانی] میں موجود ہے۔ ان زبانوں میں 'پیتو' 'لاتو' 'کیتا' 'سیتا' وغیرہ مروج ہیں، حالانکہ دیگر ہند-آریائی زبانوں میں یہ الفاظ پیا، لایا اور سیا بن چکے ہیں۔[2]

سندھ سے کشمیر تک ''وادی سندھ کی زبانوں'' میں 'اسین' 'اسان' 'اسي' وغیرہ مشترک الفاظ ''اسي'' سے نکلے ہیں، سنسکرت لفظ 'ویئم' (جس کے ساتھ انگریزی لفظ we بھی منسلک ہے) سے نہیں نکلے۔ یہ لفظ 'اسي'، سنسکرت سے پہلے یا سنسکرت کے زمانے کی پراکرت کا ہے، جسے اگر 'اولین-پراکرت' (Proto-Prakrit) کہا جائے تو مناسب ہوگا۔ بہرحال ایسے الفاظ وادی سندھ کی زبانوں کے مشترک مگر سنسکرت سے ایک الگ سرچشمہ کا پتہ دیتے ہیں۔

---

(1) Sindhi, on the Contrary, Claims a much more clear relationship to the Dardic languages(Which influenced it from northren side) being protected from the east by the desert of western Rajisthan. (Grierson: Lingustic survey of India vol. viii P:1)

(2) Grierson: Lingustic survey of India vol. i P:14

(ب) ۶۰۰ سال قبل مسیح سے ۵۰۰ سال بعد مسیح

سندھ کی زبان اور پالی پراکرت : ابتدائی قدیم دور کے بعد ہم پچھلے قدیم دور (۶۰۰ سال ق م سے ۵۰۰ سال بعد مسیح) پر آتے ہیں۔ یہ 'ہند' کی پراکرت زبانوں کا دوسرا دور ہے۔ 'سندھ کی زبان' پر جس پراکرت کے اثر کا امکان نظر آتا ہے وہ ''پالی'' تھی جس کا مؤثر دور ہندوستان میں تقریباً ۶۰۰ سال ق م سے شروع ہوتا ہے۔ تقریباً اسی زمانے کے بعد ہی سندھ پر باہر سے ہندوستان کے مذہبی نیز سیاسی اثرات کا آغاز ہوتا ہے؛ اس کے بعد بدھ دھرم کا پرچار خواہ جین (چندر گپت) اور بدھ حاکموں (اشوک اور کنشک) کا سیاسی اقتدار، مختلف اوقات میں تھوڑے یا زیادہ عرصہ کیلئے قائم ہوا؛ اس لئے پالی اور دیگر ''دوسرے دور والی'' پراکرت زبانوں کا اثر سندھ کی زبان پر ممکن نظر آتا ہے۔ مگر پراکرت زبانوں خصوصاً پالی زبان کا اثر کس قدر سندھ کی زبان پر پڑا ہوگا، اس کیلئے تاریخ کی طرف دیکھنا چاہئے۔

پالی زبان کا عروج تقریباً ۶۰۰ برس قبل مسیح اور مہاتما بدھ کے زمانہ سے شروع ہوتا ہے۔ اس زمانہ خواہ اس کے بہت بعد، اشوک کی حکمرانی (تقریباً ۲۵۰ سال ق م) سمیت سندھ میں بدھ دھرم کے پرچار کا تاریخی ثبوت نہیں ملتا۔ اشوک کے مذہبی پرچار کی کوئی بھی تحریر سندھ میں موجود نہیں ہے۔ سندھ کے سب سے زیادہ قریب اشوک کی تحریریں شاید شہباز گڑھی اور مانسہرہ والی ہیں، جو پالی زبان کے مقامی محاورے (Dialect) میں کندہ ہیں۔ اسی کندہ محاورے سے سمجھ میں آتا ہے کہ اشوک کے ایام میں خود پالی پراکرت شمال مغربی ہندوستان کے مقامی محاوروں کے قالب میں بند ہو چکی تھی۔

سندھ میں بدھ دھرم کا مؤثر پرچار اس سے چار سو برس بعد دوسری صدی عیسوی میں کوشان گھرانے کے دور میں شروع ہوا۔ عیسوی سنہ ۵۰ کے لگ بھگ کوشان شاہ کنشک کے ایام میں، اشوک کے خالص بدھ متی 'ہناین' پر مہاین پنتھ غالب آیا، جس کے مطابق ظاہری کریا کرم اور پاٹھ پوجاؤں نے زور پکڑا۔ مہاتما بدھ کے لباس خواہ اس کے آستانوں، ڈیروں پر پوجا کیلئے ستون اور دقل (Stupa) منار اور مندر بنے۔ وہ ستون اور دقل (Stupa) مہاین پنتھ کے نمایاں نشان تھے۔ سندھ میں بدھ ٹکر (بدھوں کی پوجا پاٹھ کی پہاڑی) میرر کن کا منارہ، ڈیپر گھانگھرو کا منارہ، کاہو کا ٹیلہ اور موئن جو دڑو کے بدھ مندر اسی مہاین پنتھ کے پختہ ثبوت ہیں۔ سندھ کے مہاین پنتھ کا پرچار ممکن ہے کہ کنشک کے دور میں شروع ہوا ہو؛ مگر غالب گمان یہ ہے کہ اس پنتھ نے سندھ میں کنشک کی تیسری پشت کے

حاکم ''واسدیو'' کے ایام میں تقریباً دوسری صدی کے لگ بھگ زور پکڑا[1] ''واسدیو'' کے جو سکے ''موئن جو دڑو'' کے بالائی سطح والے 'بدھ کھنڈرات' سے ملے ہیں ان کے مطابق سندھ میں کوشانی سیاسی اقتدار (جس پر ہی مذہبی پرچار کا زیادہ دار و مدار رہا) کا زمانہ دوسری صدی عیسوی قرار دیا جا سکتا ہے۔

اگر مہاین پنتھ کا پرچار پالی پراکرت میں تسلیم کیا جائے تو پھر کہا جا سکتا ہے کہ پالی پراکرت کا اثر سندھ کی زبان پر تقریباً دوسری صدی عیسوی سے شروع ہوا۔ مگر سوال یہ ہے کہ جس پالی محاورے میں وہ پرچار ہوا اس کی لسانی کیفیت کیا تھی؟ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ اشوک کی، شہباز گڑھی اور مانسہرہ کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ۲۵۰ سال ق م کے لگ بھگ پالی پراکرت مقامی محاوروں کے قالب میں بدل چکی تھی۔ اس کے تین چار سو سال بعد پالی کے ان محاوروں میں اور زیادہ تبدیلی آئی ہوگی۔ گویا، جب پالی زبان خود اپنے آخری پراکرتی دور سے گذر رہی تھی اور اس کے محاورے (Dialects) علاقائی زبانوں کے ساتھ خلط ملط ہو کر اپنی اصلیت کھو رہے تھے، اس دور کے کسی ''مخلوط پالی محاورے'' میں مہاین پنتھ کا پرچار سندھ میں ہوا۔ اس کا ثبوت، کنشک کے دور کی ایک پالی عبارت سے ملتا ہے، جو ایک تانبہ کی تھالی پر کندہ ہے۔ وہ تھالی سندھ کی قدیم قریبی حدود کے اندر یعنی بہاول پور سے سولہ میل جنوب - مغرب کی جانب بدھ کے قدیمی مندر ''سئی وہار'' کے کھنڈرات سے دستیاب ہوئی تھی۔[2]

اس عبارت کا بنیادی مقصد غالباً یہ ہے کہ ''دمن وہار'' مندر کی ایک پجارن ''بال نندی'' اور اس کی ماں ''بال جیہ'' نے مہا رائے کنشک کی حکمرانی کے گیارہویں سال کے ''ڈائسیس'' مہینہ کی ۲۰ تاریخ کو ''سئی وہار'' مندر میں بھکشو گیانی ''ناگدت'' کو بھینٹ دی۔

خاص غور طلب بات یہ ہے کہ وہ عبارت خالص پالی میں نہیں بلکہ اس کے ''بختی محاورہ'' (Bacterian Pali) میں لکھی ہوئی ہے، دو دانشوروں سر 'بیلی' اور پروفیسر 'ڈاؤسن' کی رائے کے مطابق اس کتبہ میں مقدونی مہینہ ڈائسیس (Daesius or Daisios) کا نام واضح معلوم ہوتا ہے جو غالباً بختی یونانیوں کے ذریعہ رائج ہوا۔ ڈاکٹر ہارنلی نے اس کتبہ کی زبان کو مغربی پالی

---

(۱) واسدیو کی حکمرانی کا عرصہ مبہم ہے: کچھ لوگوں نے اس کا دورِ حکومت پہلی صدی عیسوی بتایا ہے جبکہ کچھ لوگوں نے تقریباً ڈیڑھ سو سال کے بعد کا۔

(۲) کتبہ کی یہ تھالی جی-ییسٹ (G-Yeast) کو فروری ۱۸۶۹ء میں ملی، جو بعد میں میجر 'سٹبس' (Stubbs) نے حاصل کر کے سر بیلی (Sir E.C.Bailey) کی طرف کلکتہ بھیج دی، جہاں پر سنہ ۱۸۷۰ء میں ''ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال'' کے جرنل میں اس پر دو مضمون شائع ہوئے۔ اصل تھالی ۳۰ مربع انچ ہے، جس کا چھوٹا عکس ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے جرنل (جلد ۳۹ پلیٹ نمبر ۲) میں شائع ہوا۔

16-الف
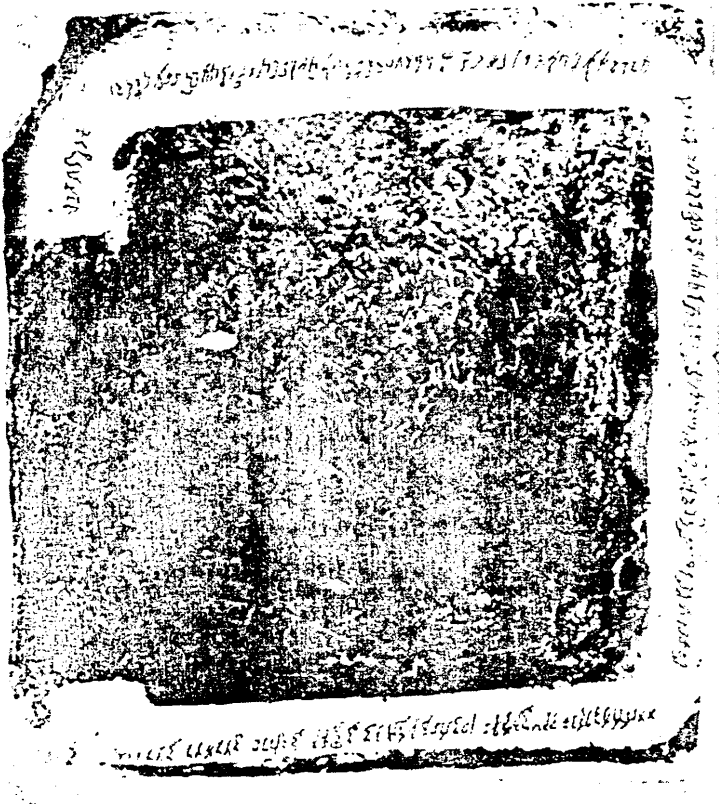
''بختی پالی'' محاورے میں لکھا گیا کنشک دور کا ایک کتبہ جو کہ

سئی وہار، بہاولپور سے ملا ہے۔

(محکمہ آثار قدیمہ کے تعاون سے)

16-ج

THE INDIAN ANTIQUARY.

[3] ''دُسی وہار'' سے پائے گئے ''بختی پالی'' کتبے کی تین الگ الگ
تلفظ والی تحریر اور اس کا انگریزی ترجمہ

بتایا ہے۔ بہاول پور گزیٹیئر میں سابقہ تحقیق کی بناء پر اسے بختی پالی کا کتبہ تسلیم کیا گیا ہے۔ (۱)

بہرحال حدودِ سندھ میں آخری پراکرتی دور کا یہی کتبہ دستیاب ہوا ہے جو پالی کے کسی مقامی محاورہ میں کندہ ہے۔ سنسکرت کا کوئی کتبہ یا کوئی بھی قدیم تحریر سندھ کے کسی بھی حصہ سے اب تک دستیاب نہیں ہوئی۔ اسی بناء پر کہا جاسکتا ہے کہ سنسکرت کا اثر، جو اسی پالی محاورہ کے ذریعے سندھی زبان پر پڑا ہوگا وہ اکثر دخیل الفاظ کی صورت میں پڑا ہوگا۔ کیونکہ پالی کا مخلوط پراکرتی محاورہ صرف ونحو کے لحاظ سے بذات خود سنسکرت سے بہت زیادہ ہٹ چکا تھا البتہ سنسکرت سے مشتق (Derived) الفاظ جس بھی صورت میں سندھ کی زبان میں جذب ہوئے وہ سرزمین سندھ میں اسی صورت میں باقی رہے، اور آج تک باقی ہیں۔ غالبًا پالی محاورہ کے ذریعے سنسکرت کے کافی الفاظ سندھ کی زبان میں داخل ہوئے۔ سندھ میں بدھ دھرم کا 'مہاین پنتھ' رائج ہوا، اور جیسا کہ مہاین پنتھ سندھ میں پہلی صدی عیسوی سے گیارہویں صدی تک (۲) جاری رہا، اس لئے سمجھ میں آتا ہے کہ اس عرصہ میں ہی 'سندھ کی زبان' کو بدھوں کی پوتر زبان پالی کے ذریعے سنسکرت سے نکلے ہوئے الفاظ کا بڑا ذخیرہ ملا۔

دیگر حکمران قوموں کی زبانوں کا اثر:

پالی پراکرت کا اثر 'سندھ کی زبان' پر خاص طرح سے دھرمی پرچار کے ذریعے ہوا۔ سیاسی اقتدار کے ذریعے حکمرانوں کی زبان کا رعایا کی زبان پر بہت کچھ اثر پڑتا ہے۔ لیکن کوشان گھرانے کا سیاسی اقتدار سندھ پر کوئی زیادہ عرصہ نہیں رہا۔ اس دور کی سیاسی تاریخ ظاہر کرتی ہے کہ پالی کے علاوہ ایرانی، یونانی، ترکی اور داردی بولنے والی قوموں کا سندھ پر سیاسی اثر رہا۔ ذیل میں ان زبانوں کا زمانہ وار خاکہ دیا جاتا ہے۔

---

(۱) پہلے پروفیسر ڈاؤسن (Dowson) اور سربیلی (Sir E.C.Bailey) نے اس عبارت کو ۱۸۷۰ء میں پڑھا اور اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا پروفیسر ڈاؤسن کا ترجمہ اور کتبہ کے بارے میں تفصیل ''جرنل آف دی رائل ایشیا ٹک سوسائٹی'' (جلد:N-S 6 سنہ ۱۸۷۰ء ص ۴۹۷-۵۰۲) میں شائع ہوئی اور سربیلی کا ترجمہ ''جرنل آف ایشیا ٹک سوسائٹی آف بنگال'' (جلد:۳۹، ۱۸۷۰ء، ص ۶۵-۷۰) میں شائع ہوا۔ اس کے بعد ڈاکٹر ہارنلے (A.F Rudolf Harnle) نے یہ کتبہ پڑھا جو بمبئی سے شائع ہونے والے ''انڈین اینٹکری'' (Indian Antiquary، ماہ نومبر ۱۸۸۱ء، ص ۳۲۴-۳۳۱) میں پروفیسر ڈاؤسن اور سربیلی کے رسم الخط سمیت شائع ہوا۔ ڈاکٹر ہارنلے نے مہینہ کا نام "Daisika" پڑھا ہے، جسے مقدونی مہینہ "Daision" (مئی-جون) سمجھنا چاہئے۔ ڈاکٹر ہارنلے کی رائے میں کتبہ میں دیے گئے مہینہ کا نام ''مغربی پالی محاورہ'' کے زیر اثر اصل مقدونی مہینہ کے نام سے تبدیل ہوا ہے۔ بہاول پور گزیٹیئر میں اس کتبہ کو ''بختی پالی کا کتبہ'' تسلیم کیا گیا ہے۔ (دیکھئے بہاولپور ریاست کا گزیٹیئر، ریاستہائے پنجاب کے گزیٹیئر سلسلے کی جلد ۶-الف لاہور ۱۹۰۸ء، ص ۳۸۴)

(۲) بدھ کی صورت والی اینٹ۔

زبانوں کا زمانی خاکہ

قدیم ایرانی زبان کا اثر	۵۱۵-۲۵۰ ق م فتح دارا ۵- صدی ق م ۴- صدی ق م
یونانی زبان کا اثر:	۳۲۶-۳۲۵ ق م، فتح سکندر ۳- صدی ق م ۲- صدی ق م ۱۹۵-۱۵۰ ق م، بلخ کے یونانی حاکموں کی فتح
ترکی اور داردی زبانوں کا اثر:	۱۵۰-۱۲۰ ق م، ساکا اور ستھین قوم کے حملے ۱- صدی ق م
پالی پراکرت کا اثر:	۴۰-۵۰ مسیحی، کوشان شاہ کنشک
ترکی اور داردی کا اثر:	۱۰۲/۱۶۰-۲۰۰م، پارتھین کے حملے ۲- صدی م
پچھلی ایرانی زبان کا اثر:	ساسانی تسلط
ترکی اور ایرانی کا اثر:	۳- صدی م ۴- صدی م، ہیاطلہ ۴۷۰-۴۸۰م، سفید ہن ۵- صدی م ۳۱۵- م، خسرو نوشیرواں
ملکی زبانیں:	۶- صدی م، رائے خاندان ۷- صدی م، برہمن خاندان

اب سوال یہ ہے کہ اس تمام قدیم دور کے تاریخی اور لسانی ماحول کا ''سندھ کی زبان'' پر کیا اور کتنا اثر رہا؟

سندھ کے قدیم تمدن کی زبان شاید سامی-صفت تھی۔ اس پر جو ابتدائی اثرات مرتب ہوئے ہوں گے وہ خاص طور پر منڈا، دراوڑی اور ایرانی زبانوں کے اور بعد میں داردی زبانوں

کے ہوں گے۔ سندھ کی زبان یا زبانوں پر سنسکرت کا اثر دیر سے پالی محاورہ کے ذریعے ہوا، مگر اس عرصہ، میں مغربی اور شمالی زبانوں - مثلاً ایرانی، یونانی، ترکی اور داردی - کا بھی اثر پڑا۔ ان اثرات کے علاوہ ''سندھ کی زبان یا زبانوں' سے پیدا شدہ 'سندھی زبان' کی ذاتی اصلیت یا تاریخی حقیقت، سنسکرت اور اس کی پراکرت زبانوں سے بالکل منفرد تھی؛ اسی وجہ سے 'سندھی زبان' نے دیگر پراکرت زبانوں کے مقابلے میں ایک نرالی نوعیت اختیار کی۔ دیگر پراکرت زبانیں، جو اپنے دوسرے ارتقائی دور سے گذر کر زیادہ بگڑیں، ان زبانوں کو قدیم نحویوں نے ''اپ بھرنش'' کہا - یعنی معیار سے گری ہوئی۔ ان نحویوں کی پرکھ کا معیار تھا ''سنسکرت کے ساتھ قربت اور مناسبت''؛ مگر سندھی زبان جو اپنی اصلی آراستگی اور ترتیب میں نرالی تھی، اور جس پر ہندوستانی پراکرتوں کے مقابلے میں مغربی اور شمالی زبانوں کا اثر زیادہ ہوا تھا، وہ اس معیاری پرکھ کی رو سے تو بہت زیادہ بگڑی ہوئی تھی۔ اسی لئے بقول بعض محققین، جس زبان کو ان نحویوں نے ''وراچڈ اپ بھرنش'' یعنی 'بہت زیادہ بگڑی ہوئی' کہا، وہ 'سندھ کی زبان' تھی۔ حقیقت میں ''وراچڈ اپ بھرنش'' کا نام سندھ سے بہت اوپر شمالی خطہ کی کسی زبان پر آسکتا ہے، سندھی زبان پر نہیں؛ کیونکہ ''وراچڈ اپ بھرنش'' کی اصطلاح میں بھی 'سنسکرت سے مناسبت' ملحوظ ہے۔ سندھی زبان کا تو معیار ہی انوکھا تھا۔ اسی لئے پراکرت گرامر بنانے والے 'مارکنڈیہ' کا یہ قول کہ: ''وراچڈ سے بھی سندھ کی زبان زیادہ تبدیل شدہ ہے''، زیادہ وزن دار اور قابلِ غور ہے۔ اس قول کی تائید میں ایک اہم ثبوت موجود ہے - مثلاً: ''وراچڈ اپ بھرنش'' میں 'س' کا تلفظ تبدیل کر کے ''ش'' کرتے تھے، مگر سندھی زبان میں ''ش'' کا تلفظ تبدیل کر کے ''س'' کرتے تھے۔ سندھ کے لوگوں کی یہ انوکھی لسانی خصوصیت بعد میں بھی کافی عرصہ تک باقی رہی جیسا کہ ''شاعر ابو عطا سندھی'' کی آنے والی مثالوں سے ظاہر ہوگا۔

سنسکرت، پراکرت اور اپ بھرنش:

'سندھی زبان' کی تاریخی حیثیت کو سمجھنے کے لئے سنسکرت، پراکرت اور اپ بھرنش کے باہمی رابطہ کو بھی صحیح معنی میں سمجھنا ضروری ہے: کیونکہ عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ سندھی اپ بھرنش سے نکلی ہے، اپ بھرنش پراکرت سے اور پراکرت سنسکرت سے۔ اس سلسلے میں درج ذیل نتائج، جو ان زبانوں کے قدیم معتبر علاقائی ہندو، بدھ اور جین علماء اور کچھ غیر علاقائی علماء کے نظریات کے مطابق ہیں، انہیں پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے:

ا- کچھ قدیم ہندو علماء کے خیال میں اپ بھرنش زبان پراکرت سے نکلی اور پراکرت سنسکرت

سے۔ ہیم چندر، مارکنڈ یہ، دھنِک اور دوسروں کی تحریر سے یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ ان دانشوروں نے اس برعظیم کی کچھ 'ادبی زبانوں' کو پراکرت کہا ہے اور ان کی بنیاد (پراکرت، پرکرت=جزو، بنیاد) سنسکرت کو تسلیم کیا ہے۔ مگر دیگر قدیم ہندو، بدھ اور جین علماء کی رائے اس کے برعکس ہے، نیز موجودہ علمی تحقیق نے اس نظریئے کو ہمیشہ کے لئے رد کردیا ہے۔ اول تو ہندو علماء میں سے وَرَرَشی اور دیگر نحویوں اور ادیبوں نے اپ بھرنش کو پراکرت سے نکلا ہوا تسلیم کرنا تو دور کی بات ہے، اسے پراکرت گروہ کی زبان ہی تسلیم نہیں کیا۔ ان کے بقول سنسکرت، پراکرت اور اپ بھرنش تینوں مختلف قسم کی زبانیں ہیں''ڈنڈن '' (ڈنڈن) بھی ان علماء میں سے ہے جو کہتا ہے کہ قدیم ادبی کتابیں چار الگ زبانوں-سنسکرت، پراکرت، اپ بھرنش اور مشر (مشترکہ زبانوں)- میں لکھی ہوئی ہیں۔ وہ بعض ادبی کتابوں میں استعمال شدہ ابھیرن کی زبان کو اپ بھرنش کے گروہ میں شمار کرتا ہے۔ یہ علماء، 'شاستروں' یا 'رسائل' میں استعمال شدہ جو بھی زبان سنسکرت سے انوکھی ہے، اسے اپ بھرنش شمار کرتے ہیں۔ ''واگ بھٹ'' خواہ ''رَوِکَر'' دونوں اپ بھرنش کی دو قسمیں تسلیم کرتے ہیں، جن میں سے فقط ایک کی بنیاد پراکرت بتاتے ہیں، لیکن دوسری کو ''دیس بھاشا'' یا عوامی زبان تسلیم کرتے ہیں۔

۲- دوسرا یہ کہ ہندو علماء کے علاوہ بدھ مذہب والوں کی روایات کے مطابق بھی سنسکرت، پراکرت اور اپ بھرنش الگ زبانیں ہیں۔ مثلاً شمالی ہندوستان کے بدھوں کی تحریری روایات کے مطابق مہاتما بدھ کی موت کے ایک سو سولہ سال بعد چار ''ستھویر'' ہوئے جو چار الگ الگ ذاتوں میں سے تھے اور چار الگ الگ زبانیں-سنسکرت، پراکرت، اپ بھرنش اور پیشاچی- بولتے تھے۔

۳- تیسرا یہ کہ ''جین مت والوں'' کے نظریات کے مطابق بھی 'پراکرت' سنسکرت سے نہیں نکلی ہے۔ یہ ثابت ہوچکا ہے کہ اردھ ماگدھی (جسے قدیم ملکی نحویوں نے ''آرش'' یا ''آرشم'' کہا ہے) جس میں مہاتما مہابیر سوامی نے دھرم تبلیغ کی، وہ تمام پراکرت زبانوں میں نہایت بنیادی اور اہم ہے۔ جین علماء کی رائے میں ''اردماگدھا'' سب سے قدیم بلکہ تمام زبانوں کی اصل ہے۔ ''نامسدھ'' عالم ''رُدرَتھ'' کی ''کاویالنکار'' کے بارے میں لکھتے ہوئے کہتا ہے کہ ''اردماگدھی'' ہی سے علاقائی فرق اور نحوی تبدیلی کے بعد سنسکرت اور دیگر زبانیں نمودار ہوئیں۔ دیگر نحویوں کی تحریر سے بھی اسی رائے کی تائید ہوتی ہے۔ خود 'ہیمچندر' کہتا ہے کہ ''جین سوتروں کی زبان ''آرش'' کے بارے میں دیے ہوئے اس کے تمام قاعدے مستثنات (Exceptions) کے محتاج ہیں۔ ''ترِوکرم'' نے بھی ''آرش'' کو اپنی گرامر سے مستثنیٰ کیا، کیونکہ اس کے خیال کے

مطابق وہ بذات خود ایک جداگانہ زبان ہے اور سنسکرت اس کا سرچشمہ نہیں۔
۴- چوتھا یہ کہ موجودہ علمی تحقیق نے بھی اس نظریئے کو ہمیشہ کیلئے رد کردیا ہے، کہ ''پراکرت'' یا ''پراکرت زبانیں'' سنسکرت سے نکلی ہیں۔ پراکرت کے مطالعہ اور تحقیق میں ''پشیل'' (R.Pischel) اور ''سینارٹ'' (Senart) کا اعلیٰ مقام تسلیم شدہ ہے۔ پشیل کی رائے میں تمام پراکرتوں کا سرچشمہ قدیم عام مقبول محاورے (Popular Dialects) ہیں اور دوسرا یہ کہ ہندوستان کی تمام جدید زبانیں سنسکرت سے نکلی ہوئی نہیں ہیں۔ (۱)

اپ بھرنش اور سندھی کا تعلق:

سندھی زبان کی تاریخی اور خصوصی حیثیت کو سمجھنے کے لئے ''اپ بھرنش'' اور سندھی کے تعلق کے نظریئے کو صحیح طور پر سمجھنا بھی ضروری ہے۔ اس سلسلے میں اول یہ جاننا ضروری ہے کہ ''اپ بھرنش'' کسی ایک خاص زبان کا مخصوص نام نہیں بلکہ اسی سلسلے کی بھاشاؤں کے مجموعہ کا نام ہے: یعنی کوئی بھی ایسی بھاشا یا زبان، جو سنسکرت کے صحیح معیار سے ہٹی ہوئی ہو۔ اس لحاظ سے ''اپ بھرنش'' برعظیم پاک و ہند کی عام مقبول زبانوں کا نام ہے۔ (۲)

ہیمچندر اور مارکنڈیہ، جو کہ پراکرت کے نحویوں میں خاص درجہ رکھتے ہیں، ان دونوں نے ''اپ بھرنش'' کے متعلق لکھا ہے۔ ہیمچندر (۱۰۸۸-۱۱۷۶ء) قدیم نحوی ہے اور اس نے اپنے گرامر ''سِدّھ ہیمچندر'' میں اپ بھرنش کو ایک مجمل نام کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اپ بھرنش کے متعلق اس کے قواعد سے ظاہر ہوتا ہے کہ کئی عام مقبول زبانیں اس میں شامل ہیں۔ اس کے قاعدہ نمبر ۴ کے مطابق اپ بھرنش میں کَ، کھَ، تَ، تھَ، پَ، پھَ کا تلفظ اکثر تبدیل ہوکر گَ، گھ، دَ، دھَ، بَ، بھَ ہوجاتا ہے۔ اس قاعدے کی بنیاد پر سندھی کو اپ بھرنش گروہ کی زبان ثابت کرنا مشکل ہے۔ مارکنڈیہ ایک نامعلوم مصنف کے حوالے سے پوری کی پوری ستائیس زبانوں کو ''اپ بھرنش'' گروہ میں شمار کرتا ہے۔ مارکنڈیہ نے ''اپ بھرنش'' کی تین قسمیں بتائی ہیں: ایک ''ناگر'' جو سب سے اہم ہے، دوسری ''وراچڈ'' جو ناگر سے نکلی اور اس نے ''سندھو

---

(۱) تصدیق کے لئے دیکھئے، پشیل کا ''پراکرت بولیوں کا تقابلی گرامر''، جرمن سے انگریزی ترجمہ، دہلی، ۱۹۵۷ء، ص ۶-۷

I agree with Senart that all the Prakrits go back to popular dialects as their source and their all essential elements originally developed from the living speeches (P.7) This Sanskirt wes not the basds & the Prakrit. The fact that all the new Indian languages do not go back to Sanskrit today needs no more proof (P.6) [R. Pischel: comparative Grammar of the Prakrit languages: translated from German by Subhadra Jha` Motilal Banarasidass Publishers, Delhi 1957, P P 6-7]

(۲) تصدیق کیلئے دیکھئے پشیل کا ''پراکرت بولیوں کا تقابلی گرامر'' انگریزی ترجمہ دہلی ۱۹۵۷ء، ص ۳۱

-دیش'' میں جنم لیا ''سندھو- دیشی یووراچڈ وبھرنشیہ''؛ تیسری 'اپناگر' جو 'ناگر' اور 'وراچڈ' کے سنگم سے نکلی۔ مارکنڈیہ کے اس بیان سے گریرسن اور دیگر نے یہ سمجھا ہے کہ ''وراچڈ'' سندھ میں پھلی پھولی، اور موجودہ سندھی ''وراچڈ'' سے نکلی اور وراچڈ 'اپ بھرنش' سے۔ حالانکہ مارکنڈیہ اور دیگر قدیم لکھنے والوں نے جہاں کہیں ''سندھو'' یا ''سندھو-سؤویر'' کے نام لئے ہیں، تو وہاں اس سے مراد موجودہ ''سندھ'' نہیں بلکہ ملتان اور جنوب مغربی پنجاب کا خطہ مراد ہے۔ (۱)

اسی لئے یہ محض ایک قیاسی نتیجہ ہے کہ موجودہ سندھ کی سندھی زبان ''وراچڈ'' سے نکلی ہے، کیونکہ اس قسم کے نتیجے کیلئے کوئی بھی بنیادی علمی دلیل نہیں ہوسکتی۔ خود مارکنڈیہ کی دی ہوئی دلیل غور طلب ہے: کیونکہ وہ خود ''وراچڈ'' کی ایک لغوی خصوصیت یہ بتاتا ہے کہ اس میں ''ج'' اور ''چ'' کے تلفظ کے مقابل ''ی'' کا تلفظ پیدا ہوا۔ سندھی میں حرف 'ج' کے مقابل 'ی' کے تلفظ پیدا ہونے کا گمان ہوسکتا ہے (اگر ہم 'ج' کے آگے خواہ پیچھے 'ی' ملاکر ''ئج'' یا ''جیہ'' کو ''ج'' کے برابر سمجھیں) لیکن ''چ'' سے پہلے یا بعد میں ''ی'' کے تلفظ پیدا ہونے کا سندھی میں کوئی بھی ثبوت موجود نہیں۔ مارکنڈیہ نے ایک اور خصوصیت یہ بتائی ہے کہ ''ش'' اور ''س'' کا تلفظ تبدیل ہوکر ایک نیا تلفظ بنتا ہے۔ مگر یہی خصوصیت اس نے 'اردماگدھی' کے لئے بھی بیان کی ہے۔ ایک اور نحوی ''پرتھوی دھر'' نے یہی خصوصیت ''سنکار'' زبان کی بھی بتائی ہے؛ جس کا مطلب ہے کہ یہ خصوصیت ''وراچڈ'' کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ ہم آگے چل کر شاعر ''ابو عطاء'' کی مثال میں ''س'' اور ''ش'' کے تلفظات کے بدلنے کی خصوصیت کا ذکر کریں گے، لیکن جیسا کہ یہ لغوی خصوصیت سندھی زبان کیلئے مخصوص نہیں بلکہ دوسری زبانوں میں بھی موجود ہے اس لئے اس سے، سندھی کے، وراچڈ سے نکلنے کی مضبوط دلیل نہیں مل سکتی۔

آخر میں خاص غور طلب بات یہ ہے کہ 'مارکنڈیہ کویندر' نے اپنی کتاب ''پراکرت سروسو'' سندھ سے سینکڑوں میل دور مشرقی ہندوستان (اوڑیسہ) میں لکھی، اس وجہ سے مغربی ہندوستان کی زبانوں کے بارے میں اس کی رائے کو اتنی اہمیت نہیں دی جاسکتی۔ دوسرا یہ کہ مارکنڈیہ کوئی زیادہ قدیم علم نحو کا ماہر نہیں۔ اس نے اپنی کتاب راجہ ''مکند دیو'' کے دورِ حکمرانی میں لکھی۔ جس کا عرصہ حکمرانی بعض محققین نے ۱۶۶۴ء لکھا ہے مگر بعض دوسرے محققین کی رائے کے مطابق مارکنڈیہ بہر صورت ۱۵ویں صدی عیسوی کے ابتدائی پچیس سالوں کے بعد گذرا ہے، یعنی ۱۴۲۵ء کے بعد، جو کہ سندھ میں سمہ حکمرانوں کا آخری دور تھا، یعنی وہ دور جس میں ہمیں سندھی زبان کی شاعری

(۱) محقق بیرونی نے وضاحت سے سمجھایا ہے کہ قدیم ''سؤویر'' کا علاقہ یہی ملتان کا علاقہ تھا (''سوبیرھو الملتان'' کتاب ماللھند، حیدرآباد دکن، ص۲۵۳ اور ۲۵۶)

''ابیات'' کی مکمل صورت میں ملتی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ مارکنڈیہ کے دور سے بھی بہت پہلے سمہ حکمرانوں کے ابتدائی ایام کے اشعار بھی ملتے ہیں جن میں، موجودہ سندھی زبان اپنی مکمل صورت میں نظر آتی ہے۔[1] بلکہ اس سے بھی بہت پہلے سومروں کے آخری دور کی زبان کے خد و خال بھی 'معموں' (گِاھہ)[2] کی صورت میں واضح نظر آتے ہیں[3] اگر موجودہ سندھی زبان 'وراچڈ' سے نکلی ہوگی تو وہ سومروں کے ابتدائی دور میں یا اس سے بھی پہلے نکلی ہوگی۔ ہیمچندر سومروں کے ابتدائی دور کا ماہر علم نحو ہے، لیکن اس نے صرف اپ بھرنش کا ذکر کیا ہے وراچڈ کا نام بھی نہیں لیا۔

'اپ بھرنش' کی لغوی اور تاریخی حیثیت:

'اپ بھرنش' کی صحیح لسانی اور تاریخی حیثیت کو پھر بھی مد نظر رکھنا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں پشیل کا بیان کردہ تحقیقی نظریہ نہایت ہی اہم ہے: یعنی کہ ''اپ بھرنش'' ان بھاشاؤں کا مجموعی نام ہے، جو کہ سنسکرت کے صحیح لغوی معیار سے ہٹی ہوئی تھیں۔ اصولاً یہ عام مقبول عوامی زبانیں تھیں، جو براہ راست سنسکرت سے نہیں نکلی تھیں، اس لئے صرف و نحو اور لغت کے اعتبار سے سنسکرت کے قواعد کا ان پر اطلاق نہیں ہوسکتا تھا، وہ ایسی ''پراکرتیں'' تھیں جن کا سرچشمہ سنسکرت سے پہلے کی کوئی عوامی زبان یا زبانیں تھیں، جن کو ''اولین - پراکرت'' (Proto-Prakrit) یا ''ویدی بھاشا'' (Vedic Language) کے گروہ میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ موجودہ لسانی تحقیق نے بھی یہی ثابت کیا ہے کہ ''اپ بھرنش'' گروہ کی بولیوں اور ''ویدی بھاشا'' میں کافی حد تک یکسانیت ہے[4] اس حقیقت کے اعتبار سے البتہ ''سندھی'' کو ''اپ بھرنش'' گروہ کی زبان شمار کیا جاسکتا ہے، لیکن یہ سندھ کی اپنی مقامی اپ بھرنش تھی۔ ہم اس سے پہلے دیگر مستقل دلائل کی بنیاد پر بھی اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ سندھی کا تاریخی رشتہ سنسکرت سے پہلے کی کسی عام مقبول 'اولین - پراکرت' سے ملتا ہے۔ اس سلسلے میں، موجودہ دور کا ایک سندھی محقق جن نتائج پر پہنچا ہے وہ قائلِ

---

(۱) دیکھئے باب پنجم

(۲) 'گِاھہ' سنسکرت کا لفظ ہے جس کے لفظی معنی ہیں لفظ چبا جانا، غیر واضح تلفظ، لفظ چبایا ہوا جملہ، دہرے اندازے یا دہرے تخمینے والی بات، اشارہ، رمز، نشانی، معمہ، بھید، پہیلی وغیرہ اور سندھی ادبی اصطلاح میں 'گِاھہ' کہتے ہیں: کہانی میں موقع کی مناسبت سے دوہا کہنے کو، یعنی قصے کے دوران مناسب موقع شعر کہنا، گفتگو کے درمیان (لفظی) اشارے دینا۔ واضح رہے کہ اس کتاب میں 'معمہ' یا معمے وغیرہ اسی معنی اور مفہوم میں استعمال ہوئے ہیں۔
دیکھیئے: ۱- سندھی - اردو لغت، ص: ۷۰۶
۲- جامع سندھی لغات، جلد ۵، ص: ۲۳۸۴ (مترجم)

(۳) دیکھئے باب چہارم

(۴) تصدیق کیلئے دیکھئے اس سے پہلے دیا گیا پشیل کا ''پراکرت بولیوں کا گرامر'' (ص ۳۲)

"Apabhran'sa shows affinities with the Vedic Language not in a small measure"

غور ہیں:[1]

۱- ''وراچڈ'' اسی ''ناگر'' کا ایک نمونہ تھی، جو (ناگر) راجستھان اور گجرات سمیت وسط-مغرب ہندوستان کی بین العلاقائی زبان تھی۔

۲- یہ ''وراچڈ'' اس وقت جو لوگ بولتے تھے، وہ یا تو مغربی پنجاب کی وسط- وادیٔ سندھ (جس کو مارکنڈیہ سے پہلے کے مصنفین نے ''سندھو-دیش'' کے نام سے پکارا ہے) کے تھے یا جنوبی پنجاب اور شمالی سندھ کے درمیانی علاقے کے رہنے والے تھے۔

۳- زیریں وادیٔ سندھ میں سندھ کی ''سندھی پراکرت''، جو کہ اپنے ارتقائی دور سے گذر کر ''مقامی سندھی اپ بھرنش'' کی صورت اختیار کرچکی تھی، وہ اسی دور میں (جب وراچڈ سندھ سے اوپر کے کسی علاقے میں بولی جاتی تھی) اپنے سندھ ملک کی اہم زبان تھی۔

۴- اس ''مقامی سندھی اپ بھرنش'' کا ''ناگر'' کے ساتھ صرف اتنا رشتہ تھا، کہ وہ دونوں ایک ہی بنیاد سے نکلی تھیں۔

۵- ''موجودہ سندھی زبان' غالباً اسی 'مقامی سندھی اپ بھرنش' سے نکلی۔

اوپر جو کچھ کہا گیا ہے اس کی روشنی میں، موجودہ وقت میں جاری اس نظریہ کو قبول کرنے میں ہچکچاہٹ ہوتی ہے، جس کے مطابق کہا جاتا ہے کہ ''وراچڈ'' زیریں وادیٔ سندھ کی زبان تھی اور موجودہ صورت والی سندھی زبان بھی ''وراچڈ'' سے نکلی ہے۔ ڈاکٹر سنیتی کمار مکرجی کی رائے میں سندھی کی اصل اور بنیاد غالباً سندھی کا اپنا ہی موروثی لسانی سرمایہ ہے؛ اور وہ ان الفاظ اور نحوی بناوٹوں سے الگ ہے، جسے شمال یا مغرب سے سندھ میں آئی ہوئی یا آباد شدہ اقوام گذشتہ صدیوں میں اپنے ساتھ لائیں۔ (جیرامداس)

نتائج:

مندرجہ بالا تجزیہ اور تحقیق، دلائل اور مثالوں کی بناء پر ہم درج ذیل نتائج پر پہنچے ہیں:

۱- سندھ کی قبل از تاریخ قدیم تہذیب کی زبان کے آثار ''موئن جو دڑو'' کے کھنڈرات سے ملی ہوئی مہروں میں محفوظ ہیں۔ اس قبل از تاریخ قدیم زبان کی حقیقت معلوم نہیں ہوسکی

---

(۱) ہم ۱۹۵۰ء میں ''دسویں سندھی ادبی کانفرنس (لاڑکانہ)'' کے موقع پر سندھی زبان کی اصل اور بنیاد پر غور کرتے ہوئے مذکورہ بالا نتائج پر پہنچے۔ سنہ ۱۹۵۷ء میں شری جیرامداس دولترام نے ''آل انڈیا اورینٹل کانفرنس'(دہلی) کے ''سندھی سیکشن'' میں سندھی کی اصل نسل کے متعلق اپنا صدارتی خطبہ پڑھا، جس میں وہ صاحب مارکنڈیا اور دیگر کے بیانات کی چھان بین کرتے ہوئے ان نتائج پر پہنچا
[Jairamdas Daulatram: "the Ancestry of Sindhi", Bharatiya Vidya, Vol. xvii, P.41.....59, (the Address), P. 58-59] (Conclusions)]

ہے؛ ہوسکتا ہے کہ وہ کوئی ''سامی صفت'' زبان ہو جو کہ عراق کی قدیم 'سمیری تہذیب' کی زبان کی ہم عصر تھی۔ مقامی طور پر، اس کی دراوڑی سلسلہ سے بھی نسبت ہوسکتی ہے۔

۲- موجودہ سندھی زبان براہ راست سنسکرت سے نہیں نکلی، بلکہ سنسکرت سے پہلے کی مقامی پراکرت یا پراکرتوں سے نکلی ہے۔ وہ 'ہند-آریائی' زبان ہے، لہندا (سرائیکی، بہاولپوری، ملتانی، ڈیروی، ہندکو)، کشمیری اور شمالی سندھ وادی کی داردی زبانیں اس کی بہنیں ہیں۔ بود و باش کے لحاظ سے یہ تمام کی تمام وادئ سندھ کی قدیم ''ہند-آریائی'' زبانیں ہیں؛ لیکن ترتیب اور تاریخی ارتقاء کے لحاظ سے وہ اس برعظیم کی دیگر ''ہند آریائی'' زبانوں سے نرالی ہیں؛ کیونکہ ان کی بناوٹ اور نمو میں منڈا اور دراوڑی زبانوں کے علاوہ ہند-ایرانی اور مغرب سے داخل ہونے والی دیگر زبانوں کے اثر کا بھی عمل دخل شامل رہا ہے۔

۳- سندھی اس ''وراچڈ اپ بھرنش'' سے نہیں نکلی، جس کا گذشتہ قدیم نحویوں نے ذکر کیا ہے۔ سندھی کا خمیر سندھ کی سرزمین ہی میں تیار ہوا: اِس کی اصل اور بنیاد اس کا اپنا موروثی سرمایہ ہی ہے، جس کی تاریخ سنسکرت سے پہلے والی ''پروٹو-پراکرت'' یا ''اولین-پراکرت'' تک پہنچتی ہے۔

باب دوم

سندھی زبان کی تشکیل کا ابتدائی دور

(۵۰۰-۹۵۰ء)

'سندھی زبان' کی تشکیل کا ابتدائی دور رائے خاندان، برہمن خاندان اور عرب حکومت کا دور ہے جسے لگ بھگ ۵ویں صدی عیسوی سے گیارہویں صدی عیسوی کے آخر تک سمجھنا چاہئے۔ اس دور میں موجودہ 'سندھی زبان' کی تشکیل ہوئی۔ اس عرصہ سے پہلے کے دور کو ہم ''سندھ کی زبان یا زبانوں'' کا دور کہیں گے، کیونکہ ہمارے پاس کوئی بھی یقینی دلیل موجود نہیں کہ رائے خاندان کی حکومت سے پہلے، یعنی پانچویں صدی عیسوی سے قبل، موجودہ سندھی زبان کا خاکہ موجود تھا۔

(الف) رائے اور برہمن خاندان کے دور میں زبان کی ترتیب اور صورت:

عرب - اسلامی حکومت اور اس سے پہلے کے تین چار سو برس، مقامی زبانوں کے میلاپ سے ایک مشترک اور زیادہ عام فہم 'سندھی زبان' کے ابھرنے کا پیش خیمہ تھے۔ اسی دور میں بدھ دھرم والوں کا مہایان پنتھ سندھ کے تمام عوام میں پھیلا ہوا تھا اور لوگوں کے اس مذہبی ملاپ کے ذریعے معاشرتی اور لسانی ملاپ کے لئے بھی میدان تیار ہوا۔ سندھ کے رائے خاندان کی حکومت غالباً چوتھی صدی سے شروع ہوئی اور ساتویں صدی کے ابتداء تک قائم رہی اور ان تین سو سالوں میں ان کی حکومت کے ذریعے سندھ میں سیاسی مرکزیت کا ایک خاکہ پیدا ہوا۔ رائے خاندان سندھ کے سمہ خاندان سے تھا۔ 'رائے چنگل'، 'رائے سیھرؤ' یا 'رائے ساھڑ' اور رائے 'سہسین' اس خاندان کے نامور حکمران تھے۔ ایران کے ساتھ سیاسی، سماجی تعلقات کے باعث اس خاندان کے سرداروں میں 'جام' (جام> جم) کے لقب کا رواج ہوا۔[1] اس دور میں اور اس

---

(۱) اس تاریخی سلسلہ پر ہم نے سندھی موسیقی کے متعلق اپنی تصنیفات میں قدرے روشنی ڈالی ہے دیکھئے ''سندھی موسیقی جی تاریخ'' اور انگریزی میں شائع شدہ "Development of music in Sind" Hyderabad Sind, 1973

سے پہلے 'بدھ دھرم' ہی حکمرانوں اور عوام کا دھرم تھا؛ اسی مذہبی اور سیاسی یکسانیت نے سندھ کی زبانوں اور محاوروں کو مرکزیت دینے کیلئے راہ ہموار کی۔

فتحِ اسلام سے پہلے کی 'سندھی زبان' کے کچھ الفاظ اور فقرے کتاب ''فتح نامہ'' میں ملتے ہیں جو اس طرح ہیں:

۱- اول تو کچھ خاص اسم ہیں مثلاً کچھ قبائل کے نام- لاکھا، ٹھاکر، جت، سمہ، کاکہ، چنہ، سہتہ، اگھم، لوھانہ، بھاٹیہ وغیرہ جو آج بھی وہی ہیں۔ لوگوں کے ناموں میں سے خاص سندھی نام- سیہاراس (سیہڑ و یا ساہڑ)، چندر (چاند)، ڈاہر (آواز اٹھانے والا)، موکھ (موکھیو) بسایہ (وسایو)، وکیہ (وکیو)، کاکہ (کاکو) وغیرہ، جن میں سے ساہڑ، چنڈ، وسایو، وکیو اور کاکو آج بھی موجود ہیں۔ ندیوں اور نہروں کے ناموں میں سے مہران، جلوالی (جراري) ساکرہ، موج اور ارل کے نام؛ اس کے علاوہ کنبہ، دندہ اور بیت یعنی کُنب = بڑا تالاب، بھنور، ڍنڍ (ڈھنڈھ = جھیل) اور ٻيٽ (جزیرہ) کے الفاظ ہیں۔ اراضی اور شہروں کے ناموں میں سے کچھ یہ ہیں: بلھار (ولھار)، ساوندی (ساوڑی) ، ودھاتیہ، جھم، کرہل اور دہتایت۔ اضافی تراکیب اس طرح آئی ہوئی ہیں: دندہ وکر بہار (وکر بہار کی جھیل)، کاکا راج (کاکوں کا راج)، کھارمٹی (کھارے کی مٹی)، ندمٹی (ندی کی مٹی)، بدرکھو (بدھ- رکھو یعنی بدھ کے بُت کی رکھوالی کرنے والا)۔ ان اضافی تراکیب کی نوعیت ظاہر کرتی ہے کہ شاید اس دور میں حروفِ اضافت جداگانہ استعمال نہیں ہوتے تھے۔ آج بھی اس قدیم ترتیب کی مثالیں سندھی میں موجود ہیں مثلاً: جھنگ ٻلو (جنگل کا بلا)، جنبُ جھرڪي (کنجشک آسیا پہاڑی چڑیا)، پٽ۔تتر (بیابان کا تیتر، بٹیر)، رس۔ول (رس والی بیل، رَسَوت)، ٿر۔ٻاٻيھو (بیابانی فاختہ) وغیرہ

۲- ''فتح نامہ'' میں سندھ کی زبان کا صرف ایک جملہ دیا ہوا ہے: ڈاہر نے اپنے لشکر کو اطمینان دلانے کیلئے آواز دی کہ ''نسی من، نسی من'' یعنی 'من ایں جام' (= میں یہاں ہوں) علامہ مرحوم ڈاکٹر داؤد پوتہ کا گمان ہے کہ شاید یہ اصل میں سنسکرت کا جملہ ''اسمی اتر'' ہو؛ مگر، غالب گمان ہے کہ ڈاہر نے اپنے لشکر کو خطاب بھی ان کی عام زبان ہی میں کیا ہوگا اور اس حالت میں یہ جملہ ''ھتي مون، ھتي مون'' (میں یہاں ہوں میں یہاں ہوں) [1] کے معنی میں ہوسکتا ہے۔ اگر اس طرح ہے تو پھر اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس وقت تک

(۱) نسي من (نسي = لھي = ھتي = ھتي؛ من = مون) = ھتي مون (یہاں ہوں مَیں)

سندھی زبان کی ترتیب اکثر مفرد الفاظ پر قائم تھی؛ حروف خواہ ازمنہ کے مطابق 'افعال' ابھی تک جملہ کے ربط اور ترتیب کا لازم وملزوم جزو نہیں بنے تھے۔

۳- ہماری موجودہ زبان کے الفاظ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں الفاظ 'حروفِ صحیح' سے بنے ہوئے تھے اور طویل حروفِ علت (ا، و، ی) بالکل ہی کم تھے۔ طویل حروفِ علت کے علاوہ الفاظ مثلاً بہ، تہ، نہ، مکھ (چہرہ)، نتھ، ککڑ (مرغ)، مکڑ، گدڑ (گیدڑ)، -شاید اسی تاریخی اصلیت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ الفاظ کی ایسی بناوٹ و ساخت کے ماضی کے مطالعہ سے گمان ہوتا ہے کہ عربی کے اثر سے پہلے سندھی الفاظ اکثر و بیشتر حروفِ صحیح کے مرکبات تھے۔

۴- اسی طرح موجودہ سندھی زبان اور اس کے محاوروں کا مطالعہ، زبان کے ماضی کی تاریخ کے بارے میں قدرے رہنمائی کرتا ہے؛ ملک کے دیگر حصوں یعنی لاڑ، تھر، شال، کھارو، کوہستان اور کاچھو کے لہجوں میں جو فرق ہے، وہ مشہور و معلوم ہے؛ لیکن اس کے علاوہ قبائلی زبانوں میں تو اور بھی زیادہ فرق ہے۔ مثلاً جتوں (جت بلوچ قبیلہ)، مچھیروں، سامیوں، چوہانوں وغیرہ کی زبان میں نہ صرف لہجہ اور تلفظ بلکہ لغت اور محاورے کا بھی بڑا فرق ہے۔ جس صورت میں آج بھی اتنا فرق موجود ہے تو ماضی بعید میں یہ فرق اور بھی زیادہ ہی رہا ہوگا۔ لاکھا، سمہ، سہتہ، چنہ اور جت قبائل کے مابین بہت پہلے نہ صرف رسم و رواج کا بلکہ زبان کا بھی فرق رہا ہوگا؛ کیونکہ سندھ کے ان قبائل کے افراد الگ الگ علاقوں میں آباد تھے۔ سندھی نسب-نامہ کی ایک قدیم کہاوت ہے کہ: ''سندھ سموں، کاچھے چنوں، بھاٹی جیسلمیر''۔[1] محمد بن قاسم نے سندھ میں ان قبائل کی اکثریت و تسلط بالکل اسی کہاوت کے مطابق دیکھا۔ اس دور میں ان قبائل میں سے ہر ایک کا اپنا اپنا رسم و رواج اور جداگانہ زبان ہونے میں کسی قسم کا شک نہیں کیا جاسکتا۔

اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ فتحِ اسلام سے پہلے ملک کے مختلف حصوں میں مختلف اقوام و قبائل کی اپنی اپنی زبانیں تھیں۔ اس کی تائید مشہور عربی عالم ابن ندیم کی تقریباً ایک ہزار سال قبل کی ہوئی تحقیق سے بھی ہوتی ہے، جسے آگے چل کر بیان کیا جائے گا۔ اس کی تصدیق 'جت' قبائل کی زبان اور قدرے 'ٹھاکروں' (سوڈھوں) کی 'ڈھاٹکی' زبان سے بھی ہوتی ہے۔ جن پر ذیل میں روشنی ڈالی جاتی ہے۔

---

(۱) یعنی سندھ میں سمہ، کاچھے میں چنہ اور جیسلمیر میں بھاٹیہ راج ہے۔ (مترجم)

(ب) جت قبائل کی زبان اور سوڈھوں ٹھاکروں کی ڈھاٹکی زبان:

آٹھویں صدی عیسوی کی ابتداء میں مسلمانوں کی آمد کے وقت (۷۱۱ء) سندھ میں جو قبائل آباد تھے (سہتہ، سمہ، لاکھہ، کاکہ، چنہ، لوہانے، جت، ٹھاکر وغیرہ) ان میں سے آج باقی تمام قبائل کی زبان 'خالص سندھی' ہے؛ البتہ جت اور ٹھاکروں کی زبانوں میں اپنی اپنی خصوصیت ہے جو شاید قدیم تاریخی دور کی یادگار ہے اور جس سے 'سندھی زبان' کے قدیم خاکہ کے بارے میں کچھ نتائج اخذ کئے جاسکتے ہیں۔

ڈھاٹکی زبان: سوڈھوں، ٹھاکروں کی زبان ڈھاٹکی ہے جس پر ننگر پارکر کی طرف گجراتی زبان کا اثر اور اس کے کنارے والی آبادی (مٹھی، ڈیپلو تحصیل کا جنوبی حصہ) پر کچھی زبان کا اثر اور چھاچھرو تحصیل کے مشرق میں 'کنٹھے' کی طرف راجستھانی-مارواڑی کا اثر ہے۔ مگر درمیانی 'اُڈھر' کے حصہ کی ڈھاٹکی زیادہ صاف اور معیاری ہے، جس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بنیادی مرکزیت وہی سندھی والی ہے مثلاً: 'ڪي تو ڪرين' [ڇا تو ڪرين (کیا کر رہے ہو)] ڪيڏ تو جائين [ڪيڏانهن ٿو وڃين (کہاں جا رہے ہو)] حرف اضافت کے لئے اگرچہ 'ري' اور 'رو' (جي، جو) آج کل زیادہ استعمال ہو رہا ہے، اس کے باوجود بھی بعض جملوں میں سندھی کے ''جي'' اور ''جو'' استعمال ہوتے ہیں مثلاً ''تاھ جي'' [تھجی (تمہاری)] 'ای کھیتر تاھ جو آھے' [ھي کت توھان جو آھي (یہ کھیت تمہارا ہے)] ماضی میں 'ت' جو سندھی میں داردی زبانوں کے اثر کی پرانی یادگار ہے (رتو = سرخ ہوا؛ التو، سلتو = چیو = کہا؛ وتو = ورتو = لیا؛ پانتو = پانیو = سمجھا وغیرہ) وہ ڈھاٹکی زبان میں ''ھئڻ'' (ہوجانا یا ہونا) کے صیغوں میں موجود ہے مثلاً

هون آيو هتو=آءُ آيو هوس	(میں آیا تھا)
تون آيو هتو=تون آيو هئين	(تو آیا تھا)
او آيو هتو=هو آيو هو	(وہ آیا تھا)
اسين آيا هتا=اسين آيا هئاسون	(ہم آئے تھے)
او آيا هتا=هو آيا هئا	(وہ آئے تھے)
اپي آيا هتا = اوهين آيا هئا	(آپ آئے تھے)

'ڈھاٹکی' میں جمع متکلم اور مستقبل کا صیغہ ''آن'' کے اضافہ سے ہوتا ہے جیسا کہ 'اسین

جاسان' اسین ویںداسون (ہم جائیں گے) اسی طرح 'جت' قوم کی زبان میں ''اسی اچاں تا'' اسین ایںداسون (ہم آئیں گے) ہے۔ شاید یہ ترتیب قدیمی ہے جو آج کل سندھی میں تبدیل ہوچکی ہے۔

جت قبائل کی زبان: جت قبائل کی زبان میں ''قدیم سندھی'' کے خاکہ کے مزید آثار موجود ہیں۔ دوسری اور تیسری صدی عیسوی میں جب ساکا (Scythians) قبائل نے جنوب مشرق ایرانی حصہ (سیستان) پر قبضہ کیا تو اس وقت جت-بلوچ قبائل نے وہاں سے مکران، موجودہ بلوچستان اور سندھ کی طرف ہجرت کی، 'ساکا' بھی سیستان فتح کرنے کے بعد مکران، بلوچستان اور سندھ فتح کرکے جنوب کی جانب کاٹھیاواڑ-گجرات کی طرف بڑھے۔ ساکا قبائل کے ان حملوں کی وجہ سے ہجرت کرنے والے جت-بلوچ قبائل نے پہاڑوں اور میدانوں؛ صحراؤں کو آباد کیا۔ یہ بلوچوں کی سب سے بڑی ہجرت تھی جس میں بعض قبائل (بروہی- بلوچوں) نے سندھ اور بلوچستان کے پہاڑوں کو آباد کیا اور وہاں کی زبان اختیار کی؛ تو دیگر قبائل (جت- بلوچوں) نے بڑھ کر سندھ اور سبی کے بیابانوں کو اپنا وطن بنایا اور آئندہ تین صدیوں کے عرصہ میں وہ مقامی باشندوں سے گھل مل کر ایک ہوگئے اور انہوں نے مقامی زبانوں کو اختیار کرلیا۔ شمال میں سبی اور ناڑی کے میدانوں میں اور نیچے لاڑ کی طرف، جاتی، کچھ، بنّو (بنو) اور دیگر بیابانی علاقوں میں سندھی جت بلوچوں کی آبادی اسی قدیم ہجرت کی یادگار ہے۔[1] مقامی بود و باش کے لحاظ سے بعد میں کچھ جت قبائل نے مقامی 'سرائیکی زبان' اختیار کی اور دوسروں نے مقامی سندھی زبان۔ جن قبائل نے 'مقامی سندھی زبان' کو اپنایا ان میں سے آج کل 'میر جت' قبائل وہ زبان بولتے ہیں جس میں قدیم سندھی زبان کے زیادہ آثار موجود ہیں، حالانکہ 'علاقۂ کچھ' کے 'رادھا جت' قبائل بھی اسی قدیم زبان کے کچھ الفاظ اور جملے استعمال کرتے ہیں مگر ان کی زبان بہت حد تک 'خالص سندھی' میں بدل چکی ہے۔ اس لئے جت قبائل کی زبان سے ہماری مراد 'میر جت قبائل کی زبان' ہے جس کے آثار علاقۂ کچھ اور لاڑ کے 'رادھا جت قبائل' کی زبان میں بھی موجود ہیں۔ سندھ میں 'میر جت قبائل' کا اصلی علاقہ سبی - ناڑی ہے، جہاں پر 'شورن' جھل' 'ناڑی' اور 'جیکب آباد' اضلاع میں ان کی بہت زیادہ آبادی موجود ہے۔ اس کے علاوہ سندھ میں یہ قبائل خاص طور پر خیرپور، حیدرآباد اور ٹھٹہ اضلاع میں آباد ہیں۔ ان قبائل میں راوچی،[2]

---

(۱) ہم اوپر کہہ آئے ہیں کہ جت بلوچ قبائل کی یہ سب سے قدیم ہجرت تھی، اس کے بعد ایران کی طرف سے بلوچوں کی مزید ہجرتیں اسلامی دور کے بعد ہوئیں، جن میں سے سب سے بڑی ہجرتیں دو تھیں: ایک گیارھویں-بارھویں صدی عیسوی اور دوسری پندرھویں-سولہویں صدی عیسوی کے ادوار میں۔

(۲) 'راوچی' یا 'راوچھی' ایک بڑا قبیلہ ہے جس میں دیگر چھوٹے چھوٹے ذیلی قبائل شامل ہیں جن میں سے سردار قبیلہ 'جونگلانی' ہے۔

مندوستانی، بیاسانی، لاکھانی، براہمانی، کرمتی، مندانی، سکتانی، بیامانی، کنڈانی، تیجوانی، سیتانانی،گنڈکانی اور بلندانی شامل ہیں۔ یہ لوگ اکثر 'جت قبائل کی قدیم زبان' بولتے ہیں۔ لاڑ اور کچھ کے 'رادھا جت' قبائل میں رادھا،شیھہ، عامر، لاکھانی،مٹھانی،آریانی، وزیرانی، مندانی، جیئندانی، ربنانی،بھنبھوانی، ڈاتوانی، فقیرانی وغیرہ قبائل شامل ہیں؛ ان کی زبان میں بھی 'قدیم زبان' کے بعض الفاظ اور جملے رائج ہیں۔ انہی خصوصیات کی وجہ سے بھٹائی صاحبؒ نے ان کی زبان کو 'جت قوم کی زبان' کہا ہے۔ زبانی روایات کے مطابق شاہ صاحب نے ایک موقع پر جت قبائل کے بارے میں درج ذیل شعر کہا جس میں آپ نے ان کی زبان کے الفاظ استعمال کئے، شاہ صاحب کا شعر یوں ہے:

هلو هلو ڪن، 'واچڻ' جي وائي
هُل سٽي هوندي جو، سوڙهياس ڙي مائي
جيڪا بولي جتڙين سمجهين نه سائي
'هزون' گهٽي ڏاهي، پرهوت وني 'هوٽي' وٽا

[چلئے چلئے کہتے رہے، چلنے کی بات ان کا شور سُن کر میں ششدر رہ گئی جَتوں کی زبان میں سمجھ نہیں سکی میں بہت عقلمند تھی لیکن وہ میرا محبوب اُس طرف لے گئے]۔

شعر کی اس روایت میں پانچ الفاظ 'جتوں کی زبان' کے ہیں: واچڻ = هلڻ (چلنا)، هوندي = هنن (ان کا)، سمجهين = سمجهيس (میں سمجھی)، هزون = هياس (میں تھی) هوٽي = هوڏانهن (اس طرف)۔

رسالے کے ایک اور شعر میں ہے:

هنجهر هٺا هير، ويا نهوڙي ننڊ ۾
[ابھی یہاں ہی تھے،سوتے میں برباد کر کے چلے گئے]

هنجهر يعني هينئر (بمعنی ابھی، اس وقت) جس کے لئے 'جت زبان' میں دوسرا لفظ 'هيلان' ہے۔

ترتیب کے لحاظ سے 'جت زبان' اور 'موجودہ سندھی' زبان میں کوئی فرق نہیں البتہ جت زبان میں کچھ ایسی خصوصیات باقی ہیں جو غالباً 'قدیم سندھی زبان' کے آثار و علامات کی یادگار ہیں۔ اس سلسلہ میں درج ذیل خصوصیات غورطلب ہیں:

(الف) اسم:

جت زبان[1] میں کافی الفاظ موجودہ سندھی لغات سے مختلف اور انوکھے ہیں جیسا کہ گیھن (گھر)، جَر (پوتی=اوڑھنی)، پیل (ننڊ =نیند)، گھیٹ (ننڊو ٻار = چھوٹا بچہ)، نائي (سَوَڙ = رضائی، لحاف)، مڙي (ماء =ماں)، اڙ (ڏاچي =اونٹنی) وغیرہ وغیرہ۔ مگر ان میں کئی اسم ایسے ہیں جن میں 'ز' یا 'ذ' کا تلفظ موجود ہے، جو سندھی زبان میں اکثر 'ھ' سے بدل چکا ہے آج کل 'ز' یا 'ذ' کے تلفظ والے الفاظ جو سندھی میں رائج ہیں وہ اکثر عربی اور فارسی سے لئے گئے ہیں۔

جت زبان	سندھی	اردو
۱۔ ساز، ساس	ساٹھو	آدمی، انسان
۲۔ میز	مینھن	بھینس
۳۔ ویز	ویھڻ	بیٹھنا
۴۔ ڏز	ڏھہ	دس
۵۔ اوڻیز	اوڻیھہ	انیس
۶۔ ویز	ویھہ	بیس
۷۔ ورز	ورھیہ	برس، سال
۸۔ گیزون، گیذون	گیھون	گندم
۹۔ سزو	سھو	خرگوش
۱۰۔ آذمي	آدمي	آدمی، انسان
۱۱۔ سزرو	سھرو (ع، صھر)	سُسر، خسر

مندرجہ بالا الفاظ میں سے ۱ سے ۹ تک ہند آریائی زبانوں کے الفاظ ہیں جن کے 'س' کو 'ز' کے تلفظ میں ادا کیا گیا ہے، ۱۰ اور ۱۱ اصل میں عربی لفظ ہیں جن کے 'د' اور 'ھ' کو 'ذ' یا 'ز' کے تلفظ میں ادا کیا گیا ہے۔ ان بیرونی الفاظ کے علاوہ بھی جت قوم کی زبان میں ایسے الفاظ موجود ہیں جن میں 'ذ' یا 'ز' کا تلفظ موجود ہے جیسا کہ: کذي (ڪٿي=کہاں)، چذاٹ (ننڊي

(۱) جت قوم کی زبان میں بھی مختلف گاؤں اور ذیلی قبائل کی لغت میں فرق ہے مثلاً ان میں سے کچھ لوگ 'کھاڑؤ' اور کچھ لوگ 'شاڑؤ' (=کیا) بولتے ہیں اسی طرح گیزون اور گیذون (گندم)، ھیٹي اور ویسین (یہاں پر) ما اور مانھین (میں نے) ھو اور اسي (وہ) ھنجھر اور ھیلان (ابھی، اس وقت)، نائي اور گادي (سَوَڙ، بمعنی لحاف)۔

اُٹ= چھوٹی اونٹنی)، رذاٹ (ٹاٹ=برتن)، زھٹو (وھاٹو=تکیہ)، گذٹ (اگھڻ = پونچھنا)، ھزون (آءٌ ھئس= میں تھا) وغیرہ۔

(ب) ضمیر:

ضمائر کی صورت اس طرح ہے: آجو یا آجون (آءٌ یا آئون= میں)، اسي (اسین =ہم) اتون (تون =تم)، ائین (اوھین =آپ)، ھو یا اسي (ھو=وہ) اور ھي (اُھي= وہ جمع)۔ ان میں سے آخری تین ضمائر بالکل انہی صورتوں میں موجودہ سندھی میں اب تک رائج ہیں۔

(ج) حروف استفہام:

کھاڑو یا شاڑو (چا=کیا)، کالیي (چو=کیوں)، کذِي (کٿي= کہاں)، کيٽي یا کيٽي (کيڏانھن =کدھر)، کيلان (ڪڏھن=کب)، کوھين (کيڏانھن =کدھر)، کاھوٓ (کھڙو=کون سا)۔ ان میں سے آخری حرف ”کاھو“ اب تک سندھی زبان کے ”کوہستانی“ محاورہ میں رائج ہے۔ جٹ زبان کا ”کيٽي“ اور ڈھاٹکی کا ”کيڙ“ ہم معنی لفظ ہیں اور دونوں ایک ہی لغت کے نشان پر گواہ ہیں۔

(د) ظرف:

مثلاً ھیٹي (ھيڏانھن =ادھر، اس طرف) ھِرٹي (ھوڏانھن =اُدھر، اُس طرف) تائین (مٿان=اوپر، اوپر سے)، ہڑائین (ھيٺان= نیچے سے) گِذرا (پويان= پیچھے سے)۔ ان میں سے ابتدائی چار لفظ قدیم ”مقامی سندھی“ کے ہیں، جبکہ آخری لفظ بلوچی زبان (گڈا یا گڑا) کا ہے جس کی اصل صورت مقامی محاورہ کے زیر اثر تبدیل ہوچکی ہے۔

(ھ) اضافی صورتیں:

مانھوُن (منھنجو=میرا)، سانھوُن (اسانجو=ہمارا)، توھُون (تنھنجو= تیرا)، واھون (ھنن جو=ان کا)، ھي جو (ھن جو = اسکا)، ھُج جو یا ھوندي جو (ھنن جو=ان کا)، پانھوُن (پنھنجو=اپنا)۔ سندھی میں پہلی تین صورتیں موجود ہیں مگر ان کے معنی بدل چکے ہیں (مانھون=میری طرف سے؛ اسان ھون =ہماری طرف سے؛ توھون= تیری طرف سے)

(و) حروف جر:

زِي (تي، پر=پر، میں)، کِ (کي=کو)، کَان (کان =سے)، سُونْ (ڏي=کی طرف)، تِ (تي=پر)، جیسے کہ:

ماڪ	=	مجھے	ساڪ	=	ہمیں
توڪ	=	تجھے	واڪ	=	آپ کو، تمھیں
هوڪ	=	اُسے	تيڄان	=	انہیں

سندھی کے کوہستانی محاورہ (لہجہ) میں 'ماڪ' اور 'توڪ' اب تک ''مان ڪِ'' اور 'تو ڪِ' (مانکھ اور توکھ، یعنی مجھے، تجھے) کی صورت میں رائج ہیں۔

(ز) اعداد شماری:

ڪڙو (ایک)، ٻهه (دو)، ترئي (ترئے = تین) چار (چار)، پنج (پانچ)، ڇه (چھ)، ست (سات)، اَٺ (آٹھ)، نو (نو)، ڏز (دس)

(ح) فعل اور زمان:

اکثر افعال کے لئے ہوبہو موجودہ سندھی کے الفاظ ہیں جیسا کہ اچڻ (آنا)، ڪَرڻ (کرنا) وغیرہ؛ کچھ افعال میں تلفظ کی معمولی تبدیلی ہے، جیسا کہ وِڃڻ (واو کی زیر کے ساتھ)، اس کے علاوہ کئی ایسے انوکھے الفاظ بھی ہیں جو قدیم لغت کی یادگار ہیں: مثلاً لُهرڻ (لاهڻ=اتارنا)، پاڙڻ (کڻڻ=اٹھانا)، گُذن (اُگهڻ=پونچھنا)، ڪڙهڻ (پيڻ=پینا)، میئڻ، میهڻ (ڇڏڻ=چھوڑنا)، وَهڻ (وڃڻ=جانا) وغیرہ۔ ان میں سے 'وهڻ' سندھی میں بھی ''وڃڻ = جانا'' موجود ہے ''وهيو ساٿ سندوء'' (اپنا قافلہ چلا گیا)، اچڻ =آنا سے امر، حال، مستقبل اور ماضی کی صورتیں درج ذیل طور پر بنیں گی:

امر:

آريو=آءُ (آیئے، صیغہ واحد)؛ اچيس=اچو (آیئے، صیغہ جمع)؛ اچي=اچي (آئے)؛ اچيڻ=اچن (آئیں)

مضارع اور مستقبل:

اچُون اچين تو=آءَ اچان ٿو/ايندس میں آتا ہوں/آؤں گا

اَ تُون اچين تو=تون اچين ٿو/ايندين تو آتا ہے/آئے گا

هو اچي تو = هو اچي ٿو/ايندو وہ آتا ہے/آئے گا
اسي اچان تا = اسين اچون ٿا/ايندا سون ہم آتے ہیں/آئیں گے
ائين اچيس تا = اوهين اچو ٿا/ايندؤ تم آتے ہو/آؤ گے
هي اچيڻ تا = اهي اچن ٿا/ايندا وہ آتے ہیں/آئینگے

ماضی:

اچو آئوسانْ = آءٌ آيس (میں آیا) اسي آواسان=اسين آياسون (ہم آئے) اَتُونْ آئُونْ = تون آئيينْ (تو آیا)، ائينْ آواس = اوهين آيا (تم آئے)، هو آئو = هو آيو (وہ آیا)، هي آوا = اهي آيا (وہ آئے) سندھی کے کوہستانی لہجہ میں ابھی تک 'هو آئو' اور 'هي آوا' رائج ہیں۔ جت قوم کی زبان میں ''ماضی مطلق'' کے صیغہ 'ي' کے اضافہ کے بغیر ہیں: یعنی 'آئو' (نہ کہ 'آيو')، ڳالهائو (ڳالهايو=بولا، بات کی)، ٻيو (بيٺو=کھڑا ہوا)، ڪو (ڪيو=کیا) وغیرہ

هي ڪم مين ڪو = هي ڪم مون ڪيو [یہ کام میں نے کیا]
هو ڪم پين ڪو = هي ڪم تو ڪيو [یہ کام تونے کیا]
هي ڪم هوڻ ڪو = هي ڪم هن ڪيو [یہ کام اس نے کیا]
هي ڪم اسي ڪو = هي ڪم اسان ڪيو [یہ کام ہم نے کیا]
هي ڪم اَئين ڪو = هي ڪم اوهان ڪيو [یہ کام آپ نے کیا]
هي ڪم هجيڻ/وجيڻ ڪو = هي ڪم هنن ڪيو [یہ کام انہوں نے کیا]

غالباً قدیم سندھی میں بھی ماضی کی یہی صورت تھی اور اب تک سندھی میں ماضی کیلئے اِسی ترتیب والے الفاظ موجود ہیں۔ بھٹائی صاحب کے رسالے میں 'اَئو' کا لفظ موجود ہے:

''پاڻي پٽيهل ۾ اڳيون نہ اَئو'' (سُر: ڏهر)[1]

---

(۱) پورا شعر یوں ہے:

سُڪي ڍورُ ڍَنُون ٿئو، ڪنڌي ڏنو ڪائو
پاڻي پٽيهَلَ ۾ اڳيون نہ آئو
ماڻهن ميڙائو، ڪَنِي ڪَنِي پيٽين

[دریا خشک ہو کر کہیں کہیں سے بہنے لگا، اس کے کناروں سے پانی اتر گیا، پٹیہل (دریائے سندھ کی شاخ 'رین' سے تحصیل بدین کے گاؤں 'جون' سے جنوب میں نکلنے والی چھوٹی) نہر میں پہلے والا پانی دوبارہ نہیں آیا، لوگوں کے ہجوم (آبادی) بھی کہیں کہیں نظر آتے ہیں]۔

دیکھیے: شاہ جو رسالو، مطبوعہ شاہ عبداللطیف بھٹ شاہ ثقافتی مرکز ۱۹۷۴ء/۱۳۹۴ھ، ص: ۴۸۲ (مترجم)

'ھو' (=تھا) کا لفظ عام رائج ہے، اگرچہ شمالی سندھ کے لہجہ میں 'ھئو' اور 'ھیو' استعمال ہوتے ہیں۔ لاڑی (جنوبی سندھ کے) لہجہ میں دیہاتی عام زبان میں 'مو' = مئو (=مرا)، 'سو' (سئو، بڈو=سنا) اور 'چو' (چیو=کہا) کے تلفظ رائج ہیں۔

جت-بلوچوں کی قبائلی زبان کے مندرجہ بالا مختصر جائزے[1] سے درج ذیل نتائج نکلتے ہیں جن کی بنیاد یہ نظریہ ہے کہ: ''جت قوم (جاٹوں) کی زبان'' ایک قدیم 'مقامی سندھی زبان' کی یادگار ہے، جسے کچھ جت-بلوچ قبائل نے صدیوں قبل سندھ کے کسی حصے میں مستقل طور پر آباد ہوکر اختیار کیا؛ ان کی وہ زبان 'قدیم سندھی زبان' کا ایک خاص محاورہ (Dialect) تھی۔ اسی وجہ سے اس کے مطالعہ سے ''قدیم سندھی زبان'' کے بارے میں درج ذیل نتائج حاصل ہوتے ہیں:

۱- قدیم سندھی زبان میں 'ذ' اور 'ز' کے صوتیات بہت زیادہ تھے، جو وقت گذرنے کے ساتھ 'ھ' اور 'س' سے بدل گئے ''موجودہ سندھی'' میں 'ز' اور 'ذ' والے مقامی الفاظ بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر رہ گئے ہیں۔

۲- 'جت قوم کی زبان' میں 'تا' (= تا ، تھا) وِھ (=وجھ، ڈال) وغیرہ کے استعمال سے گمان ہوتا ہے کہ 'قدیم سندھی' میں 'ھ' سے مرکب تلفظ (ASPIRATES)[2] کم تھے جو بعد میں ظاہر ہوئے۔

۳- 'ڪ' (ڪي =کو) 'ت' (تي =پر، اوپر) وغیرہ حروف کی صورت والے الفاظ خواہ ماضی کی (بغیر ی اور ء) 'ڪو'، 'پو' وغیرہ صورت کے صیغوں سے معلوم ہوتا ہے کہ 'قدیم سندھی' میں بہت سارے الفاظ صحیح حروف اور چھوٹی حرکات (زیر، زبر، پیش) سے مرکب تھے اور ان میں ('ا' 'ؤ' 'ی') کے اضافی تلفظ کا استعمال نسبتاً کم تھا۔

۴- ڪڙو (ھڪڙو، ایک) ڪڙي (ھڪڙي، ایک مؤنث) وغیرہ الفاظ کی ترتیب ظاہر کرتی ہے کہ سندھی تلفظات میں 'ھ' کا ضمنی اضافہ نسبتاً آخری دور میں ہوا۔ موجودہ دور کے مطالعے سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ سندھی الفاظ میں 'ن' 'ھ' 'ء' اور 'ی' کا اضافہ گزشتہ تقریباً ایک سو سال سے زیادہ رائج ہوا ہے۔

---

(۱) موقع ملا تو "تفصیلی جائزہ" ایک جداگانہ کتاب کی صورت میں پیش کیا جائے گا۔

(۲) آواز کو سانس کے ساتھ ادا کرنا جس سے 'ہ' کی آواز نکلے۔ (Feroz Sons English to English and Urdu Dictionary, P:53) (مترجم)

(ج) عرب دورِ حکومت میں زبان کی تشکیل و ترقی:

عرب دورِ حکومت میں ''سندھ کی زبان یا زبانوں'' پر جو اثرات مرتب ہوئے وہ یہ تھے:

۱- زبان میں مزید مرکزیت پیدا ہوئی:

اس دور میں سندھ کے مختلف حصوں اور قبائل کی زبان میں مزید مرکزیت پیدا ہوئی جس کی وجہ سے ایک جامع 'سندھی زبان' کی تشکیل ہوئی اور وہ ایک عام ملکی زبان قرار پائی اور اس کی بنیاد مضبوط ہوئی۔ اس مرکزیت کے اہم اسباب یہ تھے:

(۱) پورا سندھ ایک پختہ نظام حکومت کے تحت آ گیا، جو اڑھائی سو برس تک قائم رہا، ملک میں قافلوں کی آمد و رفت اور تجارت، قضا اور عدالت، خراج اور زراعت کے یکساں سرشتے نے سماجی اور اقتصادی زندگی میں یک جہتی پیدا کردی۔

(۲) ملک کے لوگوں نے دین اسلام قبول کیا اور اسلامی عقائد نے عملی زندگی میں یکسانیت پیدا کردی، جس کی وجہ سے سماجی خواہ سیاسی مرکزیت مزید مضبوط ہوئی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قبائلی تفریقیں کم ہوئیں اور اسلامی شریعت نے قبائلی رسم و رواج کو ہموار کیا۔

(۳) اس دور میں نئے شہروں اور آبادیوں کا سلسلہ بڑھا اور منصورہ کا نیا مرکزی شہر تعمیر ہوا۔ تجارت کے لئے بری اور بحری راستے کھلے اور تجارتی ترقی اور قافلوں کی آمد و رفت سے ملک کے مختلف حصے باہم مربوط ہوئے۔ ملک کے مختلف حصوں میں رہنے والے لوگوں کے درمیان مزید میل جول پیدا ہوا اور ان کے میل جول اور تعلق نے ملک کی مختلف زبانوں اور لہجوں میں لسانی ربط پیدا کیا جو ایک عام مشترک ''سندھی زبان'' کی نمو کیلئے مفید ثابت ہوا۔

۲- زبان کی نفسیاتی کیفیت تبدیل ہوئی:

محمد بن قاسم نے سندھ کے مختلف شہروں میں عربوں کی آبادیاں قائم کیں(۱) اور اہل سندھ کے، عرب ملازموں، کاریگروں اور علماء کے ساتھ گہرے معاشرتی تعلقات استوار ہوئے اور عربوں نے سندھ کو اپنا وطن بنالیا۔ محمد بن قاسم کے بعد عرب باشندے واپس جانا چاہتے تھے مگر انہیں خلیفہ سلیمان کا فرمان پہنچا کہ ''یہاں ہی (یعنی سندھ میں) رہ کر کھیتی باڑی کرو، ہل چلاؤ اور سکھی رہو'' (۲) اس حکم کے بعد عرب باشندوں نے سندھ کو اپنا وطن سمجھ لیا اور سندھی کاشت کاروں اور آبادگاروں کے پڑوسی بن کر خود سندھی بن گئے۔ ان کی دائمی سکونت کہ وجہ سے عربوں

---

(۱) دیکھیں: ''فتح نامہ سندھ''

(۲) تاریخ طبری مطبوعہ لیڈن (Lieden) جلد ۲، ص ۱۲۷۵

اور سندھیوں کے درمیان شادیوں اور رشتہ داریوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ سندھیوں کی شرافت و مروت سے بڑے بڑے عرب خاندان متاثر ہوئے اور ان کے ساتھ رشتہ داریاں قائم کیں۔ معتبر حوالوں کے مطابق حضرت علیؓ کے فرزند محمد، امام زین العابدینؒ اور امام زید بن الحسین کی مائیں سندھی تھیں (۱)۔ علی اصغر بن زین العابدین علی بن الحسین کی والدہ بھی سندھی تھی (۲) بنو امیہ کے مشہور جرنیل مہلب کے دو بہادر بیٹوں مُفَضَّل اور عبدالملک کی والدہ سندھی تھی اور اس کا نام مائی 'بھلی' تھا (۳) بنو امیہ کے آخری کمانڈر انچیف یزید بن عمر بن ہبیرۃ الفزاری کی والدہ، جو کہ اپنے زمانے کی نہایت حسین عورت تھی وہ بھی سندھی تھی (۴)

اسی سندھی رشتہ کی وجہ سے اس دور کے شاعر 'ابو عطا سندھی' نے اس کے ظالمانہ قتل پر ایک دردناک مرثیہ کہا جو دیس بدیس مشہور ہوا اور عربی شاعری میں مرثیہ گوئی کی بہترین مثال قرار پایا، اور عربی ادب کی کئی کتابوں میں بطور نمونہ نقل ہوا۔(۵)

عربوں اور سندھیوں کی رشتہ داریوں کے متعلق دیگر حوالہ جات بھی موجود ہیں مگر مندرجہ بالا مثالیں بالکل ابتدائی اور اہم ہیں۔ عرب اور سندھیوں کی آپس میں رشتہ داری نے اہل سندھ کی سماجی زندگی پر بڑا اثر ڈالا۔

دوسرا بڑا سبب، جس نے لوگوں کی انفرادی خواہ اجتماعی زندگی میں بڑی نفسیاتی تبدیلی پیدا کی وہ تھا اسلام کا دلوں پر اثر۔ خدائے عز و جل کا خوف، کفر و ایمان میں فرق، دنیا اور آخرت کا تصور، جنت و جہنم (عذاب اور ثواب) کی فکر، حق کی خاطر جان دینے اور شہادت کی دل پذیری وغیرہ جیسے اسلامی عقائد نے لوگوں کی سوچ اور ارادوں میں نئی کیفیت پیدا کی جس کی وجہ سے شخصی اور اجتماعی نفسیات کا رخ تبدیل ہوا۔ اسی طرح اسلامی اعمال- شریعتِ اسلام کی پابندی، نماز، روزہ، صدقات اور خیرات جیسے شعار- نے زندگی کے عملی طرز اور طریقے کو تبدیل کر دیا اور لوگوں کے عادات و اطوار، اخلاق و اعمال کو ایک نئی نہج عطا کی اور عوام کی شخصی اور اجتماعی نفسیات میں تبدیلی پیدا کردی۔

---

(۱) کتاب المعارف (ابن قتیبہ)، ص۱۱۰

(۲) عمدۃ الطالب، ص۳۰۴

(۳) دیوان فرزدق، مطبوعہ پیرس، ص۷۷ اور مطبوعہ مصر، ص۱۶

(۴) کتاب المعارف (ابن قتیبہ)، ص۲۰۸

(۵) المعارف: ص۲۰۸، الطبری: ۳/۷۰، الشعراء: ص۴۸۴، الامالی: ۱/۲۷۱، العقد: ۲/۳۱، الخزانۃ ۴/۱۶۷، الحماسہ ۲/۵۲-۱۵۱، الاغانی: ۱۶/۸۱، الوفیات: ۳/۹۱-۲۹۰، المرتضی: ۱/۱۶۱، المقطعات: ص۱۰۲، الحصری: ۳/۲۱۲، الاقتضاب: ص۲۹۲؛ الاضداد: ص۶۷، ادب الکاتب: ص۲۴، وشرح: ۱۲۴، مراۃ الجنان: ۱/۲۷۸، لسان العرب (عہد) (اتم)

اس اجتماعی نفسیات کا زبان کی نفسیات پر بھی اثر پڑا۔ جب لوگوں کے خیالات، احساسات اور جذبات کی نوعیت بدلنے لگی تو ان کے نفسِ کلام کی ہیئت کا بدلنا بھی لازمی تھا۔ اسلام، ایمان، شریعت، دین، توحید، فرض، سنت، نماز، روزہ، حج، زکواۃ، خیرات اور دیگر متعدد الفاظ روزہ مرہ کی زبان میں رائج ہوئے: عملی زندگی میں ان تصورات (Concepts) کا اثر، غور وفکر کی کیفیت (Thought Process) اور عمل کی نوعیت (Behaviour) بلکہ اس سے بھی زیادہ نفسِ کلام کی ہیئت اور زبان کی ترتیب پر پڑا جس کی وجہ سے سندھی زبان کی نفسیات میں بڑی تبدیلی آئی۔

۳- زبان کی لغات میں اضافہ ہوا:

اس دور میں سندھی زبان کے سرمایۂ لغت میں اضافہ ہوا۔ زراعت اور پیشہ وروں، کام کے متعلق اصطلاحات اور کام کے آلات کو عربی زبان کے الفاظ اور نام ملے۔ زراعت میں ''ہاری'' اور ''مجیری'' کے بنیادی نام عربی لغت کے زیرِ اثر سندھی زبان کا حصہ بنے۔ ہاری کا لفظ اگر 'ہر' (ہل) سے اسم فاعل ہے تو بھی عربی کے زیرِ اثر، اور اگر یہ 'حارث' لفظ سے نکلا ہوا ہے تو بھی عربی کے ہی زیرِ اثر۔ 'ھرلو' (رہٹ) یا 'ایٹ' (چرخہ) کے لئے عربی نام ''ناعورہ'' سے سندھی میں ''نار'' کا نام رائج ہوا اور نار چڑھانے والے کو اس ابتدائی دور میں اسم فاعل کی ترکیب کے مطابق 'ناری' کہا گیا، جس کا نشان آج تک ''ہاری ناری'' کی اصطلاح میں موجود ہے۔ ''مجیری'' کا لفظ عربی فعل ''اجار-یجیر'' سے نکلا ہے اور اس کے معنی ہیں محافظ یا سنبھالنے والا۔ عراق کی آباد زمین کی طرح سندھ کی زمین کی پیائش ہوئی اور 'جریب' کا قدیم عربی لفظ مروج ہوا۔ عرب دور میں، خلیفہ معتصم باللہ کے ایام حکومت میں سندھ کے گورنر موسیٰ بن عمران نے زرعی ترقی کیلئے موجودہ سکھر بیراج کی طرح ایک بیراج یا بند بنوایا جس کا نام ''سکر المید'' رکھا گیا تھا یعنی 'مید' یا 'مچھیروں' کا بند''۔ عربی میں 'سکر' کے معنی ہیں بند: ممکن ہے کہ سکھر شہر کا نام اسی قدیم بند کے نام کی یادگار ہو(۱)۔

دریا اور نہروں کے کناروں پر آمد و رفت کے لئے گودیاں تعمیر ہوئیں، جن سے سندھی میں لفظِ پھُرُ (عربی لفظ فرضۃ = کچا پل) عام مستعمل ہوا۔ اسی طرح اناج کے پیانے کا نام 'کاسو'

(۱) مؤرخ بلاذری نے اپنی کتاب ''فتوح البلدان'' میں ''فتح سندھ'' کے باب میں 'سکر المید' کا ذکر کیا ہے۔ (دیکھئے 'فتوح البلدان': دغویہ کا مرتب کردہ، مطبوعہ یورپ (برل)، ۱۸۸۶ء، ص۴۴۰) بلاذری کے بیان کی بنیاد پر کافی وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ مچھیروں کا بند موجودہ ''اروڑ-روہڑی''۔ سکھر کے علاقے میں بنوایا گیا تھا، کیونکہ اس موقع پر موسیٰ کی چھاؤنی اروڑ کے نزدیک تھی۔

کسی عربی پیمانہ 'کاسہ' (برتن) کی یادگار ہے؛ چوتھائی کا لفظ عربی کے لفظ 'ربع' کا ترجمہ ہے اور 'خراز' کا لفظ عربی کے ذریعے آئے ہوئے فارسی پیمانہ کا نام ہے۔ لوہاروں کے پیشے میں 'مترکو' (ع-مطرقۃ) اور 'سنداڻ' (ع-سندان) کے لفظ عربی اثر کی یادگار ہیں۔ جہاز رانی میں 'مکری' (عربی-مخر= کشتی کا پانی کی سطح کو چیرنا > مخری= کشتی) ملاح، میربحر، زورق (کشتی کی ایک قسم) ونجھ = پتوار (فارسی سے عربی کے ذریعے) سکاڻ = دنبالہ (ع-سکان) وغیرہ الفاظ رائج ہوئے:

قصابوں کے پیشے میں 'کاسائی' (ع-قصاب)، 'کاتی' = چھری (ع-قاطع)، حلوان (بکری کا چھوٹا بچہ)، ذبح، حلال، حرام اور تکبیر؛ اسی طرح پیشۂ تجارت میں دکان کا لفظ (فارسی سے عربی کے ذریعے)، ساہمی (ترازو)، دلال، منیب، بیانو (ع-بیعانہ، پیشگی رقم Advance)، کاباڙو (ع-قبالہ = بیع نامہ، دستاویز)، کھڑیو یا کھرجین (ع-خُرج = باردان، وہ دہرا تھیلا جو ٹٹو کی پیٹھ پر اسباب لادنے کے لئے ڈالتے ہیں)، بقر یا باقری (ع-بقال = سبزی فروش)، بجاج (ع-بزاز = کپڑے کی پھیری والا)، حلوو (ع-حلوہ)، قرض، تھوم (لہسن)، بصر (پیاز)(۱) وغیرہ

عربوں اور سندھیوں کے گہرے سماجی رشتے کی وجہ سے عام لوگوں کے ناموں کی نوعیت میں بھی تبدیلی آئی۔ دشمنوں پر رعب ڈالنے کے لئے عرب اپنے افراد اور قبائل کے نام کڑوے پھلوں اور خطرناک جانوروں کے ناموں پر رکھتے تھے۔ مثلاً آدمی کا نام حنظلہ(۲) (=ٹوھہ یعنی اندرائن)۔ قبیلہ کا نام بنو اسد (=شیر کے بچے) وغیرہ۔ یہی اثر سندھی ناموں پر بھی پڑا: سندھی میں لوگوں کے نام (مثلاً ٹُوھُو (اندرائن)، گوڑو (کڑوا)، اکُ (آک)، نم (نیم کا درخت)، شینھڑو (چھوٹا شیر)، سگھو (طاقت ور، قوی)، سبھر (تنومند، موٹا تازہ)، ڈِھنگانو (ہٹا کٹا، شہہ زور)، لوھہ مروڑ (لوہا مروڑنے والا وغیرہ) اور ذاتوں کے نام (ناہر = بھیڑیا، بگھیاڑ (بھیڑیا)، شینھڑا (شیر کے بچے)، واسینگ (کالا ناگ) وغیرہ عربی نہج پر مگر خالص سندھی زبان میں رائج ہوئے۔ روز مرہ کے لباس میں بھی تبدیلی آئی اور کپڑوں کے عربی نام سندھی زبان کا جز بنے: مثلاً

---

(۱) قرآن شریف میں ارشاد ہے: 'وَ بَصَلِھَا' سورۃ بقرہ، آیت نمبر۶۱ (مترجم)

(۲) نبی پاک علیہ الصلواۃ والسلام کے کئی ایک صحابیوں کے نام حنظلہ ہیں۔ ابنِ حبان بُستی نے ''تاریخ الصحابہ'' میں نبی پاک ﷺ سے روایت کرنے والے حنظلہ نامی تین صحابہ کا ذکر کیا ہے: حنظلہ بن الربیع بن صیفی، یہ نبی پاک ﷺ کے کاتب بھی تھے۔ دوسرے حنظلہ بن حنیفۃ بن حذیم اور تیسرے حنظلہ بن قیس بن عمرو انصاری۔ اس کے علاوہ حنظلہ بن ابی عامر بھی صحابی ہیں (ان کا باپ ''المنافق'' کے لقب سے مشہور دشمنِ رسول تھا) جو جنگِ اُحد میں ابوسفیان پر حملہ کرتے ہوئے اسود بن شداد یا شداد بن الاسود کے ہاتھوں شہید ہوئے، جسے بعد میں غسل دینے کے لئے فرشتے آسمان پر لے گئے اور غسیل الملائکہ کے لقب سے مشہور ہوئے۔ اسی نہج پر سندھی میں ''ٹوھو'' (=اندرائن) نام عام ہے اور اندرائن کو عربی میں حنظلہ کہتے ہیں۔ (مترجم)

رئــو (رداء = دوپٹہ)، پوتی = اوڑھنی (فوطہ=کمر بند یا پٹکہ)، گج (قز)(۱)، گندی (غطاء)(۲) اور صدری؛ گھریلو زندگی میں لفظ ابو، (۳) امانْ (والدہ)، دِلو (مٹکا، گھڑا)، دہکي (چنگیری، روٹی رکھنے کی ٹوکری)، تباک (تبا کھ= طبق-طباق، مٹی کا بڑا تھال) وغیرہ عربی لغت ہی سے سندھی زبان کا حصہ بنے۔

عربوں اور سندھیوں کے سماجی اور معاشرتی تعلق کا اثر شہروں سے باہر دیہاتی رہن سہن خصوصاً مویشیوں کی پرورش، اونٹوں اور گھوڑوں کے پالنے اور رکھنے کے پیشے پر بھی پڑا۔ مویشی رکھنے اور پالنے والوں نے جانوروں کی پہچان کے لئے عربوں کی قدیم رسم سے متاثر ہوکر اپنے جانوروں کو داغ اور چیرے دیے۔ مویشیوں کی پہچان کے لئے ''داغوں'' کا سلسلہ جس قدر عرب اور سندھی قبائل میں عام مروج اور مکمل نظر آتا ہے، دنیا کی دوسری کسی بھی قوم میں اس قدر نہیں ملتا۔ سندھ میں عربی گھوڑوں اور اونٹوں کی نسلیں پالی جانے لگیں، یمن کے ''مہرۃ بن حیدان'' قبیلہ کے اونٹوں کی نسل میں سے سندھ میں 'مہری' اونٹوں کی نسل آئی اور عمدہ اور تیز رفتار اونٹوں پر نام ہی 'مہری' پڑ گیا۔ گھوڑوں میں سے 'ابلق، کمیت' کی نسلیں غالباً عراقی گھوڑوں کی عربی نسلوں سے ہوئیں اور سواری کے گھوڑے کا نام 'عیراق' (=عراق) پڑ گیا

''ڪڏهن پرن پيادا پٽ تي، ڪڏهن آئيندن عيراق'' (کبیر شاہ)

[کبھی پا پیادہ بیابان میں چلتے رہتے ہیں، کبھی انہیں عیراق (گھوڑا) لے کر آئے گا]۔

جس طرح عربی زبان میں اونٹ اور گھوڑے کی اقسام، رنگوں، چال، امراض اور علاج کے الگ الگ نام تھے اسی طرح سندھی زبان میں بھی الگ الگ نام رکھے گئے۔ اونٹ کے، پیدائش سے چھ برس تک کی عمر کے نام: پیدا ہوا تو گوئرو یا مزات (ما+زاد)، دو سال کا ہوا تو ڀهاڻ (ڈبھانڑو)، تین سال کا ہوا تو تهاڻ (تہانڑو)؛ چار پانچ سال کا ہوا تو ڇٽ (چھٹ)، چھ سال کا ہوا تو دوڪ (دوک)، سات سال کا چوکو (چوگو)؛ آٹھ سال کا ڇڪو (چھکو) اور نو سال کا ہوا تو 'نیش' (نیش یعنی نو سال کا جوان اونٹ جو بالکل عربی لفظ 'بازغ' کا ہم معنی ہے)، اس کے بعد نو سے بارہ سال تک کے اونٹ کو 'بنیش' اور بارہویں سال کے بعد 'رموش' کہا جانے لگا۔ اسی طرح بلحاظ عمر گھوڑے کے نام: 'وچھیرو' 'سرل'، 'دوک'، 'چوسال'، 'پانجاریو' وغیرہ؛

(۱) عربی میں قز کہتے ہیں کچے ریشم کو- دود القز- ریشم کا کیڑا، قزاز ریشم کا تاجر- سندھی میں گج کہتے ہیں عورتوں کے کشیدہ کیے ہوئے کُرتے کو۔ (مترجم)

(۲) عربی میں غطاء کے معنی ہیں ''پردہ'' سندھی میں گندی کہتے ہیں رنگین کپڑوں کے ٹکڑوں سے بنی ہوئی گدڑی، اوڑھنی، دوپٹہ کو۔ (مترجم)

(۳) یہ لفظ 'الف' پر زبر اور 'ب' پر پیش اور زبر کے درمیانی تلفظ کے ساتھ ہے، بمعنی 'باپ'، 'والد'۔ (مترجم)

رنگ کے اعتبار سے گھوڑے کے نام:

'کُمیت'، 'جابونْ'، 'نیرؤ'، 'بور'، 'مُشکی'، 'چینو'، 'نُقر ؤ'، 'بگلو'، 'ابلق'، 'سَنجاف'،

'سُرخو'، 'مکڑؤ'، 'سمند'، 'پنج کلیان'، 'کبوتریو'، اور 'دیناری' وغیرہ ۔

گھوڑے کی زین وغیرہ ساز و سامان میں سے 'رکیب' اور اونٹ کے ساز و سامان میں سے 'نط' (=نطع یعنی چمڑے کا بالا پوش) اور 'گاشو' (غشاء = پوش) عربی زبان سے آئے۔ اسی طرح مویشیوں، گھوڑوں اور اونٹوں کے بارے میں الفاظ واصطلاحات کا ذخیرہ عربی زبان کے اسی سرمائے کے زیرِ اثر خواہ نہج اور نمونے پر پھلا پھولا اور وسیع ہوا۔

پاؤں کے نشانات ڈھونڈھنا، پکھتر دیکھنا، جنگلی غذا تلاش کرنا، چھوٹے کنویں اور گھاٹ بنوانا، مویشیوں کو موسمِ برسات میں اگی ہوئی گھاس چرانا، اونٹوں کو بٹھوانا، ایسی بیٹھکوں پر رات کو آگ جلانا، دھونی رما کر بیٹھنا اور غیر آباد زمینوں کو آباد کرنا، یہ تمام کے تمام سندھ کی برّی (دیہاتی یا جنگلی) زندگی کے وہ واضح پہلو ہیں، جن پر عرب کی بدوی لغت کا گہرا اثر موجود ہے۔ عرب رات کو اونٹوں کی بیٹھکوں کے وقت آگ روشن کرتے تھے تاکہ اسے مسافر دور ہی سے دیکھ کر وہاں آسکیں۔ آگ کا جلانا اور دھونی رمانا مہمان نوازی اور مردانگی کا شیوہ تھا۔ سندھی اصطلاحیں:

''ہوتو ہارڻ'' یا ''فلاڻي ڪانه ہاري'' جیسی اصطلاحات اس بدویانہ زندگی کی یادگار ہیں:

[''ہو تو ہارڻ'' یعنی ہمت دکھانا، کچھ کرکے دکھانا اور فلاڻي ڪانه ہاري یعنی فلاں شخص نے ہمت نہیں دکھائی، مرد بن کر نہیں رہا]۔

ٿو مرون ماري مڙس ڪي تون ويٺو آهين . بي ايمان

انهيءَ جٽي ڪان مٺو يلو هون، تو ڪانئر ہاري ڪان!

(دین محمد لغاری)

(تھو مِروں مارے مڑس کھے، توں ویٹھو آھیں بے ایمانَ

انھی جٹے کھاں مُٹھو بھلو ھُوں، تو کانئر باری کانَ)(۱)

[یعنی جوان آدمی کو خنزیر مار رہا ہے اور بے ایمان! تو کھڑا ہوا دیکھ رہا ہے، تیرے اس طرح کے زندہ رہنے سے مر جانا بہتر تھا، اے نکما! تو نے کچھ بھی ہمت نہیں دکھائی!]

اسی طرح ''کیما کوڙڻ'' (کیما کھوڑنٹو = منزل انداز ہونا) اسی بدوی تمدن کی گواہی دے رہا ہے:

''عشق آڻي جت ڪيما ڪوڙي، دين ڪفر جا تڳا توڙي''

[جہاں آ کر عشق منزل انداز ہوتا ہے وہاں کفر اور اسلام کی تفریق ختم ہو جاتی ہے]
عرب شاعروں نے اپنے محبوب کے ویران نشانات (جنگل میں گھروں کے نشانات) کو گایا ہے۔ مثلاً امراؤالقیس کہتا ہے:

قفا نبك من ذكرىٰ حبيب و منزلِ
[ٹھہریئے تاکہ محبوب کے ویران نشانات کی یاد میں آنسو بہائیں]
شاہ صاحب کہتے ہیں کہ:

کاروڙيان ڪٽي، ويڙهي جهپ ويا
سيڻ منهنجا سيد چئي، هاڻي هت هئا
پسي پڊ ان جا، لڙي لڙڪ پيا
ڏيهي ڏور ويا، ڏيان ڏوراپا ڪن ڪي.

[کھاروڑی (گاؤں) سے اٹھا کر ویڑھی جھپ (گاؤں کی طرف) چلے گئے۔ میرے ساجن (گاؤ والے) ابھی تو یہاں ہی تھے ان کے ویران نشانات دیکھ کر آنسو نکل آئے ہم وطن، دور چلے گئے، گلہ شکوہ کس سے کروں]۔
بدوی عرب شاعروں نے اپنے محبوب کی نزاکت کو اونٹ اور اونٹنیوں کے عمدہ اوصاف (مثلاً لمبی گردن) کے ساتھ مشابہت دی ہے؛ سندھی شاعر بھی کہتا ہے:

نبي سر جون نام ـ ڪنيون، سي ننگ پريون ڪن نات
هڪڙي لوڏ لوهاڻين ڪي، ٻ ٻيءَ جا سونهن سمات
جويون جيسلمير جون، اٺني ڪل ڪنوات.

(سانوڻ)

['نبی سر' کی نامور، حیادار عشوہ گری کرتی ہیں لوہانیوں (ایک قبیلہ) کو ایک تو ناز نخرے ہیں اور دوسری سماٹ قوم والی سُو بھا، جیسلمیر کی تمام عورتیں جوان اونٹنیوں (کی مانند) ہیں]۔

(۴) سندھی الف-ب کی ترتیب، رسم الخط اور صرف-نحو پر اثر پڑا:

عربی نظامِ تعلیم کے ذریعے الف-ب کے حروف صحیح میں اضافہ ہوا، اور عربی الف-ب کے گیارہ حروف (ث، ح، خ، ص، ض، ط، ظ، ع، غ، ف، ق) سندھی الف-ب میں داخل

ہوئے۔

عربی زبان کے زیرِ اثر طویل حروف علت (الف، 'و' اور 'ی') کا زیادہ استعمال ہوا۔ اسی لئے ایسے سندھی الفاظ جو اس وقت زیادہ تر حروف صحیح کا مجموعہ ہوتے تھے، ان کے تلفظات میں الف، واو، ی کے سُبک تلفظات نے آسانی اور سلاست پیدا کی، مثلاً سندھی لفظ ''بت'' (بھت) کو عربوں نے 'بھطۃ' یا 'بھطا' کر کے لکھا۔

عربوں اور سندھیوں کے مسلسل میل جول اور عرب عالموں کی سندھی دانی اور علمی تصنیفات کے اضافے سے تلفظات کی صحت اور رسم الخط پر توجہ ہوئی۔ سندھ ہی میں اکثر سنسکرت زبان کی کتابوں کے تراجم ہوئے۔ منصورہ شہر میں جو قابل عالم اور ادیب موجود تھے اور جو سندھی کے ساتھ ساتھ ہندی زبانوں کے بھی ماہر تھے انہوں نے یقینی طور پر ترجمہ کے وقت الفاظ کی صحت اور صحیح تلفظ پر توجہ دی ہوگی۔ اس علمی ماحول میں سندھی زبان کے الفاظ کو صحیح رسم الخط کے مطابق لکھا گیا جس کی وجہ سے آج بھی سندھی الفاظ کے ذریعے اصلی پراکرت الفاظ کا پتہ لگایا جاسکتا ہے۔ سندھی زبان پہلی مرتبہ عربی رسم الخط میں لکھی جانے لگی اور عربی زبان کی زیر، زبر، پیش، جزم اور مد کی نشانیوں نے الفاظ کے صحیح تلفظ قائم کرنے میں بڑی مدد دی۔

سندھ کی زبان یا زبانوں میں اس زمانے میں 'ز' اور 'س' کے تلفظ کی کثرت تھی، جت قوم کی زبان کے تجزیئے سے 'ز' کی کثرت ظاہر ہے۔ اس لئے اہلِ سندھ عربی زبان کے الفاظ میں 'ج' اور 'ش' کے تلفظ کو تبدیل کر کے 'ز' اور 'س' کی آواز بولنے لگے۔ مشہور ادیب جاحظ نے اپنی تصنیف ''کتاب البیان والتبیین'' میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے؛ وہ لکھتا ہے کہ: سندھ کا باشندہ لامحالہ 'ج' کا تلفظ 'ز' کرتا ہے، خواہ وہ عرب کے فصیح و بلیغ قبائل 'بنوقیس' اور 'بنو ہوازن' میں پچاس سال ہی عرصہ بسر کر چکا ہو(۱)

جاحظ نے اپنی دوسری تصنیف ''کتاب الحیوان'' میں سندھ کی ایک بوڑھی عورت (جس کی مادری زبان سندھی تھی) کا اپنی سواری اور بار برداری کے اونٹ کے بارے میں ادا کیا ہوا ایک فقرہ نقل کیا ہے جس میں وہ عورت ''جمل'' (اونٹ) کو ''زمل'' کہہ کر پکار رہی تھی۔ (۲)

---

(۱) کتاب البیان والتبیین، جلد۱، ص۲۶

(۲) لقد رکبت عجوزة سندیة ظهر بعیر فلما اقبل به البعیر و ادبر و طمر فمخضها مرة مخض السقاء و جعلها مرة کانها ترهز فقالت بلسانها و هی سندیة عجمیة: "اخزی الله هذا الزمل" (کتاب الحیوان، جلد۳، ص۹)

ابو عطاء سندھی(۱) عربی کا مشہور اور مانا ہوا شاعر ہے، جس نے تقریباً ۱۳۲ھ میں وفات پائی۔ وہ بچپن ہی سے عرب قبیلہ 'بنو اسدؔ' میں رہا، مگر اس کے باوجود اس کی زبان میں سندھی تلفظات کی خصوصیت باقی تھی جس کی وجہ سے وہ 'ج' کو 'ز' اور 'ش' کو 'س' تلفظ کرتا تھا۔ جس پر اس کے دوسرے ہم عصر شعراء اور ادیب نکتہ چینی بھی کرتے رہتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ اور اہم واقعہ رونما ہوا، جو عربی ادب کی کتابوں میں یوں مشہور ہے:

ابو الحسن مدائنی کی تحقیق کے مطابق یہ بات یوں مشہور ہے کہ 'معلیٰ بن ہبیرہ' اور 'حماد الراویہ' جو کہ دونوں شاعر، راوی اور ادیب تھے، ان کے درمیان ایک طرح کی ادبی رقابت بھی تھی؛ اس لئے معلیٰ نے سوچا کہ وہ کسی طرح ایک ایک سطر پر حماد کو ابو عطاء سندھی سے ٹکرادے تاکہ ابو عطاء اپنی ہجو گوئی سے حماد کو ذلیل و خوار کردے۔

اسی منصوبے کے تحت معلیٰ نے ایک مرتبہ حماد سے کہا کہ: ''اگر تو نے ابو عطاء سے کسی بھی طرح 'زج' (بھالہ)، 'جرادۃ' (مکڑ) اور 'مسجد بنی شیطان' کے الفاظ کہلوائے تو میں اپنا خچر ساز و سامان سمیت تجھے دے دوں گا''۔ حماد نے یہ بات قبول کرلی اور اسی منصوبے کے تحت ایک محفل منعقد کی گئی، اس محفل کی روداد بیان کرتے ہوئے حماد بیان کرتا ہے کہ: ابو عطاء سندھی آیا اور آکر بیٹھا اور خوش خیر عافیت کے طور پر کہنے لگا کہ: **مرھبا مرھبا ھیاکم اللہ** (یعنی **مرحبا مرحبا حیاکم اللہ**)۔ میں نے بھی اس سے خوش خیر عافیت پوچھی اور اُسے رات کا کھانا پیش کیا، جس پر اس نے کہا کہ: **لاھاجۃ لی بہ** (=**لا حاجۃ لی بہ**) یعنی مجھے اس کی حاجت نہیں۔ اس کے بعد اس نے نبیذ طلب کی جو اسے دی گئی، نبیذ پینے کے بعد جب وہ خمار میں آیا تو میں نے اسے کہا کہ اے ابو عطاء! کسی شخص نے مجھے کچھ اشعار پہیلیوں اور معموں کے طور پر بھیجے ہیں، جن کے

---

(۱) ابو عطاء سندھی کا نام افلح بن یسار تھا، باپ بیٹے دونوں سندھ سے بنو اسد کے ذریعہ غلاموں کے زمرہ میں کوفہ پہنچے، ابو عطاء کو ادب اور شعر و شاعری کا بڑا ذوق تھا چنانچہ اس نے اس میں کمال پیدا کیا۔ اس کے جدید آقا عنترۃ بن سماک نے اسے آزاد کردیا لیکن بعد میں جب ابو عطاء کو امراء کے درباروں سے انعامات و اکرامات ملنے لگے اور اس کا شہرہ چہار سُو پھیلنے لگا تو اس کے آقا نے اس سے آزادی کی قیمت چار ہزار وصول کرلی۔ جب وہ رقم دے کر باقاعدہ آزاد ہوا تو اس نے عنترۃ بن سماک کی دل کھول کر ہجو کی۔ ابو عطاء چونکہ سندھی الاصل تھا اس لئے بعض حروف کا تلفظ صحیح نہیں کرتا تھا، اس کے لب و لہجہ سے اصل سندھیت کی بُو باس ظاہر ہو ہی جاتی تھی۔ وہ حرف ''ز'' کو ''ج'' کی جگہ استعمال کرتا، اسی طرح ''ش'' کی جگہ ''س''۔ اس وجہ سے اس نے ایک غلام خریدا جسے متبنیٰ (منہ بولا بیٹا) بنا کر اس کا نام 'عطاء' رکھا اور خود 'ابو عطاء' کی کنیت اختیار کی۔ تاریخ میں کنیت ہی سے مشہور ہوا۔ شعر خود کہتا لیکن لوگوں کو وہ شعر 'عطاء' ہی پڑھ کر سناتا۔ شعر پڑھ کر سنانے والوں کو اس زمانہ میں ''راوی'' کہا جاتا تھا۔ ''افلح بن یسار ابو عطاء'' کا یہ راوی بنو امیہ اور بنو عباس کی جنگ میں کام آگیا۔ حاصل مطالعہ تاریخ سندھ از سید ابو ظفر ندوی، ص: ۳۰۴ (مترجم)

جواب میں نہیں دے سکا، حالانکہ کل سے اب تک کوشش بھی کرتا رہا ہوں، آپ اس سلسلے میں میری مدد کریں گے! ابوعطاء نے کہا کہ: ''شعر سناؤ!'' میں نے اسے شعر سنایا

ابن لی ان سئلت ابا عطاء

[اے ابوعطاء! مجھے سمجھایئے اگر میں پوچھوں]

یقیناً کیف علمک بالمعانی

[کہ یقینی طور پر تجھے فنِ معانی میں کتنی مہارت ہے]

ابوعطاء نے کہا کہ:

خبیر عالم فاستال تزدنی (تجدنی)

[میں جاننے والا ماہر ہوں، پوچھ تجھے معلوم ہوجائے گا]

بھا تبا (طبا) و آیات المثانی

[کہ میں اس فن میں یگانۂ روزگار ہوں]

جس پر میں نے اس سے پوچھا کہ:

فما اسم حدیدۃ فی رأس رمح

[اس لوہے کے ٹکڑے کا کیا نام ہے جو نیزے کی چوٹی میں]

دوین الکعب لیست بالسنان

[ٹخنے کے قریب ہے مگر وہ نیزہ بھی نہیں]

ابوعطاء نے کہا کہ:

ھو الزز (الزج) الذی ان بات دیفا (ضیفاً)

[وہ زز (صحیح تلفظ 'زج' یعنی بھالہ) ہے جو اگر]

لصدرک لم تزل لک اولتان (عولتان)

[رات کے وقت تیری چھاتی کا مہمان بنے تو تجھے ہمیشہ کیلئے دکھ دے ڈالے گا]

جس پر میں نے اسے کہا کہ خدا تجھے نیکی عطا کرے شاید تیرا مقصد 'زج' ہے۔

میں نے پھر پوچھا:

فما صفراء تدعیٰ ام عوف

[وہ پیلے رنگ کی کونسی چیز ہے جسے ام عوف کہا جاتا ہے]

كان رجيلتيها منجلان؟

[جس کے پاؤں درانتی کی طرح ہیں؟]

اس نے جواب دیا کہ:

اردت زرادة (جرادة) و ازن زنا (اظن ظنا)

[تیری مراد 'زرادة' (صحیح لفظ جرادة یعنی مکڑ) ہے]

بانک ما اردت سوئ لسانی

[مگر مجھے شک ہے کہ تیرا ارادہ میری زبان کی خامی نکالنے کے سوا اور کچھ نہیں]

میں نے اس سے کہا کہ: "اللہ پاک تیرے لئے آسانیاں پیدا کرے اور تجھے بڑی زندگی دے!"

اس کے بعد میں نے اس سے پوچھا کہ:

اتعرف مسجداً لبنی تمیم

[کیا آپ کو بنی تمیم کی اس مسجد کا علم ہے]

فویق المیل دون بنی ابان؟

[جو ایک میل سے کچھ زیادہ بنی ابان کے محلے کے پرلی طرف ہے]

اس پر ابو عطاء نے کہا کہ:

بنو سیطان (شیطان) دون بنی ابان

[وہ بنو سیطان (صحیح لفظ بنو شیطان) کی مسجد ہے جو بنو ابان کے محلے سے اتنی ہی دور ہے]

کقرب ابیک من ابد المدان (عبد المدان)

[جتنا تیرے باپ کا رشتہ ابدالمدان (صحیح لفظ عبد المدان) قبیلہ سے دور ہے]

حماد کہتا ہے:

"میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور میں سمجھ گیا کہ وہ ناراض ہوگیا ہے۔ جس پر میں ڈر گیا اور اس سے کہا کہ اے ابو عطاء! اس وقت مجھے معاف کردے اور میرا بچاؤ کر، البتہ جو کچھ مجھے ملا ہے اس میں سے آدھا حصہ آپ کا ہوا، اس پر اس نے کہا کہ 'پوری

بات سناؤ' میں نے اسے پوری بات بتادی، کہنے لگا کہ: تجھ پر کوئی حرف نہیں، جو کچھ تجھے ملا ہے وہ تیرا ہے، مجھے اس کی ضرورت نہیں، یہ کہہ کر وہ کھڑا ہوگیا اور معلیٰ کو برا بھلا کہتے ہوئے روانہ ہوگیا'' (۱)

ابو عطاء سندھی کا دور ۱۳۲ھ کے لگ بھگ ختم ہوتا ہے: اس لحاظ سے یہ حکایت ثابت کرتی ہے کہ دوسری صدی ہجری کے اوائل میں سندھ کی زبان کے محاوروں میں 'ز' اور 'ج' 'س' اور 'ش' کے تلفظات میں کوئی فرق نہیں تھا۔ دوسرا یہ کہ سندھ میں عرب حکومت کے اس ابتدائی دور میں ابھی اہلِ سندھ خالص عربی حروف -'ح'، 'ض'، 'ظ' اور 'ع' وغیرہ- سے بھی مانوس نہیں ہوئے تھے اور ان حروف کے تلفظات اہل سندھ کی زبان پر پورے طرح چڑھے نہیں تھے۔ تیسرا اس حکایت سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ایسے نیم پختہ تلفظات پر کس طرح تنقید ہوتی رہی۔ اس علمی تنقید خواہ اہلِ سندھ اور عربوں کے درمیان عام تعلقات کا ہی نتیجہ ہوا کہ سندھی الفاظ کے تلفظ میں 'ج' 'ز' 'س' اور 'ش' کے جداگانہ اور مستقل تلفظات کا اضافہ ہوا۔ آج کل سندھ کے قدیم باشندے - یعنی لاکھا، سمہ، سہتہ، چنہ وغیرہ - جو دیہاتوں میں رہتے ہیں؛ ان میں سے ان پڑھ بھی یہ تلفظات بالکل صحیح اور صاف ادا کرتے ہیں؛

صرف سندھ کے ہندو لوہانہ جو سماجی طور پر عرب مسلمانوں سے الگ رہے، ان میں البتہ اب تک ان تلفظات کی خامی موجود ہے۔

چوتھا یہ کہ سندھی الفاظ اور جملوں کی ترتیب پر عربی زبان کی اعراب کا اثر ہوا۔ 'اعراب' جملے میں بناوٹ اور ایستادگی کے لحاظ سے لفظ کے آخر حرف والی اس حرکت (زیر، زبر، پیش) کا نام ہے جو جدا جدا حالتوں کے تحت تبدیل ہوتی ہو۔ ہندوستان کی موجودہ زبانوں میں سے سندھی زبان ہی ہے جس میں اعراب کا سلسلہ مکمل طور پر موجود ہے۔ سندھی کے مذکر اسم اپنی اصل صورت میں اکثر پیش کے ساتھ ہوتے ہیں اور مؤنث اسم زیادہ تر زیر یا زبر کے ساتھ (علاوہ بعض جزوی مستثنات Exceptions کے-مثلاً مَس، گس وغیرہ)۔ حالتِ فاعلی (اور فعلِ لازمی) میں البتہ اسماء کی اعراب وہی اصل حرکت رہے گی (مثلاً گھرُ کشادو آھے)؛ مگر اضافی اور جری حالتوں میں آخری حرف کا پیش تبدیل ہوکر زیر بن جاتا ہے (جیسا کہ: حالتِ اضافی میں 'گھرَ جو دھنی' اور حالتِ جری

(۱) اس حکایت کیلئے دیکھئے اصلی ماخذ ''الاغانی'' ۱۶/۸۰، ''الشعراء'': ص۴۸۳، ''الخزانۃ'': ۴/۱۷۰، ''العقد'': ۳/۴۵۶، ''الوفیات'': ۲/۸۶-۵۸۵ (د-سلین۳/۳۹-۴۳۸)، ''بدائع البدائہ'' ص:۱۹-۲۰

میں 'گھرَ میں'، 'گھرَ کھے'، 'گھرَ ڈانھں')، لیکن اگر حرف جر حذف کردیا جائے تو آخری حرف پر زیر دی جائے گی مثلاً فلاڻي جي گھرِ وڃ (فلاں کے گھر جا) جو دراصل فلاڻي جي گھرَ ۾ وڃ (فلاں کے گھر میں جاؤ، کے مساوی ہے) جن مرد حضرات کے ناموں کے آخر میں 'وُ' ہے وہ حالتِ ندا میں تبدیل ہوکر الف بن جائے گا، اور حالتِ اضافی اور حالتِ جری میں 'یِ' بن جائے گا: مثلاً 'الھہ ڈنوُ' حالتِ ندا میں 'اے الِھہ ڈنا' بن جائے گا اور یہی نام حالتِ اضافی اور جری میں ''الھہ ڈنے جو چاچو''، ''الھہ ڈنے کھے چئیم''۔ مگر عربی کی طرح سندھی میں بھی عورتوں کے نام ''مبنی'' ہیں، (یعنی ان کی اعراب تبدیل نہیں ہوتی) مثلاً 'بانو کا بیٹا'، 'بانو سے کہا'، 'بانو نے کہا' وغیرہ۔

مثلاً ہم کہتے ہیں 'احمد آیوُ (احمد آیا) اور 'احمد چیوُ' (احمد نے کہا): ان دونوں صورتوں میں حالتِ فاعلی ہے مگر پہلا فعل لازمی ہے اور دوسرا فعل متعدی۔ سندھی اعراب کے قاعدے کی رو سے متعدی فعل کے فاعل کی اعراب زیر ہوگی۔ یعنی پیش تبدیل ہوکر زیر بن جائے گا اور 'وُ' تبدیل ہوکر 'یِ' بن جائے گا۔ مثلاً الھہ ڏنو آيو (الھہ ڈنو آیا) اور الھہ ڏني چيو (الھہ ڈنہ نے کہا)۔ سندھی میں بالکل عربی کی طرح تمام کے تمام ضمائر مبنی ہیں یعنی ان میں اعراب کی تبدیلی نہیں ہوتی؛ 'ھُو'، 'تُوں' وغیرہ تمام ضمائر ہر حالت میں اپنی اصل صورت میں رہیں گے۔ مقصد یہ کہ سندھی زبان کا یہ فنِ اعراب عربی زبان کے گہرے اثر کا نتیجہ ہے۔

(۵) گرامر کے اجزاء اور حصوں پر عربی کا اثر ہوا:

(الف) اسم:

عربی سے دنوں اور مہینوں کے نام اور دیگر کئی اسم سندھی زبان کا حصہ بنے - مثلاً بصر (پیاز)، جبل (پہاڑ)، تھوم (لہسن)، دبکی (طباق یا چنگیری)، دلو (مٹکا)، رسو (رسہ) وغیرہ کئی اسم روز مرہ کی زبان میں داخل ہوئے؛ 'ناڑ' (ع- ناعورہ - ناڑ کے معنی ہیں رہٹ، پانی کا چرخہ)، مجیری (زمین کا مالک، زمیندار)، جریب (۱)، کاسو (۲)، وغیرہ الفاظ کھیتی باڑی کے پیشے میں داخل ہوئے؛ 'سنداڻ' (۳) اور 'مُتر کوُ' (عربی میں 'المطرقۃ') پیشۂ آہنگری کے نام بنے؛ 'کھڑیوُ (۴)، کُھرجین،

(۱) ایک بیگھا یا بیس بسوا زمین کو جریب کہتے ہیں۔ (مترجم)
(۲) عربی میں 'الکاس' کے معنی ہیں پیالہ، ساغر، بھرا ہوا ہو خواہ خالی، قرآن میں ارشاد ہے ''وکاسا دھاقا'' یعنی چھلکتے ہوئے پیالے ہوں گے۔ (مترجم)
(۳) عربی میں 'السندان' کے معنی ہیں 'آہری' یا 'نہائی' جس پر لوہار لوہا کوٹتا ہے۔ (مترجم)
(۴) کھڑیو اور کھرجین کے معنی ہیں 'خرجی' یعنی وہ دہرا تھیلا جو اسباب لادنے کیلئے ٹٹّو کی پیٹھ پر ڈالتے ہیں۔ (مترجم)

ساھمی وغیرہ الفاظ تاجروں کے ذریعے رائج ہوئے؛ اور زورق(۱) (=کشتی کی قسم) سِڑھہ (شراع)(۲)، سُکھان (سکان) (۳) وغیرہ نام ملاحوں اور ناخداؤں کے استعمال میں آئے۔

ان عربی الاصل اسماء کے علاوہ خود سنسکرت یا پراکرت سے جو اسم سندھ میں رائج ہوئے ان میں سے بھی کچھ پر عربی کی لغوی تبدیلی کا اثر ہوا اور اسی اثر کے بدولت ان کے اصلی تلفظات حروف کی تبدیلی کی وجہ سے بدل گئے مثلاً وہ خالص سندھی الفاظ یا وہ پراکرت یا سنسکرت کے الفاظ جو سندھی میں رائج تھے اور جن کے آخر میں 'یــــہ' یا 'ہ' تھی ان کی وہ اواخر 'ج' میں تبدیل ہوگئیں؛ اس تبدیلی کی وجہ سے 'سـوریـہ'، 'آشـچـریـہ'، 'کـاریـہ' کے الفاظ تبدیل ہوکر سورج، اچرج (۴) اور کارنج بن گئے۔ ونجھ (ونجھ) (۵) کا لفظ جو اسی اصلی صورت میں یا 'وٹہ' کی صورت میں رائج تھا اور جسے غالباً ایرانی ملاحوں نے 'ونہ' کر کے ادا کیا، وہ عربی کی اسی لغوی تبدیلی کے زیرِ اثر بدل کر 'ونج' بن گیا اور آج تک اسی تبدیل شدہ صورت 'ونجھ' میں رائج ہے۔ (☆)

(ب) ضمیر:

ضمیر 'ھو' (وہ) اور 'آءٌ' (میں) عربی الاصل ہیں۔ لفظ 'آءٌ' خاص طور پر سندھ کے

---

(۱) عربی میں زورق کے معنی چھوٹی کشتی کے ہیں۔ (مترجم)

(۲) سِڑھہ بادبان کو کہتے ہیں۔ عربی میں الشِراع کے معنی ہیں ہر نصب کی ہوئی اور اٹھائی ہوئی چیز مثلاً کشتی کا بادبان، کمان کی تانت، اونٹ کی گردن جس کی جمع 'اشرعۃ' اور 'شرع' ہے دیکھئے المنجد ص۵۲۲۔ (مترجم)

(۳) عربی میں السکان من السفینۃ کے معنی ہیں پتوار اس کی جمع 'سکانات' ہے دیکھئے المنجد ص۳۸۲۔ (مترجم)

☆ عربی لغت کے قانون کی رو سے یہ تبدیلی مشہور اور مسلّم ہے: علمِ لغت کے مشہور عرب محقق ''موھوب الجوالیقی'' کی مشہور کتاب ''کتاب المعرب من الکلام الجمی علی حروف المعجم'' (طبع لیزگ ۱۸۶۷ء) اور دیگر معتبر تصنیفات میں اس تبدیلی کی مثالیں موجود ہیں، ان میں سے درجِ ذیل مثالیں بطور خاص ہند اور سندھ کی زبانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔

اصل صورت		عربی اثر کے تحت تبدیل شدہ صورت
ایریه	آریہ نسل کے والد	ایرج
دهنه	بمبئ سے نیچے جنوب کی طرف بندر کا نام	دھنج
بواریه	عربی اصول کے مطابق 'بیریہ' کی جمع، 'بیرہ' = بیڑہ یا بیڑی؛ 'بیریہ' یعنی کشتی والا یا ملاح، ناخدا، کشتی بان	بوارج
سیابه	ایک قدیم بلوچی قبیلے کے نام 'سیاہ پا' یا 'سیاہ پاذ' کا تبدیل شدہ تلفظ - 'سیاپہ' > 'سیابہ'	سیابجہ
انبه	ہندھی میں لفظ 'انب' (آم) کا اُس وقت مروج تلفظ	انبج
هلیله	جارکھوں، کھارکوں یا ھریڑ (ھڑ) آج کل 'ھلیلا'، شمالی سندھ میں تازہ کھجور کو کہتے ہیں	ھلیلج

(۴) بمعنی تعجب۔ (مترجم)

(۵) کشتی کا دنبالہ، پتوار۔ (مترجم)

زیریں علاقے میں رائج ہے، اور جیسا کہ اس علاقے میں دیبل اور منصورہ مرکزی شہروں کی وجہ سے سندھی پر عربی کا اثر ہوا تو وہاں پر عربی لفظ 'انا' کا سندھی تلفظ ''آن'' (<آنءْ <آئون) ہمیشہ کیلئے استعمال میں آگیا۔ سندھ کے شمالی حصے میں قدیم دور سے ہی فارسی کا اثر زیادہ رہا اس وجہ سے لفظ 'من' سے 'ماں' مروج ہوگیا۔

فعل کے دہرے متصل ضمیری اواخر جس مکمل صورت میں سندھی میں رائج ہیں اس طرح دوسری کسی بھی ہند-آریائی زبان میں نہیں ملتے۔ یہ ''دہرے متصل'' اواخر غالباً براہ راست عربی سے یا عربی سے فارسی کے ذریعے سندھی میں رائج ہوئے۔ واضح رہے کہ تنہا ''متصل ضمیری اواخر'' سنسکرت میں ملتے ہیں، جن کی مثال سندھی میں اس طرح ہوگی 'چیم' (میں نے کہا) 'ماریوسوں' (ہم نے مارا) مگر سندھی میں اس ترکیب کے آخر میں ایک اور ''دہرا آخر'' بھی رائج ہے جیسے کہ 'چیمَسِ' یا 'چیومانس' (میں نے اسے کہا)، 'ماریوسونس' (ہم نے اسے مارا)۔ دہرے ضمیری اواخر کا یہ نظام عربی کی خاص خصوصیت ہے: جیسا کہ مصدر ''ضرب'' سے 'ضربتُ' (میں نے مارا) اور 'ضربتہٗ' (میں نے اسے مارا)۔

(ج) فعل:

اصل عربی الفاظ سے سندھی میں 'افعال' بنے جیسا کہ دفنائڻ (دفنانا)، نظرڻ (نظر لگانا)، نيتڻ (نیت کرنا)، مرھڻ (دینا، عطا کرنا)، ضربڻ (مارنا)، طلبڻ (طلب کرنا)، ترڪڻ (لکھے ہوئے وغیرہ کو مٹانا، صاف کرنا) وغیرہ

(د) اسم فاعل اور مفعول:

عربی کے زیرِ اثر 'فاعل' اور 'مفعول' کے وزن پر سندھی میں 'اسم فاعل' اور 'اسم مفعول' کی تراکیب مروج ہوئیں۔ آج کل ان اوزان پر سندھی میں صدہا الفاظ استعمال ہوتے ہیں، جن میں سے اکثر و بیشتر 'علم و ادب' کے بالکل آخری دور میں فارسی کے زیرِ اثر ہی سندھی میں داخل ہوئے ہیں، لیکن سندھی میں فاعل اور مفعول کی تراکیب کے پرانے آثار نسبتاً ان الفاظ میں ملتے ہیں جو سطحی نظر سے عربی کے محسوس ہی نہیں ہوتے مثلاً 'ہاری'، 'ماری'، 'کاری' (=کار والا/کام والا)، 'چاری'، 'ماچھی'، 'مانجھی' وغیرہ کے خالص سندھی الفاظ عربی اسم فاعل کی ترکیب کے زیرِ اثر بنے ہیں اور 'باقی'، 'جاری'، 'لائق'، 'جاہل'، 'سائل'، 'شامل' وغیرہ قسم کے خالص عربی اسمِ فاعل قدیم دور سے

سندھی میں رائج ہو چکے ہیں۔ عربی وزن 'مفعول' کی ترکیب میں سے آخری 'ل' کی خصوصیت سندھی میں اسم مفعول کا لازم وملزوم جز بن چکی ہے(۱)۔

(ھ) حرف جر:

'لاءِ (=عربی 'لِ') اور 'واسطے' - یہ دونوں حرف دراصل عربی ہیں مگر سندھی میں عام طرح استعمال ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ 'طرف' =ڈانھن (یعنی طرف کو، جانب کو) 'فِی' (= میں، 'فی ماہ' 'فی سیکڑا' وغیرہ) اور 'بِ' = سے، (ساتھ، 'باللہ' 'بالآخر' وغیرہ) بھی رائج ہیں۔

(و) حرف استفہام:

'کِیئن' (کیسا، کیسے) =عربی میں 'کَیْ'، جوکہ 'کیف' کا ہلکا تلفظ ہے (۲)۔

(ز) حرف ندا:

'یا' 'الا' اور 'شال' (=انشاء اللہ)- تینوں حرفِ ندا عربی الاصل ہیں۔ اس کے علاوہ خوف کے وقت 'سانپ-سانپ' یا 'چور-چور' کا لفظ بھی عربی کی ندائی ترتیب ''تحذیر'' کا نتیجہ ہے۔

(٦) زبان کے علم و ادب کی بنیاد رکھی گئی:

سندھ میں عرب حکومت کے دور میں اسلامی سلطنت کا علاقہ، علم و ادب اور سائنس میں پوری دنیا میں ممتاز تھا۔ جہاں جہاں اسلام پہنچا وہاں علمی ترقی ہوئی سندھ میں بھی فتحِ اسلام کے بعد نئے علمی دور کا آغاز ہوا۔ سندھ میں عرب حکومت کے ابتدائی سو سالہ دور ہی میں سندھ کی علمی درسگاہوں سے عربی، سندھی اور ہندی زبانوں کے ماہرین پیدا ہوئے۔ عباسی دور حکومت میں - خصوصاً مامون کے دور میں - جو علمی اور فنی کتابیں سنسکرت سے ترجمہ ہوئیں وہ زیادہ تر سندھ کے گورنروں کی معرفت اور سندھ کی درسگاہوں سے فارغ التحصیل علماء کی مدد سے ہوئیں۔ ایک عرب عالم کا بیان ہے کہ اس نے علاقہ طبرستان کے کسی کتب خانہ میں ایک 'ہندی' کتاب کا عربی میں ترجمہ دیکھا، جس میں بتایا گیا تھا کہ یہ ترجمہ 'ساوندی کے امیر' کے زیر سرپرستی ہوا ہے(۳)۔

---

(۱) مثلاً بڌل (سنا ہوا) ڈٺل (دیکھا ہوا) ورتل (لیا ہوا) ڈنل (دیا ہوا) ڀڳل (ٹوٹا ہوا/بھاگا ہوا) کاڌل (کھایا ہوا) کارایل (کھلایا ہوا) آندل (لایا ہوا) آیل (آیا ہوا) وغیرہ۔ (مترجم)

(۲) 'مغنی اللبیب' کے مصنف نے وضاحت کی ہے کہ 'کیْ' درحقیقت 'کیف' کے ہلکے تلفظ والا لفظ ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ:

کی تجنحون الی سلم، و ما ثیرت
تتلاکم و لظیٰ الھیجام تفطرم

(۳) سر دست اصل حوالہ دستیاب نہیں، ہو سکا محض حافظہ کی بنیاد پر مطلب لکھ دیا گیا ہے۔

'ساونُدی' سندھ کا شہر 'ساوڑی' (تحصیل نواب شاہ میں) تھا، جس کے والی 'سمہ' تھے۔ خاص اہلِ سندھ میں سے کئی محدث، مصنف، مؤرخ اور شاعر پیدا ہوئے۔ ابو عطاء سندھی عربی کے بلند پایہ شاعر اور ابو معشر سندھی، تاریخ کے مشہور راوی، انہی اوائلی شخصیات میں سے تھے۔ دار الخلافۂ سندھ منصورہ کے قاضی ''احمد بن محمد'' نے عراق اور فارس میں شہرت حاصل کی۔ 'انسابِ سمعانی'، 'معجم البلدان' اور دیگر عربی کتب میں کئی سندھی محدثین خصوصاً علمائے دیبل کے نام ملتے ہیں۔ سندھی مصنفین میں سے 'فرح السندی'، 'ابو الفرج السندی' اور 'خلاد السندی' (جو کہ کوفہ میں کپڑے کی پھیری والا تھا) کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ (۱)

ایک طرف سندھی النسل علماء نے عربی علوم میں شہرت حاصل کی تو دوسری طرف عربی النسل علماء نے سندھ میں سندھی اور ہندی زبانوں کے مطالعے میں بازی جیت لی۔ سندھ میں منصورہ علمی مرکز تھا جہاں ۱۱۷ھ اور سندھی سال ۱۰۹ (۷۳۵ء) میں 'برہمگپت' کی کتاب ''کنڈ کادیک'' (کھنڈ کھادیک) کا عربی میں ''الارکند'' (۲) کے نام سے ترجمہ کیا گیا۔ سنہ ۲۸۸ھ میں منصورہ شہر میں ابو محمد الحسین نامی ایک عالم تھا جس نے وہاں ایک معتبر شخص سے سنا کہ کشمیر کے ایک راجہ۔ جس کا نام مھروک بن رایق اور لقب 'رائے' تھا جو ہندوستان کے نام نہاد راجاؤں میں سے تھا۔ اس نے سنہ ۲۷۰ھ میں حاکمِ سندھ عبداللہ ہباری کو لکھا کہ اسلامی احکامات کا علاقائی ہندی زبان میں ترجمہ کروا کر بھیج دیں۔ عبداللہ نے منصورہ کے ایک عالم کو طلب کیا جو دراصل عراقی خاندان سے تھا اور شاعر بھی تھا نیز ہندوستان کی اہم زبانوں بلکہ محاوروں کا بھی ماہر تھا۔ اس عالم نے راجہ کی ضرورت کے مطابق اسلامی احکامات کو بصورت قصیدہ علاقائی زبان میں نظم کیا اور وہ قصیدہ راجہ کو بھیج دیا گیا جو راجہ کو بہت ہی پسند آیا، بعد میں اس راجہ نے امیر عبداللہ سے اسی مصنف کو مانگ لیا۔ بالآخر وہ عالم راجہ کے دربار میں پہنچا اور تین سال کے بعد وہاں سے واپس آیا (اور اس نے آ کر بتایا کہ راجہ قلب و زبان سے اسلام قبول کر چکا ہے مگر سیاسی مصلحت کی بناء پر عام اعلان نہیں کر رہا (اور یہ بھی بتایا کہ) وہاں کے راجہ نے اسے ملکی زبان میں قرآن شریف کا ترجمہ کرنے کا بھی کہا جو اس نے پورا کر دیا (اس عالم نے راجہ کی طرف سے ملنے والے انعام و اکرام کے متعلق بتایا کہ) مختلف تین اوقات میں راجہ نے اسے چھ سو من سونا انعام کے طور پر دیا (۳)۔

---

(۱) دیکھئے ''فهارس النجاشي والطوسي''

(۲) دیکھئے البیرونی کی کتاب 'غرۃ الزیجات' پر راقم کا انگریزی میں مقدمہ، ص ۲۲-۲۰، مطبوعہ ۱۹۷۳ء

(۳) 'عجائب الہند' تصنیف بزرگ بن شہریار، مطبوعہ لائیڈن، ص ۲-۴ واضح رہے کہ اس زمانے میں 'من' ایک چھوٹا پیمانہ ہوتا تھا۔

ان حقائق سے ظاہر ہے کہ سر زمین سندھ میں نہ صرف عربی کے مطالعہ کے لئے درسگاہیں قائم تھیں مگر سندھی بلکہ 'ہند' کی زبانوں کے مطالعے کیلئے بھی مناسب انتظام تھا۔ سندھ میں سندھی اور عربی دونوں زبانوں کو بڑی اہمیت حاصل تھی کیونکہ عربوں اور سندھیوں کے مشترکہ رہن سہن کی وجہ سے دونوں ایک دوسرے کی زبان سمجھتے اور بولتے تھے۔ تمام عرب سیاحوں کا بیان ہے کہ سندھ میں سندھی اور عربی زبانیں رائج تھیں، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ عرب حکومت نے سندھی زبان کو بڑی اہمیت دی اور اس کی ترویج و ترقی کے لئے باقائدہ انتظام کیا۔

سندھ میں سندھی کے ساتھ ساتھ عربی کے عام فہم ہونے کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اہلِ سندھ نے بغداد خواہ اسلامی سلطنت کے دیگر علاقوں کے ساتھ اپنے تعلقات قائم کئے اور وہاں کی علمی، ادبی وفنی ترقی سے براہِ راست بہرہ ور ہوئے؛ دوسرا یہ کہ سندھ اور بغداد کے درمیان تمدنی تعلقات وسیع ہوئے۔ سندھ کے عرب گورنر، جو کہ مرکزی حکومت کی طرف سے آتے تھے، وہ خود علم و ادب کے شائق تھے۔ ابتداء میں تو ان کے ساتھ ہنرمند، کاریگر، منتظم اور فوجی افسر ہی آئے مگر بعد میں مرکزی عرب ممالک سے بڑے عالم، سیاح اور سیاسی لیڈر بھی سندھ میں آتے رہے۔ شاید ابوجعفر منصور (۱) کے ایام میں امام ابراہیم - جسے بعد میں شہید کردیا گیا - سندھ میں آیا اور اس نے تاریخِ سندھ پر تحقیق کی۔ ہماری رائے کے مطابق 'فتح نامہ' (۲) کا ایک باب جو کہ محمد بن قاسم کے دریا کو پار کرنے کے متعلق ہے، وہ امام ابراہیم کی تحقیق کا نتیجہ ہے (۳)۔

---

(۱) عرصہ حکومت ۱۳۶ تا ۱۵۸ھ (مترجم)

(۲) فتح نامۂ سندھ المعروف چچ نامہ یہ برِّعظیم پاک و ہند کے تاریخی سلسلے کی سب سے پرانی کتاب ہے جس میں سندھ کی قبل از اسلام حکومتوں کے مختصر حالات اور سنہ ۱۵ سے ۹۶ھ تک ہندوستان کی شمال مغربی سرحدوں پر اسلامی افواج کے ابتدائی بری و بحری حملوں اور آخر میں مکران اور سندھ کی اسلامی فتوحات کا مفصل اور مستند ذکر ہے۔ یہ کتاب اصل میں عربی زبان میں تھی سنہ ۶۱۳ھ میں 'اروڑ' (بھکر) کے ایک بڑے عالم فاضل مولانا اسماعیل بن علی بن محمد بن موسیٰ بن طائی بن یعقوب بن طائی بن محمد بن موسیٰ بن شیبان بن عثمان ثقفی کے ہاں سے علی بن حامد بن ابی بکر کوفی کو ہاتھ آئی، جو قاضی اسماعیل کے آباء واجداد کے پاس عربی میں تحریر شدہ تھی۔ علی بن کوفی نے اسے عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا۔ اغلب یہی ہے کہ یہ عربی کتاب ابوالحسن علی بن محمد بن عبداللہ بن ابی سیف کے پاس 'المدائنی' المتولد سنہ ۱۳۵ھ المتوفی ۲۲۴/۲۲۵ھ کی تصنیف ہے یا اس کی وفات کے بعد کسی اور مصنف یا مصنفین کی تصنیف ہے۔ علی کوفی اسے 'عرب عالموں کی تصنیف قرار دیتا ہے۔ اس فارسی ترجمہ کا سب سے قدیم نسخہ سنہ ۱۰۶۱ھ کا تحریر کردہ ہے جو پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری میں محفوظ ہے۔ لیفٹیننٹ ٹی-پوسٹنس (T - Postans) نے سنہ ۱۸۳۸ء اور سنہ ۱۸۴۱ء میں ''جرنل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال'' میں اس کا مختصر ترجمہ شائع کیا۔ اس کا انگریزی میں مکمل ترجمہ مرزا قلیچ بیگ نے کیا جو کراچی کے کمشنر پریس سے سنہ ۱۹۰۰ء میں طبع ہوکر شائع ہوا۔ اس کا پہلا سندھی ترجمہ جناب مخدوم امیر احمد مرحوم نے کیا جس کی نگرانی جناب ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ صاحب نے کی اور سنہ ۱۹۵۷ء میں سندھی ادبی بورڈ کی جانب سے شائع ہوا، اس کا اردو ترجمہ بلوچ صاحب ہی کی نگرانی میں جناب اختر رضوی صاحب نے کیا جسے سندھی ادبی بورڈ نے اپریل سنہ ۱۹۶۳ء میں شائع کیا۔ ملخص مطالعہ مقدمہ از مصحح ڈاکٹر بلوچ صاحب، ص ۱-۷۲ (مترجم)

(۳) دیکھئے فتح نامۂ سندھ، مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد، سنہ ۱۹۵۴ء، ص ۲۱۵، ۴۸۰-۴۸۱

اس کے علاوہ سندھ سے کپڑے کے تاجر (بزاز) فیل بان، صراف، موسیقار اور باورچی بغداد، بصرہ، کوفہ اور دیگر مرکزی شہروں میں پہنچے۔ سندھ کا کپڑا خاص طور پر عورتوں کی اوڑھنیاں/ چادریں اور رنگین دوپٹے بغداد اور دوسرے شہروں میں مقبول تھے، یہاں تک کہ سندھی لفظ 'پوتی' عربی تلفظ 'فوطۃ' (۱) کی صورت میں اس دور کی عام مروج عربی زبان کا جز بن گیا۔ البتہ لغت کے قدیم عالم ابن درید نے یہ وضاحت کی کہ اصل میں یہ لفظ عربی نہیں۔ مگر بعد میں ساتویں صدی ہجری کے درمیانی عرصے کے مشہور لغوی محقق حسن صغانی - (وفات ۶۵۰ھ)، جو کہ سندھ میں رہا تھا اور سندھی زبان سے واقف تھا - نے بالآخر تحقیقی طور پر بتایا کہ 'فوطۃ' در اصل سندھی لفظ (پوتی) ہے، اور اس کے اصل سندھی تلفظ میں پیش کی آواز (اُو= پُو) نہیں ہے بلکہ درمیانہ تلفظ (او=پو) ہے (۲)۔

سندھ کے باورچیوں ہی نے شاید بغداد میں سندھی پلاؤ کی دو قسمیں 'لیمویہ' (لیمائی) (۳) اور 'بلبیہ' (سندھ کے مہلبی گورنروں کی طرف منسوب) جسے 'بہطہ' (بھٹ) بھی کہتے تھے (۴)، رائج کیے (۳)۔

سندھ کے کفش دوزوں کے بنے ہوئے کھسے اور سلیپر بغداد کی شوقین بیگمات بہت پسند کرتی تھیں (۴)۔ سندھ کے ان کاریگر کفش دوزوں نے اپنی عربی دانی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان سلیپروں پر دلچسپ عربی اشعار کشیدہ کیے۔ ایک سندھی سلیپر پر یہ اشعار لکھے ہوئے تھے:

جعلت خدی له ارضا   فقلت طاَمنْ فوقها و ارضا

فقال 'لا' قلت بلیٰ سیدی   صبرا علی الحب وان مضیٰ

[میں نے اپنے گال کو اس کیلئے فرش بنایا اور اس سے کہا کہ اس پر قدم رکھ اور خوش رہ

(۱) 'الفوطۃ' کے معنی ہیں 'پیٹی' جس کو خدام، چپڑاسی، اردلی وغیرہ استعمال کرتے ہیں۔ اس کی جمع 'فوط' ہے، اور عوام کے نزدیک دستی رومال کو بھی کہتے ہیں جس سے ہاتھ پونچھے جائیں۔ دیکھئے المنجد، ص ۶۷۷۔ (مترجم)

(۲) کتاب الطبیخ (سنہ تصنیف ۶۲۳ھ) تصنیف محمد ابن الکاتب البغدادی، مطبوعہ موصل، سنہ ۱۳۵۳ھ (۱۹۳۴ء)، ص ۱۵، ۱۹، ۳۱-۳۲

(۳) نیبو یا لیمن ذائقے والا۔ (مترجم)

(۴) یہ اردو میں لفظِ 'بھات' کا مخفف ہے۔ (مترجم)

(۵) کتاب التربیع و التدویر من رسائل الجاحظ (طبع ساسی)، ص ۱۳۴-۱۳۵

(۶) کتاب التربیع و التدویر من رسائل الجاحظ (طبع ساسی)، ص ۱۳۴-۱۳۵

اس نے کہا 'نہیں' میں نے اسے کہا 'ہاں ہاں جناب' محبت کے گذرے ہوئے ایام کو نبھاؤ] (۱)

سندھ اور مرکز کے درمیان ان آزادانہ اور باہمی تعلقات کے علاوہ سندھ کے عرب گورنروں نے بھی ادبی ذوق کو مہمیز دی، ان کی معرفت کچھ عرب شعراء (مثلاً مطیع بن ایاس اور الصمۃ بن عبداللہ القشیر ی) سندھ میں آئے۔ سندھی النسل شعراء (مثلاً ابو عطاء سندھی، عیاض سندھی اور ابو الضلع سندھی) اپنی اعلیٰ عربی شاعری کی وجہ سے اسلامی ممالک میں مشہور ہوئے۔ چونکہ سندھ میں عربی کے ساتھ ساتھ سندھی زبان کو بھی ترقی دی گئی تھی اس وجہ سے سندھ میں سندھی زبان کے بھی شاعر پیدا ہوئے اور ممکن ہے کہ ان میں سے کچھ شعراء باہر بھی گئے ہوں۔ سندھ میں ان شعراء کے کارناموں کے متعلق کوئی احوال نہیں ملتا البتہ ایک حوالہ کی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ غالباً سندھی زبان کا ایک شاعر جس نے سندھی زبان میں بغداد کے برمکی وزراء کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا اور وہ سندھ کے عرب گورنر کی معرفت و معاونت سے بغداد پہنچا، جس کا ذکر عربی کے ایک قدیم عالم نے اپنی تصنیف میں کیا ہے۔ امام حافظ ابو حاتم محمد بن حبان البستی متوفی ۳۵۴ھ نے اپنی کتاب "روضۃ العقلاء ونزہۃ الفضلاء" میں لکھا ہے کہ: "میں نے ابراہیم سے سنا کہ اسے ابن ابی القعقاع نے کہا کہ مجھ سے ابو ہذیل نے بیان کیا کہ میں یحیٰ بن خالد برمکی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا کہ ایک ہندی شخص اپنے ترجمان کے ساتھ محفل میں آیا؛ اس ترجمان نے یحیٰ سے کہا کہ یہ شخص شاعر ہے اور اس نے آپ کا قصیدہ لکھا ہے۔ یحیٰ نے کہا کہ ہاں سنائیے! جس پر اس شخص نے کہا:

ارہ اصرہ ککرا - کی کِرَہِ مَنُدرہ

یحیٰ نے مترجم سے پوچھا کہ کیا کہتا ہے؟ مترجم نے کہا کہ یہ کہہ رہا ہے کہ:

اذا المکارم فی آفاقنا ذکرت

فانما بك فیها یضرب المثل

[جب بھی ہمارے ہاں اچھائیوں اور نیکیوں کا ذکر ہوتا ہے تو ان میں آپ کی مثال دی جاتی ہے]

جس پر یحیٰ نے اسے ایک ہزار دینار بطور انعام دینے کا حکم دیا (۲)

مذکورہ بالا روایت میں اس شاعر کو ہندی شخص (رجل ہندی) کہا گیا ہے، تاہم اس سے

---

(۱) کتاب الظروف والظرفاء، از ابو الطیب الوشاء، ص ۱۴۸

(۲) "روضۃ العقلاء و نزہۃ الفضلاء" مطبع کردستان العلمیہ، مصر ۱۳۲۸ھ، ص ۲۱۵ اور مطبع مصطفیٰ البابی الحلبی، مصر، ۱۳۷۴ھ/۱۹۵۵ء، ص ۲۱۴

مراد 'سندھی' ہی ہے کیونکہ اس قدیم عرب دور میں 'سندھی' کو 'ہندی' بھی کہا جاتا تھا یہ اس لئے کہ سندھ اور ہند ایک ہی ملک کے دو علاقے تھے؛ ایسی کئی مثالیں موجود ہیں جن میں بعض مصنفین نے جب بھی 'ہندی' لکھا تو اس سے ان کی مراد (دو دلیلوں کی بنیاد پر) 'سندھی' ثابت ہوتی ہے۔ خوش قسمتی سے اس بات کا ذکر ''مجمل التواریخ والقصص'' کے مصنف نے بھی کیا ہے، جس میں اس نے اس شخص کو واضح طور پر ''سرزمین سندھ کا شاعر'' بتایا ہے؛ البتہ اس مصنف کے بقول اس شاعر نے یہ شعر یحیٰ کے بیٹے فضل کی تعریف میں کہا، یہ مصنف کہتا ہے کہ: سرزمینِ سندھ کا ایک شخص اس (فضل) کے حضور حاضر ہوا اور اپنی زبان میں ایک شعر پڑھ کر سنایا جو یہ تھا:

اره برهُ کنکره کراکری مندره

فضل نے پوچھا کہ یہ کیا کہہ رہا ہے؟ ترجمان نے اسے جواب دیا کہ یہ کہہ رہا ہے:

اذا المکارم فی آفاقنا ذکرت

فانما بك فیها یضرب المثل

جس پر فضل نے خوش ہو کر اسے ایک ہزار دینار، ایک قیمتی جوڑا کپڑوں کا، اونٹ اور دیگر تحائف دیے اور ترجمان کو بھی پانچ سو دینار عطا کیے اور کہا کہ: ہم نے اس زبان میں (یعنی اس زبان کا) ایسا دوسرا نہیں دیکھا(۱)۔

بعد میں بارہویں صدی کے ایک اور سیاح ابن نورالدین مکی نے اپنی کتاب ''نزہتہ المجلیس'' میں یہ شعر حضرت بلالؓ کی طرف منسوب کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حضرت بلالؓ نے یہ حبشی زبان کا شعر نبی پاک ﷺ کی تعریف میں کہا ہے(۲)۔ ابن نورالدین ۱۱۳۳ھ کے لگ بھگ ہندوستان کے سفر پر آیا تھا اور وہ بالکل آخری دور کا مصنف ہے، اس وجہ سے قدیم عربی مصنفین کے مقابلے میں اس کی رائے کو اہمیت نہیں دی جاسکتی۔

افسوس کہ اس تاریخی شعر کے الفاظ کی موجودہ صورت ایسی ہے کہ اس سے اس کی اصل

---

(۱) مجمل التواریخ والقصص، مطبوعہ ایران، ص۳۴۳

(۲) ابن نورالدین مکی: ''نزہتہ المجلیس'' جلد اول، ص۳۵۹۔ ابن نورالدین کی یہ رائے غالباً اس سطحی خیال پر ہے کہ یہ الفاظ حضرت بلال کی مرقد کی دیوار پر لکھے ہوئے ہیں، اس لئے یہ شعر انہی کا کہا ہوا ہوگا، حالانکہ حضرت بلال کا مقبرہ (دمشق میں) قدرے پچھلے عہد کا بنا ہوا ہے جس پر یہ عبارت بعد میں لکھی گئی۔

عبارت اور مطلب صحیح طرح معلوم نہیں ہوسکتے۔(ا) یہ شعر برمکی امراء کی تعریف میں کہا گیا۔ چونکہ ۱۸۷ھ میں ہارون الرشید نے جعفر بن یحییٰ برمکی کو قتل کروادیا اور برمکی خاندان کا خاتمہ کردیا، جس سے ظاہر ہے کہ یہ شعر ۱۸۷ھ سے پہلے پڑھا اور قلمبند کیا گیا ہوگا۔ اتنی قدیم تحریر کی اصل صورت مٹ جانے کا امکان ہے۔ کیونکہ پہلی بات تو یہ ہے کہ جس نے یہ شعر قلمبند کیا اس نے اس شعر کا صحیح تلفظ کس قدر لکھا؟ وہ معلوم نہیں، اس کے بعد مذکورہ بالا دونوں مصنفین نے جس رسم الخط میں یہ شعر اپنی کتاب کے اصل نسخوں میں درج کیا وہ بھی معلوم نہیں؛ ہمارے پاس اس شعر کا یہی رسم الخط موجود ہے جو کہ کتابت و طباعت کی غلطیوں کے بعد بچ گیا ہے: اس لئے بالفرض وہ اوائلی الفاظ ہماری سمجھ میں آنے والے ہوتے تو بھی آج تبدیل شدہ صورت میں ہم انہیں نہیں سمجھ سکتے۔

اس کے باوجود بھی یہ قدیم حوالہ سندھی زبان کے لئے ایک قیمتی سرمایہ ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ کہ یہ سندھی زبان کا عربی رسم الخط میں اولین تحریری نمونہ ہے۔ دوسرا یہ کہ اس حوالہ سے ثابت ہو رہا ہے کہ ۱۸۷ھ تک، یعنی سندھ میں عرب دور حکومت کی ابتداء (۹۳ھ) سے تقریباً ایک سو برس کے اندر سندھی زبان میں اس قدر ادبی صلاحیت پیدا ہوچکی تھی کہ اس میں ایسی بہترین شاعری ہوسکتی تھی، جس میں مرکزی سلطنت کے وزیر کی تعریف میں قصیدہ منظوم ہوا، تیسرا یہ کہ یہ حوالہ اس وقت کے سندھی ادبی ذوق کا بھی گواہ ہے: اگر یہ شاعر سندھ کے کسی گورنر کی مدد اور معاونت سے بغداد پہنچا، تو اس سے عرب گورنروں کی سندھی ادب کے ساتھ دلچسپی کا بھی ثبوت بہم پہنچتا ہے؛ شاعر کو جو انعام ملا وہ برمکیوں کی مثالی سخاوت کے علاوہ ان کی طرف سے سندھی زبان کی قدردانی کی بھی گواہی دیتا ہے؛ نیز یہ حوالہ اس دور کے عرب علماء و ادباء کی سندھی زبان کے ساتھ علمی دلچسپی کو ثابت کرتا ہے، جو انہوں نے اس شعر کو سندھی زبان کے اصل الفاظ میں قلمبند کرکے محفوظ کرنے کی کوشش کی۔

نتائج: رائے خاندان، برہمن خاندان اور عرب - اسلامی دورِ حکومت میں سندھ کی مسلسل سیاسی وحدت کی وجہ سے "سندھ کی زبانوں" میں مزید مرکزیت پیدا ہوئی اور ایک عام فہم زبان کی نمو ہوئی۔ عرب دورِ حکومت میں زبان کی نفسیاتی کیفیت تبدیل ہوئی، زبان کے تمدنی سرمائے میں اضافہ ہوا اور زبان کی ترتیب، رسم الخط اور صرف ونحو پر اثر پڑا۔ سندھی زبان عربی رسم الخط میں لکھی جانے لگی اور یہ رسم الخط مزید عام رائج ہونے لگا، اگرچہ اس دور میں دوسرے مقامی رسم الخط بھی رائج رہے۔

(ا) ڈاکٹر عبدالجبار جونیجو نے اس شعر کے متعلق لکھا ہے کہ: "میری تحقیق کے مطابق شاعر کا نام 'مندھرہ' تھا، یا وہ ذات کا 'مندھرہ' تھا۔ اس نے خود ثنائی میں کچھ سطریں لکھی ہوں گی یا کسی 'مندھرہ' حاکم یا رئیس کی تعریف میں یہ شعر اس کے پاس پہلے سے موجود ہوگا، بغداد میں آنے کے بعد وہاں صورتحال کو منہ دینے کے لیئے ممکن ہے کہ اس نے یہی شعر کہہ دیا ہو۔
"مجمل التواریخ" میں درج شعر کے تلفظ کو میں نے سندھی میں یوں پڑھا ہے:

اهڙا ہڙا کو [نہ] ڪري، ڪہ ڪري منڌرو

یعنی ایسی مہربانی کوئی بھی نہیں کر سکے گا، جیسی 'مندھرہ' کرتا ہے۔ اس تلفظ کو فی الحال ظنی تلفظ کہا جاسکتا ہے، لیکن عالم اور ادیب حضرات اس پر غور کرسکتے ہیں۔ خاص طور پر اس لحاظ سے کہ سندھی کو عربی میں لکھتے وقت رسم الخط تبدیل ہوجاتا ہے۔
دیکھیئے: سندھی ادب جی مختصر تاریخ، ص: ۳۹، مطبوعہ گلشن پبلیکیشن، حیدرآباد، طبع چہارم، ۲۰۰۴ء (مترجم)

باب سوم

سندھی زبان کی انفرادیت اور بین الاقوامی حیثیت کا مسلّم ہونا

(۹۵۰-۱۰۵۰ء)

تاریخی لحاظ سے یہ دور، اس سے پہلے کے دور کا تسلسل اور اس کی آخری کڑی ہے۔ عرب دورِ حکومت کے ابتدائی تقریباً اڑھائی سو برس (۷۱۲-۹۵۰ء) میں بڑھتے ہوئے سیاسی، دینی اور تجارتی روابط کے باعث سندھی کے مقامی لہجوں میں مزید مرکزیت پیدا ہوئی اور ایک عام فہم سندھی زبان کی ''تحریری وحدت'' میں اضافہ ہوا اور مختلف مقامی تحریروں کے بجائے پورے ملک میں ایک جیسا عربی رسم الخط رائج ہوا۔

سنہ ۱۱۲-۱۱۶ھ (۷۳۰-۷۳۴ء) کے عرصہ میں دار الحکومت شہر منصورہ کی بنیاد پڑی (۱) اور یہ شہر بغداد سے بھی قبل علمی تحقیق کا مرکز بنا، البیرونی نے اپنی ''کتاب الہند'' میں ایک اہم حوالہ دیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہجری سن ۱۱۷ کے صفر مہینے میں اور سندھی سال ۱۰۹ کے چیت مہینے میں ہند کے عالم برہمگپت کی نجوم پر لکھی ہوئی کتاب ''کھنڈ کھادیک'' کا عربی زبان میں ترجمہ ہوا جو ''اَرکَنڈ'' کے نام سے مشہور ہوا۔ (۲)

مختلف حوالہ جات اور حقائق سے ظاہر ہے کہ اس دور میں علم، ادب، شعر، موسیقی، ہنر اور حرفت کی قدردانی ہوئی۔ مرکزی حلقوں کی ہدایت اور مقامی علمی ذوق کی وجہ سے، سندھ کے بیدار مغز عمال اور امراء نے سندھ کو تعلیم اور تحقیق کا مرکز بنایا۔ مشہور محقق مسعودی نے سنہ ۳۰۰ھ/۹۱۲ء کے لگ بھگ سندھ میں آکر سندھو ندی کے دھارے کی جغرافیائی تحقیق کی اور الجاحظ کے اس نظریہ کو رد کیا کہ سندھو ندی اور نیل ندی کا منبع ایک ہے۔ (۳) اس کے علاوہ مسعودی نے سندھ

---

(۱) سنہ ۱۱۶ھ/۷۳۴ء میں منصورہ شہر میں ڈھلا ہوا ایک سکہ برٹش میوزیم میں موجود ہے، جس سے ظاہر ہے کہ اس سال تک منصورہ دار الحکومت بن چکا تھا۔

(۲) دیکھیے! ص ۵۶-۵۷، نیز البیرونی کی ''کتاب الہند'' عربی متن (طبع حیدرآباد دکن سال ۱۳۷۷ھ/۱۹۵۸ء) ص: ۳۸۳ اور کتاب الہند کا انگریزی ترجمہ (ایڈورڈ سخاؤ، لندن، ۱۹۱۰ء) جلد دوم، ص ۴۸

(۳) مسعودی: ''کتاب التنبیہ والاشراف'' مطبوعہ لائیڈن، ۱۸۹۳ء، ص ۵۴

کی موسیقی اور سازوں کے بارے میں بھی تحقیق کی جسے اس نے اپنی ''کتاب الزلف'' میں درج کیا۔ (۱) اس دور میں مقامی زبانوں کے مطالعہ کی بطور خاص ہمت افزائی کی گئی۔ سرزمینِ سندھ میں نہ صرف عربی و سندھی کے مطالعہ کے لیے درسگاہیں تھیں بلکہ سنسکرت اور ہندی زبانوں کے مطالعے کے لیے بھی کچھ خاص ادارے تھے۔ اس کے علاوہ سرکاری طور پر مقامی زبانوں کے ترجمان مقرر ہوئے۔ سندھ میں عباسی دور کے مشہور گورنر جنید بن عبدالرحمٰن کا ترجمان ''بکیر بن ماہان'' ایک عالم شخص تھا۔ (۲) اس دور میں بغداد کی شاہی ''سائنس اکیڈمی'' (بیت الحکمۃ) میں مختلف سائنسز اور فلسفوں کا مطالعہ بعد میں شروع ہوا، اور اس سے بھی پہلے سنسکرت کی کتابیں سندھ کے علماء کے ذریعے جمع کی گئیں اور ان کا مطالعہ کیا گیا۔

چوتھی صدی ہجری (دسویں صدی عیسوی) کے درمیانی عرصہ کے لگ بھگ، یعنی عرب حکومت کے قیام کے بعد دو اڑھائی سو سالہ عرصے میں، سندھی اور عربی دونوں زبانوں کو اہمیت حاصل تھی۔ اس دور میں جب عرب جغرافیہ دان اور سیاح سندھ میں آئے تو انہوں نے عربی اور سندھی دونوں زبانیں یہاں عام رائج دیکھیں، یعنی لوگ دونوں زبانیں بولتے تھے۔ جغرافیہ کے دو محققین، اصطخری اور ابن حوقل، جنہوں نے ۳۴۵ھ/۹۵۶ء کے لگ بھگ سندھ اور بلوچستان میں آ کر تحقیق کی تھی، انہوں نے یہاں کی زبانوں کے بارے میں آنکھوں دیکھی معلومات قلمبند کیں کہ: منصورہ (موجودہ سندھ) ملتان اور ان کے قرب و جوار کے علاقوں کی زبان عربی اور سندھی ہے، اور مکران (بلوچستان) کے باشندوں کی زبان ''فارسی اور مکری'' (بلوچی) ہے (۳)۔ بعد میں بشاری المقدسی نے بھی بیان کیا ہے کہ: دیبل کے علاقے (لاڑ/جنوبی سندھ) کی زبان سندھی اور عربی ہے اور پنجگور علاقے کی زبان بلوصی (بلوچی) ہے(۴)۔

مندرجہ بالا محققین سے تقریباً تیس بتیس برس بعد سنہ ۳۷۷ھ/۹۸۷ء میں بغداد کے مشہور دانشور اور کتب فروش ابن الندیم نے مختلف کتابوں کے مطالعہ (اور غالباً بغداد میں رہائش

---

(۱) مسعودی: کتاب مروج الذہب، طبع پیرس، جلد دوم، ص۳۲۱-۳۲۲ ۔
(۲) تاریخ طبری، طبع یورپ، جلد دوم، ص۱۷۲۶
(۳) اصطخری: کتاب ''سالک الممالک'' مطبوعہ لائیڈن، ۱۸۷۰ء، ص۱۷۷؛ ابن حوقل: ''کتاب المسالک والممالک'' مطبوعہ لائیڈن، ۱۸۷۲ء، ص۲۳۲ (اصل الفاظ یوں ہیں: لسان اہل المنصورۃ والملتان ونواحیھا العربیۃ والسندیۃ، ولسان اہل مکران الفارسیۃ والمکریۃ۔)۔
(۴) دیبل علاقے کے بارے میں بشاری کے الفاظ یہ ہیں: ''کلامھم سندی وعربی'' اور پنجگور کے بارے میں: ''لسانھم بلوصی''۔ دیکھیے: کتاب احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم، مطبوعہ لائیڈن، ص۴۷۹

60 -الف

Dā mo

da ra Brā

hma na

Dā mo

da ra

بھنبھور کے قدیم آثار سے پائی گئی ٹھیکریوں پر لکھے ہوئے الفاظ

60-ب

"کتاب الفہرست" میں دیئے گئے اعداد کی صورت

(دیکھئے صفحہ 61)

پذیر اور وہاں آنے والے سندھی علماء سے حاصل شدہ معلومات) کی بنیاد پر اہلِ سندھ کی زبان اور رسم الخط کے بارے میں مزید تفصیلی معلومات جمع کیں۔ وہ اپنی مشہور محققانہ تصنیف ''کتاب الفہرست'' میں لکھتا ہے کہ:

اہلِ سندھ کی مختلف زبانیں (لغات) اور مختلف مذاہب ہیں ان کے کئی قسم کے رسم الخط ہیں، ایک شخص، جس نے ان کا ملک دیکھا ہے، مجھے بتایا کہ ان کے تقریباً ایک سو رسم الخط ہیں، اس نے یہ بھی بتایا کہ اہلِ سندھ نو (۹) تک ہندسے الگ الگ کر کے لکھتے ہیں؛ اس کے بعد دہائیوں کو ہر ہندسے کے نیچے ایک صفر دے کر لکھتے ہیں (یعنی ا کے نیچے صفر، تو دس ہوئے، ۲ کے نیچے صفر، تو بیس ہوئے) سو کے اعداد کے لیے ہر ہندسے کے نیچے دو صفر، اور اسی طرح ہزار کا عدد ہر ہندسے کے نیچے تین صفر دے کر لکھتے ہیں(۱)۔

ابن الندیم کا یہ حوالہ غور طلب ہے کہ ''سندھ میں کئی مقامی رسم الخط رائج ہیں'' غالباً زمانۂ قبل از اسلام میں سندھ کے مختلف علاقوں یا شہروں میں الگ الگ رسم الخط استعمال ہوتے تھے، جو چوتھی صدی ہجری کے آخر تک رائج رہے، حالانکہ تمام ملک میں اس وقت عربی رسم الخط رائج ہو چکا تھا۔ سندھ کے یہ مختلف رسم الخط ٹالپور امراء کے دور تک رائج رہے، کہ اس وقت بھی سندھ کے بعض شہروں میں الگ الگ قسم کے ''مہاجنوں یا ساہوکاروں کے لفظ (ہندسے)'' رائج تھے، جنہیں کیپٹن اسٹک (Stack) نے ۱۸۵۰ء میں اپنی تحریر کردہ گرامر میں شایع کیا ہے۔

اصطخری اور ابن حوقل کے حوالہ جات، کہ سندھ سے ملتان تک سندھی زبان بولی جاتی ہے اور ابن الندیم کا حوالہ کہ سندھی زبان کے الگ الگ محاورے اور رسم الخط ہیں، ان تمام حوالہ جات کی تصدیق تقریباً ساٹھ سال بعد محقق البیرونی کی مشہور تصنیف ''کتاب الہند'' سے بھی ہوتی ہے، جو اس نے ''ہندوؤں کی تہذیب و ثقافت'' کے متعلق لکھی تھی، وہ خود برصغیر ہند میں آیا اور ۱۰۱۷ سے ۱۰۳۰ء، پشاور سے ملتان تک اس موضوع پر تحقیق کرتا رہا، بیرونی نے یہ کتاب عربی میں لکھی، لیکن ایک محقق کی حیثیت سے اس نے جا بجا اصل سنسکرت الفاظ اور جملے اور اس وقت رائج مقامی زبانوں کے اسم اور الفاظ درج کیے ہیں، اور اس کے علاوہ کچھ دیگر مقامی معلومات بھی درج کی ہیں:

(الف) ایک جگہ پر اس نے گنتی کے ہندسے اس طرح دیئے ہیں (۲)

عدد قطاری البیرونی	عدد قطاری موجودہ سندھی	عدد قطاری البیرونی	عدد قطاری موجودہ سندھی

(۱) ابن الندیم: ''کتاب الفہرست'' مطبوعہ مصر، ۱۳۴۸ھ، ص ۲۷

(۲) ''کتاب فی تحقیق ماللھند'' عربی متن، طبع یورپ، ص ۲۴۵، طبع حیدرآباد، ص ۵۰۲، طبع یورپ کے عربی متن پر ڈاکٹر ''سخاؤ'' کا انگریزی مقدمہ ص ۱۴ (XXIV)

برتہ	برکھ، برکت (۱)	نوین	نَوَ
بیہ	بہ	دہین	ڈھ
تریہ	ٽي	یاھی	یارھن
چوتؔ	چار	دواہی	ٻارھن
پنچی	ڀنج	(تروھی) ترھی	تیرھن
ست	ڇھ	چودھی	چوڏھن
ستین	ست	ڀنچاھي	ڀندرھن
اٹین	اٺ		

(ب) بارہ مہینوں کے نام اس نے اس طرح لکھے ہیں (۲):

مہینے کا نام البیرونی	مہینے کا نام سندھی	مہینے کا نام البیرونی	مہینے کا نام سندھی
۱۔ چیتر	چیٹر (چیت)	۷۔ اشوج	اسو
۲۔ بیشاک	ویساک (بیساکھ)	۸۔ کارتک	ڪتي (کتی)
۳۔ جیرت	جیٹ (جیٹھ)	۹۔ منکھر	منگِھرُ، ناھري (مگھر)
۴۔ آشار	آکاڑ (آکھاڑ)	۱۰۔ ہوش	ہوھ (پوہ/پوس)
۵۔ شرابن	ساوڻ (ساون)	۱۱۔ ماگ	مانگھ (ماگھ)
۶۔ بھادرو	بدرو (بھادوں)	۱۲۔ ہاگن	ڦڳڻ (پھاگن)

(۱) ''برک'' (برکھ) یا ''برکت'' بمعنی 'ایک'۔ بَیراجی نہریں بننے (۱۹۳۲ء) سے پہلے جب موسمی نہروں کے پانی پر چرخہ یا رہٹ چڑھاتے تھے اور جوار اور باجرہ کی فصل بہت ہوتی تھی، اس وقت اسے تولنے کے بجائے ایک قسم کے پیمانہ (ٹویو) کے ساتھ بھرتے تھے۔ ضلع سانگھڑ کے علاقے میں کھلیان بھرنے والے کو 'ایک' کہنے کے بجائے 'برکھت' کی آواز لگاتے ہوئے ہم نے خود سُنا۔

(۲) ''کتاب الہند'' عربی متن، طبع یورپ، ص ۱۰۳، ۱۰۶-۱۰۷، طبع حیدرآباد دکن، ص ۱۷۵

(ج) ہفتے کے دنوں کے نام اس طرح قلم بند کئے ہیں(۱):

دن کا نام البیرونی	دن کا نام سندھی	دن کا نام البیرونی	دن کا نام سندھی
آدتِ بار	آرت وار (اتوار)	برھسپت وار	وسپت وار (جمعرات)
سوم بار	سومار (پیر)	شکر بار	شکروار (جمعہ)
منگل بار	منگل وار (منگل)	شنیشچر بار	چنچر (ہفتہ)
بُد بار	بِدر وار (بدھ)		

(د) اس دور کے بعض الفاظ بھی دیئے ہیں جیسے کہ:

البیرونی کے وقت میں	موجودہ سندھی	البیرونی کے وقت میں	موجودہ سندھی
اکل	آگر (انگلی)	یومَ	یون (زمین)
توھر	توھر (تھوہر)	ہرھر	ہھر (پہر)
جِنْجُوَا	جنیو (زُنار)	برلو	پِرُون، پلھڻ (سوسمار)
پاتال	پاتال (تحت الثریٰ)	مکر	منگر (بڑی مچھلی، وھیل)

مذکورہ بالا مثالوں پر اگر غور کیا جائے تو محقق ابو ریحان البیرونی نے خالص سنسکرت الفاظ کے علاوہ، جو دوسرے عام مروج علاقائی نام اور الفاظ استعمال کئے ہیں، ان میں سے اکثر موجودہ سندھی زبان سے ملتے جلتے ہیں۔ ایڈورڈ سخاؤ (Sachao)، جس نے "کتاب الہند" (عربی متن) کو مرتب کیا ہے، اس نے اپنے مقدمہ میں البیرونی کے استعمال کردہ علاقائی الفاظ خصوصاً گنتی کے اعداد کے بارے میں لکھا ہے کہ: یہ جس بھی زبان کے ہیں وہ زبان بنسبت دیگر جدید ہند-آریائی زبانوں کے، سندھی سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے اور اس سے ملتی جلتی ہے(۲)۔ البیرونی گنتی کے اعداد کو "برقہ" "بیہ" "تریہ" لکھتا ہے یعنی کہ "برکت" "دو" "تین"۔

سندھ میں اب تک عام دستور ہے کہ جب کھلیان کی ماپ تول کرتے ہیں یا اور کوئی چیز تولتے ہیں تو پہلا پیمانہ گنتے ہوئے "ایک" کہنے کے بجائے "برکت" کہتے ہیں غالباً یہ دعائیہ

---

(۱) "کتاب الہند" عربی متن، طبع یورپ، ص۱۰۴، طبع حیدرآباد دکن، ص۱۷۱

(۲) "کتاب فی تحقیق ماللہند" کا انگریزی مقدمہ، ص۲۵،

"The numerals as well as great many other words seem to show, as far as I have been able to compare Indian dialects, that the vernacular of Alberuni is more nearly related to Sindhi than to any other of modern Neo-Aryan languages of India." (Edward C. Sachao: Introduction to the Arabic Text of Alberoni's India, P.XXXV)

اصطلاح ہے، یعنی کہ اللہ کرے کہ برکت ہو! البیرونی نے جو ہفتے کے دنوں کے نام، سال کے مہینوں کے نام یا دیگر عام الفاظ دیئے ہیں ان پر غور کرنے سے بھی ان میں موجودہ سندھی ناموں کا عکس نمایاں نظر آتا ہے۔ اس سے گمان ہوتا ہے کہ آج سے ساڑھے نو سو برس پہلے جب البیرونی نے اپنے وقت میں (۱۰۲۰-۱۰۳۰ء) یہ الفاظ ان تلفظات کے ساتھ لکھے اس وقت سندھی زبان کا دائرہ ملتان تک وسیع ہو چکا تھا۔ البیرونی ملتان میں رہا اور غالباً سندھ میں بھی آیا(۱) اور اس نے یہ الفاظ ملتان اور سندھ میں بولتے ہوئے سنے۔ ہم ابن حوقل کا حوالہ پہلے ہی دے آئے ہیں کہ: منصورہ اور ملتان کی زبان سندھی اور عربی ہے(۲)

ابن الندیم کا یہ بیان کہ سندھ میں کئی رسم الخط رائج ہیں، اس کی تصدیق بیرونی کی تحقیق سے بھی ہوتی ہے، البیرونی لکھتا ہے کہ:

''مالوہ میں ''ناگری'' الف ب رائج ہے، اس کے بعد ''اردناگری'' (ــِ ''ادھ ناگری'' یعنی شکستہ خطِ ناگری) ''بھاٹیہ'' اور سندھ کے کچھ حصوں میں رائج ہے، جنوب سندھ میں سمندری کنارے کے متصل ''ملقشو'' علاقے میں ''ملقاری'' الف ب رائج ہے؛ اور بہمنوا یعنی منصورہ میں ''سیندب'' رائج ہے'' (۳)

اپنے اس بیان میں البیرونی نے کم از کم تین رسم الخط کا ذکر کیا ہے، جو ۱۰۲۰-۱۰۳۰ء کے عرصہ میں سندھ میں رائج تھے۔ ''بھاٹیہ'' (جیسلمیر) اور سندھ کے کچھ حصوں، یعنی جیسلمیر سرحد سے متصل مشرقی علاقوں میں ''شکستہ خطِ ناگری'' رائج تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً موجودہ سکھر، خیر پور، سانگھڑ اور تھر پارکر اضلاع کے مشرقی علاقوں میں شکستہ خطِ ناگری رائج تھا، سمندری کنارے، یعنی موجودہ ٹھٹہ ضلع کے جنوبی علاقے میں ''ملقاری'' رسم الخط رائج تھا۔ تاریخی اعتبار سے دریا سے مغرب کی طرف ''میرپور ساکرو'' کے علاقے میں قدیم دور سے ''نگامرہ'' قوم آباد تھی اور ممکن ہے کہ یہ انہی کے رسم الخط نگامرہ کی طرف اشارہ ہو۔ وسطِ سندھ کے علاقے اور دارالحکومت ''بہمنوا'' یا منصورہ میں ''سیندب'' یعنی ''سیندھوَ'' یا سندھی رسم الخط رائج تھا، یہ ''عربی-سندھی'' رسم الخط تھا جو پہلے پہل منصورہ کے علاقے میں استعمال ہوا اور وہاں سے رفتہ رفتہ تمام سندھ میں رائج ہوا۔

''عربی-سندھی'' رسم الخط کا قدیم ترین نمونہ خود محقق بیرونی کی تحریروں میں موجود ہے۔ وہ ''ملقاری'' کے لفظ میں 'ق' حرف لائے ہیں، 'منگر' (منگر) اور 'انگل' (یعنی انگل) کے الفاظ میں ''گ'' کے تلفظ کے لئے 'ک' حرف لائے ہیں۔ یعنی کہ خود محقق بیرونی نے سندھ کے مقامی تلفظات کو ادا کرنے کیلئے حروف پر نقاط لگا کر نئے حرف نکالے۔ اس سے ظاہر ہے کہ 'سندھی-عربی رسم الخط' جو ہم تک پہنچا ہے، اس کے تحریراً تاریخی آثار ۱۰۲۵-۱۰۳۰ء کے عرصہ میں ملتے ہیں۔

---

(۱) دیکھئے: ''غرۃ الزیجات'' پر راقم کا انگریزی مقدمہ، ص ۳۹-۴۳

(۲) سندھی اور سرائیکی آپس میں بہنیں ہیں اور ان کے الفاظ ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔

(۳) ''کتاب فی تحقیق ما للہند'' عربی متن، طبع یورپ، ص ۸۲، طبع حیدرآباد دکن، ص ۱۲۵، انگریزی ترجمہ (ایڈورڈ سخاؤ) جلد اول، ص ۱۷۳

سندھ کی لسانی انفرادیت اور بین الاقوامی حیثیت کا مسلّم ہونا

عرب-اسلامی دور میں، نئے علمی، ثقافتی، سماجی اور سیاسی ماحول کے زیرِ اثر، سندھی اور عربی کا آپس میں گہرے رشتہ اور عمل و ردِعمل کا آغاز ہوا، جس سے سندھی زبان کی لسانی انفرادیت مستحکم ہوئی نیز وہ بین الاقوامی سطح پر تسلیم کی گئی۔ اس انفرادی حیثیت اور اہمیت کی وجہ سے سندھی زبان کے بارے میں بین الاقوامی سطح پر علمی تحقیق شروع ہوئی جس میں جاحظ، ابن حوقل اور دیگر علماء نے سندھی زبان کے متعلق حوالہ جات قلمبند کیئے۔ چوتھی صدی ہجری کے دوسرے نصف میں اسحاق ابن الندیم نے اس تحقیق میں قدم آگے بڑھایا اور اسی دور میں بشر بن عبدالوھاب الفزاری نے سندھی لغت کا مزید گہرا مطالعہ کیا۔ اس کے بعد پانچویں صدی ہجری کے نصفِ اول میں محقق بیرونی نے سندھ اور سندھی زبان کے بارے میں وسیع پیانے پر معلومات قلمبند کیں۔

دوسری اور تیسری صدی سے عرب علماء نے علمِ طب پر تحقیق کا آغاز کیا اور دواؤں میں استعمال ہونے والی معدنیات، جڑی بوٹیوں اور سامانِ پنسار کے بارے میں کتابیں لکھی جانے لگیں۔ مختلف ممالک میں جڑی بوٹیوں اور دواؤں کو سمجھنے اور پہچاننے کے لئے ضروری تھا کہ ان کے نام دوسری ایسی زبانوں میں بھی دیے جائیں، جن کی اس دور میں بین الاقوامی حیثیت مسلّم ہو، یا جن میں جڑی بوٹیوں اور پنسار (Materia Medica) کی پہچان کا علم کافی ترقی کرچکا ہو۔ اس سلسلے میں، قدیم زبانوں میں سے یونانی، رومی اور سریانی اور رائج زبانوں میں سے عربی اور فارسی، اور 'ہند' کی زبانوں میں سے سندھی اور ہندی کی بین الاقوامی حیثیت تسلیم کرتے ہوئے ان زبانوں میں، ادویات میں استعمال ہونے والی معدنیات اور جڑی بوٹیوں کے نام دئے گئے۔ 'سندھی' سے مراد خاص سندھی زبان اور 'ہندی' سے مراد (سندھی کے علاوہ) ہندوستان کی دیگر جملہ لغات تھیں۔ سندھی نہ صرف اس وقت بین الاقوامی حیثیت رکھتی تھی بلکہ سندھ میں اسبابِ پنسار کی معلومات بڑی ترقی کرچکی تھی؛ سندھ میں اسبابِ پنسار کی تجارت اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ ہندوستان کے دیگر علاقوں کی جڑی بوٹیاں بھی سندھ ہی سے مغرب کی طرف دیگر ممالک میں بھیجی جاتی تھیں (۱)۔ اس لئے دیگر معاصر زبانوں کے ساتھ سندھی زبان میں جڑی بوٹیوں اور اسبابِ پنسار کے نام دینا ضروری سمجھا گیا۔

---

(۱) اس کی گواہی بیرونی کی ''کتاب الصیدنہ'' سے ملتی ہے، جس میں بتایا گیا ہے کہ 'تربذ' نامی چیز کو ہندستانی لوگ ''ترنج'' کہتے ہیں جس کی سب سے عمدہ قسم سفیدی مائل رنگت والی ہے، جو نہلواڑہ (گجرات کا تاریخی شہر انہلواڑ) کے بعد سندھ سے (عرب-ایران کی طرف) آتی ہے۔ دیکھئے کتاب الصیدنہ 'تربذ' کے بیان کے تحت۔

یہ نہیں کہا جاسکتا کہ سب سے پہلے اسبابِ پنسار کے نام سندھی اور ہندی میں کب دئے گئے؟ غالباً یہ سلسلہ دوسری صدی ہجری میں سندھ میں منصورہ کے علماء سے شروع ہوا اور بعد میں بغداد تک پہنچا۔ ابو حنیفہ دینوری نے اپنی ''کتاب النبات'' میں سندھ کے درخت کندني (کنڈلی یا کریر) کے بارے میں لکھا جس سے سرخ رنگ حاصل کیا جاتا تھا (۱)۔ محمد بن زکریا رازی نے اپنی تصنیف ''کتاب الصیدنۃ'' میں بعض ایسے اسبابِ پنسار کے نام دئے جو سندھ میں بھی موجود تھے اور سندھ ہی سے باہر جاتے تھے۔ چوتھی صدی ہجری میں بشر بن عبدالوہاب الفزاری نے اپنی کتاب ''تفاسیر الادویہ'' میں اسبابِ پنسار اور دواؤں کے سندھی اور ہندی نام مزید تفصیل کے ساتھ درج کئے، غالباً وہ سندھ آیا اور رہا اور یہاں ہی پر اس نے اہلِ سندھ سے سندھ کی جڑی بوٹیوں اور دواؤں کے بارے میں تحقیق کی (۲)۔

اس کے بعد محقق البیرونی نے سنہ۱۰۵۱/۱۰۵۰ء میں اپنی ''کتاب الصیدنۃ فی الطب'' لکھی (۳) جس میں اس نے جڑی بوٹیوں اور دواؤں کے ناموں کو یونانی، سریانی، عربی، فارسی، سندھی، ہندی اور دیگر بعض مقامی زبانوں میں قلمبند کیا اور ان کے بارے میں مزید تفصیلات بھی درج کیں۔

البیرونی نے اس موضوع پر اس سے پہلے لکھی گئی تمام اہم اور مستند کتابوں سے استفادہ کیا اور اس نے خود سندھ اور ہند میں آکر مزید تحقیق کی۔ ہماری رائے کے مطابق البیرونی سندھ کے شمالی علاقہ ملتان اور نشیبی جنوبی علاقہ منصورہ (موجودہ سندھ) میں آیا (۴) اور اس نے دیگر مطالعہ کے ساتھ ساتھ سندھ کی جڑی بوٹیوں کے بارے میں بھی معلومات حاصل کیں۔ بیرونی نے اپنی ''کتاب الصیدنۃ'' میں تقریباً بہتر جڑی بوٹیوں اور دواؤں کے نام سندھی میں لکھے ہیں،

---

(۱) کنڈڑی درخت ہمیں تلاش کے بعد میرپور ساکرو کے علاقے میں دستیاب ہوا ہم نے اس پر ایک انگریزی مضمون میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ مضمون کے لئے دیکھئے: سندھ یونیورسٹی ریسرچ جرنل ''ہیومنیٹیز اور سوشل سائنس'' سال ۱۹۶۵ء۔

(۲) دیکھئے: ذیل میں دی گئی ''جڑی بوٹیوں کے ناموں کی فہرست'' صفحہ نمبر ۸۵، جس میں وہ لکھتا ہے کہ سندھ کے باشندے ''اسقیل'' کو ''قویا بصل'' کہتے ہیں۔

(۳) اس کتاب کا سب سے قدیم قلمی نسخہ ترکی کے شہر برصا کی پبلک لائبریری میں موجود ہے، ہم نے وہاں جا کر اس کا مطالعہ کیا تاکہ ناموں کے رسم الخط میں غلطی نہ ہو۔ اب یہ کتاب انگریزی ترجمہ کے ساتھ ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن پاکستان، کراچی کی جانب سے ۱۹۷۳ء میں چھپ چکی ہے۔

(۴) زیریں سندھ میں جنوب/لاڑ کی طرف بیرونی کی آمد پر ہم نے اس کی کتاب ''غرۃ الزیجات'' پر اپنے انگریزی مقدمہ میں تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ غالباً وہ منصورہ شہر میں آیا اور وہاں رہا، کیونکہ وہ ''غضف'' درخت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ: مجھے منصورہ شہر کے لوگوں نے بتایا کہ۔۔۔۔۔۔۔''

جن میں سے نصف سے زیادہ 'بشر' کی ''کتاب تفاسیر الادویہ'' کے حوالہ سے لکھے ہیں اور باقی نام اس نے اپنی طرف سے تحقیق کر کے لکھے ہیں۔ چونکہ وہ نام سندھی زبان کی انفرادی اہمیت اور بین الاقوامی علمی حیثیت کے بارے میں ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں، اس لئے ہم ''کتاب الصیدنہ'' کے عمیق مطالعے کی بناء پر انہیں پوری تفصیل کے ساتھ ذیلی جدول میں دے رہے ہیں۔

اس جدول کے پہلے کالم میں اس وقت کا وہ مشہور نام ہے جسے البیرونی نے ''کتاب الصیدنہ'' میں حروفِ تہجی کی ترتیب پر قلمبند کیا ہے۔ اس نام کے سامنے گول دائرہ (o) سے مراد یہ ہے کہ اس کا سندھی نام بشر بن عبدالوہاب فزاری کی کتاب سے لیا گیا ہے۔ سامنے ستارے کی نشانی (☆) یہ ظاہر کرتی ہے کہ اس کا سندھی نام اور اس سے متعلق دیگر معلومات خود البیرونی کی طرف سے فراہم کردہ ہیں۔ دوسرے کالم میں 'سندھی' نام جس طرح ''کتاب الصیدنہ'' میں لکھے ہوئے ہیں ویسے ہی دئے گئے ہیں۔ تیسرے کالم میں ''کتاب الصیدنہ'' اور ابو حنیفہ دینوری کی ''کتاب النبات'' (۱) سے دوسری ایسی ضروری معلومات فراہم کی گئی ہیں جو اسبابِ پنسار کی پہچان میں کارآمد ہوسکتی ہیں۔

اس سلسلے میں ''کتاب الصیدنہ'' کے انگریزی ترجمہ سے بھی کچھ ضروری معلومات حاصل کی گئی ہیں۔ آخر میں چورس [] کے اندر ہم نے اپنی طرف سے سندھی ناموں اور اسبابِ پنسار کی پہچان کے بارے میں کچھ وضاحت کی ہے، جو اس مرحلے میں ابتدائی حیثیت رکھتی ہے اور مزید تحقیق طلب ہے۔

(۱) ''کتاب النبات'' جلد اول، 'الف' سے 'ز' تک، تصحیح برنہارڈ لیون، مطبوعہ اُپسالہ، سویڈن، ۱۹۵۳ء، کتاب النبات'' جلد دوم، 'س' سے 'ی' تک، تصحیح ڈاکٹر حمید اللہ، قاہرہ، مصر، ۱۹۷۳ء

البیرونی کی ''کتاب الصیدنہ'' میں درج شدہ سندھی ناموں کا جدول:

اسبابِ پنسار کا اصل نام	سندھی نام	مزید معلومات
O ارطی	مہت	ارطی جمع ہے اس کی واحد ''ارطاۃ'' ہے۔ اسے ''رمث'' بھی کہا جاتا ہے اور سندھ میں اس کا نام مہت ہے (بشر بن عبدالوہاب فزاری)۔ یہ پودہ ریتیلی زمین میں اُگتا ہے، اس کا قد چھوٹا اور اس کے پتوں کا رنگ سرخی مائل ہوتا ہے۔
O آزاد درخت	لم	یہ فارسی نام ہے؛ عربی میں اسے 'سیبانہ' کہتے ہیں۔ جرجان ملک میں بہت ہوتا ہے اور وہاں پر اسے ''وَنِ'' کہتے ہیں۔ [غالباً سندھی لفظ 'وڻ' کا عکس] سندھی میں اسے لم کہتے ہیں (بشر بن عبدالوہاب فزاری)۔ [معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانے میں عام طور پر سندھی نام 'لم' تھا۔ آج بھی شمالی سندھ میں لم بولتے ہیں، اگرچہ وسطِ سندھ اور لاڑ کی طرف 'نم' کہتے ہیں]
O اسطوخوذو	دہار	رومی لفظ 'ستوخس' سے لیا گیا ہے۔ ''سندھی میں اسے دہا کہتے ہیں'' (بشر بن عبدالوہاب فزاری)۔ یہ ایک پودا ہے جو غزنی کی طرف پیدا ہوتا ہے، سب سے عمدہ سبز پتوں والا ہوتا ہے۔
O اسقیل	قویا بصل	''سندھی اسے قویا بصل کہتے ہیں'' (بشر بن عبدالوہاب فزاری)۔ خطی نسخہ 'ب' کے حاشیے پر بتایا گیا ہے کہ ''سندھی اسے 'کھاندہ' یا 'کھندری' کہتے ہیں''۔ [کھاندہ اور کھندری سے 'کِنبد' (پیاز کی گانٹھ) اور 'کِنبدڑي' (چھوٹی گانٹھ) کا گمان ہوتا ہے۔ سندھ میں 'جھنگ بصر' (جنگلی پیاز) ہوتا ہے جو دوائی میں کام آتا ہے۔ برسات کے موسم میں ریگستان میں بہت پیدا ہوتا ہے اور بالکل پیاز (بصر) جیسا ہوتا ہے، ہوسکتا ہے کہ اس قدیم دور میں اسے 'کویا بصر' کہتے ہوں]
O اسرنج	سنو	فارسی میں ''شنگرف'' اور سندھی میں 'سنو' کہتے ہیں (بشر بن عبدالوہاب فزاری) [سندھ میں پنساریوں کے پاس دو قسم کا ہوتا ہے: ایک، شنگرف اور دوسرا شنگرف سندھی کہلاتا ہے]

O اَشنہ	سیابروا	یہ ایک پودا ہے جسے فارسی میں 'دوالہ' اور ہندی میں 'چڑیلہ' یا 'چریرہ' کہا جاتا ہے۔ بشر بن عبدالوہاب فزاری کے بقول سندھی میں اسے ''سیابروا'' اور ہندی میں 'مسیلیوا' کہتے ہیں۔
O اشترغاز	O سی ہنکھفار	یہ 'انگدانِ خوش' نامی بوٹی کی جڑ ہے، جسے سندھی میں 'سی ہنکھفار' کہا جاتا ہے (بشر بن عبدالوہاب فزاری)۔ [سی ہنکھفار سے مراد شاید 'باریک ہِنگ جڑ' ہو۔ انگریزی ترجمہ اس طرح دیا گیا ہے: "It is the root of good syrian rue"]
O اُصف	O قوتری	عام طرح اسے 'کبر' کہا جاتا ہے۔ یہ ایک قسم کا 'بیج' یا 'پھل' (ثمرۃ) ہے۔ بشر کے بقول اسے سندھی خواہ ہندی لوگ 'قوتری' کہتے ہیں۔ [قوتری سے ڪنڙي (کنڑی) کا گمان ہوتا ہے]
O افیون	سرشنی رس	افیون رومی نام ہے اس کا فارسی نام ''دوشش نارکوک'' ہے (بیرونی)۔ بشر کے بقول فارسی میں اسے 'ملبند خوشخواک سیاہ' اور سندھی میں 'سرشنی رس' کہتے ہیں۔ [موجودہ لفظ 'چرش' اسی قدیم نام 'سرشنی رس' سے نکلا ہے۔]
O اقاقیا	سلہ ارھا یا سلنارھا	'اقاقیا' اصل میں رومی/یونانی نام ہے عربی میں اسے 'نفذ' کہتے ہیں (البیرونی)۔ فارسی میں اسے 'ملبند شدرک' اور سندھی میں 'سلہ ارھا' کہتے ہیں (بشر بن عبدالوہاب فزاری) [چرش کا فارسی نام جو بشر نے بتایا ہے، اس میں 'ملبند' کا لفظ ہے جس سے گمان ہوتا ہے کہ 'اقاقیا' بھی اسی قسم کی کوئی چیز ہے، کتاب الصیدنہ کے ایک اور مخطوطہ میں 'سلہ ارھا' کے بجائے 'سلنارھا' لکھا ہوا ہے۔]
O اقحوان	فلانج	'اقحوان' وہی 'بابونج' [بابونہ] ہے۔ بقول بشر بن عبدالوہاب فزاری اسے سندھی میں 'فلانج' کہتے ہیں۔ [فلانج= فلانہ= فلانو= پھلانو۔ غالباً اس زمانے میں 'بابونی' کو سندھی میں 'پھلانو' کہتے تھے۔]

O اکلیل الملک	سوتن	اسے فارسی میں 'شاہ بسہ' یا 'شاہ افسر' کہتے ہیں۔ اس قول کے مطابق ہندی میں اسے 'اسپرک' یا 'پرنک' کہتے ہیں۔ بشر بن عبدالوہاب فزاری کے بقول سندھی میں اسے 'سوتن' کہتے ہیں۔ ['اسپرک' غالباً 'اسپغول' ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ قدیم زمانے میں سندھی میں اسپغول کو 'سوتن' کہتے تھے۔ انگریزی ترجمہ میں یوں بتایا گیا ہے: "It is a grass which spreads horizantaly on ground"]
☆ ام غیلان	جاماھا	بیرونی کہتا ہے کہ عربی میں اسے 'الشوکۃ' اور سندھی میں 'جاماھا' کہا جاتا ہے۔ ['الشوکۃ' کے لفظی معنی سے ظاہر ہے کہ یہ کوئی خاردار پودا ہے۔ اس معنی کے پیشِ نظر 'جاماھا' وہی خاردار پودا ہے، جسے آج کل سندھی میں 'ڈراماہو' کہا جاتا ہے۔ پرانے زمانے میں 'ڈراماہو' کو غالباً 'جاماھو' یا 'جاماھو' کہتے تھے]
O انیسون	سروق	یہ رومی یونانی نام ہے۔ بقول بشر اس کا سندھی نام سروق ہے، جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ وہی 'نانخواہ رومی' ہے۔ [انگریزی ترجمے میں نانخواہ کو (Aniseed) لکھا گیا ہے]
O بنج	دھطورا؟ [بھنگ]	بقول بشر بن عبد الوہاب فزاری 'بنج' کی دو قسمیں ہیں: ایک پہاڑی [جنگلی] اور دوسری 'بستانی' [باغائی] اس کا فارسی میں نام ''گوز ماثل'' اور سندھی میں ''دھطورا'' ہے۔ [گوز ماثل، کا سندھی نام ڈاتورو (دھتورا) بتایا گیا ہے، مگر البیرونی لکھتا ہے کہ 'بنج' الگ چیز ہے اور 'گوز ماثل' الگ چیز ہے، اس لئے 'بھنگ' کو 'ڈاتورو' (دھتورا) نہیں کہا جائے گا۔ البتہ ڈاتورو بھی سندھی نام ہے اور یہ گوز ماثل کا نام تھا، کیونکہ کتاب الصیدنہ میں ایک اور جگہ پر 'جوز ماثل' نام کے نیچے وضاحت کی گئی ہے کہ ہندی میں اسے ''تہ تورہ'' یعنی ''دہ تورہ'' کہتے ہیں]
☆ بورق	اوس	بیرونی کی وضاحت کے مطابق رومی/یونانی میں اسے ''افرونظرون'' اور سریانی میں ''بجرا'' اور سندھی میں 'اوس' کہتے ہیں اس کی بہترین قسم 'آرمینا' ملک سے آتی تھی۔

☆ بوزیدان	شنذوار	بیرونی کی وضاحت کے مطابق 'بوزیدان' فارسی نام ہے اور سندھی میں اسے 'شنذوار' کہتے ہیں۔ یہ وہی ''عقار ہندی'' ہے۔ سفیدی مائل رنگت اور ریشوں سے گندھے ہوئے چھلکے کی طرح ہوتا ہے۔
O بھراج	سریس	اسے عربی میں ''الرنف'' کہتے ہیں۔ اسے ''بہرم جنگلی'' یا ''العصفر البری'' بھی کہتے ہیں۔ بقول بشر بن عبد الوہاب فزاری فارسی میں ''بورکر'' یا ''بولکر'' اور سندھی میں ''سریس'' کہتے ہیں۔ رات کے وقت اس کے پتے سکڑ کر ڈنٹھل سے جا لگتے ہیں۔ [سریس= سریہ= سرینہ۔ سندھی سرینہ کے پتے سورج غروب ہوتے ہی بند ہوجاتے اور سکڑ جاتے ہیں۔ یا ہوسکتا ہے کہ پرانے زمانے میں کسی اور پودے کو سریہ کہا جاتا تھا، جس پر سے ''سرینہ'' درخت پر یہ نام پڑ گیا۔]
O توتیا	طتو [تتو] مورکرنیون	بشر بن عبدالوہاب فزاری کے بقول سندھی خواہ ہندی میں اسے ''طتو'' کہتے ہیں۔ اس کی ایک قسم مور کی گردن کی طرح (علی لون عنق الطاؤس) ہرے رنگ کی ہے، جسے فارسی میں ''سنگِ مس'' اور سندھی خواہ ہندی میں ''مورکرنیون'' کہتے ہیں۔ دوسری قسم سفید رنگ کی جسے سندھی خواہ ہندی میں ''سنگِ طتو'' کہتے ہیں۔ ''مورکرنیون'' یعنی مور کی گردن کی طرح، مور کی گردن کی رنگت جیسا۔ یہ دونوں سندھی نام یعنی 'طتو' اور 'مورکرنیون' جو کہ ایک ہزار سال پہلے رائج تھے ان کے آثار و علامات آج تک موجود ہیں، یعنی سندھ کے پنساریوں کی اصطلاح میں اس وقت بھی 'توتیا' کو ''مورتھو'' یا ''مورتھوتھو'' کہتے ہیں۔ لفظ مور ''مورکرنیون'' کی یادگار ہے اور ''تھو'' یا ''تھوتھو'' وہی سندھی لفظ ہے جسے بشر بن عبدالوہاب نے ''طتو'' لکھا ہے۔ کتاب الصیدنہ کے برصا والے نسخے میں ''طتو'' میں 'ت' کے اوپر 'شد' دی ہوئی ہے، جس سے 'تھ' کی پہچان ہوتی ہے۔

O توبال النحاس	کرماشا	بقول بیرونی رومی/یونانی میں اسے ''کلفیطس'' سریانی میں ''ھبابا'' اور فارسی میں ''تولبرنج'' کہتے ہیں۔ بقول بشر فزاری سندھی میں اسے ''کرماشا'' اور فارسی میں ''پوستہ مس'' کہتے ہیں۔ [یہ تانبے کا چورا یعنی ایک معدنی چیز ہے اور انگریزی میں اسے (Copper dust) کہا جاتا ہے]
O جندبیدستر	گندبیستر	البیرونی کی تحریر کے مطابق یہ فارسی نام ہے یعنی ''بحری کلب (کتا) کے فوطے'' اس کے لفظی معنی اس طرح ہیں: گند=فوتہ/خصیہ+ بے= بغیر+ دست= تام/مکمل، جس کے معنی ہیں: ''نامکمل، فوطے''۔ اسے ''کلب الماء'' یا ''ثعلب الماء'' بھی کہا جاتا ہے۔ بیرونی کہتا ہے کہ حمزہ کی تعریف کے مطابق ہندی میں اسے ''گندشیر'' اور بشر بن عبدالوہاب فزاری کی تحریر کے مطابق اسے سندھی میں ''گندبیستر'' کہتے ہیں۔ [ایک ہزار سال پہلے سندھی میں بھی یہی فارسی نام رائج تھا، البتہ سندھی لب و لہجہ کی وجہ سے ''گندبیدستر'' کے بجائے ''گندیستر'' کہا جانے لگا اسے آج کل ''اود بلاؤ کے فوطے'' کہا جاتا ہے]
O جندلیش؟	گندیستن [گندلیش]	کتاب الصیدنہ کے برصا کتب خانہ کے نسخے میں یہ نام آیا ہوا ہے۔ اصل لفظ (غالبًا) ''جندلیش'' ہے نیز اس میں بتایا گیا ہے کہ ہندی میں اسے ''کھندیش'' (=گندلیش) کہتے ہیں، اور بقول بشر بن عبدالوہاب اسے سندھی میں ''کھندیستن'' کہتے ہیں۔ [’کھندیستن‘ یہ لفظ اسی طرح لکھا ہوا ہے، لیکن غالبًا اس کا صحیح رسم الخط ''گندلیش'' ہی ہوگا]
O جوزالقی	منبھل [میٹ قل]	بشر کے بقول سندھی میں ''منبھل'' اور ہندی میں ''مین بھل'' کہتے ہیں۔ البیرونی نے وضاحت کی ہے کہ ''بھل'' کے معنی میوہ ہے (بھل ھو الثمرة) [بھل یعنی پھل اس کے معنی ہیں میوہ۔ سندھی نام 'منبھل'، یعنی 'منپھل'؛ آج کل سندھی میں میٹ قل کہلاتا ہے]

○الحاح	جواسا	ایک چھوٹا پودا ہے جس کا بیج چاول کے برابر لال سرخ رنگ کا ہوتا ہے، اسے ''اشترخار'' بھی کہتے ہیں۔ بقول بشر فزاری اسے سندھی میں ''جواسا'' کہا جاتا ہے ['جواسا' سے مراد شاید ''جوانسا'' یعنی ''جوانسو'' ہو]
○الحبۃ الخضراء	کلنکور	البیرونی کہتا ہے کہ یہ ''بطم'' درخت کا پھل ہے جسے فارسی میں ''خـنـجـک'' اور سیستانی زبان میں ''کنبشک'' کہتے ہیں اور سندھی میں اسے ''کلنکور'' کہتے ہیں۔ اس درخت کا گوند سب سے عمدہ ہوتا ہے۔ [اصل رسم الخط 'کلنکور' (کھلنکھور) جو کہ لغت کی کتاب ''مدار الافاضل'' کے مطابق ''خنجک'' نامی دانہ (بیج) کی قسم ہے، جسے ''کلتھی'' بھی کہا جاتا ہے۔ آج کل سندھی میں ''حبۃ الخضراء'' (لفظی معنی ہرا بیج) کا علمی نام 'بن' ہے]
○حرمل	ھملو	بیرونی کے بقول اسے فارسی میں ''سپند'' اور سندھی میں ''ھملو'' کہا جاتا ہے۔ [ھملو سے مراد ھرملو ہے جسے آج بھی 'ھرملو' یا 'ھرمرو' کہا جاتا ہے۔ ابو حنیفہ دینوری نے اس نام کو اپنی ''کتاب النبات'' میں درج کیا ہے۔ یہ پودا پتھریلی زمین میں خاص طور سے 'لکی' کی طرف زیادہ ہوتا ہے]
○حضض	''وطہ'' یا ''الوطہ'	بقول بیرونی رومی/یونانی میں اسے ''لوقیون'' اور فارسی میں ''پیل زھرہ'' کہا جاتا ہے۔ بشر فزاری کے بقول سندھی میں ''وطـہ'' یـا ''الـوطـہ'' اور ہندی میں اسے ''قولوط'' کہا جاتا ہے۔ [اس دور میں سندھی پنسار میں غالبًا یونانی نام رائج ہوچکے تھے، کیونکہ اصل عبارت میں بتایا گیا ہے کہ: سندھی میں اسے وطہ یا ایک اور تلفظ کے مطابق الوطہ کہا جاتا ہے اور جالینوس نے بھی اسے یہی نام دیا ہے (و بـالـسـنـدیۃ ''وطـہ'' و فی نسخۃ ''الوطہ'' و کذالك سماہ جالینوس)۔ ابو حنیفہ دینوری نے کتاب النبات میں لکھا ہے کہ یہ پودا ریتیلی زمین میں ''قیقان'' (قلات) کی طرف پیدا ہوتا ہے)

O حلتیت	ھین [ھنگ] (ھینگ)	البیرونی کہتا ہے کہ یہ ''انجدان'' (انگدان) درخت کا گوند ہے اور فارسی میں اسے ''انگزد'' کہا جاتا ہے۔ سندھی میں اسے 'ھین' کہتے ہیں۔ [آج کل حلتیت کا عام سندھی نام ''ھنگ'' (ہینگ) ہے؛ غالباً ہزار سال پہلے بھی سندھی میں اسے ''ھنگ'' (ہینگ) ہی کہتے تھے جسے عربی میں 'ھین' کے تلفظ کے ساتھ ادا کیا گیا۔]
☆ خبث الفضہ	رفاقطی (رپاکٹی)	البیرونی کہتا ہے کہ اسے یونانی اور عربی میں ''اقلیماء'' اور فارسی میں ''کیشہ'' اور سندھی میں ''رفاقطی'' کہا جاتا ہے۔ [رفاقطی یعنی رپاکٹی کا صحیح نام ''رپاکٹِ'' ہے، مگر 'ٹ' کی زیر والے تلفظ کو 'ی' کے ساتھ ادا کیا گیا ہے۔ ''خبث الفضہ'' کے لفظی معنی ہیں 'چاندی کا زنگ'، غالباً سندھی لفظ 'کٹ' (زنگ) سے ہی فارسی میں اسے 'کیشہ' کہا گیا]
☆ خبث الذہب	سورن قطی [سون کٹ]	مندرجہ بالا نام ''خبث الفضہ'' کے ذکر کے تحت البیرونی کہتا ہے کہ ''خبث الذہب'' کو یونانی اور عربی میں ''اقلیماء اصفر''، فارسی میں ''نخبتہ زر'' اسندھی میں ''سورن قطی'' کہا جاتا ہے۔ ''سورن قطی'' یعنی سونے کا زنگ]
O خلاف	ویوس	بشر فزاری کے بقول یہ وہی 'صفصاف' ہے۔ فارسی میں اسے ''بید سبیذ'' (بید سفید) اور سندھی میں ''ویوس'' کہتے ہیں۔ ''خلاف'' درخت کی لکڑی سے گوند نکلتا ہے۔
☆ دلفین	بولو	البیرونی کے مطابق ''دلفین'' یونانی نام ہے، عربی میں اسے ''دخش'' (۱) اور سندھی میں ''بولو'' کہا جاتا ہے۔ [دلفین یونانی لفظ Dolphin ہے۔ 'بولو' شاید قدیم تلفظ ہے، آج کل اسے ''بلھڻ'' کہا جاتا ہے۔ یہ ایک دریائی جانور ہے جو بطور خاص دریائے سندھ کے روہڑی-سکھر علاقے میں زیادہ ہوتا ہے۔

(۱) المنجد میں ''الدخس'' بغیر نقاط کے آیا ہے اور اس کے معنی میں لکھا ہے کہ یہ ایک سمندری جانور ہے (مترجم)

		اس کا سندھی میں دوسرا نام ''ٻرُونڍ '' ہے۔ البیرونی کو یہ دونوں سندھی نام معلوم تھے۔ یہاں پر وہ 'بولوٗ (یعنی ٻلھڻ) لایا ہے اور اپنی دوسری تصنیف کتاب الہند میں 'برلوٗ لکھا ہے یعنی 'ٻرُونڍ ' کیونکہ وقت گذرنے کے ساتھ 'ل' تبدیل ہوکر 'ر' ہوگیا اور عام تلفظ میں تبدیلی آگئی۔]
☆ دم الاخوین	بانورت	ابو حنیفہ دینوری نے کتاب النبات میں لکھا ہے کہ یہ ایک قسم کا پودا ہے جس سے سرخ رنگ نکلتا ہے۔ البیرونی کے مطابق پنساریوں کی اصطلاح میں عام طرح سے اسے 'فاطر' کہا جاتا ہے۔ سندھی میں اسے 'بانورت'، فارسی میں 'خون سیاو شان'' اور ہندی میں 'پانڈورت' کہتے ہیں۔ [ہوسکتا ہے کہ 'بانُورت' شاید اصل میں 'پانوَرَت' یعنی 'پانڈوَرت' ہو لیکن 'دم الاخوین' خواہ 'خون سیاوشان' کے لفظی معنی ہیں ''دو بھائیوں کا خون'' یا ''بھائیوں کا خون'': اس لحاظ سے 'بانورت' غالباً اصل سندھی نام ''ڀائن رت '' (بھائن رَت) کی عربی صورت ہے۔ سرخ رنگ کے لحاظ سے اسے 'رت' (خون) کہا گیا۔ سندھ میں آج کل اس پنساری چیز کا علمی نام ''ہیرا دکھنی'' ہے، مگر ایک ہزار سال قبل یہ چیز سندھ میں خالص سندھی نام ''بھائن رت'' کہی جاتی تھی۔]
☆ زرنب	تونیا	'زرنب' یا 'زرقفت' ایک قسم کے پتے ہیں جن میں تیز خوشبو ہوتی ہے۔ یہ سیستان کے علاقے سے عرب ملکوں میں آتے تھے۔ ہندی اور سندھی میں اسے ''تونیا'' کہتے ہیں۔ [ہندی اور سندھی کا یہ نام کتاب الصیدنہ کے برصا کتب خانے کے قلمی نسخے میں دیا گیا ہے۔ مطبوعہ کتاب میں سندھی نام نہیں دیا گیا، مگر ہندی نام ''توینائی'' لکھا ہوا ہے، اور حاشیہ میں بتایا گیا ہے کہ ایک اور قلمی نسخے میں ''تونینانجی'' لکھا ہوا ہے۔]
زرنیخ	ہڑتال اور منسل	البیرونی کہتا ہے کہ ''زرنیخ'' کی دو قسمیں ہیں: زرد اور سرخ۔ زرد رنگت والے کو سندھی اور ہندی میں 'ہڑتال' کہتے ہیں؛ سرخ رنگت والے کو سندھی میں ''مسعل'' اور ہندی میں ''منجل'' کہتے ہیں۔[تمام نسخوں میں ''مقسل'' لکھا ہوا ہے، مطبوعہ کتاب کے حاشیہ میں ٹامسن کے حوالے سے بتایا گیا ہے کہ یہ لفظ اصل میں شاید ''مینسل'' ہو، یعنی

		’مقسل‘ ہے ’منسل‘ صحیح لفظ ’زرنیخ‘۔ یا Realgar نہیں۔ ہڑتال نام کی چیز سندھی میں مشہور ہے۔زرد رنگت والی کو ہڑتال اور سرخ رنگ والی کو ’من چھر‘ کہا جاتا ہے (فرہنگِ جعفری)۔ سندھی ’من چھر‘ (=من جر=من جل) اور ہندی ’منجل‘ ایک ہی بات ہے نیز ’من چھر‘ (=من چھر = من چل = من صل = منسل) اور ’منصل‘ یا ’منسل‘ ایک ہی بات ہے، تھر کے پنساریوں کے پاس ہم نے تین قسمیں (ہڑتال) دیکھیں: ورقی، گئون (گائے)، ڏندي (دندی) اور ’من چھر‘]
☆ زرین درخت	والو بندلوا یا والو بندلو	عربی میں ’عریان‘ اور سندھی میں ’والو بندلوا‘ یا ’دالو بندلو‘ کہتے ہیں [مطبوعہ کتاب میں ’دالو بندلو‘ لکھا ہوا ہے لیکن نیچے حاشیہ میں بتایا گیا ہے کہ اس کتاب کے نسخۂ ’ق‘ کا تلفظ ’والو بندلوا‘ ہے برصا کے نسخے میں بھی ’ والو بندلوا‘ ہے]
☆ زنجبیل	سُنڈھ (سونٹھ)	البیرونی کے مطابق تازہ سونٹھ کو ’ادرک‘ اور خشک کو ’سنڈھ‘ (سونٹھ) کہاجاتا ہے۔ [مطبوعہ کتاب میں ’’سنڈھ‘‘ لکھا ہوا ہے، ظاہر ہے کہ یہ سندھی تلفظ والا سندھی نام ہے۔ ہندی میں اسے ’سونٹھ‘ کہا جاتا ہے۔ممکن ہے کہ البیرونی کے زمانے میں ہندی میں بھی یہی سندھی نام یعنی ’ادرک‘ اور ’سنڈھ‘ استعمال ہوتے ہوں۔]
☆ زنجفر	منکلو (منکھلو) یا جاما منکلو (جاما منکھلو)	عربی میں اسے ’’زنجرف‘‘ یا ’’سنجرف‘‘ کہا جاتا ہے۔ صاف یا پسے ہوئے (مسحوق) ’زنجرف‘ کو ہندی میں ’سندور‘ اور غیر پسے ہوئے کو ’منکھل‘ کہتے ہیں۔ بشر فزاری کے بقول سندھی میں اسے ’منکھلو‘ یا ’جاما منکھلو‘ کہتے ہیں۔ [بشر فزاری کا بتایا ہوا سندھی نام کتاب الصیدنہ کے برصا والے مخطوطہ میں موجود ہے لیکن مطبوعہ کتاب میں یہ پورا جملہ چھوٹا ہوا/چھوٹ ہے۔]

☆ زھم	کھتوری	’زہم‘ اور ’زباذ‘ ایک ہی چیز ہیں۔ ہندی نام ’کتورہ‘ ہے اور جس حیوان سے یہ پیدا ہوتا ہے اسے ’کتور بلاری‘ کہتے ہیں۔ اس کے مشک کو ہندی میں ’’تندی‘‘ یا ’’پودیس‘‘ کہتے ہیں۔ الخشکی کے بقول یہ (مشک) سندھ کی طرف سے دیبل اور سندان سے آتا ہے۔ [’کتورہ‘ یعنی ’کھتورہ‘۔ یہ سندھی لفظ ’کھتوری‘ ہے؛ ہندی لفظ کا تلفظ ’کستورہ‘ (کھستوری ہونا چاہئے تھا۔ دوسرا یہ کہ ’کتور بلاری‘ (Civet cat) سندھی اضافی ترکیب کے مطابق ’کھتور بلاڑی‘ (کستوری والی جنگلی بلی) ہے۔ جیسا کہ ’زہم‘ سندھ سے دیبل اور سندان ہی سے عرب ملک میں آتا تھا، اس لئے یہ مقامی نام بھی ’سندھی‘ سمجھنے چاہئیں۔ کیونکہ وہ موجودہ دور کے سندھی تلفظات سے ملتے جلتے ہیں۔ ہندی نام ’تندی‘ اور ’پودیس‘ الگ طور پر بتائے گئے ہیں۔]
O سابیرج	سیبیزاوا	دمشقی کے بقول یہ چیز ’لفاح‘ ہی ہے، جسے ابو معاذ کے بقول ’سابیشک‘ کہا جاتا ہے۔ بشر فزاری کے بقول اسے فارسی میں ’سبیزہ‘ اور سندھی میں ’سبیز اوا‘ کہتے ہیں۔ [’لفاح بری‘ کو سندھ میں موجودہ پنساریوں کے علمی نام کے ساتھ ’’لکھما لکھئی‘‘ کہا جاتا ہے لیکن اگر اصل نام ’لفاح‘ کے بجائے ’لقاح‘ ہے تو پھر سندھی میں ’لقاح‘ کا پنساریوں کے نزدیک علمی نام ’اکوھی‘ ہے (فرہنگِ جعفری)]
☆ سذاب	سدابو (سوا؟)	یہ دو قسم کے ہیں: ایک بستانی دوسرے بری۔ البیرونی کہتا ہے کہ ’سدابو‘ یہ وہی ’فیغاتن‘ ہے اور بری (جنگلی) کو ’فیغاتن اغریون‘ کہتے ہیں۔ بری قسم والا طعام میں بالکل نامناسب ہوتا ہے۔ سندھی میں اس (بری) کو ’سدابو‘ کہتے ہیں۔ محمد بن زکریا رازی کے بقول ’بری‘ کا بیج ’حرمل‘ کے بیج سے چھوٹا اور زیادہ سیاہ ہوتا ہے۔ ہندی میں اسے ’ساوہ‘ کہتے ہیں یعنی ہمیشہ سبز۔ [’سدابو‘ طعام میں ڈلتا ہے اور ممکن ہے کہ وہ ’سوا‘ ہی ہو جسے پہلے زمانے میں شاید ’سدابو‘ کہتے تھے۔ عربی نام ’سذاب‘ غالباً سندھی نام ’سدابو‘ سے لیا گیا ہے۔ ’ساوہ‘ بھی سندھی لفظ ہے لیکن اسے ہندی شمار کیا گیا ہے۔ ’ساوہ‘ یعنی ’سبز‘ یا ’ہمیشہ سبز‘۔]

☆سماق	تتل	سندھی اور ہندی میں اسے 'تتل' کہتو ہیں مطابق یہ نام 'تـنـتـکـھ'، 'ترکھ'، 'تماتیر' یا 'ترکیھ' ہے۔ فارسی میں اسے ''ترہ'' کہتے ہیں۔ ایک سرخ رنگ کی کھٹے ذائقے والی چیز ہے (رازی) اور دوسری کڑوے ذائقے والی، جسے رنگ ریز استعمال میں لاتے ہیں۔ [فی الحال ہمیں زیادہ معلومات حاصل نہیں ہوسکی ہیں۔ نیچے 'الاشروق' کو بھی 'ترک' کہا گیا ہے۔]
☆سورنجان	لاکھل مول (لاکل مول) اور سکورہ [پھول کا نام ہے]	یہ ایک بوٹی کی جڑ ہے جسے 'جعفریہ' کہتے ہیں۔ موسمِ بہار میں سب سے پہلے پھول نکالتی ہے۔ بقول بشر فزاری فارسی میں اسے 'لعبت بر بری' اور سندھی میں 'لاکھل مول' کہتے ہیں۔ بشر الفزاری کی کتاب کے ایک اور نسخے میں 'لاقول' لکھا ہوا ہے، جو اصل (بوٹی کی جڑ) ہے----------- فارسی میں اسے 'سورنگان' کہتے ہیں۔ اسے بھی 'ترک' کہا گیا ہے۔ دوسرے قول کے مطابق 'اصل' بوٹی خریف کے موسم میں برسات سے پہلے پیدا ہوتی ہے اور یہ بھی کہاجاتا ہے کہ اس کے پھول کو سندھی میں 'سکھورہ' (سکورہ) کہتے ہیں۔ [بشر فزاری کی کتاب کے کراچی سے طبع شدہ نسخے میں سندھی نام نہیں دیا گیا، البتہ برصا والے نسخے میں موجود ہے جس کی اصل عبارت یوں ہے: "**وبالسندية لاكل مول، و في نسخة 'لاقول' وهو اصله**". 'لاقول' دراصل بوٹی کی جڑ ہے۔ 'لاکھل مول' کے معنی 'لاکل کی مول' یعنی ''لاکل کی جڑ'' ہے۔ یہ آخری بیان اگرچہ 'سورنجان' کے تحت دیا گیا ہے اور 'سورنجان' ہی کے متعلق ہوسکتا ہے مگر ایسا لگتا ہے کہ گویا یہ بیان کسی دوسری چیز کے بارے میں تھا اور بعد میں دونوں بیان خلط ملط ہوگئے ہوں۔ سندھ میں آج بھی پنساریوں کے پاس 'سورنجان' کی دو قسمیں ملتی ہیں: میٹھی سورنجان اور کھٹی سورنجان۔]

☆ سوس	مہلتی یا ملتی یا مسلی	ہندی میں اسے 'مہلت' کہتے ہیں۔ بقول بشر فزاری ہندی میں 'رسون' اور سندھی میں اسے 'مہلتی' کہتے ہیں۔ بشر کی کتاب کے ایک اور نسخے میں 'مسلی' یا 'ملتی' لکھا ہوا ہے۔ [کراچی طباعت کے ایڈیٹر نے وضاحت کی ہے کہ ہندی نام 'ملٹھ' یا 'ملھٹی' ہے۔ مذکورہ بالا بیان سے سندھی نام 'مہلتی'، 'ملتی' یا 'مسلی' ملتے ہیں یہ وہی 'ملٹھی' ہی ہے]
☆ صبار	انبلی	یہ وہی 'تمر ہندی' ہے سندھی میں اسے 'انبلی' کہا جاتا ہے۔ [کراچی سے طبع شدہ کتاب میں 'اِنبلی' لکھا ہوا ہے۔ برصا کے قلمی نسخے میں 'املی' یا 'امالی'، بغیر زیر اور زبر کے لکھا ہوا ہے۔ ''اِنبلی'' پڑھا جائے تو بھی اس سے مراد ''املی'' ہوگا جسے ہندی نام سمجھنا چاہئے۔ سندھی میں آج کل یہ ''گِدامری'' کہلاتی ہے ممکن ہے کہ قدیم سندھی نام 'گد انبلي' (= گدآمری= گد+ آملی □=گد + آنبلی= ایک ساتھ لگی ہوئی کھٹی کیریاں= املی کے گچھے میں ایک ساتھ لگے ہوئے دانے) کی تبدیل شدہ صورت ہو۔]
صمغ	شیر شیروا (=شیرو)	بشر فزاری کے بقول اسے فارسی میں 'کوز' اور سندھی میں 'شیروا' کہتے ہیں۔ البیرونی مزید بتاتا ہے کہ ہندی میں اسے 'چیر' کہتے ہیں۔ [برصا کے قلمی نسخے میں 'شیروا' ہے۔ کراچی طبع میں 'شیر' لکھا گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سندھی تلفظ 'اُ' (آخر میں و) کے آخر میں الف لگا کر 'اوا' لکھا گیا۔ مثلاً 'جیرُ' کو 'جیروا'۔ اس اعتبار سے 'شیروا' اصل میں 'شیرُ' بنے گا۔ 'صمغ' دراصل گوند (Samar, Shittam wood) ہے۔ 'ببول' اور دوسرے کانٹے دار درختوں کے گوند کو 'صمغ' کہا جاتا ہے۔ اس زمانے میں گوند کو 'شیرُ' کہتے تھے۔]
☆ صندل	صندل [چندن] سرکھنڈ	'صندل' کو آج بھی 'صندل' یا 'چندن' کہا جاتا ہے۔ لیکن اس طرح کے سندھی نام کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ البیرونی نے واضح کیا ہے کہ ہندی اور زنجی (افریقی) زبان میں 'چندل'، 'چندن' یا 'چندان' کہتے ہیں وہ مزید کہتا ہے کہ: "له بزر كالعدس والمقاصيرى 'سه سو كند' اى قطاع جيدة. والاحمر منه "رخت چندن" [غالب گمان یہ ہے کہ اس عبارت میں 'سہ سو کنڈ' اصل میں 'سر سر کھنڈ' ہو 'سرکھنڈ' اسی 'چندن' کا دوسرا سندھی نام ہے، اور 'سرکھنڈ' خواہ (ہلکے تلفظ

عربی نام	سندھی نام	تفصیل
		کے ساتھ) 'سرکھن' کہلاتا ہے۔ شاہ صاحب کے رسالے میں ایک وائی کا مصرعہ یوں ہے: 'سيٽين سرُ ڪنڌ سبجي، عطر ھرين اتورا' دوسرے کسی شاعر نے کہا ہے کہ: انجان اور بے قدر لوگ: "ساري وٺ سرڪن جو تا بيد برابر ڪن"]
☆عروق	هلِدر (ھيڊ)	ہندی میں اسے 'ھلدر' اور فارسی 'زرچوبہ' کہتے ہیں بقول بشر فزاری سندھی میں اسے 'ہلدر' کہتے ہیں۔ [مطبوعہ نسخے میں 'ہلدر' ہے جو کتاب الصیدنہ کے دیگر نسخوں کے مطابق ہے۔ برصا کے نسخے میں 'ہَلزِر' یا 'ہَلذِر' لکھا ہوا ہے ('ذ' اور 'ذ' کی یہ تبدیلی جائز ہے۔) آج کل اسے سندھی میں 'ھیڈر' اور ہندی میں 'ہلدی' کہا جاتا ہے۔ سندھی کے موجودہ تلفظ میں قدیم تلفظ والی آخری 'ر' اب تک موجود ہے۔ اس زمانے میں سندھ میں 'ھیڈر' کو 'ہلدر' کہتے تھے۔]
☆'العشروق' یا 'العشرق'	تَتل تترکھ قوال سریش	یہ سرخی مائل رنگت اور دل کو لبھانے والا خوشبو دار پودا ہے۔ بشر فزاری کے بقول ''العشروق'' 'سنائی' ہے اور سندھی میں اسے 'ترکھ' یا 'قوال سریشی' کہتے ہیں۔ [اوپر البیرونی نے 'سماق' کا یقینی سندھی اور ہندی نام ''تتل' بتایا ہے لیکن اس نے یہ بھی کہا ہے کہ: کچھ لوگوں کے بقول اسے 'تتر' بھی کہتے ہیں۔ یہاں بشر فزاری کے بقول 'العشروق' 'سنائی' ہے اور سندھی میں 'العشروق' خواہ 'سنائی' کو 'تترک' یا 'قوال سریش' کہتے ہیں۔ عربی تلفظ 'قوال سریش' سے اصل سندھی تلفظ ڪوال چرش' یا ڪنوار چرش' کا گمان ہوتا ہے۔]
☆عُصفر	کُھنبو (ڪُھنبو) (رنگ ساون)	ہندی میں 'کُسُنب' فارسی میں 'اسپرگ' اور سندھی میں اسے 'رنج ثاون' کہتے ہیں۔ [برصا کے نسخے میں اسی طرح ہے لیکن کراچی سے طبع شدہ نسخے میں اس کا حوالہ نہیں دیا گیا۔

		اس کے بجائے فارسی اور سندھی نام والی عبارت ایک اور نسخے کے حاشیہ سے لی گئی ہے جو یوں ہے: "بالفارسیة 'اسپرگ' وبالسندیة 'رنج ثاون' (؟) و فیہ نظر" 'رنج ثاون' کے سامنے سوالیہ نشانی یا بعد میں شک والے الفاظ کہ "فیہ نظر" کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ 'برصا' کے نسخے میں 'رنج ثاون' صاف لکھا ہوا ہے۔ ہندی نام 'کسعب' سے ظاہر ہے کہ یہ 'کھنبو' ہے 'رنج ثاون' یقینی طور پر سندھی نام 'رنگ ساوڻ' کی صورت ہے۔ اس زمانے میں 'کھنبو' کو سندھی میں 'رنگ ساوڻ' بھی کہتے تھے۔ ساون (موسم) میں رنگی برنگی بادل ہوتے ہیں، اسی لحاظ سے 'ساون رنگ' گویا کہ 'کھنبو' کی طرح ہے اب تک سندھ کی 'سینگار شاعری' میں یہ تشبیہہ عام ہے۔]
☆ عنب الثعلب	قواد	بقول بشر فزاری اسے فارسی میں 'روباد زح' اور سندھی میں 'قواد' کہتے ہیں۔ [کراچی طباعت کے ایڈیٹر نے حاشیہ میں 'برہان قاطع' کی سند سے اس کا دوسرا فارسی نام 'روباہ ترمک' لکھا ہے نیز بتایا ہے کہ ہندی میں اسے 'مکو' کہتے ہیں۔]
☆ حب الغار	شنکر (= شکر؟)	بشر کے مطابق فارسی میں اسے 'دہمست' اور سندھی میں 'شنکھر' کہتے ہیں۔ یہ 'لوبیا' کے دانوں کے برابر پیلاہٹ مائل سفید رنگت کے دانے ہیں۔ [کراچی طباعت کے ایڈیٹر نے بتایا ہے کہ 'سنکر' لفظ 'مدار الافاضل' لغات (۲۷۹X۲) میں موجود ہے۔ ممکن ہے کہ یہ سندھی نام خاردار درخت 'کنڈی' کی پھلی کا ہو۔ اس درخت کی پھلیوں میں جو بیج ہوتے ہیں وہ سفیدی اور پیلاہٹ کی طرف مائل ہوتے ہیں۔]

☆ الغضف	غضف قلنج	البیرونی کہتا ہے کہ: لغت کے ماہر 'ابنِ درید' کے 'دیوان اللغۃ' میں بتایا گیا ہے کہ ہند (ہندوستان بشمولِ سندھ) میں یہ درخت کھجور کا ہم شکل ہے، جس کے خوشوں اور پتوں سے چھت میں لٹکنے والے جالی دار ٹوکرے اور چٹائیاں بناتے ہیں (یتخذ من خوصۃ الغرائر والحصر)؛ لیکن مجھے منصورہ (سندھ) کے شہریوں نے بتایا کہ: یہ ایک درخت ہے جسے سیراف، عمان اور بصرہ کے لوگ، "الخوص المکری" یعنی مکرانی کھجور کہتے ہیں۔ منصورہ کے شہری خود مقامی طور پر اسے عربی میں "الغضف" کہتے ہیں اور اس کا سندھی نام 'قلنج' ہے یہ انسانی قد کے برابر ہوتا ہے، اس میں پھل لگتا ہے جس میں سخت گول گٹھلیاں ہوتی ہیں جن سے تسبیح کے دانے بناتے ہیں۔ [غالبًا یہ پھیش، پیش کی جھاڑی ہے۔]
فلفل	مرچ	'فلفل اسود' (سیاہ رنگ والی) کو ہندی میں 'مِرَچ' کہتے ہیں اور سندھی زبان میں 'مَرچ'۔ [سیاہ مرچ کا بیان ہے۔ مطبوعہ کتاب میں "بالسغدیۃ" (سغدی زبان) لکھا ہوا ہے۔ لیکن غالبا اصل صحیح لفظ "بالسندیۃ" ہوگا (یعنی سندھی زبان میں) کیونکہ اس سے پہلے ہندی زبان (بالہندیۃ) کا ذکر ہے۔ کتاب الصیدنہ کے ایک اور قلمی نسخہ (ق) میں بھی "بالسغدیۃ" کے بجائے "بالسندیۃ" لکھا ہوا ہے۔ آج بھی سندھی میں 'مرچ' لفظ کو میم کی زیر کے ساتھ بولا جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک ہزار برس پہلے البیرونی کے دور میں 'مَرچ' (میم کے زبر کے ساتھ) کہتے ہوں۔]
قوۃ الصباغین	مجت	اسے ہندی میں 'منت' کہتے ہیں اور فارسی میں 'رودن'۔ ['منت' کا رسم الخط سندھی کے تلفظ 'مجت' (منجھ) سے ملتا جلتا ہے۔ ہندی تلفظ 'مجیٹھ' ہے۔ البیرونی کہتا ہے کہ: اچھے قسم کی 'منجھ' بلخ اور آرمینیا سے جرجان، سیستان اور مکران جاتی تھی اور وہاں سے ہند اور زنج (افریقہ) کی طرف لے جاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ مکران کے بعد سندھ میں لاتے ہوں گے اور اس کے بعد وہاں سے ہند میں۔ اس اعتبار سے مقامی سندھی نام 'منجھ' ہی سے ہندی نام 'مجیٹھ' پڑا ہوگا۔ عربی نام کے لفظی ترجمہ کے مطابق انگریزی میں اسے Dyer's Madder کہتے ہیں۔]

رُفہ	حادطج	بقول بشر فزاری اسے ہندی میں 'طج' اور سندھی میں 'حادطج' کہتے ہیں۔ عامۃ الناس میں یہ 'دارصینی' (دارچینی) کے نام سے مشہور ہے۔ [سندھ کے خطۂ لاڑ میں کہیں کہیں 'تج' نام سننے میں آتا ہے، لیکن آج کل عام سندھی نام 'دالچینی' ہے، جو عربی نام 'الدارصینی' کی وجہ سے مشہور ہوا۔ 'حادطج' شاید اصل میں 'حارطج'، ہو یعنی 'گرم تج' - دارچینی کا اثر گرم ہے۔]
☆ قُردمانا	بہ سودا	بقول بشر فزاری ('دٗ کے ساتھ) 'قردمانا' خواہ ('ط' کے ساتھ) 'قرطمانا' کہتے ہیں اور یہ رومی نام ہے۔ فارسی میں اسے 'کرویا رومی' اور سندھی میں 'بہ سوڈ' کہتے ہیں۔ [کراچی طبع کے ایڈیٹر نے Gray کے حوالے سے بتایا ہے کہ اس کا انگریزی نام Carum cravi ہے۔]
☆ کرفس جبلی	کھرسفائج یا سفاتج	'کرفس' کو فارسی میں 'کرفس جوینی' کہتے ہیں۔ ہندی میں اس کی جڑ کو 'کہربا' اور اس کی گٹھلی کو 'کھہرنج' کہتے ہیں۔ بقول بشر فزاری 'بزر الکرفس' کو سندھی میں 'کھر سفائج' کہتے ہیں۔ [کرفس کا ذکر الگ دیا گیا ہے اور اس کے بعد 'کرفس جبلی' کا بیان، جس کے تحت بشر فزاری کا مندرجہ بالا حوالہ دیا ہوا ہے۔ کراچی طبع میں 'کھر سفائج' ہے۔ برصا کے نسخے میں 'کھرسفاتج' ہے۔ 'کھر سفائج' خواہ 'کھر سفاتج' سے اصل سندھی نام 'گھر صفائی' کا گمان ہوتا ہے۔ آج کل سندھ کے پنساریوں کے پاس 'مُنھن صفائی' کے نام کی ایک چیز موجود ہے۔ ممکن ہے کہ پرانے دور میں اسے 'گھر صفائی' کہا جاتا ہو۔]
☆ گزمازج	ساکڑ	اصل فارسی نام 'گزمارگ' ہے۔ یہ ایک بیج ہے جو ڈالیوں اور شاخوں میں ہوتا ہے (ثمرۃ الطرفاء)۔ الرسائلی کے بقول یہ 'جوز الاثل' ہے۔ ہندی میں اسے 'ساکھوڑ' کہتے ہیں۔ ['گز' فارسی میں 'جھاؤ' کے درخت کو کہتے ہیں۔ ''ساکھوڑ وہی سندھی 'ساکڑ' (جھاؤ) ہے۔]

☆ کمون (کھمون)	جیروا (=جیرو)	رومی زبان میں اسے 'قومینون' سریانی میں 'کھمونا' اور ہندی میں 'جیرہ' کہتے ہیں۔ ایک اور بیان کے مطابق سریانی میں 'کھمونا' اور 'زیرا' کہتے ہیں اور ہندی لفظ 'جیرہ' سریانی زبان سے لیا گیا ہے۔ مزید ایک اور بیان کے مطابق سریانی میں 'کھمونا ہند' اور فارسی میں 'زیرہ ہندو سیاہ' کہتے ہیں۔ بقول بشر فزاری ہندی میں 'اجاجی' اور سندھی میں اسے 'جیروا' کہتے ہیں۔ [سندھی نام صرف بشر فزاری نے درج کیا ہے۔ 'جیرو' کے سامنے 'الف' دے کر 'جیروا' کر کے لکھا گیا ہے۔]
☆ کہروبا	سونده وینا	مختلف بیانات کے مطابق یہ ایک قسم کا گوند ہے۔ بشر فزاری نے یہ سمجھا ہے کہ 'جذاب الحشیش' کا نام 'کہربا' یا 'قہربا' ہے اور سندھی میں اسے 'سونده وینا' کہتے ہیں۔
☆ لُبنی یا لِبنی	شلہاد یا شلہا	اس پر لبنی نام اس وجہ سے پڑا کہ وہ 'لَبن' (دودھ) کو جماتی ہے۔ بقول بشر فزاری اسے فارسی میں 'فتار و خشک' اور سندھی میں 'شلہاذ' کہتے ہیں۔ [برصا نسخے کا تلفظ 'لِبنی' اور 'شلہاذ' ہے۔ کراچی سے مطبوعہ کتاب میں 'لُبنی' اور 'شلہا' لکھا گیا ہے۔ Tyrax Tree]
لسان العصافیر	اِندرجَوْ	بقول بشر فزاری اسے فارسی میں 'مرغ زفانک' (=مرغ زبانکہ یعنی پرندے کی زبان) اور سندھی میں 'اِندرجَوْ' کہتے ہیں۔ 'اِندرجَوْ' سے 'اَندرجَپ' (اندر جھ) کا گمان ہوتا ہے۔
☆ محروث	سندھی نام نہیں پڑھا جاسکا	یہ 'سیاق الانجدان' ہے اور بعض کا کہنا ہے کہ یہ 'اشترغاز' ہے۔ ابو حنیفہ دینوری (کتاب النبات) کے مطابق یہ 'اصول الانجدان' (انجدان درخت کا تنا یا جڑیں) ہے۔ [بشر فزاری کے بقول یہ 'اصل الانجدان الطیب' یعنی خوشبودار انجدان کا تنا ہے۔ فارسی میں اسے 'گز انگدان خوش' اور سندھی میں لفظ (پڑھنے میں نہیں آیا) کہتے ہیں۔ کراچی طبع کے ایڈیٹر نے 'محروث' کا انگریزی میں نام Asfoetida بتایا ہے۔]

☆ مزدکی	بُول	ہندی میں اسے 'جاطیرس' اور سندھی میں 'بُول' کہتے ہیں۔ [یہ عبارت کتاب الصیدنہ کے نسخہ برصا کے حاشیہ میں لکھی ہوئی ہے۔ کراچی طباعت میں درمیانی الفاظ چھوٹے ہوئے ہیں اور صرف یہ لکھا ہوا ہے کہ ہندی میں اسے ---------------- بُول کہتے ہیں۔]
☆ مصطلکی	کھبہ (= کبہ)	خلیل نے اس کا نام 'کھباءٗ (کباء) بتایا ہے۔ بقول بشر فزاری اسے سندھی میں 'کبہ' اور فارسی میں 'ریباس' یا 'ریباست' کہتے ہیں۔ حمزہ نے اس کا نام 'کبہ' لکھا ہے۔ [سندھی نام 'کبہ' کراچی طباعت کے مطابق ہے۔ نیچے حاشیہ میں ایک نسخے کا رسم الخط 'کھبہ' دیا ہوا ہے۔ برصا والے نسخے میں بھی غالباً 'کبہ' ہے۔ جیسا کہ خلیل اور حمزہ نے بھی 'کھباءٗ اور 'کھبہ' لکھا ہے اس لئے سندھی نام بھی 'کبہ' ہوگا۔ جیسے کہ یہ نام قدیم عرب علماء کی کتابوں میں بھی موجود ہے اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ یہی عربی نام سندھ میں رائج ہوا۔]
☆ المغرۃ	دہاء (دھاء)	حمزہ کہتا ہے کہ یہ ایک سرخ قسم کی مٹی (الطین الاحمر) ہے۔ بقول بشر فزاری اسے فارسی میں 'گلِ سرخ' اور سندھی میں 'دہان' کہتے ہیں۔ [الطین الاحمر یا گلِ سرخ، کے معنی ہیں 'سرخ مٹی'۔ کراچی طبع کے متن میں 'دہان' لکھا ہے اور نیچے حاشیہ میں بتایا گیا ہے کہ برصا نسخے کا رسم الخط 'دہاز' ہے۔ راقم نے برصا نسخے کے مطالعے کے دوران یہ رسم الخط قلم بند نہیں کیا تھا، لیکن صحیح سندھی نام 'دہاءٗ (=دھاء) ہوگا۔ 'دھاءٗ پتھریلی سرخ مٹی ہے جسے کمہار برتنوں پر گلکاری کے لئے استعمال کرتے ہیں۔]
☆ منج	ففی	'منج' عربی نام ہے فارسی میں 'کونک' اور سندھی میں اسے 'ففی' کہتے ہیں۔ یہ اعلیٰ قسم کے معجونوں میں کام آتا ہے، لیکن 'بنج' (بھنگ؟) نہیں ہے۔ اسے 'منج زریق شتان' نیز 'منج طورانی' کہتے ہیں۔ [ففی سے مراد 'پپی' ہے۔ یعنی پوست کا ڈوڈا؟۔]

نارمشک نارمشک	نارعفف (= نارغفن) = ناگ ڦڻ (ناگ پھن)	ہندی میں 'ناگ کھیسر' کہتے ہیں اور سندھی میں 'نار عفف'۔ ایک اور نسخے کے مطابق 'ناروقیسر' ہے۔ دوسری کتابوں میں ہے کہ ہندی لوگ اسے 'ناگیست' کہتے ہیں۔ صحیح ہندی نام 'ناگر متر' نیز 'ناکھفف' یا 'ناکھیسر' ہے۔ یہ ایک عمدہ خوشبودار پھول ہے جس کے پتے گلنار جیسے ہیں۔ [سندھی نام 'نار عفف' خواہ ہندی نام 'ناکھفف' میں آخری 'ف' شاید اصل میں 'ن' ہو اور سندھی نام 'نار عفف' کا 'ع' شاید اصل میں 'غ' ہو اس لحاظ سے 'ناغفن' اور 'ناکھفن' سے 'ناگ پھن' کا گمان پیدا ہوتا ہے۔]
☆ نانخواہ	جواڻ یا جاڻ (جوانڑ یا جانڑ)	سندھی میں اسے 'جوان' کہا جاتا ہے۔ بقول بشر فزاری فارسی میں اسے 'نغن خوالان' یا 'نانخواہ' کہتے ہیں۔ [کراچی ایڈیشن کے ایڈیٹر نے حاشیہ میں لکھا ہے کہ برصا کے نسخے نیز 'ق' نسخے کا رسم الخط 'ج' کی زیر کے ساتھ 'جِوان' ہے لیکن دوسرے نسخوں میں 'ج' کے پیش کے ساتھ 'جُوان' ہے جسے مطبوعہ متن میں برقرار رکھا گیا ہے۔ موجودہ دور میں سندھی تلفظ جَواڻ (جَوانڑ) یا 'جاڻ' (جانڑ) ہے علاقہ تھر میں اسے 'اَجُمونْ' بھی کہتے ہیں۔]
☆ نشا	کيسوان کير (کھیسواں کھیر)	فارسی میں اسے 'نشاستہ' اور سندھی میں 'کھیسواں کھیر' کہتے ہیں۔ یہ وہی لُباب بُرّ ہے۔ ['لباب بُرّ' یعنی گندم کا لباب یعنی 'نشاستہ'۔ 'کھیسواں کھیر' = 'گیھواں کھیر'، 'گیھواں' کے معنی ہیں 'گیھوں کا' = گندم کا۔ 'گیھواں کھیر' بمعنی 'گندم کا کھیر' یعنی 'نشاستہ'۔]
☆ نطرون	رطرولس	یہ 'سرخ بُورق' ہے اور سندھی میں اسے 'رطرولوس' یا 'رطرولس' کہتے ہیں۔ [برصا کے نسخے میں 'رطرولموس' ہے اور کراچی طبع میں 'رطرولس' لکھا گیا ہے۔ ممکن ہے کہ سندھی تلفظ 'رطرولس' اصل لفظ 'نطرون' کی بگڑی ہوئی صورت ہو۔]

☆ نمام	سسرم	یہ 'سینئمر' ہے سندھی خواہ فارسی میں اسے 'سسرم' کہا جاتا ہے۔
☆ السّورہ	شنوا	سندھی میں اسے 'شنوا' اور فارسی میں 'آہک' کہتے ہیں۔ [یہ لفظ غالباً اصل میں 'شنوٗ' تھا جس کے آگے 'الف' لگا کر 'شنوا' کر کے لکھا گیا ہے۔ 'شنوٗ' یعنی 'چُونا'۔]

جڑی بوٹیوں اور اشیاء پنسار کے مندرجہ بالا سندھی نام کم از کم چوتھی صدی ہجری/۱۰ویں صدی عیسوی کے آخر میں اس دور کی تمام علمی دنیا میں رائج تھے۔ یہ سب اشیائے پنسار، سندھ میں بھی استعمال ہوتی تھیں جس سے اس دور میں یہاں کی طبی معلومات اور عملی علاج کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ ان میں سے کچھ اشیاء آج تک سندھ کے پنساریوں کے پاس انہی ناموں سے موجود ہیں اور دیگر کچھ اشیاء موجودہ پنساریوں کے مخصوص ناموں سے معلوم و موجود ہیں۔ یہ نام اور الفاظ اس دور میں سندھی زبان کی پیشہ ورانہ طبی اور لغتِ پنسار کے مخصوص ذخیرے پر گواہ ہیں۔ ان الفاظ کے مطالعہ سے آج سے ایک ہزار سال قبل کی سندھی لغات اور زبان کے بارے میں درجِ ذیل واضح آثار ملتے ہیں:

۱- سندھی زبان میں کچھ الفاظ اور نام، جو کہ اس دور میں رائج تھے، وہ آج متروک ہو چکے ہیں۔

۲- اس دور کے کچھ نام آج بھی معمولی تبدیلی کے ساتھ استعمال میں آتے ہیں، جیسا کہ 'سورن' اور 'رپا' کے بجائے 'سون' اور 'رپو'؛ اگرچہ 'رپو' کے بجائے چاندی کا لفظ زیادہ استعمال ہوتا ہے۔

۳- اس دور کے کچھ الفاظ آج بھی اپنی اصل صورت میں رائج ہیں، جیسا کہ 'لم' جو کہ اب تک شمالی سندھ کی زبان میں استعمال ہوتا ہے حالانکہ وسط اور زیریں سندھ کی زبان میں 'ٹم' زیادہ رائج ہے۔

۴- 'جیرو'، 'شیرو'، 'شنو'، 'ھملو' (ھرملو=حرمل)، 'منگلو' یا 'گم' (گُنم)، 'منگرو'؟(؟) اور 'والوبندلو' یا 'دالو بندلو' (اُن کے آخر میں اُس دور کے رسم الخط میں 'الف' دیا ہوا ہے) الفاظ کی ترتیب سے ظاہر ہے کہ ایک ہزار برس پہلے بھی مذکر اسماء کے آخر کا تلفظ 'او' کی صورت میں تھا جیسا کہ آج بھی ہے۔

۵- ایک ہزار برس قبل سندھی زبان کی اضافی تراکیب 'مضاف الیہ + مضاف' کے جوڑ والی ہوتی تھیں۔ اس طرح کہ ایک تو ان میں مضاف الیہ پہلے اور مضاف بعد میں آنا لازمی تھا۔ حروفِ اضافت 'جا' 'جو' 'جی' اب تک الگ استعمال نہیں ہوئے تھے، مثلاً کھتھور-بلاڑی، میزڑ-ہکل، رپا-کٹ، سورن (سون)-کٹ، بھائن-رت، لاکھل-مول، رنگ- ساون، ناگ- پھن اور گیہواں-کھیر۔

٦- تشبیہی یکسانیت دکھانے کے لئے 'اوں' والی آخر استعمال ہوتی تھی، جیسا کہ ''مور-کرنیوں''۔

نتائج:

رائے خاندان، برہمن خاندان اور عرب - اسلامی دور حکومت میں سندھ کی مسلسل سیاسی وحدت قائم رہی، جس کی وجہ سے سندھ کی مقامی زبانوں میں مرکزیت پیدا ہوئی اور مجموعی طور پر ایک عام فہم 'سندھی زبان' وجود میں آئی۔ عرب - اسلامی دور میں عربی-سندھی رسم الخط اور عام فہم سندھی زبان کے دائرے میں مزید توسیع ہوئی، اگرچہ ملک میں مختلف زبانیں اور مختلف رسم الخط بھی رائج رہے۔

مگر اس طویل عرصہ میں رفتہ رفتہ سیاسی، معاشرتی اور تجارتی روابط کے باعث 'سندھی زبان' میں مزید مرکزیت پیدا ہوئی، زبان کی نفسیاتی کیفیت تبدیل ہوئی، زبان کے تمدنی سرمایہ میں اضافہ ہوا اور زبان کی ترتیب، رسم الخط اور نحو وصرف پر اثر پڑا۔ علمی و تعلیمی ترقی کی وجہ سے 'سندھی زبان' کے عالم اور شاعر پیدا ہوئے۔ عرب علماء نے سندھی زبان، ادب اور رسم الخط میں دلچسپی لی، اس کے بارے میں تحقیق کی اور اپنی معلومات کتابوں میں قلم بند کیں۔ سندھی زبان پہلی بار عربی رسم الخط میں لکھی جانے لگی، جس کی اوائلی اور نادر مثال اس سندھی شاعر کے قصیدے کا شعر ہے، جو اس نے 'یحیٰ برمکی' یا اس کے بیٹے 'فضل' کی تعریف میں کہا تھا۔ محقق البیرونی نے سندھی اور بعض دیگر مقامی زبانوں کے الفاظ اور نام عربی رسم الخط میں لکھے اور عربی حروف پر مزید نقاط لگا کر انہیں سندھی تلفظ کے لئے استعمال کیا۔ سندھ کے دار الحکومت منصورہ شہر اور اس کے قرب و جوار میں ''سندھی-عربی'' رسم الخط نے جنم لیا اور وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ وہ تمام سندھ میں رائج ہوا۔ اس دور میں سندھی زبان کے علمی مطالعہ کا آغاز ہوا اور کچھ مشہور محققین نے سندھی زبان کے بارے میں اپنی آراء قلم بند کیں۔ طبی لغات میں سندھی زبان کی انفرادیت اور بین الاقوامی حیثیت تسلیم کرتے ہوئے کئی جڑی بوٹیوں کے نام دوسری زبانوں کے ساتھ ساتھ سندھی میں بھی لکھنا ضروری سمجھا گیا۔

باب چہارم

سندھی زبان کی تعمیر و توسیع اور زبانی ادبی روایت کی ترقی کا دور

(سومرا دورِ حکومت ۱۰۵۰-۱۳۵۰ء)

پچھلے باب میں ہم بیان کر آئے ہیں کہ عرب - اسلامی دور میں سندھی زبان کی مرکزیت مزید مضبوط ہوئی، اس کی اندرونی نحوی ترتیب میں اضافہ ہوا اور سندھی زبان نہ صرف سندھ میں اہم 'عام ملکی زبان' بنی بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی اس کی اہمیت تسلیم کی گئی۔ اس دور کی اسلامی اور علمی دنیا میں، اس پورے برصغیر میں سے فقط 'سندھی' اور 'ہندی' کو ہی علمی طور پر تسلیم کیا گیا اور الگ الگ تصانیف میں ان ہی زبانوں کا نام لیا گیا۔ اس کے بعد سومرہ دور میں بین الاقوامی سطح پر 'سندھی' کی انفرادی حیثیت اور اہمیت قائم رہی۔ مولانا جلال الدین رومی (۶۷۲ھ/۱۲۷۳ء) جو ساتویں صدی ہجری (سومرہ دور) کے بڑے مفکر تھے، انہوں نے اپنی مشہور 'مثنوی' میں ذاتِ انسانی کی وحدت اور باہمی محبت کا سبق سمجھاتے ہوئے کہا کہ: ذاتِ انسانی کی وحدت، نسل، رنگ یا زبان کے امتیازات اورر اختلافات سے بالاتر ہے۔ اس سلسلے میں زبانوں کے اختلاف کی مثال دیتے ہوئے ''سندھی'' اور ''ہندی'' کا انہوں نے نام لیا اور کہا کہ:

سندیاں را اصطلاحِ سند مدح
ہندیاں را اصطلاح ہند مدح

جس کا خاص مطلب یہ ہے کہ اہلِ سندھ اپنی سندھی زبان اور اہلِ ہند اپنی ہندی زبان بولیں: سندھیوں کو ان کی سندھی زبان محبوب اور مبارک ہو اور ہند والوں کو ان کی ہندی زبان محبوب اور مبارک ہو!

سومرا دورِ حکومت میں عربی اور سندھی کا کسی حد تک سابقہ عرب دور والا تعلق اور رشتہ قائم رہا، عربی انتظامی اور تعلیمی زبان رہی لیکن سندھی کی اہمیت میں اضافہ ہوا کیونکہ رفتہ رفتہ مقامی باشندوں اور مقامی حکمرانوں (سومروں) کی مادری زبان (سندھی) نے مزید مقبولیت حاصل کی۔

دوسرا یہ کہ سومرا دورِ حکومت میں 'سندھی زبان' کی تعمیر و ترقی کے لئے مزید مؤثر سماجی اور سیاسی اسباب پیدا ہوئے: سومروں کا عروج سندھ کے مقامی اسلامی سماج اور مقامی سیاسی قوت کا عروج تھا، جو سندھی زبان کی ترقی و تعمیر کا بھی اہم سبب بنا۔

سومروں کی حکومت کا تاریخی اور جغرافیائی پس منظر

اوائلی سومرہ سربراہان غالباً چوتھی صدی ہجری کے آخر یا پانچویں صدی ہجری کی ابتداء میں سندھ کی دو اہم ریاستوں، منصورہ اور ملتان، کے عرب امیروں کے جانشین ہوئے۔ سومروں کے 'بھاگ'(۱) فقیروں کی روایت کے مطابق سومروں کا پہلا قبائلی سردار ۲۲۱ھ میں ہوا۔ اس کے بعد چوتھی صدی ہجری کے لگ بھگ آخر میں 'امیر ساہو' مشہور سردار بنا، جس کا بیٹا 'امیر سومار' پیدا ہوا جس کے نام کی نسبت سے دوسرے سومرا حکمران مشہور ہوئے۔ امیر سومار خود یا اس کے والد، دادا اور چچاؤں یا بھتیجوں اور بیٹوں نے سندھ کی دونوں ریاستوں منصورہ اور ملتان پر اپنی سرداری قائم کی، ملتان میں چوتھی صدی ہجری کے بالکل آخر یا پنچویں صدی ہجری (گیارہیوں صدی عیسوی) کے آغاز میں سومرا امیروں نے سیاسی اہمیت حاصل کی۔ بعض تاریخی حوالہ جات کی بناء پر کہا جاسکتا ہے کہ اوائلی سومرہ سربراہان فاطمی مبلغین کے زیرِ اثر، دینی یا سیاسی عقیدے کے طور پر بغداد کے خلفاء کے بجائے مصر کے فاطمی حکمرانوں کی طرف مائل ہوئے۔ امیر سومار کا بیٹا راج پال، جو 'ابن سومار' کی عرفیت سے مشہور ہوا اور جس نے ملتان میں سیاسی اہمیت حاصل کی، اس نے غالباً سلطان محمود غزنوی کی ابھرتی ہوئی طاقت کے زیر اثر فاطمیوں سے اپنا منہ موڑا اور تعلق توڑا۔ اس لئے ۴۲۳ھ (۱۰۳۲ء) میں شام کے 'دروزی فاطمی' فرقی کے مبلغ بہاء الدین نے اس کی طرف خط لکھا اور اسے 'دروزی فاطمی عقائد' کی طرف مائل کرنے کی کوشش کی (۲) لیکن یہ کوشش کامیاب نہ ہوسکی۔

پانچویں/چھٹی صدی ہجری میں غزنی اور غور کے سلاطین کی سیاسی طاقت نے، ملتان اور سندھ میں قرمطی، دروزی اور اسماعیلی فرقوں کے عقیدے اور فاطمیوں کے سیاسی اثر کو ختم کردیا اور شمال-مغرب ہندوستان میں ایک نئی ابھرتی اسلامی طاقت کی بنیاد ڈالی۔ اس لئے سومرا سربراہوں

(۱) اسم خاص، ایک ذات کا نام ہے۔ مختلف قبائل اور برادریوں کے نائی، موچی، مانگنے والے اور میراثی الگ الگ ہوتے تھے۔ قدیم دور میں 'بھاگ' سومروں کے فقیر (مانگنے والے) تھے اور 'بھان' سمّوں کے فقیر تھے۔ (مترجم)

(۲) اس خط میں راج پال کو، ملتان کے سربراہ داؤد کو اسماعیلی عقیدے پر واپس لانے اور ملتان والوں کے خلاف کاروائی کرنے کے لئے ابھارا گیا ہے جو غالباً غزنوی سلاطین کی فتوحات کی وجہ سے دروزی اسماعیلی عقائد سے منحرف ہوگئے تھے (خط کے لئے دیکھئے: ایلیٹ کا ''مقامی ماخذوں پر مبنی ہندوستان''، تصحیح 'ڈاؤسن' لندن ۱۸۶۷ء، ص: ۴۹۱-۴۹۳)

نے بھی ایسے عقائد اور فاطمی حکمرانوں سے اپنا تعلق توڑ لیا اور وہ غزنی کے سلاطین اور بغداد کے خلفاء کی طرف زیادہ مائل ہوئے؛ دینی عقائد میں بھی شریعت اسلامی کے مرکزی نظریئے کی حمایت کی اور اپنے لئے 'اسلام کی حمایت' کے القاب اختیار کئے۔

شمال کی طرف سے غزنی اور غوری سلاطین کی بڑھتی ہوئی طاقت کی وجہ سے ملتان کی ریاست سومروں کے ہاتھ سے نکل گئی اور غالباً چھٹی صدی ہجری میں اس کا خاتمہ ہوگیا۔ اس کے باوجود بھی جنوبی حصے میں یعنی موجودہ بہاول پور ڈویژن (قدیم بہاولپور ریاست) کے علاقے میں مقامی طور پر سومرہ حکمران خودمختار حیثیت میں یا سندھ کے سومرہ (اور بعد میں سمہ؟) حکمرانوں کے ماتحت بھی کافی عرصے تک حکومت کرتے رہے۔ 'ہاکڑہ دریا' کے مشرقی کنارے پر 'پتڻ' (گھاٹ) کے پاس ایک شہر آباد ہوا، جو بعد میں ''پتڻ مناري'' (گھاٹ منارہ) کے نام سے مشہور ہوا۔ ایک روایت کے مطابق یہ سومروں کا اہم شہر تھا، بلکہ کسی دور میں ان کا دارالحکومت بھی تھا اور غالباً چودھویں صدی عیسوی تک یہ شہر آباد تھا۔ اسی علاقہ میں 'مروٹ' کا قلعہ (جس کے کھنڈرات ہاکڑہ دریا کے جنوبی کنارے پر واقع ہیں اور وہاں اکبر بادشاہ کے دور کی مسجد بھی موجود ہے۔) بھی سومروں کے قبضہ میں تھا اور وہاں پر ۱۴۹۴ء/۱۴۹۱ء تک 'ملک جام سومرو' حکمران تھا۔ (۱) ان آثار سے ظاہر ہے کہ ملتان کی پوری ریاست سے ان کی اوائلی حکمرانی ختم ہونے کے بعد بھی، سندھ اور ملتان کے درمیانی حصہ پر ان کا بہت عرصہ بعد تک غلبہ برقرار رہتا ہوا آیا۔ اس طرح سندھ اور ملتان دونوں پہلے عربوں اور بعد میں سومروں کے نظامِ حکومت کے تحت رہے اور دونوں میں یکساں سماجی اور سیاسی سلسلے قائم رہے نیز دونوں کے معاشرے اور زبانوں میں گہرا رشتہ استوار ہوا۔ سندھی زبان کا اثر ملتان تک پہنچا، اور ملتان اور سندھ کے (سرے والی) سرائیکی زبان سندھ میں رائج ہوئی: اس طرح سندھی اور سرائیکی گویا دونوں خطوں کی مشترکہ زبانیں بنیں۔

زیریں سندھ میں سومرا طاقت کا آغاز سال ۴۴۸ھ بتایا گیا ہے۔ میر محمد معصوم نے لکھا ہے کہ اس سال سومرا قبائل ''ٹھری'' (موجودہ تحصیل ماتلی میں ٹھری نظامانی) میں جمع ہوئے اور انہوں نے اپنی حکومت قائم کی۔ سندھ کی عام روایات میں دلو رائے بادشاہ کا ذکر موجود ہے۔ چھٹو

(۱) مروٹ کا قلعہ اس سے قبل سومرہ عہد میں بھی آباد تھا جو ۶۴۸ھ (۱۲۵۰ء) میں 'طبقات ناصری' کا مصنف منہاج الدین بھی یہاں آیا تھا۔ ایک اور حوالہ کی رو سے اس قلعہ کے دروازے کے اوپر ہندی (راجستانی) میں درج ذیل کتبہ لگا ہوا تھا، جس میں ملک جام سومرہ کے قلعہ بنوانے کا ذکر ہے ''سمبت (سال) ۱۵۴۸ برکھی پر سدی ۲، مروٹ پتھا ملک جام سومرہ کوٹ پاکی کھٹیل پھرائی'' یعنی سال ۱۵۴۸ (مطابق ۱۴۹۴ء) میں یہ قلعہ بنوایا گیا۔ [بہاول پور ریاست کا گزیٹیئر ۱۹۰۴ء XXXVI-A مطبوعہ لاہور ۱۹۰۸ء، ص ۳۷۲]

اور دلورائے دونوں بھائی تھے، ان کے والد کا نام عمران تھا، اسی وجہ سے 'چھٹو عمرانی' [یعنی چھٹو بیٹا عمران کا] مشہور ہوا۔ دلو رائے غالباً منصورہ کا حکمران تھا، اس کے نام کی نسبت سے اب تک وہ علاقہ 'دلوڑ' کہا جاتا ہے۔ دلو رائے کے خلاف تاریخ طاہری کے یک طرفہ بیان کی وجہ سے، اسے ظالم سمجھا گیا ہے لیکن دوسری بہت ساری روایات کی رو سے وہ بڑا باہمت اور حوصلہ مند حاکم تھا اور کئی بڑے کارنامے اس کے دور میں سرانجام پائے۔ 'مورڑو' کو شیشے کی مشین دلو رائے نے ہی بنوا کر دی تھی، جس کے ذریعے اس نے مگر مچھ کو مارا۔ دودو سومرہ کلاں (دودو نہری) نے دلو رائے کی بیٹی سے شادی کی اور چھوٹا دودو سومرو، دلو رائے کا نواسہ تھا۔ ایک روایت کے مطابق 'وگہہ کوٹ' کا پرگنہ بھی دلو رائے نے ہی دودے کو دیا تھا(۱)۔ دلو رائے کے والد 'عمران' کے نام سے گمان ہوتا ہے کہ وہ شاید منصورہ ریاست کے آخری عرب خاندان کا حکمران تھا، جس کا مطلب ہوا کہ عرب خاندان سندھ کے سومرا حکمرانوں کی ننھیال تھے۔ ایک اور علامت جو تمام عوامی روایات میں موجود ہے، اس کے مطابق چنیسر کی والدہ لوہارن تھی اور دودو (ثانی) ددھیالی خاندان کی، بیوی سے تھا۔ چونکہ دودو کی والدہ دلو رائے کی بیٹی تھی اس اعتبار سے دلو رائے بھی سومرا نسل کا بادشاہ تھا۔ اس اوائلی دور میں دار الحکومت ابھی تک منصورہ میں تھا۔

سندھ میں سومروں کی آبادی کا بڑا مرکز غالباً جنوب-مغربی سندھ اور سندھ اور کچھ کا درمیانی علاقہ تھا۔ 'کچھ-گجرات' کی سرحد پر لڑائیوں، اروڑ کے قریب دریا کی تبدیلیوں اور مشرقی نارہ کی قدیم خود رو نہر میں پانی کی کمی بیشی کی وجہ سے سومروں کی حکومت کے مراکز بھی مٹنے لگے۔ سومروں کی سیاسی طاقت کے اوائلی مراکز بالائی سندھ سے لے کر زیریں جنوبی سندھ تک 'ہاکڑہ ڈھورو' کی آبادی کے سہارے قائم ہوئے تھے؛ 'ہاکڑہ ڈھورو' (مشرقی نارہ) کی آبادی پر وگہہ کوٹ (۲) اور عمر کوٹ، اور مغرب کی طرف 'پران ڈھورو' کی آباد اراضی میں 'ٹھری' (۳) اور روپاہ (۴) ان کی طاقت کے مراکز بنے۔ غالباً ساتویں صدی ہجری (تیرہویں صدی عیسوی) کی ابتداء میں 'پران ڈھورو' میں پانی کی کمی بیشی کی وجہ سے سومروں کی حکومت کا مرکزی دائرہ مزید مغرب کی طرف 'لوہانہ-پٹیہل' ڈھوروں کے آباد علاقے کی طرف بڑھا؛ جس کی وجہ سے موجودہ

---

(۱) دودہ چنیسر سے متعلق مختلف بیانات اور دیگر عام روایات میں یہ آثار و علامات موجود ہیں۔
(۲) جس کے کھنڈرات 'رہمو کی بازار' سے تقریباً چار کوس جنوب مشرق کی طرف رن کچھ میں موجود ہیں۔
(۳) 'ٹھری' کے شاہی کھنڈرات تحصیل ماتلی میں (ماتلی شہر سے) چھ میل شمال مشرق کی طرف واقع ہیں۔
(۴) اس شہر کے کھنڈرات 'روپاہ ماڑی' کے نام سے بدین سے مشرق-جنوب کی طرف اور موجودہ گاؤں 'کڈھن' سے تقریباً چھ میل مغرب-جنوب کی طرف موجود ہیں جہاں پر مقامی روایت کے مطابق دودو اور چنیسر کے قبرستان کے نشانات بھی موجود ہیں۔

ٹھٹہ ضلع میں مغربی طرف دیبل اور مشرقی طرف مُنہمَتُور (۱) ان کی حکومت کے مرکزی شہر بنے۔ ۶۲۱/۱۲۲۴ء میں دیبل کا حکمران 'سنان الدین چنیسر' تھا (۲) جو جلال الدین خوارزم شاہی کے حملے کے وقت دیبل چھوڑ کر چلا گیا۔

سندھی زبان کا پھیلاؤ:

سومرہ دور کے مذکورہ بالا تاریخی جغرافیائی پس منظر کی روشنی میں سندھی زبان کی پہنچ اور وسعت کے بارے میں درج ذیل نتائج ظاہر ہوتے ہیں: ۱- حکمرانوں کی زبان کا حکومت کی حدود کے اندر خواہ سرحدوں تک بڑا اثر ہوتا ہے۔ جنوب- مشرقی سندھ اور سندھ- کچھ کے سرحدی حصے سومروں کی حکومت کے اثر و طاقت کا مرکز بنے، جس کی وجہ سے اس مرکزی علاقہ میں سندھی زبان پھیلی۔ ابتدائی اور درمیانی دور میں سومروں کی طاقت کا رخ کچھ، کاٹھیاواڑ اور گجرات کی سرحدوں کی طرف رہا، اس وجہ سے کچھ کی طرف سومروں، سموں اور سندھ کی دوسری قوموں کی بستیاں قائم ہوئیں اور کچھ میں 'سندھی زبان' پھیلی۔ گجروں کے ساتھ سومروں کی لڑائیوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ 'سندھی زبان' اور کاٹھیاواڑ- گجرات کی زبانوں کا ایک دوسرے سے تعلق شروع ہوا۔ ۲- سومروں کی کچھ اور کاٹھیاواڑ کی طرف متعدد بستیاں (جو ۱۹۴۷ء میں پاکستان قائم ہونے تک سلامت تھیں) اس قدیم دور کے سیاسی اور معاشرتی اثر کی یادگار ہیں۔ عمرکوٹ میں سومروں کے سیاسی مرکز، اور 'سوڈھوں' کے ساتھ ان کے تعلق کی وجہ سے سندھی اور سوڈھوں کی زبان کے محاوروں (ڈھاٹکی، پارکری وغیرہ) میں میل جول ہوا نیز سندھی زبان علاقۂ تھر میں عام ہوئی۔ ۳- سومروں کے ابتدائی دور کے بعد جیسے ہی ان کی طاقت کے مراکز اندرونِ سندھ کے علاقوں میں قائم ہوئے تو وسطِ سندھ کے سمہ اور دیگر قبائل کو سومروں کی حکومت میں مزید دخل حاصل ہوا، جس کی وجہ سے سمہ اور درمیانی سندھ کے دیگر قبائل کی زبان، جو کہ نسبتاً زیادہ صاف اور عام فہم تھی زیادہ رائج ہوئی، اور اس نے معیاری سندھی زبان کی تعمیر و ترقی کے لئے میدان ہموار کیا۔

---

(۱) یہ نام 'محمد طور' خواہ دیگر مختلف تلفظات کے ساتھ لکھا ہوا ملتا ہے، لیکن اس کا عام مشہور زبانی تلفظ 'مہمتور' یا 'مامتور' یا 'مُنہمتور' ہے۔ مشہور مقامی کہاوت ہے کہ ''مُنھُن' متور میں کندھ کپور میں'' اس کہاوت کے ذریعے زیادہ درست یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ نام 'مُنھُن' +متورُ ہے، یعنی متور > متو سومروں کے علاقہ متور (نہر یا خودرو نالا؟) کا 'رخ'۔ 'مُہمتور' کے کھنڈرات تحصیل جاتی میں موجود بستی 'شاہ کپورُ کے متصل جنوب مشرق میں ایک بڑے علاقہ میں پھیلے ہوئے ہیں جہاں شہر کی جامع مسجد کی بنیادوں کے نشانات ہم نے تقریباً بیس برس قبل (تقریباً ۱۹۵۸ء) واضح طور پر موجود دیکھے تھے۔

(۲) تاریخ ''طبقات ناصری'' میجر راورٹی کا ایڈیشن کلکتہ طبع ۱۸۶۴ء، ص ۱۷۳، ''تاریخ جہاں کشا'' مصنف عطا ملک جوینی، گب میموریل طبع لندن، جلد ۲، ص ۱۴۸

۴- سومروں کی حکومت، عرب-اسلامی حکومت کی جانشین تھی، اور اس وجہ سے قدیم دستور کے مطابق عربی سومروں کے دور میں بھی تعلیم و ترتیب خواہ سرکاری کاروباری زبان کے طور پر جاری رہی سومروں کے دور میں 'معیاری سندھی زبان' کی مزید تعمیر و ترقی کے لئے دوسرے درج ذیل اسباب سودمند ثابت ہوئے:

(الف) اس دور میں سر زمین سندھ اور اس سے متصل علاقوں میں بڑے دین دار، اولیاء اور درویش پیدا ہوئے جنھوں نے عوام کی روحانی اور اخلاقی تربیت کے لئے 'ذکر' اور 'سماع' کے سلسلے قائم کئے، جس کے ذریعے تصوف و طریقت، فیض و ہدایت، ارادت و عقیدت، ذکر و فکر کے سلسلہ کے کئی الفاظ و اصطلاحات، جملے اور مثالیں سندھی میں رائج ہوئیں۔

(ب) مقامی تاریخ اور مقامی کہانیوں کی تلاش کی خاطر روایت اور راویوں کا جو سلسلہ عرب-اسلامی دور سے شروع ہوا تھا وہ سومروں کے دور میں مزید بڑھا۔ سمجھدار اور سلیقہ مند افراد پیدا ہوئے جنھوں نے مقامی واقعات اور کہانیوں کو یاد رکھا اور بیان کیا۔ خاص طور پر بھاٹوں میں سے 'بھاگ قبیلہ' کے فقراء سومرہ قوم کے نزدیک آئے اور ان کی نسلوں پشتوں کو یاد رکھا نیز دیگر سماجی کردار ادا کئے۔ اس وقت سے 'راج بھاگ' (یعنی راج اور بھاگ یعنی ہر 'راج' کا ایک 'بھاگ' ہوتا ہے) کی اصطلاح رائج ہوئی اور اب تک رائج ہے۔ بھاٹوں، بھانڈوں(۱) اور دیگر منگتوں اور میراثیوں نے اس دور کی عشقیہ داستانوں، لڑائیوں اور واقعات کو بیان کرنا اور گانا شروع کیا، اور یہ قصہ خوانی اور گانے کا فن بعد میں سموں کے دور میں عروج کو پہنچا۔ نسلوں، پشتوں، کہانیوں، واقعات اور بہادروں کی بہادری کو بیان کرنے کے جذبے نے، سندھی زبان میں 'بیان' کی وسعت پیدا کی اور قصہ اور رجز خوانی کے ذوق نے سندھی سرود میں اضافہ کیا (۲) واقعات اور قصوں کو گانے کی خاطر عوامی شعر کی ایک صنف 'ڳاھہ'' (۳) نامی پیدا ہوئی اور عام مقبول ہوئی۔ 'ڳاھہ' ہندی 'دوہا' سے الگ ایک خاص سندھی صنف ہے اور اس کا نام 'ڳاھہ' بھی سندھ کے تاریخی پس منظر کے لحاظ سے بدھوں کے قدیمی ''گاتھا'' کی یادگار تھا۔ ذیل میں ہم ان سلسلوں پر مختصراً، اس دور کی مثالوں کے ذریعے روشنی ڈالیں گے۔

---

(۱) (ڀان) اسم خاص۔ ایک ذات کا نام ہے، قدیم مسلمان منگتوں کی برادری، جس کا خاص پیشہ داستانیں، کتھائیں سنانا اور دان وصول کرنا ہوتا تھا۔ یہ لوگ خاندانوں کے شجرے یاد رکھتے اور شادی کے موقع پر سناتے ہیں۔ سندھ میں ان کی ذیلی شاخیں: آمنانی، پنڈیا، ہُر با (ھرٻا)، موتیا، لیدا (ليڏا)، والا، چھنانی اور پنجی پار ہیں۔ ان میں سے ایک شخص 'اِجن' نام کا ہوگزرا ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ اس نے جام انڑ سمہ سے دان وصول کیا۔ دیکھیئے: جامع سندھی لغات، جلد دوم، ص: ۵۲۲ (مترجم)

(۲) تفصیل کے لئے دیکھئے ہماری کتاب "سنڌي موسيقي جي مختصر تاريخ" (بھٹ شاہ ثقافتی مرکز، بھٹ شاہ/ حیدرآباد سندھ، ۱۹۷۸ء) باب پنجم: سرود موسیقی ص ۹۳-۱۰۶)

(۳) دیکھیے: ص:۲۴، حاشیہ نمبر۲ (مترجم)

سندھی میں ذکر اور سماع کے سلسلے:

سومروں کے دور میں ملتان کے غوث بہاؤ الدین زکریا (۵۷۸-۶۶۱ھ/۱۱۸۲-۱۲۷۵ء)، پاک پتن کے بابا شیخ فرید الدین مسعود گنج شکر (۱۲۷۵ء-۱۱۷۳ء) اُچ کے سید جلال سرخ بخاری (غوث صاحب کے معاصر و مرید)، شیخ عثمان قلندر شہباز (وفات ۶۷۱ھ/۱۲۷۲ء) اور شیخ حسین عرف پیر پٹھو (وفات ۶۴۶ھ/۱۲۴۸ء) بڑے اولیاء اور درویش تھے، جن کا سندھ میں بڑا اثر تھا اور جنھوں نے عوام الناس کی اخلاقی اور روحانی تربیت بھی کی۔ یہ تمام بزرگ سومرہ دور میں ہو گذرے اور سومرہ حکمرانوں کی بھی ان کے ساتھ عقیدت تھی۔ ان بزرگوں کی خانقاہوں، خاص طور سے غوث صاحب اور بابا فرید گنج شکر کی خانقاہوں سے ذکر کے سلسلے شروع ہوئے۔ چونکہ سندھی زبان میں بیان کی صلاحیت پیدا ہوچکی تھی اس لئے ذکر اور سماع کے سلسلے سندھی میں بآسانی شروع ہوئے؛ سندھی 'ذاکرین' اور 'قوال' سندھ اور ملتان کے خطوں میں مشہور ہوئے اور سندھی 'ابیات' اور 'کافیاں' منظوم ہونے لگیں (۱)۔

پیر پٹھو اور قلندر شہباز کی درگاہوں پر رکھے ہوئے کچھ بڑے نقارے سومرہ حکمرانوں کی طرف سے نذرانے کے طور پر دئے ہوئے ہیں۔ سومرہ حکمرانوں کی غوث صاحب کے ساتھ بھی عقیدت تھی۔ تاریخ معصومی کے حوالہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ دودو سومرو، ۱۲۴۸ء-۱۲۴۶ء کے عرصہ میں، غوث صاحب کے خلیفہ حضرت پیر پٹھہ سے ملتان میں ملا اور انہیں درگاہ کے لیئے زمین دینے کا وعدہ کیا۔

غوث صاحب (ملتان) اور بابا فرید (پاک پتن) کی درگاہوں سے جو ذکر و سماع کے سلسلے شروع ہوئے، وہ مقامی زبانوں خاص طور پر سندھی اور سرائیکی میں تھے۔ غوث صاحب کے مریدین و معتقدین کی بڑی تعداد سندھ سے تھی، نیز سندھی 'ذاکر' اور 'قوال' ہی ان کے سلسلۂ سماع کے قائدین تھے۔ جنھوں نے سماع کی محافل میں سندھی شعر بڑے سوز و گداز سے پڑھے نیز ذکر کا سلسلہ سندھی اشعار میں قائم کیا۔

غوث بہاؤالدین زکریا کا اثر ملتان اور سندھ میں اس قدر تھا کہ شیخ فرید گنج شکر اس خطے کو شیخ بہاؤالدین کا علاقہ کہا کرتے تھے (۲) ان کا پوتا شیخ رکن الدین (وفات ۱۳۳۵ء) سومرہ حکمرانوں کے آخری دور میں ہوگزرا ہے۔ مؤرخ ضیاء برنی کی تحریر کے مطابق تمام اہلِ سندھ ان کے مرید ہوگئے اور کئی علماء بھی ان کے حلقے میں داخل ہوگئے تھے (۳)۔ حضرت شاہ رکن عالم کے یہاں بھی سماع کی محفلیں ہوتی تھیں جن کا قاعد (منتظم) قوال 'حسن سندھی' ہوتا تھا، جو سندھی

(۱) "سنڌي موسيقي جي مختصر تاريخ" باب پنجم، ص: ۸۴-۹۲

(۲) میر حسن سجزی: فوائد الفوائد ص ۱۳۸

(۳) تاریخ فیروز شاہی ص ۳۴۷

اور فارسی کلام گاتا تھا۔ ایک مرتبہ شیخ حضرت شاہ رکن الدین کے مرید شیخ عثمان نے اسے کہا کہ: میر حسن! کچھ سنائیے! جس پر اس نے معذرت چاہی لیکن شیخ عثمان نے اسے بہت مجبور کیا؛ جس پر میر حسن نے شیخ سعدی کے کچھ اشعار سنائے (۱)

شیخ فرید گنج شکر (۵۶۹-۶۶۴ھ/۱۱۷۳-۱۲۷۵ء) کی تعلیم و طریقہ کا سلسلہ بھی سندھ تک پہنچا ہوا تھا اور ان کے سلسلے میں سماع کو خاص اہمیت حاصل تھی اس لئے سندھی ذاکرین اور قوالوں نے یقینی طور پر پاک پتن میں ان کی خانقاہ پر بھی سماع کی محفلیں قائم کی ہوں گی۔ ایک حوالہ کے مطابق دہلی میں شیخ نظام الدین اولیاء کے پاس شیخ فرید گنج شکر کا مرید حسین سندھی نامی قوال رہتا تھا، جس وقت وہ سرود کرتا اور گاتا تھا تو حضرت شیخ پر وجد طاری ہو جاتا۔ (۲) غالب گمان ہے کہ حسین سندھی قوال نے شروع میں حضرت شیخ فرید کی خانقاہ پر سماع و سرود کیا اور بعد میں وہاں سے حضرت نظام الدین اولیاء کی خدمت میں حاضر ہوا۔

بابا فرید گنج شکر کے ذکر اور دوہوں میں سندھی الفاظ:

میر خورد کرمانی نے 'سیر الاولیاء' میں بتایا ہے کہ ''شیخ فرید ہندی زبان اچھی طرح بول سکتے تھے'' (۳) 'ہندی' سے مراد ملتان اور سندھ کی مقامی زبان 'ہندوی' ہوسکتی ہے جو اس دور میں سرائیکی-سندھی زبانوں کی آمیزش والی زبان تھی۔ شیخ فرید نے اپنے مریدین کو اپنی اپنی زبان میں ذکر کرنے کی تلقین کی تاکہ وہ الفاظ کو سمجھ سکیں اور ان کے دل پر اثر ہو۔ محمد غوثی گوالیاری نے اپنی کتاب ''جواہر خمسہ'' میں (۴) اس ذکر کے تین جملے درج کیے ہیں، جن کی ترتیب سے ظاہر

---

(۱) تذکرہ قطبیہ، تصنیف جمال الدین ابو بکر الہ آبادی، طبع کردہ مرحوم پیر غلام دستگیر نامی، لاہور، ۱۳۷۱ھ، ص ۱۳۶، ۱۳۸۔ حسن سندھی نے شیخ سعدی کے درج ذیل اشعار پڑھے:

چو سر بپائی تو انداختم خیال تو رفت
کہ من ازان توام تا ز دل نیندازی
بہ نیزہ بازی مژگان مریز خون مرا
کہ نیست ز کشتن خون عاشقان بازی

(۲) تذکرہ قطبیہ ص ۱۳۶-۱۳۷

(۳) سیر الاولیاء، طبع دہلی ۱۳۰۲ھ، ص ۱۸۳

(۴) جواہر خمسہ کے مخطوطۂ سندھ یونیورسٹی کی عبارت درج ذیل ہے؛ جیسا کہ فی الحال کسی دوسرے نسخے کو دیکھنے کا موقع نہیں ملا اس لئے اس عبارت کو ہی پیش نظر رکھا گیا ہے: ''بندگی حضرت قطب الاقطاب حضرت شیخ فرید گنج شکر قدس سرہ ذکر ایں از ہندوی وضع فرمودہ اند، باید بدیں سند:

اھون تو اھو نہ تون اھھین تون

طریق ایں ذکر دریا بہ جلسہ معھود نگاہ دارد و روی آسمان کردہ بطریق کرشمہ نگریست بہ زبان گوید کہ ''اھون تون'' لمحہ چشم را وا دارد یا روی زمین کردہ و ہمان طریق دیدہ بزباں گوید کہ ''اھو نہ تون'' لحظہ نظر بر زمین دارد بعدہ بہ دارد بر خود گمارد پیاپی سہ کرت یاغت کرت ''اھھین تون'' گوید تا مادام کہ حضور یگانگی است قرار گیرد۔

ہے کہ یہ سرائیکی -سندھی کے ہیں۔ اگرچہ بگڑے ہوئے رسم الخط کی وجہ سے پوری طرح سمجھ نہیں آئے تاہم تیسرا فقرہ ''اھیں توں'' غالباً سندھی فقرہ ''آھین ھین توں'' (=آھین ئی توں = اے اللہ! توں ئی آھین) ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت بابا فرید مسعود گنج شکر عام مقامی زبان 'ہندوی' سے واقف تھے، لیکن بعض عام روایات میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ انہوں نے ''ہندوی'' میں دوہے کہے۔ کچھ محققین کی رائے میں وہ دوہے، جو 'بابا فرید' کے نام سے منسوب ہیں وہ بابا فرید مسعود گنج شکر کے کہے ہوئے نہیں بلکہ ان کے جانشینوں میں سے 'فرید ثانی' کے کہے ہوئے ہیں۔ ایسے دوہے سکھوں کی مذہبی کتاب ''آدگرنتھ'' (گروگرنتھ) کے آخری پانچویں حصے ''بوگ'' (بھوگ) کے زیرِ عنوان دیے گئے ہیں، جن سے ظاہر ہے کہ کچھ دوہوں پر سرائیکی سندھی کا رنگ چڑھا ہوا ہے، اس سلسلے میں درج ذیل دوہے غور طلب ہیں (۱)

سَرَوَرَ پَنکي هيڪڙو، ڦاهيوال پچاس
اه لهري گڊ ٿيا، بچي تيري آس

[تالاب یا جھیلَ میں پرندہ اکیلا ہے اور اسے پھنسانے والے پچاس جمع ہوکر آگئے ہیں، اب تیرے ہی آسرے وہ پرندہ بچ سکے گا]

اِني نِڪي جَنگيمْ، ٿل ڏوگر ڀويوم
اج فريدَ ني ڪوجڙا، سو ڪُهان ٿيوم

[ان چھوٹی ٹانگوں کے ساتھ میں نے تھر ریگستان عبور کئے فریدا! آج تو (قریب رکھا ہوا) کوزہ بھی سو کوس مجھ سے دور ہوگیا]

فريدا سبنئان من مائڪ، ڏاهڻ مول مَ چانگوا
جي توء پري دي سڪ، هيانئْو نه ڏاه ڪهين دا

(۱) یہ 'سلوک' آدگرنتھ میں دیے گئے ہیں لیکن بابا فرید کا کلام آخری دور کی دیگر تصنیفات میں بھی درج شدہ ہے مثلاً سندھی کتاب ''شیخ فرید صاحب جن جا جیون چرتر ۽ شبد'' (مطبوعہ 'گورسنگت' ہیرآباد، حیدرآباد، ۱۹۲۶ء میں درج ذیل سندھی آمیز سلوک دیے گئے ہیں:

صبر منجهه ڪمانڻ، اي صبر ڪاني هٽو
صبر سندا باڻ، خالق خطا نه ڪري

ترجمہ: صبر کمان کمان میں ہوتا ہے، صبر بان اور بھالا مارنے والا ہوتا ہے، صبر کے تیر خالق خطا نہیں کرتا۔

دلهه محبت جن، سيئي .... سچئا
جن من هور سلڪ هور، سه ڪاڍي ڪچئا

ترجمہ: جن کے دل میں محبت ہے، وہی ---------- سچے ہیں جن کے مَن میں وہم و اندیشہ وہ محبت کے کچے ہیں

ٻيڙا ٻنڌ نه سڪيو، ٻنڌن ڪي ويلا
ڀر سرور جب اوڇلي، تب ترڻ ڏهيلا

ترجمہ: بیڑے کو باندھنا (یعنی لنگر انداز کرنا) نہیں سیکھا، جب اس کے باندھنے کا وقت تھا۔ جب تالاب کے کنارے سے پھینک دیا اس وقت تیرنا مشکل ہوا۔

[فریدا تمام لوگوں کا من، موتی ہے اور اسے توڑنا بالکل اچھا نہیں اگر تجھے محبوب کی سچی یاد ہے تو کسی کا بھی دل نہ توڑ]

فريدا گلي مهُ سجن وِيهه، اک ڊونڊيندي نه لهان
دکاڻ جيبه ماليهه، کارڻ تنا ماهري

[فریدا! باتونی خیر خواہ تو بیسیوں ہیں لیکن (ان میں سے) تلاش سے بھی نہیں ملتا میں اوپلے کی طرح جل رہا ہوں ان سچے دوستوں کی خاطر]

ان دوہوں کے رسم الخط کو ہم نے کوشش کر کے اسی طرح ہی لکھا ہے جس طرح 'آدگرنتھ' میں ہے: یعنی کم از کم ۱۶۰۴ء تک (جس دور میں آدگرنتھ تالیف ہوا) یہ دوہے اسی طرح ہی پڑھے جاتے تھے۔ پہلے دو دوہوں میں سندھی اثر نمایاں ہے؛ نہ صرف اتنا بلکہ ان ہی معنوں میں درج ذیل سندھی اشعار آج تک مشہور ہیں، جن سے گمان ہوتا ہے کہ فرید کے مندرجہ بالا دوہے سندھی اشعار کی ترجمانی ہیں کیونکہ ان میں نہ صرف تصور وہی ہے بلکہ سندھی الفاظ اور جملے بھی وہی سمائے ہوئے ہیں:

سر ۾ پکي هيڪڙو، پاڙهيري پنجاه
رکي هڪ الله، لڏي لهرين وچ ۾(۱)

[تالاب میں پرندہ ایک اور شکاری پچاس ہیں اسے اللہ ہی اپنی پناہ میں رکھے، لہروں کے درمیان ہچکولے کھا رہا ہے]

ٿر ڈونگر بر روه، ميي سپ مناڙيا
اَگڻ اسي کوه، هاٺي هن جماز کي (۲)

[تھر پربت، ریگستان، پہاڑ اونٹ نے سب عبور کر لئے لیکن اس تیز رفتار اونٹ کے لئے آنگن اسی کوس کے فاصلے پر ہے۔]

تیسرے اور چوتھے دوہے کی دونوں سطروں میں قافیے درمیان میں آئے ہوئے ہیں، حالانکہ ہیئت کے اعتبار سے 'دوہے' کی دونوں سطروں میں قافیے آخر میں آتے ہیں۔ 'دوہرا' کے معنی ہیں 'دو سینگ والا' یعنی دونوں سطروں کے آخری قافیوں والا۔ دوہرے (دوہے) کی ترتیب میں درمیانی 'قافیہ' لانے والی مندرجہ بالا ترمیم غالباً سندھی اشعار کی ترتیب کے زیرِ اثر آئی، جو اس دور میں سندھی ذاکروں نے سماع کی محفل میں پڑھے۔

---

(۱) یہ شعر شاہ صاحب کے رسالے میں موجود ہے۔

(۲) یہ شعر سلسلہ مند منعت گروں کی زبانی روایات کے ذریعے چلتا آیا ہے۔ ہم نے ٹالپور امراء کے دور کی ایک قلمی کتاب دیکھی جس میں شاعر غلام علی مداح نے میر مراد علی خان کا کلام جمع کیا ہے اس کے آخر میں یہ شعر درج ذیل طور پر غلط لکھا ہوا ہے۔ بہر حال اس سے ظاہر ہے کہ گزشتہ صدی میں یہ شعر ادیبوں اور شاعروں کو بھی معلوم تھا

"ٿر ٿر ڏيهه ڏونگر هن، ميي سپ مناڙيا
هاٺي هن جماز کي آڱڻ پڻ اسي کوهن"

سندھ کی عوامی داستانوں اور مشہور قصوں کی بنیاد

سومرہ دور کے سندھی ماحول میں عام محافل کے ذریعے مقامی قصوں۔کہانیوں عشقیہ داستانوں اور بعض دیگر خاص واقعات کا دستور اور بیان شروع ہوا۔ سندھ کے عام مقبول قصوں اور داستانوں کے عنوانات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے بیشتر کی بنیاد سومرہ دور میں پڑی (۱) ان میں سے اوائلی داستان غالباً "سسئی پنہوں" کی ہے جس کی بنیاد سندھ اور بلوچستان کے درمیان قافلوں کے ذریعے تجارتی ماحول پر مشتمل ہے۔ یہ تجارت سندھ اور عراق کو ملانے والی شاہراہ کے ذریعے ہوتی تھی جو عرب۔اسلامی دور میں لسبیلہ، کیچ مکران، کرمان اور اہواز سے ہوتی ہوئی عراق تک جاتی تھی اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ یہ قصہ عرب دور کے بالکل آخر یا سومروں کے ابتدائی دور کا ہے۔ دریا بھی اس قدیم دور میں بھنبھور کے پاس سے رواں تھا۔ اس قصہ میں، سندھ میں بلوچوں کی آمد کی اہم علامت موجود ہے؛ سندھ کی طرف بلوچوں کی یہ دوسری ہجرت تھی جو چوتھی/پانچویں صدی ہجری میں تقریباً سومرہ دور کے ابتدا میں ہوئی۔ (۲)

دوسرا قصہ 'سیف الملوک' کا ہے جس میں اروڑ کے قریب سے دریا کے رخ بدلنے کا ذکر ہے، جس کے ساتھ مشرقی نارہ کے قدیم بہاؤ کا تاریخی تعلق ہے۔ سیف الملوک کا تالاب اور کنواں "کڈھن" (تحصیل بدین) سے چار پانچ کوس مشرق۔جنوب کی طرف، مشرقی نارہ کی قدیم دراڑ کے مغربی کنارے پر موجود ہیں۔ ان ناموں کا افسانے کے اس پس منظر کے ساتھ یہ تعلق ہے کہ سیف الملوک تاجر کے بیڑوں کا قافلہ اسی ہاکڑہ دریا سے گذرا اور اروڑ (الور) (۳) پہنچا، جہاں کے حاکم نے اس کی گھر والی 'بدلیع

---

(۱) میر علی شیر نے "تحفۃ الکرام" میں بھی اکثر قصے سومروں کے دور کے ذیل میں بیان کئے ہیں، البتہ انہوں نے سسئی پنہوں کی داستان کو اس دور سے پہلے کا شمار کیا ہے۔

(۲) چوتھی صدی ہجری کے عرب سیاحوں اور جغرافیہ نویسوں کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ بلوچ قبائل 'کرمان' سے بلوچستان کی طرف ہجرت کر چکے تھے۔ مزید تفصیل کے لئے دیکھئے لوک ادب سلسلے کی بتیسویں کتاب 'سسئی پنہوں' کا مقدمہ۔

(۳) قبل از اسلام سندھ کا پایۂ تخت جس کے کھنڈرات روہڑی سے پانچ میل جنوب مشرق کی طرف مشرقی نارہ (ہاکڑہ دریا) سے متصل، قدیم دریا کے کنارے پر موجود ہیں۔ اب اسی مقام پر اسی نام سے ایک چھوٹا گاؤں موجود ہے۔ سید ابوظفر ندوی 'سندھ کی تمدنی تاریخ' کے باب کے تحت "تجارتی مراکز" کے زیر عنوان پرانے دور میں سندھ کی منڈیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: چوتھی منڈی ارور ہے، جس کو 'الور' بھی کہتے ہیں، یہ سندھ کا قدیم پایۂ تخت تھا یہ بہت بڑا آباد شہر تھا، یہاں بھی تجارت کی بڑی منڈی تھی۔ سندھ کے بڑے شہروں میں سے اس کی سرحد پر سب سے آخری بڑا شہر تھا۔ ابن حوقل تحریر کرتا ہے کہ "سندھ کے بڑے شہروں میں سے ایک ارور ہے، طول و عرض میں ملتان کے برابر ہے اس کی دو شہر پناہ ہیں یہ بھی دریائے سندھ کے مشرقی جانب آباد ہے لیکن اس کا شمار منصورہ کی حدود میں ہے۔ بہت ہی ارزاں اور خوشحال شہر ہے، تجارت کی بھی گرم بازاری رہتی ہے"۔ تاریخ سندھ، ص: ۲۸۴ (مترجم)

الجمال' پر نظر بد ڈالی(۱) جس کی وجہ سے اس سلیقہ مند کاریگر نے راتوں رات دریا کا رخ اروڑ کے مقام سے بھکر کی طرف موڑ دیا (۲) روہڑی کے قریب دریائی جزیرے پر خواجہ خضر کی خانقاہ(۳) میں ایک اینٹ پر ایک کتبہ لگا ہوا تھا، جس سے گمان ہو رہا تھا کہ وہ پانچویں صدی ہجری کا ہے اور اس میں دریا کے رخ بدلنے کی طرف اشارہ تھا (۴)۔ پانچویں صدی ہجری کا ابتدائی زمانہ سومروں کی ابھرتی طاقت کا زمانہ ہے اور غالباً اسی دور میں دریا نے اپنا اہم بہاؤ اروڑ کے مقام سے تبدیل کیا اور روہڑی کے قریب سے بہنا شروع ہوا۔ تیسرا قصہ "مورڑو اور مگر مچھ" کا ہے جس کا مرکز 'سون میانی' اور 'کلاچی' (کراچی) کا سمندری کنارہ ہے جو سندھ اور عراق کی شاہراہ پر واقع ہے۔ اس کے علاوہ مورڑو کا تعلق 'دلو رائے' کے دربار سے بتایا گیا ہے، جس کا دورِ حکمرانی غالباً عربوں کے زوال اور سومروں کے ابتدائی دور میں تھا(۵)۔ چوتھا قصہ "سورٹھ اور رائے ڈیاچ" کا ہے، یہ قصہ بھی سومرہ دور ہی کا ہے(۶) کیپٹن ولبرفورس کے بیان کی رو سے ہمیر سومرو نے ۱۰۲۰ء کے لگ بھگ "جاسل" نامی ایک دلہن اغوا کی جس کی وجہ سے رائے ڈیاچ نے سندھ پر لشکرکشی کی (۷)۔

پانچواں قصہ "سومل۔راٹو" ہے جس میں بالواسطہ ہمیر سومرو کا نام آیا ہے۔ (۸) چھٹا قصہ "عمر مارئی" کا ہے جس میں عمر سومرو کا نام واضح ہے (۹)۔ ساتواں قصہ "لیلاں-چنیسر" کا ہے یہ بھی سومروں کے دور کا ہے۔ 'چنیسر' نام سومروں کی نسل سے ظاہر ہوا اور وقت کے دیگر راجاؤں اور حاکموں نے بھی اس نام کو اختیار کیا۔

---

(۱) تاریخ طاہری کے مصنف نے بدیع الجمال کو سیف الملوک کی بیٹی بتایا ہے، جبکہ تحفۃ الکرام کے مصنف نے بیوی۔ دیکھئے تاریخ طاہری، ص۳۴-۳۵، ۳۵۹، تاریخ سندھ حصہ اول، ص۴۳۱ نیز سید ابوظفر ندوی نے بدیع الجمال کو سیف الملوک کی بیوی لکھا ہے۔ تاریخ سندھ، ص۲۵۹، تحفۃ الکرام، ص: ۱۳۱ (مترجم)

(۲) تاریخ طاہری فارسی متن (راقم کی وضاحت اور مقدمے کے ساتھ) مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ ۱۹۶۴ء، ص۲۷-۲۵

(۳) مؤلف تاریخ لب سندھ خان بہادر خدا داد خان نے عرب دور کی تعمیرات کے حوالے سے لکھا ہے کہ خواجہ خضر کی خانقاہ دریائے سندھ کے درمیان میں واقع ہے، جسے 'ہندو' 'جند پیر' یا 'زندہ پیر' کہتے ہیں اس کی تاریخ تعمیر "درگاہ عالی" سے ۳۴۱ھ نکلتی ہے جو کہ ۹۴۹ء کے مطابق ہے۔ تاریخ لب سندھ، ص۳۵ (مترجم)

(۴) ۱۹۵۰-۱۹۵۵ء کے عرصے میں راقم نے یہ اینٹ خود جاکر دیکھی تھی اس کے بعد سکھر بیراج کی وجہ سے دریا کی گہرائی کم ہوگئی جس کی وجہ سے پانی بلند ہوا اور جزیرہ کی عمارتیں زیرِ سیلاب آگئیں۔ بہرحال کوزنس کی انگریزی کتاب "سندھ کے آثار" (Antiquities of Sindh) میں اس کتبہ کا فوٹو موجود ہے۔

(۵) تفصیل کیلئے دیکھئے راقم کی مرتب کردہ، لوک ادب سلسلہ کی چھتیسویں کتاب "مورڑو ۽ مانگر مڇھ" سندھی ادبی بورڈ، حیدرآباد، ۱۹۶۷ء، مقدمہ

(۶) ایضاً لوک ادب سلسلہ کی ۳۸ویں کتاب "سورٹ ۽ راءِ ڏياچ"، سندھی ادبی بورڈ، ۱۹۷۶ء، مقدمہ

(۷) تفصیل کیلئے دیکھیے راقم کی مرتب کردہ لوک ادب سلسلہ کی ۳۳ویں کتاب "سومل راٹو"، سندھی ادبی بورڈ، ۱۹۷۵ء، مقدمہ

(۸) ایضاً لوک ادب سلسلہ کی ۳۷ویں کتاب "عمر مارئی" سندھی ادبی بورڈ، ۱۹۷۶ء، مقدمہ

(۹) ایضاً لوک ادب کی ۳۱ویں کتاب "لیلا چنیسر" سندھی ادبی بورڈ، ۱۹۷۱ء، مقدمہ۔

چنیسر 'داسٹرؤ'(۱) تھا اور اس دور میں زیریں سندھ کے خطۂ لاڑ کے ایک حصے کا راجہ تھا (۲)۔ آٹھواں قصہ ''سوہنی-میہار'' کا ہے۔ سندھ کی قدیم روایات کے مطابق 'سوہنی اور میہوال' کی قبریں شہداد پور میں ویران دریا کے کنارے پر ہیں جسے ''لوہانو دریا'' (لوھاٹو دريا) یا ''سوھڻي جو ڍورو'' (سوہنی کا ڈھورہ) (۳) کہا جاتا ہے۔ سندھ کا یہ قصہ بھی سومروں کے ابتدائی دور یا اس سے بھی پہلے کا ہے۔ (۴)۔

بعد میں یہ مشہور قصے سندھ کی ادبی عمارت کے ستون ثابت ہوئے اور ان کے ذریعے سندھی زبان کی لغت، لطافت، فصاحت اور بلاغت میں بہت اضافہ ہوا، اس کے علاوہ بعض دیگر مشہور کہانیوں اور داستانوں کی بنیاد بھی مقامی روایات کے مطابق عرب حکومت کے آخر اور سومروں کے دورِ عروج میں ثابت ہوتی ہے۔ جن میں سے ایک قصہ ''مل محمود اور مہر نگار'' کا ہے، جس کا تعلق 'شاہ مکائی' (عرف جیئے شاہ) کے ساتھ ہے، جو پانچویں یا چھٹی صدی ہجری میں نیرون کوٹ (حیدرآباد) میں وارد ہوا۔ (۵)

دوسرا قصہ ''ڈمن سنار'' کا ہے جسے غالباً سب سے پہلے سندھ کے ہنرمند قصہ خوانوں نے پہیلیوں اور معموں کے ذریعے گایا (۶) روایت کے اعتبار سے ڈمن سنار کے قصہ کا تعلق بھی 'دلو رائے' کے دربار سے ہے۔ خاص سومرہ حکمرانوں سے متعلق ''عمر اور گنگا'' کا قصہ ہے جس کا ذکر تاریخ طاہری کے مصنف نے کیا ہے(۷)۔ اس کے علاوہ ''خدا دوست اور محمود غزنوی'' کا قصہ بھی آج تک سندھ کی مقامی روایات میں مشہور و معروف ہے؛ تاریخی لحاظ سے یہ قصہ پانچویں صدی ہجری کی ابتداء کا ہے جس زمانے میں سلطان محمود غزنوی نے سندھ کی سرحدوں میں قدم رکھا تھا۔ یہ سومروں کا بالکل ابتدائی دور تھا بعد میں یہ قصہ سومروں کے دور ہی سے گایا جانے لگا۔ (۸)

---

(۱) داسٹرؤ اسم خاص۔ سومروں کے ایک خاندان (گھرانہ، قبیلہ یا ذات) کا نام ہے۔ (مترجم)

(۲) کیپٹن ولبر فورس کی ''کاٹھیاواڑ کی تاریخ'' کے مطابق رائے ڈیاچ کا بیٹا ''رائے نوگھن'' گجرات سے سندھ پر حملہ آور ہوا۔

(۳) ڈھورو نشیبی زمین نیز اس پرانی اور خشک نہر کو کہتے ہیں جس میں پانی نہیں آتا ہو یا ایسی نشیبی جگہ جس میں پانی جمع ہو جائے نیز دریائے سندھ کے پرانے بہاؤ کو بھی ڈھورو کہتے ہیں۔ (مترجم)

(۴) ایضاً لوک ادب سلسلہ کی تیسویں کتاب ''سھڻي-ميھار'' سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد، ۱۹۷۲ء، مقدمہ

(۵) ایضاً لوک ادب سلسلے کا ۲۹ ویں کتاب۔ مشہور سندھی کتاب۔۷ ''ٻاھريان قصا ۽ عشقيہ داستان'' سندھی ادبی بورڈ، ۱۹۶۴ء۔

(۶) ایضاً لوک ادب سلسلے کی ۲۷ویں کتاب 'ڳاھن مان ڳالھيون'' سندھی ادبی بورڈ، حیدرآباد، ۱۹۶۴ء-مقدمہ

(۷) راقم کی تصحیح کردہ تاریخ طاہری، مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد، ص ۳۶-۴۰

(۸) قصے کی روایت کیلئے دیکھئے راقم کی مرتب کردہ لوک ادب سلسلہ کی ۲۹ویں کتاب ''ٻاھريان قصا ۽ عشقيہ داستان'' سندھی ادبی بورڈ، ۱۹۶۴ء

غور طلب بات یہ ہے کہ عرب دور کے آخر اور سومرہ دور کی ابتداء میں ان قصوں اور داستانوں کی بنیادیں قائم ہوئیں اور سومرہ دور میں وہ زبان زد عام ہوئیں اس اعتبار سے کہا جاسکتا ہے کہ سومرہ دور میں سندھی زبان میں ادائگی بیان کی صلاحیت پیدا ہوچکی تھی جو ابتدائی طور پر ان قصوں اور داستانوں پر غور وفکر کیا گیا اور انہیں بیان کیا گیا جس کی وجہ سے بعد میں وہ قصے زبانی روایات کے ذریعے مشہور اور محفوظ ہوگئے۔

سومرہ دور کی لڑائیوں کے بارے میں پہیلیاں اور مُعمّے

سندھ کی موجود عام مقبول روایات میں سومرہ دور کی کچھ مشہور لڑائیوں اور سومرہ حکمرانوں اور بعض سمہ سرداروں کی بہادری سے متعلق منظوم داستانوں گاتھا میں پہیلیاں/مُعمّے اور اشعار ملتے ہیں جن میں سے زیادہ تر اگرچہ گزشتہ دور کے قصہ گو منگتوں، بھاٹوں، بھانڈوں، گویّوں اور (آورد سے کہنے والے) سلیقہ مند دانا لوگوں کے کہے ہوئے لگتے ہیں لیکن کچھ 'پہیلیوں والے اشعار' ایسے ہیں جو تاریخی علامات اور زبان کی قدامت کے لحاظ سے کافی قدیم معلوم ہوتے ہیں۔ غالب گمان ہے کہ وہ سومرہ دور میں کہے گئے اور مسلسل زبانی روایات کے ذریعے سینہ بہ سینہ ہم تک پہنچے ہیں۔ اس طرح کے مُعمّے اور اشعار بالخصوص سومرہ دور کے تین مشہور معرکوں-یعنی (الف) سومروں اور گجروں کی لڑائیوں (ب) سومروں اور سلطان علاؤالدین کے لشکر کی لڑائیوں (ج) آخری سومرہ بادشاہ ہمیر کے ساتھ جام ہالہ اور اس کے بیٹوں کے درمیان جنگ-سے متعلق ہیں اس دور کی عام یاد داشتہ روایات کی بنیاد پر ذیل میں ان واقعات پر مختصراً روشنی ڈالی جاتی ہے۔

(الف) سومروں اور گجروں کی لڑائیاں:

ہم اوپر کہہ آئے ہیں کہ غالباً سومرہ حکومت کے اوائلی دور میں سومروں کی گجھ اور گجرات کی سرحدوں پر گجروں کے ساتھ لڑائیاں ہوئیں۔ گجروں کی حکومت جو سندھ کے جنوب-مشرق سرحد سے متصل تھی اس کا دار الحکومت ''بھنمل'' (ضلع جسونت پور ریاست جودھ پور) یا بقول کنگھام 'باہڑمیر' میں تھا یہ حکومت نویں صدی عیسوی کے ابتداء تک قائم رہی مگر سندھ کی طرف سے عربوں کی فتوحات اور ہند کی طرف سے کاٹھیاواڑ، گجرات اور مالوہ کے راجاؤں کے حملوں کی وجہ سے گجروں کی حکومت اس خطہ سے ختم ہوئی اور ان کا دار الحکومت ''قنوج'' میں قائم ہوا۔ غالباً اسی کشمکش میں کچھ گجر قبائل اور ان کے سردار کاٹھیاواڑ اور گجرات کی طرف نکل گئے اور وہاں رفتہ

رفتہ چھا گئے۔ اس لئے وہ دیس جو کبھی سنوراشٹر' (سورٹھ) کے نام سے پکارا جاتا تھا وہ تقریباً پا گجروں کے حملے کے وقت اس کی طرف مدد کیلئے کسی دانا گویّہ کے ذریعے پیغام بھیجا گیا چونکہ ''دودو'' اپنے رشتہ داروں سے ناراض ہوکر آیا تھا اس لئے گویّہ سے کہا کہ: اگر کمزور ہوئے ہیں تو کسی باندی نوکرانی کا رشتہ دے کر ہی صلح کرلیں۔ اس پر گویّہ نے اسے جواب میں کہا کہ:

جَرَ نہ کُٹن ڪِنگرين، راوَ نہ گِنيدن ويڻ،

گولي ويئي گجرين، توءِ چُندا دودي ڀيڻ.

[(رہٹ کے ٹھیکر کے لوٹے) لوٹوں سے دریا ختم نہیں ہوتا اور نہ ہی طنز و ملامت راجئوں کو جوڑ سکتا ہے گجروں کے ہاں اگرچہ لونڈی ہی چلی گئی، لیکن لوگ یہی کہیں گے کہ دودو کی بہن گئی ہے]۔

اس معمائی شعر کی زبان اس کی قدامت کی گواہی دیتی ہے۔ گویّے نے دانائی کے ساتھ دودو کو یہ بات سمجھادی کہ کسی لونڈی باندی بھیجنے سے حرم سرا میں کوئی کمی نہیں آئے گی؛ لوٹیوں کے بھرنے سے کنویں کا پانی کم نہ ہوگا اور نہ ہی گجر طعنہ دے کر عزت گنوائیں گے۔ مگر یہاں پر سوال ننگ و ناموس اور عام شہرت کا ہے کیونکہ لوگوں کے منہ بند نہیں ہوں گے۔ اگر ہماری کوئی باندی بھی بیاہ کر گجروں میں چلی گئی تو لوگ یہی کہیں گے کہ ''دودو'' کی بہن ہے۔ یہ سن کر دودو اپنی تمام رنجشیں ختم کرکے واپس آ گیا اور اپنے بھائی ''ڈونگر رائے'' کا حامی و مددگار بنا۔ ڈونگر رائے پہلے ہی رشتہ دینے کی مخالفت کرکے جنگ کیلئے تیار بیٹھا تھا، اب ان دونوں بھائیوں نے مل کر بہادری کے ساتھ گجروں کا مقابلہ کرکے میدان مار لیا۔ شاہ صاحب کے رسالے میں درج ذیل شعر اسی جنگ کی نشاندہی کرتا ہے:

ٻين سيني ڏنيون، ڏني نہ ڏونگر راءِ،

اٺ ڏنين آڏو ٿئي، ڏنيون ڏئي ڪياءِ(۱)

[باقی سب نے (خوف کے مارے) اپنی عزتیں حوالے کردیں البتہ ڈونگر رائے نے نہیں

---

(۱) اصل معمہ اسی طرح تھا، جس میں آخری دور کے معمہ گو دانا راویوں نے ذیل کی سطر بڑھادی ''لوڙيون لک متا، تنهن متيري موتانيون'' ترجمہ: اس دلیر نے اپنے اوپر سے لاکھوں تیر تفنگ ہٹادیئے۔

ڈاکٹر صاحب کی تحقیق و تصحیح سے شائع شدہ 'شاہ جو رسالو' میں یہ مُعمہ ان مصرعوں پر مشتمل ہے:

ٻئين ٻِرني ڏنيون ، ڏي نہ ڏونگرُ راءُ

اَٺَ ڏِنيِن آڏو ٿري، ڏنُيون ڏي ڪٿا

لوڙهيونْ لکَ متا، انَ مَتيري سوٽائيون.

دیکھئے ''شاہ جو رسالو'' مطبوعہ شاہ عبداللطیف بھٹ شاہ ثقافتی مرکز بھٹ شاہ، طبع اول ۱۹۷۴ء، ص ۴۷۰ (مترجم)

دیں۔ وہ ان دیکھی عورتوں کا بھی تحفظ کرتا تھا، پھر دیکھی بھالی عورتیں کسی کے حوالے کیونکر کرتا]۔

گجروں اور سومروں کی کشمکش غالباً کافی عرصہ تک چلتی رہی۔ اس زمانے میں سمہ، سومروں کا دایاں بازو تھے اور سندھ اور کچھ کی سرحد کی وجہ سے وہ گجروں سے مقابلے بھی کرتے رہے۔ اس طرح کا ایک قدیم مقابلہ کچھ کے سمہ 'جام پونئرے' اور گجروں کے سردار ''ویر گجر'' کے درمیان ''ہمیر سومرو'' کے دور حکومت میں ہوا۔ پہلے گجروں نے حملہ کیا اور یہاں سے مویشی ہانک کر لے گئے بعد میں ''جام پونئرے'' نے گجروں کے ملک پر جوابی حملہ کرکے وہاں سے چھینے ہوئے مویشی واپس کروائے:

پُونَرِي ڪيا پَرياڻ، 'ٻرڙي' تي ٻَرَ ٻِيا،
تِني وِجي واريون، لوڙيون لڪ مٿا.

[جام پونئرہ نے عہد و پیمان کئے اور حملہ کرکے (ویر گجر کے ملک میں) 'برڑو' پہاڑ کے درہ سے چھینے ہوئے مویشی واپس لے آیا](۱)

چاوَت ڪري چڙهيو، گجر گهو مَلِٺا،
پَواڙا پونئري پيلِينَ، گهٽا وچ ڪٺا.

[ویر گجر اپنے دارالحکومت ''گھوملے'' سے بڑے تاؤ کے ساتھ لشکر لے آیا لیکن ''جام پونئر'' کے ساتھیوں نے درمیان میں بڑے مقابلے کیے]

اس مقابلے میں گجروں کو کامیابی حاصل ہوئی جس کی وجہ سے جام پونئرے نے جا کر بادشاہ ہمیر سومرہ سے مدد طلب کی۔ جس کے نتیجے میں ہمیر وہاں سے جنگ کے لئے روانہ ہوا۔

جِينَ ڏونگر تِينَ هاٿيا، جين ڪيريون تين ڇتَ
هَمِيراڻي فوجَ، ڪر اڳا اُپ نَڪتَ

[فوج کے ہاتھی پہاڑ کی طرح تھے اور ان کے اوپر بڑے بڑے چھتر اس طرح تھے جیسے کھیری کے درخت(۲) ہمیر کی فوج (نیزوں، تلواروں اور زرہوں کی روشنیاں بکھیرتے) اس طرح حملہ آور ہوئی گویا آسمان پر نچھتر طلوع ہو رہا ہو]۔(۳)

---

(۱) 'ڳاهن سان ڳالهيون' ص:۸۳ پر یہ شعر یوں درج ہے:

پونئري ڪيا پرياڻَ، ٻرڙي تي ٻر ٻيا
تنين وڃي واريون، لوڙيون لڪَ مٿان(مترجم)

(۲) ایک قسم کا پہاڑی درخت۔ (مترجم)

(۳) 'ڳاهن سان ڳالهيون' ص:۸۴ پر یہ شعر یوں درج ہے:

جيئن ڏونگر تيئن هاٿيا، جيئن ڪيريون تيئن ڇَتر
هميراڻي فوج ڪَر، اڳا اُپ نکتر (مترجم)

(ب) سومروں کی علاؤ الدین کے لشکر کے ساتھ جنگ:

سندھ میں ''دودو چنیسر'' اور علاؤ الدین کا قصہ زمانۂ قدیم سے مشہور ہے جس کا ذکر (اگرچہ ایک ضعیف روایت ہی کے ذریعے) ''تاریخ طاہری'' کے مصنف نے ساڑھے تین سو سال قبل ''۱۰۲۱-۱۰۳۰ھ'' میں کیا ہے(۱)۔ سندھ میں اس قصے کی مسلسل اور عام طور پر تسلیم شدہ روایات سے گمان ہوتا ہے کہ اس قصے کے پیچھے سومرہ دور کا تاریخی پس منظر موجود ہے۔ تاریخی لحاظ سے سلطان علاؤ الدین (۱۲۹۶-۱۳۱۶ء) کے سپہ سالار ظفر خان کا سنہ ۶۹۷ھ (۱۲۹۷-۱۲۹۸ء) کے لگ بھگ سندھ پر حملہ آور ہونا ثابت ہوتا ہے(۲)۔ سندھ کی ایک مقامی روایت کے مطابق اس زمانے میں ''اسد الملت'' دودو سومرو حکمران تھا جس کی وفات ایک روایت کے مطابق سنہ ۷۰۰ھ (۱۳۰۰/۱۳۰۱ء) میں ہوئی (۳)۔

سلطان علاؤ الدین کے سپہ سالار اور سومروں کے درمیان لڑائیاں اگر ۶۹۷-۷۰۰ھ میں فرض کی جائیں تو وہ مقابلے سومرہ دور کے اختتام سے تقریباً پچاس ساٹھ برس پہلے ہوئے۔ اس لحاظ سے کہا جاسکتا ہے کہ دودو - چنیسر اور علاؤ الدین کی جنگی داستان سن ۷۰۰ھ کے بعد یعنی آٹھویں صدی کی ابتداء سے بیان ہونے لگی اور آج تک اسے بیان کیا اور گایا جاتا ہے۔

یہ قصہ سندھ کی ایک قدیم جنگی داستان (EPIC) ہے جس کی بنیاد یقینی طور پر سندھ کے سومرہ اور دہلی کے سلاطین کے درمیان کوئی خون ریز لڑائی ہے؛ البتہ اس داستان کی ساخت اور ترتیب میں سندھ کے پیشہ ور قصہ خوانوں، بالخصوص بھاٹوں، بھانڈوں، گویّوں اور آورد سے اشعار بنانے والوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ اس جنگی داستان کی روایات میں کئی مُعمّے اور اشعار شامل ہیں جن میں سے اکثر پچھلے قریبی دور کے معلوم ہوتے ہیں؛ مگر کچھ روایات میں آئے ہوئے بعض مُعمّے قدیم ہیں اور وہ غالباً سومروں کے آخری دور کے ہیں۔ مثلاً:

بھونگر راؤ نے کہا:

پيڙهي ڏيان پٽ کي، ڀونگر چيو ڀيو،
ان در متي او سونهي ٻڌو لِوالو

[جڑ، نسل بنیاد بیٹے کو دوں، بھونگر نے کہا واہ واہ
اس دروازے پر اس کا جھنڈا بندھا دلکش لگے گا]۔

---

(۱) ''تاریخ طاہری'' فارسی متن، مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ، ص ۴۰-۴۱

(۲) ''تاریخ فیروز شاہی'' (تصنیف ضیاء برنی ۷۵۸ھ) مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۲ء، ص ۲۵۳-۲۵۴ اور طبقات اکبری (تصنیف نظام الدین بخشی ۱۰۰۲ھ) مطبوعہ کلکتہ ۱۹۲۷-۱۹۳۵ء، جلد ۱، ص ۱۴۲

(۳) ''دولت علویہ'' یا ''سومروں کی حکومت'' طابع مولوی عبید اللہ شائق ۱۹۲۹ء)

علاؤالدین سے چنیسر نے کہا:

سِهر سنياِيم سومري، ڀونگر ـ ڌي ڪيڻاء،
ڀونيي ــ چنڊ پٽاندري جيڪر تو جڳاء(۱)

[سومروں سے ایک دلہن میں نے تیار کرلی ہے تیرے لئے بھونگر کی بیٹی چودھویں کے چاند کی سی۔ اللہ کرے کہ وہ تیرے لئے موزون ثابت ہو]۔

انہوں نے کہا ''سامَ''(۲) ابڑو کے پاس جائے گی تو سکھ حاصل کرے گی

ڏيوچاٽا سونَ جا، هونِ آڏاٽيا ارٽ،
آڳهه ماٽيندي ابڙي، وڏي ڪنه ورٽ.

[چرخے (سوت کاتنے کے لیے) اور کھڈی (کپڑا بننے کے لیے) سونے کے ہوں گے۔
چین سکون سے رہیں گی ابڑو کے پاس بڑے نصیب پائینگی۔

ابڑو نے کہا:

سِر سين آهينم سومريون، جي سرٽيون ڏيان سي،
سورج سئون نه ايري، ڌرتي ڌاج نه ڏي

[سومرہ ذات کی عورتیں میرے سر کے ساتھ ہیں، اگر یہ گھر کی باریک لکڑیاں میں دے دوں تو کبھی سورج طلوع نہ ہو اور زمین سے ہریالی ہی نہ اُگے]۔

ابڑو ''سام'' کی خاطر بہت بہادری سے لڑا:

اڙ آڏي هئي ابڙي، نَوَ ڇليون ڏهه لک،
گهوڙي ڪنڌ نه ڦيريو، ماري او خلق

[ابڑو نے دفاع کی خاطر لاکھوں فوج تیار کی تھی
گھوڑے نے گردن نہیں پھیری مخلوق کے مارنے سے

ابڑو مارا گیا اور اس کا سر نیزے پر چڑھایا گیا:]

اپ سيڪهين اُچو، اپ نه اُچو ڪوء،
مٿي به مٿي ٿئو، سورهه سِرُ سندوء

[آسمان سب سے اونچا ہے آسمان سے کوئی اونچا نہیں

---

(۱) اصل مصرعہ یہ ہے لیکن پچھلے قریبی دور میں اس میں ایک اور سطر ملائی گئی کہ: ڏڙي سا دو دي جهلي وانتو ڙڪي وڃاء

(۲) ''سامَ'' اس کی جمع ساموں ہے جس کے معنی ہیں: پناہ، امان، حفاظت۔ ''سام هونڻ'' کے معنی ہیں: پناہ میں آنا یا امان میں رہنا اس طرح ''سام جهلڻ'' یا ''سام ڏيڻ'' کے معنی ہیں کسی کو پناہ دینا، اسے اپنی حفاظت میں لینا۔ (مترجم)

اس دلیر کا سَر، مرنے کے بعد بھی اونچا ہوا]۔

ان مُعمّوں میں کئی قدیم اور انوکھے الفاظ ہیں مثلاً یوء واہ واہ! ؛ لِوالو = جھنڈو (جھنڈہ)؛ سِھر = ڪنوار (دلہن)؛ ڪيڻاءِ = تولاءِ (تمہارے لئے)؛ دہوچاٹا = چرخا ؛ آڈاٹیا = تیار رہٹ(ڪتڻ لاءِ = کاتنے کے لئے)؛ ورٹ = سٽاء (ترتیب)؛ پونگر = ڌي (بھونگر-بیٹی) کی اضافی ترکیب (حرف اضافت کے بغیر) وہی ہے جو عرب-اسلامی دور سے پہلے خواہ بعد میں رائج تھی، جیسا کہ بشر فزاری اور البیرونی کے بیان کردہ پنساریوں کی اشیاء کے ناموں سے ظاہر ہے(ا)۔ آخری مُعمّہ کی تراکیب میں حرف جر 'کھان' (= سے) یا 'کھاں پوءِ (= سے بعد/ کے بعد) نہیں لائی گئی: 'اُپ نہ اُچو' یعنی "اُپ کان نہ اچو (آسمان سے اونچا نہیں)"، 'مٿي' یعنی "مٿي کان پوءِ" (مرنے کے بعد)

(ج) کچھ کے علائقے میں مہڑ اور مناہین کی واگھم چاوڑہ کے ساتھ جنگ:

سندھ اور کچھ کی عام روایات کی رو سے سندھ کے سمہ خاندان میں سے "لاکھو" کے دو بیٹوں "مہڑ" اور "مناہین" نے کچھ میں "واگھم چاوڑہ" کو قتل کر کے اس کے ملک پر قبضہ کرلیا تھا۔ علاقہ کچھ کی روایات کے مطابق یہ واقعہ بکرمی سال ۹۰۰ میں ہوا لیکن روایتی علامات سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ واقعہ بعد میں سومرہ دور میں رونما ہوا۔ اس وقت "واگھم چاوڑہ" "کوٹیسر" اور "کنڈ" کے علاقے کا سردار تھا۔ جس کے پاس "مہڑ" اور "مناہین" جاکر ٹھہرے تھے اور اسے "کالکا ماتا" کی قسم کھا کر اعتماد دلایا کہ: ہم تمہارے خیر خواہ ہوکر رہیں گے۔ بعض روایات کے مطابق "واگھم چاوڑہ" ان کا ماموں تھا۔

جو تواسين پترون، تہ ماتا پاٽا وچ،
ماتا سَمريون من ۾، اسين سما ڪچون سَچ.

[اگر تیرے ساتھ ہم بدعہدی کریں تو ہمارے درمیان میں 'ماتا' ہے
مَن میں 'ماتا' کو یاد کرتے ہیں، ہم سمہ لوگ سچ بولتے ہیں] اس کے بعد جب "مہڑ" اور "مناہین" نے اپنا اثر و رسوخ بڑھا لیا تو "واگھم چاوڑہ" کو مار ڈالا اور اس کے شہر "پاٹھ گڑھ" پر قبضہ کرلیا؛ نہ صرف اتنا بلکہ انہوں نے یہ بھی کہا کہ وہ سات دیگر سردار بھی قتل کریں گے:

ماريو واگهم چاوڙو، اسين اسان جي هٿ،
جيڙو چاڙيو هيڪڙو، تيڙا چاڙينداسين سٽ.

(ا) دیکھئے! اوپر ص: ۶۲، ۶۳، ۶۴ اور ص: ۶۸-۸۷۔

[واگھم چاوڑہ ہم نے اپنے ہاتھوں مار دیا، جس طرح کا یہ ایک ہم نے مارا ہے اس طرح کے دوسرے سات ماریں گے]۔

جب ''کنھو'' اور ''کنڈ'' پر ''مہڑ'' اور ''مناہین'' کا قبضہ ہوا تو انہوں نے ''کنٹھ قلعہ'' بنوایا۔ اس زمانے میں سات چاوڑہ سردار بہت طاقتور تھے جن کا دار الخلافہ ''گنتری'' شہر تھا جس کے چاروں طرف قلعہ تھا دوسرے تمام سردار انہیں خراج دیتے تھے اور موسم کے لحاظ سے ہر جنس کا حصہ پہنچاتے تھے۔ ''واگھم چاوڑہ'' گھاس کی سات گاڑیاں دیتا تھا لیکن ''مہڑ'' اور ''مناہین'' نے چودہ گاڑیاں دینے کا وعدہ کر کے خود کو سرخرو کیا۔ اور ان پر اعتماد پختہ ہوا۔ بعد میں ساز باز کر کے انہوں نے گھاس کے نیچے اپنے ہتھیار بند لوگ بٹھا دیے جن میں ''گھنگھر'' نامی 'جت' ایک بڑا پہلوان تھا۔ جب گاڑیاں ''گنتری'' قلعہ کے دروازے سے داخل ہوئیں تو ایک بوڑھے پہر دار کو شک ہوا لیکن دوسرے پہرے داروں نے اس کی بات نہیں سنی اس نے کہا:

چٽي چاڙ ـدرواڻ: اڄ نہ گڏين گاھہ،
ڪانْ تانْ مونگ سقريل، ڪان تان آلو ماہ.

(چاڙـدرواڻ = چاوڑوں کا دربان، گڏين = بڑی بیل گاڑی (جمع ہے)، ڪانْ تانْ = یا تو، سقريل = سبز پھلیوں سمیت (مونگ سقريل یعنی ہری پھلیوں سمیت مونگ) آلو ماہ = خون آلود گوشت، تازہ گوشت۔

[چاوڑوں کے دربان نے کہا کہ آج بیل گاڑیوں میں گھاس نہیں آئی
ان میں ہری پھلیوں سمیت مونگ ہیں یا پھر خون آلود تازہ گوشت۔]

اس طرح ''گنتری'' کے قلعے پر ''مہڑ'' اور ''مناہین'' کا قبضہ ہو گیا، کچھ کا بڑا علاقہ ان کے زیر حکومت آ گیا۔ ان کا دار الخلافہ ''کنٹھ کوٹ'' ہی رہا جہاں پر بعد میں ان کی اولاد حکمران ہوئی۔ ''جام مہڑ'' کا مقبرہ اب تک وہاں موجود ہے۔

(د) جام ہالہ اور ہمیر سومرہ کی لڑائی:

یہ لڑائی سومرہ حکومت کے زوال اور سمہ خاندان کی ابھرتی طاقت کے دور میں ہوئی۔ سومروں کا آخری حاکم ''ہمیر بن دودو'' تھا جو غالباً ٹھٹہ کی طرف سمہ خاندان کی بڑھتی ہوئی طاقت کی وجہ سے عمر کوٹ کی طرف مچھلی کے شکار پر گیا ہوا تھا، جس کی وجہ سے اس کی طرف پیغام گیا کہ:

آھگورل پوچڙ يارا، اڄ گھر جين ھت،
سومرن ماري سما، ڪُنرن پريا رت

[اے بڑی آنکھوں والے محبوب! آیئے، آج تیری یہاں ضرورت ہے
سمّوں نے سومروں کو مار کر خون سے ناند بھر دیئے ہیں۔]

جب جنگ ہوئی تو فتح کا پلہ ''جام ہالہ'' کا بھاری ہوا اور ''ہمیر'' مارا گیا اور سومرہ حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔ ''جام ہالہ'' کا بیٹا ''ہوتھی'' بھی اس جنگ میں مارا گیا جس پر ''باگھی'' نے بین کیا کہ:

هوٿي جي ڦٽي هو، گيوڙَ گيوڙَ گل،
سڀ مرن سومرا، توءِ ڪونهي ڦٽي تُل

['ہوتھی' کی کنگھی دیتے وقت بالوں میں بننے والی ہر لہر میں پھول ہوتا تھا
تمام سومرہ مر جائیں تب بھی تیری کنگھی کا مثل نہیں]۔

سومرہ دور کی ان لڑائیوں کے بیانات سے متعلق کئی مُعمّے آج تک دانا لوگوں کو یاد ہیں اور کئی صدیوں سے سینہ بہ سینہ برزبان روایات کے ذریعے ہم تک پہنچی ہیں۔ مذکورہ بالا مُعمّوں کی ترتیب زبان قدیم ہے اور ان کا مضمون بھی ان قدیمی واقعات کے مطابق ہے، جس کی وجہ سے کہہ سکتے ہیں کہ اس قسم کے مُعمّے غالبًا سومروں کے دور کے ہی ہیں۔

سومروں کی سخاوت کے بارے میں بھانڈوں اور گویوں کی شکایت: (۱)

سومروں سے پہلے عرب حکمران تھے اور سخاوت عربوں کی اجتماعی زندگی کا اہم جزو تھی۔ سورج غروب ہونے کے بعد قافلوں کی بیٹھک کے وقت آگ کے الاؤ روشن کرتے تھے تا کہ مسافر وہاں آسکیں۔ سندھ میں سمہ قبائل نے قدیم دور میں اسلام قبول کیا اور عربوں کے ساتھ زیادہ میل ملاپ میں رہے، جس کی وجہ سے سخاوت ان کی زندگی کا شعار بن گئی۔ عرب - اسلامی دور میں سومرہ غالبًا سندھ کے جنوب مشرقی علاقے کچھ - سندھ کی سرحد پر رہتے تھے اور وہ عربوں کی حکومت کے آخری دور میں ان کے قریب آئے۔ دوسرا یہ کہ سومروں کی اصل بستیاں سندھ کے جنوب مشرقی علاقے میں تھیں جو زیادہ آباد بھی نہیں تھا۔ اس لئے سومروں کے پاس سخاوت کے لئے خاطر خواہ سرمایہ بھی نہیں تھا۔ بہرحال جب سومرہ حکمران ہوئے تو ان کے پاس

(۱) ممکن ہے کہ انہوں نے سمہ سربراہوں سے انعام کی لالچ میں سومروں کے خلاف اس قسم کی شکایات کی ہوں۔

عربوں جیسی سخاوت نہ رہی۔ آگ کے وہ الاؤ جو اس دور میں عرب اور دیگر پڑوسی بستیوں میں بیٹھک کے وقت روشن ہوتے تھے وہ سومروں کی آبادیوں اور بستیوں میں کچھ مدہم اور کمزور جلنے لگے۔ اس لئے اس دور کے کسی بھاٹ یا گویّے نے سومروں کی مذمت کی کہ:

سجو قسيَ سومرا، اَڌ قسي ہيو لوڪ،
جھيٽي ہارڻ جھوڪ، نہ تہ ليڙ پيائي لاتون ڪري

[یعنی اگر آدھی ملامت تمام جہاں پر پڑی تو سومروں پر ساری ملامت پڑی، کیونکہ (باوجود اس کے کہ وہ سربراہ اور سردار ہیں، پھر بھی) ان کی بستیوں کی آگ مغرب کے بعد بیٹھک کے وقت مدہم اور کمزور ہو جاتی ہے۔ البتہ دوسرے اوقات میں وہ زیادہ روشن رہتی ہے]۔ اس شعر میں مغرب کے وقت آگ سلگانے اور الاؤ روشن کرنے کی قدیم رسم کی طرف اشارہ ہے، اس وجہ سے یہ شعر سومروں ہی کے دور کا ہو سکتا ہے۔

شمالی سندھ یعنی بہاول پور کے علاقے کی ایک قدیم روایت (۱) کے ذریعے سومروں کے آخری دور کا ایک شعر ملا ہے، جو ابھی تک اس علاقہ کے عمر رسیدہ لوگوں میں مشہور و معروف ہے۔ جو آج ظاہر ہے کہ سندھی زبان سے ناواقفیت کی وجہ سے یہ معنی قدرے اپنے اندازے پر

---

(۱) یہ روایت بمع شعر، بہاول پور ریاست گزیٹیئر (پنجاب ریاست گزیٹیئر سلسلہ نمبر ۱۹۰۴)
A - xxxvi مطبوعہ لاہور ۱۹۰۸ء، ص ۷۸-۳۷۷) میں "پتن" شہر کے بیان کے تحت دی ہے جہاں سے اردو ترجمہ کی صورت میں "پتن منارا" کے عنوان سے رسالہ "العزیز"، بہاول پور (ماہ فروری ۱۹۴۱ء، ص:۴۱-۴۴) میں بھی شائع ہوئی۔ ہم نے اس روایت کو قدرے وضاحت کے ساتھ اور شعر کے رسم الخط اور درستگیٔ معنی کے ساتھ یہاں پیش کیا ہے۔ گزیٹیئر (ص:۳۷۸) میں اس شعر کو انگریزی رسم الخط میں اس طرح لکھا گیا ہے:

Dhari Dhura Rae Jainh Charan Sankhya
Pattan Patijo thio sej Wataye Sah
Hamira Pura raj na kanda Sumra

رسالہ "العزیز" میں شعر اور اس کے معنی کو اردو رسم الخط میں اس طرح لکھا گیا ہے:

دھری ڈھورا رائے، جھین چارن سانکھیاہ
پتن پتیجو تھیو، سیج وتایو ساہ
ہمیرا پورا، راج نہ کندا سومرہ

["ڈھورا رائے (سومرہ) جس نے چارن کے گھوڑے چرائے تھے پر لعنت ہو اور پتن تباہ ہو اور سیج (اوس وقت دریا ہکڑہ کا نام تھا) اپنا راستہ تبدیل کر دے اور خدا کرے ہمیر سومرہ کو حکومت کرنے کی زیادہ مہلت نصیب نہ ہو!"]

کی گئی ہے۔ اس روایت کے مطابق آخری سومرہ حکمران 'ہمیر" کے ایام میں (قل وڈا) پھل وڈا (موجودہ رحیم یار خان) کے حاکم "جام لاکھو' بن پھل نے ایک گوّیہ کو کچھ عمدہ قسم کے گھوڑے انعام میں دیے جو "ڈھورا رائے" سومرہ کی سازش سے چرالئے گئے؛ جس پر اس گوّیہ نے بد دعا کے طور پر یہ شعر کہا:

ڏَري ڍوري راءُ، جَنْهِيَن چارڻ سان ڪاهُ،
پتڻ پٽي جو ٿيو، سيج وتايو ساهُ،
هميرا پُوراهه، راڄ نه ڪندا سومرا

[یعنی ڈھورا رائے سومرہ جس کی 'چارن' کے ساتھ دشمنی ہے، وہ کمزور وضعیف ہو کر ختم ہوجائے؛ اس کا شہر "پتن" ویران ہوکر چٹیل میدان بن گیا اور ہاکڑہ (سیج) دریا خشک ہوگیا؛ ہمیر سومرہ کے بعد (ان کی حکومت کا خاتمہ ہوجائے گا اور) سومرہ حکمرانی ہی نہیں کریں گے]۔

['ہمیر اپُوراھ" یعنی ہمیر کے پورے ہونے پر یا ہمیر کے بعد'؛ اس ترکیب میں بھی "اضافت" یا حرفِ جر استعمال نہیں ہوئے۔ یہ سہ سطری ترتیب بھی سومروں کے آخری دور کی ہوسکتی ہے، جس زمانے میں 'متعہ' کے بجائے 'شعر' کا استعمال زیادہ ہونے لگا تھا] "پتن منارا" شہر کے کھنڈرات رحیم یار خان سے پانچ میل مشرق کی طرف ویران دریا ہاکڑہ کے مشرقی کنارے پر واقع ہیں۔ کرنل منچن، جو کہ ۱۸۷۲-۱۸۷۵ء میں بہاول پور ریاست کا پولیٹیکل ایجنٹ تھا، اس نے کھنڈرات میں اس وقت موجود برج کے ساتھ نیچے تہہ خانوں کی کھدائی کروائی تھی۔ وہ لکھتا ہے کہ: "دیوار کا پلستر اتارنے کے بعد "سندھی رسم الخط" میں ایک عبارت نظر آئی جس میں بتایا گیا تھا کہ بکرمی سال ۱۵۵۹ یا ۱۵۶۹ میں یہاں کے مندر کے لئے کچھ چیزیں بطور بھینٹ لائی گئی تھیں (۱)۔

بہرحال مندرجہ بالا مقامی روایت سے ظاہر ہے کہ پتن منارا کا علاقہ سومروں کے زیر

(۱) ایک عبارت جو کہ کرنل منچن نے نقل کی ہے اس سے ظاہر ہے کہ زبان راجستھانی ہے۔ بقول اس کے دیوار پر جو عبارت 'جیسے' لکھی ہوئی تھی وہ سندھی رسم الخط میں تھی۔ اُس عبارت کی اگر تصویر لی گئی ہوتی تو وہ صحیح طور پر پہچانی جاسکتی تھی۔ غالباً یہ عبارت "عربی-سندھی" رسم الخط میں تھی کیونکہ خاص "سندھی رسم الخط" یہی ہے۔ انگریزی میں عبارت اس طرح دی گئی ہے:
Anaj warki Lani athi amadni hamari awe san rupye pichche adh bhejunga
[I have Promised to send half an anna in the rupee on whatever profit I make].
یعنی: میں نے تمام قسم کے نفع سے حاصل ہر روپیہ کے پیچھے آدھا آنہ بھیجنے کا عہد کیا ہے (بہاول پور ریاست کا گزیٹیر، ص: ۳۷۹)

حکمرانی تھا اور ''پتن منارا شہر سومرہ حکومت کا مرکزی شہر تھا''۔ بہاول پور ریاست کے گزیٹیئر میں یہی بتایا گیا ہے کہ دسویں صدی عیسوی میں سومرہ حکمرانوں نے ''پتن منارا'' کو از سرِ نو تعمیر کیا۔ سومروں کا آخری حاکم ہمیر تھا جسے سموں نے معزول کردیا(۱)۔

''تحفۃ الکرام'' کے مطابق بھی سومروں کا آخری حاکم ''ہمیر'' تھا جس سے سموں نے حکومت چھینی۔ اس کی تصدیق سلطان فیروز شاہ تغلق کی طرف سے ملتان کے گورنر ''عین الملک ماہرو'' کے خطوط سے بھی ہوتی ہے جو اس نے ۱۳۵۲-۱۳۶۵ء کے عرصے میں لکھے۔ وہ لکھتا ہے کہ:

''اس وقت سومرہ حکمران ہمیر بن دودو کی حکومت کی جڑ سوکھ رہی ہے اور محض سلطان کی مدد سے قدرے ہری ہے۔ دوسری طرف سمہ ''جام بانبھنیہ'' بن ''انڑ'' اپنی سرکشی اور طاقت سے ابھر رہا ہے۔''(۲)

نہیں کہا جا سکتا کہ ہمیر سومرو سے کس سال اور مہینے میں حکومت چھینی گئی یا وہ کب فوت ہوا؛ لیکن جیسا کہ سلطان فیروز شاہ نے ۶۶-۱۳۶۵ء کے لگ بھگ ٹھٹہ پر حملہ کیا، اس سے گمان ہوتا ہے کہ ۱۳۶۵ء یا اس سے کچھ پہلے ہمیر سومرو کی حکومت کا خاتمہ ہوا۔ اس لحاظ سے مذکورہ بالا شعر کا زمانہ بھی اندازاً ۱۳۵۲ء سے ۱۳۶۵ء کا عرصہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ 'تاریخ طاہری' کی روایت کے مطابق بھی سومروں کا خاتمہ سمہ زمینداروں کی بڑھتی ہوئی طاقت کی وجہ سے ہوا۔ مذکورہ بالا روایت سے ظاہر ہے کہ ''سمہ جام'' اپنی خوشحالی کی وجہ سے سخاوت کرکے گویّوں پر نوازشیں کرتے رہے جنھوں نے پورے ملک میں جا جا کر ان کے گُن گائے۔ ان کے یہ خوشامدانہ اشعار بھی سموں کے حق میں ایک قسم کا پروپیگنڈہ ہی تھے، یہی وجہ ہے کہ سومروں کو یہ خوشامدانہ تعریفیں بری لگ رہی تھیں غالبًا اسی وجہ سے سومرہ حکمران اِن گویّوں کو ڈرانا دھمکانا چاہتے تھے۔ اس لحاظ سے ''ڈھورا رائے'' سومرہ کے اشارے پر گویّے کے گھوڑے چرانے کے واقعہ کو حقیقی قرار دیا جاسکتا ہے۔

---

(۱) ایضاً بہاول پور ریاست کا گزیٹیئر، ص: ۳۷۷

(۲) ''انشای ماہرو'' (منشات عین الملک عین الدین عبداللہ بن ماہرو) مصحح پروفیسر شیخ عبدالرشید ''شعبہ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ'' کی طرف سے شائع شدہ، ص ۸۷

سید بدر الدین رضوی کا پڑھا ہوا شعر

سید بدر الدین سومرہ دور میں ساتویں صدی ہجری میں گزرا ہے۔ وہ سید محمد مکی (وفات ۶۴۴ھ) کا بڑا بیٹا اور سید صدر الدین (۶۰۰-۶۶۹ھ) کا بڑا بھائی تھا۔ سید قمبر علی شاہ رضوی نے سن ۱۲۶۱ھ/۱۸۴۵ء میں ''شجرۂ سادات'' کے نام سے رضوی سادات کا شجرہ لکھا(۱) جس میں انہوں نے بتایا ہے کہ ایک موقع پر سید بدر الدین نے درج ذیل شعر پڑھا:

کَتين يا هارائين، مرين ته وڃي وا،
ٻنهي مَنجهون هڪڙي چڱي نه ٿئي ڪا(۲)
[جیتو یا ہارو، مرنے کے بعد ختم ہوجاؤ گے
دونوں میں کوئی بھی ایک اچھی نہیں ہوگی]۔

اگر سید بدرالدین نے اپنے والد کی وفات (۶۴۴ھ) کے بعد وفات کی ہو اور یہ شعر انہوں نے بڑھاپے کے دور میں کہا ہو تو اس لحاظ سے بھی یہ شعر زیادہ سے زیادہ تقریباً ساتویں صدی کے ۶۴۵-۶۶۰ھ کے عرصہ یعنی سومروں کے آخری دور کا ہوسکتا ہے۔(۳)

نتائج:

سومروں کا دور سندھ کی تاریخ اور سندھی زبان اور اس کی سینہ بہ سینہ (زبانی) ادبی روایت کا داستانی دور تھا۔ اسی دور میں سندھ کی اکثر عشقیہ داستانوں، جنگ ناموں اور سندھ کے سورما سرداروں کے کارناموں کو بیان کرنے کی بنیاد پڑی۔ بعد میں ان کی تار و پود میں سندھی شاعری کو بُنا گیا۔ سومروں کے دور میں ان داستانوں، قصوں اور کہانیوں کا رائج ہونے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اُس وقت سندھی زبان میں بیان کی صلاحیت پیدا ہوچکی تھی۔

سومروں کا دور ''عام فہم سندھی زبان'' کی تعمیر و توسیع کا دور تھا، جس مٰیں

(۱) یہ کتاب 'بکھر' کے سید قمبر علی ابن غفران پناہ سید امان علی شاہ رضوی البکھری نے سید محمد مکی بکھری اور ان کی اولاد کے نسب ناموں سے متعلق ۱۱/ ربیع الاول ۱۲۶۱ھ کو مکمل کی۔ دیکھیے: مقدمہ حدیقۃ الاولیاء، ص:۳۸-۳۹ (مترجم)

(۲) مقدمہ ''حدیقۃ الاولیاءٔ'' (مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ ۱۹۶۷ء) کے ص:۴۲، ۶۴ پر سید حسام الدین راشدی نے یہ شعر ''شجرہ سادات'' کے حوالے سے دو مرتبہ نقل کیا ہے۔ ص۴۲ پر دیے گئے متن میں تین الفاظ ''کتين'' ''منجهون'' اور ''چڱي'' کر کے لکھے گئے ہیں جبکہ ص۶۴ پر یہی الفاظ ''کتين'' ''منجهون'' اور ''چڱين'' کر کے لکھے ہوئے ہیں۔ دونوں مقامات پر آخری قافیے ''واءِ'' اور ''ڪاءِ'' کی صورت میں قملبند ہیں۔ خود سید قمبر علی نے یہ شعر کس رسم الخط میں لکھا تھا؟ وہ معلوم نہیں۔ ہم نے قدیم دور کے لہجے کے مطابق مذکورہ بالا رسم الخط قائم کیا ہے۔

(۳) ہمارے سامنے موجود حدیقۃ الاولیاء طبع اول ۱۹۶۷ء کے مقدمہ ص۴۲ اور ۶۴ دونوں مقام پر پہلے مصرع میں 'یا ھارائیں' کے بجائے 'تان ھارئین' ہے۔ اسی طرح اسی مصرع میں 'وڃي' کے بجائے 'وڃين' ہے، جسے ڈاکٹر صاحب نے مندرجہ بالا رسم الخط میں لکھا ہے۔ (مترجم)

سندھ کے جنوب مشرقی حصہ سے آگے علاقۂ کچھ میں سندھی زبان رائج ہوئی۔ زبانی روایات کے ذریعہ بعض مقامی واقعات اور یاد داشتوں پر مشتمل قصے اور کہانیاں رائج ہوئیں۔ عشق ومحبت کے قصے اور افسانے اور سندھ کے سورما سرداروں اور سپہ سالاروں کے جنگی کارنامے گائے جانے لگے، جس سے نہ صرف سندھی زبان میں نثری داستانوں کی بنیاد پڑی بلکہ سندھی شاعری بھی علمی سطح پر اشعار اور کافی کی صورت میں سماع کا حصہ بنی اور عوامی سطح پر معموں کی صورت میں داستانیں اور حکایات گانے کے لئے استعمال ہوئیں۔ اس دور کے نصف آخر میں سمہ حکمرانوں کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کی وجہ سے ''سندھ کے سمہ قبائل'' کی زبان کو اہمیت حاصل ہوئی، جس کی وجہ سے ''معیاری سندھی زبان'' کے پھلنے پھولنے کے لئے میدان ہموار ہوا۔

باب پنجم

''معیاری سندھی زبان کی توسیع اور اس میں اعلیٰ معیاری شاعری کی ابتداء کا دور''

(سمہ عہدِ حکومت: ۱۳۵۰-۱۵۲۰ء)

سومروں کا دور سندھی زبان میں بیان کی وسعت، قصے کہانیوں کی پرداخت اور ادبی صلاحیت کی نشو ونما کا ''تعمیری دور'' تھا، جس میں لڑائیوں اور واقعات سے متعلق اشعار اور عشقیہ داستانیں مشہور ہوئیں اور سندھی شاعری چلیپائی اشعار کی صورت میں نکھری۔ سمہ عہد میں اس 'تعمیری دور' کی مزید تکمیل ہوئی۔ 'سمہ دور' کی ابتدا میں سندھی زبان کی لسانیاتی خصوصیات اور ادبی روایات وہی 'سومرہ دور' والی ہی رہیں؛ البتہ قوت بیان میں بہت اضافہ ہوا اور لغوی سرمایہ میں وسعت پیدا ہوئی۔ حکایات اور داستانیں بیان کرنے کو ایک 'ادبی فن' کا مرتبہ ملا۔ حکایات و روایات کو چلیپائی اشعار کے ذریعے گایا جانے لگا۔ واقعاتی منظوم حکایات کو گانے کے علاوہ، سماع کی محافل کے ذریعہ سندھی بیت (شاعری) کو عوامی مقبولیت حاصل ہوئی اور یوں سندھی بیت اپنی مکمل صورت کو جا پہنچا۔ گویا سمہ دور سے اعلیٰ معیاری شاعری کا آغاز ہوا۔

معیاری سندھی زبان کی ترقی کے اسباب

سموں کی طاقت کا عروج ''جام انڑ'' کی سرداری سے شروع ہوا، جس نے تقریباً سنہ ۷۳۴-۷۳۳ھ میں بغاوت کرکے دہلی کی طرف سے مقرر کردہ سیوہن کے گورنر 'ملک رتن' کو قتل کردیا اور بالآخر ۷۵۱-۷۵۰ھ (۱۳۵۰ء) کے لگ بھگ ٹھٹہ کے جام (حکمران) کی حیثیت سے خودمختار حکومت قائم کرلی(۱)۔

سنہ ۹۲۶ھ (جنوری ۱۵۲۰ء) میں شاہ بیگ ارغون کی فتح ٹھٹہ سے سمہ حکومت کا خاتمہ

---

(۱) دیکھیے! ہمارا انگریزی مضمون ''سندھ کے سمہ حکمرانوں کا سلسلۂ حکومت'' پاکستان ہسٹاریکل ریکارڈ اینڈ آرکائیوز کمیشن کے دوسرے اجلاس (پشاور، فروری ۱۹۵۴ء) کی روداد، پاکستان گورنمنٹ پریس، کراچی ۱۹۵۷، ص: ۲۳-۲۹)

ہوگیا۔ سمہ دور کے پونے دوسو برس سندھ کے اندرونی علاقوں میں ''معیاری سندھی'' کے ارتقاء کے لئے اور سرحداتِ سندھ سے باہر عام سندھی زبان کی اشاعت کے لئے نہایت مفید ثابت ہوئے۔ سمہ دور کے درج ذیل سیاسی و سماجی پہلو اس دور میں سندھی زبان کی تاریخی حیثیت کو سمجھنے کے لئے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

اہم سمہ قبائل زمانۂ قدیم سے سندھ کے درمیانی علاقہ میں رہائش پذیر تھے۔ آٹھویں صدی عیسوی کے آغاز میں محمد بن قاسم کی فتح کے وقت ''ساوندی - سمہ'' یعنی ''سموں کی ساوڑی'' (موجودہ سَن ساوڑی کا علاقہ جو آج کل تحصیل وضلع نواب شاہ میں ہے) سموں کا اہم مرکز تھا۔ تقریباً چھ سو برس بعد ۱۴ویں صدی عیسوی کے نصف میں جام انڑ کے ذریعے سمہ طاقت کو عروج حاصل ہوا، جس نے سب سے پہلے سیوہن پر قبضہ کیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس وقت بھی سمہ طاقت کا مرکز یہ درمیانہ خطہ ہی رہا۔ جام انڑ سموں کی ''انڑ برادری'' کا سردار تھا اور سموں کے نسب نامہ اور تاریخی مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس برادری میں کم از کم پانچ اہم قبائل - انڑ، ڈاہری، ساند، ساریہ اور کیریہ- شامل تھے۔ سمہ حکومت ختم ہونے کے بعد بھی یہ قبائل کافی طاقتور رہے اور ارغونوں، ترخانوں اور مغلوں کے علاقائی گورنروں، سپہ سالاروں اور افواج سے ان کے مقابلے اور معاہدے ہوئے (۱)۔

اس دور کے اہم تاریخی مآخذ، خصوصاً 'بیگلار نامہ' اور ''تاریخ مظہر شاہ جہانی'' کے مطالعہ سے ان قبائل کی اہم بستیوں اور طاقت کے مراکز کا علم ہوتا ہے۔

اس وقت سیوہن اور نصرپور کے علاقہ جات (ریاستیں/حکومتیں) یعنی موجودہ تحصیلیں کوٹڑی (شمالی حصہ)، سیوہن (جنوب اور مغرب)، مورو (جنوب)، سکرنڈ، نواب شاہ، شہداد پور اور ٹنڈو الہیار (شمال)، تحصیل میر پور کی حدود تک انڑ قبائل کی بستیوں، آبادیوں اور قبائلی جمیعت کا علاقہ تھا۔ اس علاقے میں موجودہ سکرنڈ تعلقہ میں (جہاں اب بھی انڑ سردار کا گھرانہ آباد ہے) 'لاکھاٹ' کا علاقہ ان کی طاقت کا مرکز تھا۔ بہرحال آٹھویں صدی سے ۱۶ویں صدی تک یہ وسطی علاقہ سموں کا اہم مرکز تھا۔ سمہ دور میں ان سمہ قبائل کی مادری زبان نے - یعنی وسطی سندھ کی زبان نے - گویا 'سرکاری زبان' کی حیثیت اختیار کرلی اور وہ ملک کی 'معیاری زبان' بن گئی۔ جب سندھ کا شمالی حصہ بھی سمہ حکومت میں شامل ہوگیا تو شمالی وسطی زبان، جو کہ سمہ علاقہ کے

---

(۱) ترخانوں کے دور میں ان قبائل نے مرزا محمد باقی کے خلاف مرزا جان بابا کی مدد کی اور شاہ قاسم خان 'خان زمان' کے ساتھ مل کر مرزا محمد باقی کے حامیوں سے مقابلے کیے (بیگلار نامہ)۔ اس کے بعد مغل دور میں ٹھٹہ کے گورنروں کے نائبین اور ان کی افواج سے مقابلے کر کے نقصانات اٹھائے۔ حکومتی افواج طاقت کے بل بوتے پر انہیں مطیع نہیں کرسکیں، اس وجہ سے حکمرانوں نے ان کے ساتھ معاہدات کے ذریعے امن و امان قائم کیا۔ (تاریخ مظہر شاہ جہانی: سندھی ادبی بورڈ)

زیادہ قریب تھی، اس پر بھی معیاری زبان کا رنگ چڑھنے لگا اور 'وسطی سندھ کی معیاری زبان' کا دائرہ وسیع ہوا، دوسری طرف سمہ حاکموں نے ٹھٹہ کو اپنا دارالحکومت بنالیا جس کی وجہ سے لاڑ (زیریں سندھ) کے قدیم قبائل و اقوام کی زبانوں پر اس 'معیاری زبان' کا اثر پڑنے لگا۔

سندھی زبان کی سرحدوں کا وسیع ہونا

سمہ دور میں سندھی زبان کی سرحدیں جنوب میں کچھ اور گجرات کی طرف، مغرب اور شمال مغرب میں بلوچستان کی طرف اور شمال میں بہاول پور اور ملتان کی طرف بڑھیں اور ان سرحدوں کی طرف سندھی زبان کا دیگر پڑوسی زبانوں - خصوصاً گجراتی، بلوچی اور سرائیکی - کے ساتھ عمل اور ردعمل شروع ہوا۔

علاقہ کچھ میں سندھی زبان کے کچھی محاورہ (بول چال) کی تشکیل

کچھ میں سندھی نسلی قبائل کب آباد ہوئے؟ اس کے بارے میں کچھ کہا نہیں جاسکتا لیکن کچھ ملک عرب- اسلامی دور میں صوبۂ سندھ کے ساتھ شامل ہوا اور اس دور میں سندھ اور کچھ کے درمیان گہرے سیاسی وسماجی روابط استوار ہوئے۔ سومرہ دور میں یہ تعلقات مزید پختہ ہوئے اور اس دور میں سندھی قبائل بالخصوص سمہ قبائل نے کچھ کے بڑے علاقہ کو اپنا مسکن بنالیا۔ اسی دور سے سمہ قبائل کچھ میں پھلے پھولے اور ان کی آبادی دو اہم قبائلی گروہوں یعنی 'سندھ - سمہ' اور 'جاڑیجہ- سمہ' کے ذریعے تمام کچھ علاقہ پر چھا گئی۔ اس کے ساتھ ہی سندھی زبان کا وہاں کی مقامی زبانوں پر اثر پڑا جو بعد میں سمہ دور میں مزید وسیع ہوا اور کچھ میں سندھی زبان کے مقامی کچھی محاورہ کی تشکیل ہوئی۔

سمہ دورِ حکومت میں جب سمہ قبائل کی آبادی کچھ میں بڑھ گئی تو وہ کاٹھیاواڑ اور گجرات کی سرحدوں تک پھیل گئے۔ سومرہ طاقت کے زوال اور سموں کے عروج کی وجہ سے سومروں کی ایک بڑی تعداد بھی سندھ کی سرحد اور کچھ کے علاقہ سے جنوب میں کاٹھیاواڑ اور گجرات کی طرف نقل مکانی کرکے چلی گئی، جس کی وجہ سے کاٹھیاواڑ اور گجرات میں سندھی قبائل کے ساتھ سندھی زبان بھی داخل ہوئی، اس کے علاوہ سمہ دور میں سندھ اور گجرات کے درمیان خاص سیاسی تعلق قائم ہوا جو سمہ دور کے آخر تک قائم رہا۔ سندھ کے حاکموں اور گجرات کے سلطانوں نے بادشاہانِ دہلی سے بے نیاز ہوکر اپنی آزاد حکومتیں قائم کرنے کی کوشش کی، جس کی وجہ سے انہوں نے آپس میں دوستانہ تعلقات قائم کیے۔ سمہ جام تغلق (۸۳۱-۸۵۷ھ) کے دورِ حکومت میں یہ سیاسی اور

دوستانہ تعلقات مزید پختہ ہوئے اور سندھ کے حکمران خاندان اور سلاطینِ گجرات کے درمیان رشتہ داری کا سلسلہ شروع ہوا۔ اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے سندھ کے سمہ حاکموں کو بطور خاص سلاطینِ گجرات اور وہاں کے عوام کی مدد اور ہمدردی کی ضرورت تھی، اسی لئے جام تغلق نے اپنی دو بیٹیاں گجرات کے دو با اثر خاندانوں میں بیاہیں: ایک بیٹی 'بی بی مغلی' گجرات کے سلطان محمد اول (۸۴۵-۸۵۵ھ) کو دی، جس سے گجرات کا مشہور بادشاہ محمود بیگڑہ ۲۰ رمضان ۸۴۹ھ کو پیدا ہوا۔ دوسری بیٹی 'بی بی مُرکی' گجرات کے مشہور ولی حضرت شاہ عالم کو دی جو سمہ حکمرانوں کے روحانی پیشوا حضرت بہاؤ الدین زکریا ملتانی کے مرید اور اُچ شہر کے بزرگ سید جلال الدین سرخ بخاری کی اولاد میں سے تھے۔ اس بزرگ کے ساتھ سمّوں کی رشتہ داری کی وجہ سے گجرات کے عوام میں سندھ کے حکمرانوں کے لئے جذبۂ عزت و محبت کی بنیاد پڑی۔ سندھ کے سمہ حاکموں اور سلاطینِ گجرات کے درمیان سیاسی وسماجی تعلقات نیز گجرات کے بااثر صوفی بزرگ کے ساتھ رشتہ داری کی وجہ سے سندھ اور گجرات کے باشندوں کے درمیان قریبی تعلقات مزید گہرے اور پختہ ہوئے اور دونوں ملکوں کے درمیان تجارت کے ساتھ ساتھ لوگوں کی آمد و رفت میں بھی اضافہ ہوا۔ اسی میل ملاپ کی وجہ سے گجراتی الفاظ سندھی زبان کے 'کچھی محاورہ' میں داخل ہوئے اور دوسری طرف کچھ سندھی الفاظ کاٹھیاواڑ کے قریبی علاقہ کے راستے گجراتی زبان میں داخل ہوئے۔

لس بیلہ میں ''بیلہ کی زبان'' کی تشکیل

جنوب کی طرف لاڑ میں ٹھٹہ سمّوں کا دارالحکومت تھا، جس کی وجہ سے ان کی طاقت اور سیاسی اثر ونفوذ جنوب مغرب کی طرف بڑھا اور کوہستانی علاقہ اور لس بیلہ میں 'سندھی زبان' مزید پھیلی اور اثرانداز ہوئی۔ سمہ طاقت کے عروج سے پہلے سومروں، سموں اور دیگر سندھی اقوام و قبائل نے کوہستانی علاقہ سے بھی مزید آگے مغرب کی طرف بڑھ کر موجودہ لس بیلہ کو اپنا مسکن بنالیا تھا۔ یہ سلسلہ بعد میں سمہ دور میں وسیع ہوا جس کی وجہ سے لس بیلہ کے علاقہ میں 'سندھی زبان' عام رائج ہوئی۔ سندھی قبائل میں سے خاص طور پر ''رونجھا'' قبیلہ نے وہاں اپنی سرداری قائم کی اور ان کے جاموں میں سے ''سپڑ جام'' گزرا ہے۔ جس کی سخاوت کے قصے مشہور ہیں۔ ''رونجھوں'' کی زبان نسبتاً معیاری سندھی زبان تھی، جس کا اثر لس بیلہ کے تمام میدانی محاوروں پر ہوا اور ایک عام سندھی مقامی محاورہ یعنی 'بیلہ کی زبان' کی تشکیل ہوئی۔

بلوچستان کی طرف سندھی زبان کا سفر اور سندھی و بلوچی کا ایک دوسرے پر اثر

غالباً چھٹی صدی عیسوی سے سندھی قبائل مغرب میں مکران اور ایران کی طرف جانے لگے اور عرب - اسلامی دور میں سندھی قبائل بغداد تک جا پہنچے، اسی سفر میں کچھ قبائل نے مکران و ایران میں بعض علاقوں کو اپنا مسکن بنالیا تھا۔ سمہ دور کے آخر میں، خاص طور پر لس بیلہ میں رونجھوں کے عروج کے وقت مزید سندھی قبائل موجودہ بلوچستان کے علاقہ میں کچھ مقامات پر جا کر آباد ہوئے اور ان قبائل کے ساتھ سندھی زبان مکران تک پہنچ گئی۔ البتہ وہ قبائل 'معیاری سندھی' کے دائرۂ اثر سے باہر تھے، اس لئے اندرونی بلوچستان کے منتشر سندھی باشندوں کی زبان ناپختہ رہی، جو آج تک ان کی خاص بستیوں میں خام 'جدگالی' محاورہ کی صورت میں رائج ہے۔ اس سمت میں سندھی کے پھیلنے سے 'مغربی بلوچی' اور سندھی کا ایک دوسرے کی لغات پر اثر پڑا۔ دوسری طرف سمہ آخری دور میں سندھ کی سیاسی طاقت نے سندھ کی شمالی سرحد سے آگے بڑھ کر شمال مغرب کی طرف موجودہ جیکب آباد، سبی اور کچھی اضلاع کے میدانی علاقوں کو اپنے سیاسی اثر کے تحت لے لیا، جس کی وجہ سے ان علاقوں میں سندھی زبان رائج ہوئی۔ اور اس علاقے میں بلوچی اور سندھی کا ایک دوسرے پر مزید گہرا اثر پڑا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بلوچی الفاظ سندھی میں رائج ہوئے اور سندھی الفاظ اور محاورے ''مشرقی بلوچی'' کا حصہ بن گئے۔

پرانے دور سے سندھی اور بلوچی زبانوں کی سرحد کا ملنا، بلوچوں کا سندھ کو مسکن بنانا اور سندھی قبائل کا شمال (سبی) اور مغرب کی طرف (مکران) بلوچستان میں جا کر بسنا، صدیوں کے اس مسلسل عمل سے بلوچی زبان کے کئی الفاظ سندھی کا جزو بن گئے اور سندھی الفاظ اور صوتیات بلوچی کا جزو بن گئے۔ ذیل میں ہم بلوچی زبان کے بعض الفاظ پیش کرتے ہیں جو سندھی زبان میں استعمال ہونے لگے۔

بلوچی الفاظ کا سندھی میں استعمال ہونا۔

	اصل بلوچی	سندھی
۱)	لیڑو = پانچ سالہ یا بڑا اونٹ	لیڑو = اُٹ (اُٹھُ = اونٹ)
۲)	پُراپ، پراف = اونٹ کا بڑا بچہ (مادہ)	پوراف = بڑی اونٹنی، بڑی مرغی (تین سال تک کا)
۳)	رمغ = بکریوں کا ریوڑ	رمڑ = جانوروں کا ریوڑ
۴)	گورم = گایوں اور بیلوں کا بڑا ریوڑ	گوہر = گایوں اور بیلوں کا بڑا ریوڑ
۵)	گھٹ = پہاڑ کا مشکل چڑھاؤ	گھٹ = پہاڑی درّہ
۶)	اولاک = بارگیر جانور	اولاک = سواری کا جانور (گھوڑا)

۷)	مم = ایک جانور جو اکثر پیش کی جھاڑی میں رہتا ہے (BABOON)	مم = بندر کی ایک قسم جو گھاس کے میدانوں میں رہتے ہیں۔
۸)	تگرد = چٹائی	تکِر = چٹائی
۹)	ڈاھ = جنگ کی خبر	ڈاھم = اچانک بری خبر
۱۰)	زَہم = تلوار	زہم، زہی = تلوار
۱۱)	زِک = مشکیزہ، پکھال	ایزک = مشکیز ہر پکھال
۱۲)	لغور = بے ہمت، ڈرپوک	لغور = بے ہمت بے ہودہ
۱۳)	کھیر = ایک کانٹے دار درخت	کھیر = خشک زمین، دشت کا ایک کانٹے دار درخت
۱۴)	نشار = بیٹے، بھائی یا بھتیجے کی بیوی	نشار = بہو، بھابھی
۱۵)	بوٹھ، باٹھ = پناہ میں آیا ہوا	باٹھ = کسی کی پناہ، حفاظت میں آئی ہوئی عورت (۱)
۱۶)	کبگ = تیتر کی قسم (مورتی؟)	کبھ = کالے تیتر کی مادہ
۱۷)	لاپ = لاٹھی	لاپ = کمان کا گز، جو کسی بھی چیز کو لاٹھی کی طرح آڑا ترچھا ہو کر لگے۔
۱۸)	جمر = (بادل)	جمر، چمر (چھمر) = (بادل)
۱۹)	ھور = قسم، سخن	ھور ھٹڑ = (بڑا دعویٰ کرنا، ڈینگیں مارنا)
۲۰)	تہار = اندھیرا	تہاری = اندھیری رات

سندھی زبان کا بلوچی زبان پر کافی اثر ہوا: جب بلوچ نسل کے قبائل (بلوچ، بروہی، جت) سندھ میں رہ کر دوبارہ بلوچستان گئے تو وہ اپنے ساتھ سندھی زبان کے الفاظ اور تلفظات بھی لے گئے، جو بلوچی میں رائج ہوگئے۔ جب ساتویں صدی میں جت قبائل نے سندھ سے مکران، ایران اور مغرب کی طرف نقل مکانی کی تو وہ سندھی زبان کو بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ بلوچستان اور ایران کی حدود میں اس زبان کو ''جدگالی' (جت قوم کی زبان) کا نام دیا گیا۔ صدیوں کے بعد ان تمام 'جدگالی' بولنے والے قبائل کو 'جدگال' پکارا جانے لگا۔ اس کے بعد کے ادوار میں بھی بعض سندھی قبائل بلوچستان کے خطوں میں آباد ہوئے، جس کی وجہ سے سندھی تلفظات بلوچی زبان میں داخل ہوگئے۔ آج بھی کچھ سندھی قبائل گوادر کے شمال - مغرب، باہو،

(۱) یا کسی کے پاس عرض کرنے کے لئے وفد میں آئے ہوئے یا آیا ہوا آدمی (بعض اوقات عرض کرنے اور منانے والے لوگ اپنے ساتھ بیٹیاں اور قرآن شریف بھی لے جاتے ہیں) (مترجم)

دشتیاری اور ایرانی بلوچستان کی حدود میں رہتے ہیں اور 'جدگال' کہلاتے ہیں(۱)۔

گزشتہ صدی (۱۸۷۴ء) میں 'پیئرس' نامی انگریز نے گوادر سے باہر مروّجہ دیہاتی زبان کا مطالعہ کیا اور وہاں کے مقامی الفاظ کی فہرست تیار کی؛ جس میں درج ذیل الفاظ سندھی اور بلوچی لغات کے ایک دوسرے پر عمل اور ردعمل پر گواہ ہیں۔

بلوچی میں رائج لفظ کا تلفظ	اصل سندھی میں
۵۵، بَل (درختوں کا جھنڈ)	بیلو (بیلا)
۵۷، بجی، بچ	ٻنجي، ٻوچ (کاگ، ڈاٹ)
۵۸، چارگ (خفیہ طور پر نظرداری کرنا)	چاري (پہریدار، نگہبان، جاسوس)
۶۵، دِستہ، دتہ، دِٹہ	ڏسڻ، ڏٺو (دیکھنا، دیکھا)
۶۸، ھَني، ھَنو	هاڻي (اب، ابھی)
۷۰، اِدا	ايڏان، ايڏانهن (طرف: اسی طرف)
۷۱، جوکو	جوکو (نقصان، خطرہ، خوف)
۷۲، ڪَدين	ڪڏهين (کب)
۷۳، ڪنگال	ڪنگال (کنگال)
۷۵، ڪڪڙ	ڪڪڙ (مرغ، مرغہ، مرغی)
۷۶، لدِگ	لُڏڻ
۷۶، لگگ	لڳڻ (لگنا، چپکنا؟)
۷۹، مانْ (مانْ بوئنگ = ۾ هئڻ)	۾ (میں)
۸۳، پگار	پگھار (تنخواہ)
۸۳، پاکڙو	پاکڙو (اونٹ کا پالان)
۸۳، پن	پن (پتا، ورق درخت کا)
۸۹، سمبالگ	سنڀالڻ (سنبھالنا)
۹۰، شاهم	ساهمي (ترازو، میزان)
۹۳، چُل	چُلهه (چولھا)
۹۳، سنڊ	سَنڌ
۹۳، تِلو	ٽلي (جانوروں کے گلے کی گھنٹی، گھنگھرو)
۹۳، ڏکڻ (ڏکڻ جي هوا)	ڏکڻ (جنوب، جنوب کی ہوا)
۹۵، ٽُکر	ٽُکر (ٹکڑا، حصہ، پرزہ، بخرہ)

(۱) ای - پیئرس کا مضمون ''مکرانی بلوچی کا بیان'' رائل ایشیاٹک سوسائٹی بمبئی کا جرنل، نمبر ۳۱ (NO XXXI) جلد ۱۱ سال ۱۸۷۵ء، ص:۱-۹۸ ذیل میں الفاظ کے سامنے دیے گئے ہندسے اس مضمون کے صفحات کے ہیں۔

کافی پرانے زمانے سے سندھی اور بلوچی کے درمیان تعلق کے باعث ٽ (ٹ)، ڊ (ڈ) اور ڙ (ڑ) کے تلفظات (صوتیات) بلوچی زبان کا جزو بن گئے اور آج تک بلوچی زبان کے 'مغربی' (مکرانی) اور 'مشرقی' (مری، بگٹی اور سندھ کے سرحدی علاقہ جات کے) محاوروں میں موجود ہیں۔ مثلاً درج ذیل الفاظ خالص بلوچی ہیں اور مکران اور سبی کی طرف استعمال ہوتے ہیں لیکن ان میں وہ سندھی تلفظات موجود ہیں:

ٽیه = (غلام، نوکر)

ڊگار = (میدان، زمین)

لیڙو = (اونٹ)

'ٺ' (ٹھ) کا تلفظ بھی 'مغربی' اور 'مشرقی' بلوچی میں موجود ہے جیسا کہ: لٺ (لٹھ = لاٹھی)، ڦٺ (پھٹھ = پھٹکار)، ٺگ (ٹھگ)۔ یہ الفاظ دونوں زبانوں میں استعمال ہوتے ہیں مگر اصل میں سندھی ہی سے آئے ہیں۔ 'مشرقی بلوچی' یعنی وہ بلوچی زبان جو سندھ کی شمالی سرحد اور اس سے متصل علاقوں میں بولی جاتی ہے، اس میں سندھی اور سرائیکی کے زیر اثر ڀ (بھ)، ٿ (تھ)، ڦ (پھ)، ڇ (چھ)، ڌ (دھ)، ڍ (ڈھ)، ک (کھ)، جھ اور گھ کے تلفظات نسبتاً پچھلے دور میں داخل ہوئے: یعنی ایک تو یہ "تلفظات" بعض خالص بلوچی الفاظ کا جزو بنے اور دوسرا یہ کہ ان تلفظات والے سندھی الفاظ خاص طور پر 'مشرقی بلوچی' میں رائج ہوئے: یعنی یہ تلفظات مغربی بلوچی میں نہیں آتے، صرف 'مشرقی بلوچی' ہی میں آتے ہیں۔ مثلاً

معنی	مشرقی بلوچی	مغربی بلوچی
پيءُ (والد)	ڦٿ (پھٹ)	پ ت
پير (پاؤں)	ڦاذ (پھاذ)	پاد
ڇا (کیا)	ڇِي (چھے)	چِي
تون (تو)	ٿَوَ (تھو)	ت و

ان تلفظات والے کچھ سندھی الفاظ بھی 'مشرقی بلوچی' میں رائج ہوگئے ہیں: جیسا کہ ڌکو (دھکو = دھکا)، ڍور (ڈھور = مویشی، چوپایہ، حیوان، جانور)، ڍگو (ڈگھو ڈھگو = بیل)، گھور (شادی کے وقت پیسے لٹانا)، چورَوَ چھورَوَ (چورو، چھورو = لاوارث، یتیم)، جھیڙو (جھیڑو، جھیڑو = جھگڑا، تکرار، دنگا، فساد)، گيد (قلعہ، کوٹ، گڑھ)، جھڙ (جھڑ = بادل، ابر)، ڦذا (ڦڏو، پھڈو = رگڑا، معاملہ، جھگڑا)، مَڏي (مڏي، مڈی = اسباب، اثاثہ، سامان، ملکیت، لدا ہوا سامان، محصول لینے کی جگہ، چنگی، دریا کی وہ جگہ جہاں 'ٹیلا' مچھلی جمع کرتے ہیں، عمارتی لکڑی کی دکان)، جڏوَ (جڏو، جڈو = معذور، لاچار، محتاج، ضعیف، کمزور، بیمار، مجبور، بے

عقل)، ھَدَوَ (ھدو، ھڈو = ہڈا، جُوں، جھگڑا، ٹنٹا) اور واجھہ (وجھہ = ٹُل = موقع، گھات، چال، داؤ، کُشتی کا پیچ)

سندھی اور سرائیکی کا باہمی تعلق

اس دور میں سندھی اور سرائیکی کا تاریخی رشتہ مزید مستحکم ہوا۔ پہلے پہل رائے اور برہمن دور میں اور بعد ازاں عرب-اسلامی دور میں سندھ اور ملتان بہت عرصے تک ایک ہی سیاسی طاقت کے ماتحت رہے، جس کا خاص مرکز سندھ (ابتدا میں اروڑ اور بعد میں منصورہ) تھا۔ اس سیاسی وحدت کی وجہ سے سندھ اور ملتان کی زبانوں کے باہمی تعلق کی ابتدا ہوئی۔ سومرہ دور میں بھی کچھ عرصے تک ملتان اور بعد میں کافی عرصے تک ملتان صوبہ کا جنوبی حصہ (موجودہ بہاولپور کا خطہ) سندھ میں شامل رہے؛ جس وجہ سے سندھی اور سرائیکی کا رشتہ قائم رہا۔ نیز سومرہ دور میں سہروردی سلسلے کے علمبردار غوث بہاؤ الدین زکریا کی تبلیغ کا سندھ میں بہت اثر ہوا اور بطور خاص سمہ قبائل بڑی تعداد میں ان کے مرید و معتقد بنے، جن میں سے سینکڑوں لوگ آپکی زندگی میں اور آپ کے وصال کے بعد ہر سال ملتان جانے لگے۔ سمہ طاقت کے عروج کے دور میں سمہ حکمرانوں کی غوث بہاؤالدین زکریا کے جانشینوں اور ان کے روحانی سلسلہ کے بخاری بزرگانِ اُچ کے ساتھ عقیدت رہی۔ یہی سبب تھا کہ جب سلطان فیروز شاہ نے ٹھٹہ کا محاصرہ کیا اور جام صدرالدین بھانبھنیہ نے دلیری سے اس کا مقابلہ کیا تو سلطان فیروز شاہ کی حمایت اور جام جونہ کی موافقت سے شیخ الاسلام صدرالدین ملتانی اور اُچ کے بزرگ مخدوم جہانیاں 'جہاں گشت' نے درمیان میں پڑ کر ان کی صلح کروائی۔ مخدوم جہانیاں غالباً جام جونہ کے مرشد تھے اور سندھ سے ان کا خاص تعلق تھا، یہی وجہ ہے کہ ان کے ملفوظات میں دہلی اور سندھ کی سیاست کا ذکر موجود ہے۔ بہرحال سمہ حکمرانوں اور سندھ کے عوام کا اس دور میں ملتان اور بزرگانِ اُچ کے ساتھ روحانی تعلق رہا، جس نے سندھی اور سرائیکی کے رشتہ کو مزید مضبوط بنایا۔ غالباً سمہ جام سکندر کے ایام تک بہاولپور سمہ حکومت میں شامل تھا، جیسا کہ آگے ایک کتبہ سے معلوم ہوگا(۱)۔

سندھ اور ملتان کے درمیان تاریخی و سیاسی تعلقات اور روحانی رشتوں کی وجہ سے صدیوں کے عرصہ کے دوران سندھی اور سرائیکی کا باہمی تعلق مزید مستحکم ہوا۔ ملتان سے جنوب کی طرف موجودہ خطۂ بہاولپور کی زبان پر سندھی کا گہرا اثر ہوا اور اس میں سندھی الفاظ اور محاوروں کی آمیزش شروع ہوئی؛ دوسری طرف سندھ میں سرائیکی کا 'سندھی - سرائیکی' لہجہ رائج ہوا۔ نویں صدی ہجری کی ابتداء میں سرائیکی بطور خاص سندھ میں اور اس سے اوپر بہاولپور کے علاقہ میں کتبوں اور دیگر تحریروں میں استعمال ہونے لگی، جس کا ثبوت بہاولپور اور سندھ میں دستیاب ہونے والی اینٹوں کے ان کتبوں سے ملتا ہے جن کا ذکر آگے آرہا ہے۔

---

(۱) دیکھیے ص:۱۴۱

۱- تحصیل اباوڑو میں، ریتی اسٹیشن سے تقریباً تین چار میل جنوب میں اور قدیم 'رینی ندی - جو کہ اب ویران ہوچکی ہے - سے میل ڈیڑھ میل مشرق کی طرف 'وِجنوٹ' شہر کے کھنڈرات ہیں، سنہ ۱۸۷۳ء میں ان کی کھدائی ہوئی، وہاں سے دستیاب ہونے والی چیزوں میں ایک اینٹ بھی تھی، جس پر درج ذیل عبارت کندہ تھی:(۱)

سلطان سکندر بادشاہ ھی شان سیف اسم بالا
سرکار زھی سن سی باش ۳۵۵۱۳
کاریگر را قلم عدصر شد بس کار ابورا راطا

ظاہر ہے کہ یہ اینٹ سلطان سکندر کے عہد میں بنائی گئی۔ کتبہ کی پہلی سطر سرائیکی زبان میں ہے آخری سطر کی املا غالباً فارسی میں ''کاریگر راقلم قاصر شد بس کار او تمام (شد)'' معلوم ہوتی ہے۔

۲- تحصیل اباوڑو ہی کی سرحد کے قریب ضلع رحیم یار خان کے شہر ''سنجر پور'' کے نزدیک 'سرواہی' کے کھنڈرات ہیں، جن کے نزدیک ایک پرانے کنویں کو ہموار کرتے ہوئے ایک اینٹ برآمد ہوئی، جس پر درج ذیل کتبہ تھا:(۲)

سلانْ سلبند ٿپيان ڦکيا نام نصير
کو کنايا پُترگانْمنْ دي اونڙ نام همير
وقت سڪندر بادشاھ ملڪ ڏٽي پهلوان
رعيت راضي ايهہ جِهي جو ٻڌا نِت جوان
هڪ لک سلانْ لڳ چڪيان تيا کو تمام
تِريْ سئو ہوتي باغ دي راڌي اونڙ جام(۲)

---

(۱) مسٹر فریڈ، ای، رابرٹسن، ایگزیکیوٹو انجینئر ریلوے، ریتی ڈویژن، جو کہ بروقت موجود تھا، اس نے اینٹ والی وہ عبارت اور دیگر دستیاب چیزوں کی تفصیل لکھی جو کہ بمبئی کے اخبارات میں شائع ہوئی۔ اس تفصیل کا قدرے اختصار کلنل بی، آر، برینفل نے ''وجنوٹ'' کے متعلق اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے، جہاں سے یہ عبارت لی گئی ہے۔ دیکھئے:
"Vijnot and other old sites in N.E Sindh by Col. B.R Branfill, The Indian Antiquary, vol. XI - 1882, Bombay 1882."

(۲) کتبہ کی عبارت لکھتے وقت میں نے بعض الفاظ کو اردو تلفظ میں لکھا ہے تا کہ انہیں پڑھنے میں آسانی ہو۔ (مترجم)

اس کتبہ کو اردو رسم الخط میں یوں لکھا جاسکتا ہے: (مترجم)

سِلاں سِلبَند تھپیاں پھکیا نام نصیر
کھو کھنایا پتر گامن دے اونڑ نام ہمیر
وقت سکندر بادشاہ ملک دھنی پہلوان
رعیت راضی اینجھی جو بڈھا بنت جوان
ہک لکھ سِلاں لگ چکیاں تھیا کھو تمام
ترے سئو بوٹے باغ دے رادھے انڑ جام

یعنی: نصیر پھکیہ نامی خشت ساز نے اینٹیں بنائیں، اُنڑ ولد گامن (یا ہمیر ولد گامن انڑ) نے کنواں کھدوایا۔ والی ملک سکندر بادشاہ کے عہد میں، جب رعایا ایسی خوش تھی کہ بوڑھا بھی ہمیشہ جوان (محسوس ہوتا) تھا، ایک لاکھ اینٹیں استعمال ہوکر کنواں تیار ہوا اور انڑ جام نے باغیچے میں تین سو پودے لگوائے۔ پہلی سطر میں سندھی لفظ 'کتایا' (کھدوایا) کا پیوند لگا ہوا ہے۔ مذکورہ بالا کتبہ مرحوم مولانا محمد حفیظ الرحمٰن بہاولپوری نے اپنی کتاب ''ذکر کرام'' میں نقل کیا ہے اور اسے اردو رسم الخط میں لکھا ہے(۱)۔

اصل اینٹ پر اس عبارت کے حروف و الفاظ کا بعینہٖ رسم الخط کون سا تھا؛ وہ معلوم نہیں۔ البتہ کافی وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ ''سکندر بادشاہ'' سے مراد جام سکندر سندھ کا سمہ بادشاہ ہے؛ جس کے دور حکومت میں مذکورہ بالا انڑ جام نے یہ کنواں کھدوایا۔ سموں میں ''جام سکندر'' نامی دو بادشاہ گزرے ہیں۔ جام سکندر ثانی (چودھویں بادشاہ) نے صرف ڈیڑھ سال حکومت کی اس وجہ سے یہ کتبہ اس کے نام منسوب نہیں ہوسکتا۔ البتہ جام سکندر اول (نوّاں بادشاہ) جس کا مکمل لقب اور نام غالباً ''صدر الدین جام سکندر شاہ بن خیر الدین جام تو گاچی'' تھا۔ وہ سنہ ۸۱۶ھ (۱۴۱۳ء) کے لگ بھگ تخت نشین ہوا(۲)۔ اگرچہ اس کا عرصہ حکمرانی صحیح طور پر معلوم نہیں، تاہم اس کتبہ کی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ اس نے پانچ سات سال یا اس سے بھی زیادہ عرصہ حکمرانی کی ہوگی جو اس کے دورِ حکومت میں ملک کی آبادی و رعایا کی خوشحالی میں اضافہ ہوا۔

۳- شمالی سندھ اور بالائی علاقہ (سرے) میں ہم نے اس طرح کی دوسری اینٹیں تلاش کیں، ۲۳ جون ۱۹۷۵ء کو گاؤں گُلّو پتافی تحصیل میرپور ماتھیلو میں ایک سگھڑ (آورد سے اشعار کہنے والے) شر قوم کے نہال نامی شخص نے بتایا کہ شر بلوچوں نے گاؤں میں کنویں بنوانے کے لئے لیاروکوٹ(۳) سے اینٹیں نکلوائیں، ان میں سے ایک اینٹ پر یہ لکھا ہوا تھا:

''اللہ بخش کوھاري، سرپکي آميرن جي واري سرھيہ جي ہل تي''

[اللہ بخش کھوہاری(۴)، اینٹ پکی امیروں کے دور میں سرسوں کے ایندھن پر۔]

اس سے ظاہر ہے کہ میر تالپوروں کے دور تک ان پکی اینٹوں پر سندھ کے حکمرانوں کا نام لکھا جاتا رہا۔

---

(۱) دیکھئے: ''ذکر کرام'' مطبوعہ محبوب المطابع پریس دہلی، شائع کردہ بہاولپور سنہ ۱۳۵۷ھ، ص: ۱۲۸-۱۲۹

(۲) سمہ بادشاہوں کے سلسلہ اور حکمرانی کے لئے دیکھئے ہمارا انگریزی مضمون ''سندھ کے سمہ بادشاہوں کا سلسلۂ حکومت'' اس کا حوالہ پہلے گزر چکا ہے۔

(۳) 'لیاروکوٹ' ضلع رحیم یار خان کی حدود میں تالپور میروں کا بنوایا ہوا قلعہ۔

(۴) کھوہار: ذات ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ''اللہ بخش کھوہار نے''۔ کھوہار کا ایک اور مطلب بھی ہے: سندھی میں ''کوھہ'' (کھوہ) بمعنی کنواں، کھوہاری = کنواں تیار کرنے والا۔ (مترجم)

۴- قمرالدین پتافی نے بتایا کہ پہلے بھی ایسی اینٹیں میرپور ماتھیلو کے خطہ سے ملی تھیں۔ اس نے بتایا کہ میرے دادا بتایا کرتے تھے کہ ایک اینٹ پر یہ لکھا ہوا تھا:

سل ٽپي ٽپٽهاري ـ صابُو نانءُ ڪوهاري

دلو راء دي واري ـ سل پڪي ہل جانيي تي

[اینٹیں بنائیں بنانے والے- صابو نام کھوہار نے

دِلوراء کے دور میں- اینٹ پکی تارا میرا (چوکر، بھوسی) کے ایندھن پر]

۵- تاریخ ۲۰ فروری ۱۹۶۶ء کو 'اَلھندے خان' جسکانی (عمر اسی برس) نے بتایا کہ:

روہڑی شہر کے متصل انگریزوں نے مشرقی نارہ نہر نئے رخ کے پاس سے کھدوائی۔ ہمارے رشتہ دار وہاں مزدور تھے۔ روہڑی اسٹیشن کی موجودہ 'انجن شیڈ' کے متصل ہی 'نارہ نہر' کی کھدائی کرتے ہوئے زمین سے تقریباً پانچ گز گہرائی میں ایک پکا کنواں برآمد ہوا، جس سے تین پکی اینٹیں دستیاب ہوئیں جن پر درج ذیل عبارت لکھی ہوئی تھی:

اوستو يارو ذات پڪارو

سرهيہ جو ہل مانهہ جو گارو

سڪندر جو وارو

[کاریگر یارو ذات پکارو

سرسوں کا ایندھن ماش کا گارا

سکندر کا دور]

۶- ہم نے 'موجودہ سندھ' کے زیریں خطوں میں بھی اس قسم کی اینٹوں کی تلاش کی۔ ایک مرتبہ قدیم کھنڈرات تلاش کرتے ہوئے بتاریخ ۹ جولائی ۱۹۵۸ء کو ضلع لاڑکانہ میں میاں الیاس محمد کلھوڑہ کے مقبرہ پر پہنچے۔ معلوم ہوا کہ میاں الیاس محمد سے پہلے بھی وہاں قبرستان تھا۔ اس کے آثار کے متعلق معلومات حاصل کرتے ہوئے وہاں کے مجاور ر پیرل فقیر لاشاری سے معلوم ہوا کہ تقریباً ایک سال قبل (یعنی ۱۹۵۷ء میں) قبرستان کے جنوب مشرقی حصے میں جت قوم کے لوگوں نے کسی فوت شدہ اپنے عزیز کے لئے قبر کی کھدائی کی تو وہاں سے ایک اینٹ برآمد ہوئی، جس پر کچھ الفاظ لکھے ہوئے تھے، جو یہ تھے:

"ٽپڻ والي ٽپي سڪندر دي واري دي"(۱)

[اینٹیں بنانے والے نے اینٹیں بنائیں سکندر کے دور میں]۔

(۱) اس موقعہ پر محترم دوست محمد اسماعیل خان نون مرحوم (اس وقت دادو کے ڈپٹی کلیکٹر) اور بندہ راقم ساتھ تھے۔ پیرل فقیر کی اس روایت کو اسی وقت قلمبند کرلیا گیا۔

پیرل فقیر کو اس خشتی کتبہ میں سے صرف یہی الفاظ اسی طرح یاد تھے۔

۷۔ بتاریخ ۱۴ مئی ۱۹۶۰ء کو بھٹ بھائٹی (تحصیل کھپرو) میں عبدالکریم خاصخیلی نے بتایا کہ 'شادی پلی' اسٹیشن سے تقریباً ایک میل مغرب کی طرف ('بان' نہر سے مشرق میں) موجود ٹیلہ میں سے تلاش کرتے ہوئے ایک چورس اینٹ دیکھی جس پر درج ذیل شعر کندہ تھا:

کوئي آکي سلان کنه پکايان دلو نانءُ کُهاري

جانيي داہل ہلايا، شاه سکندر واري

[اگر کوئی پوچھے کہ اینٹیں کس نے پکائیں؟ اس کا نام دِلو کھوہارہ ہے، تارا میرا کا ایندھن جلایا، شاہ سکندر کے دور میں]۔

پیرل فقیر اور عبدالکریم خاصخیلی کی ان چشم دید گواہیوں سے ثبوت ملتا ہے کہ جام سکندر سمہ کے عہد میں پختہ اینٹوں پر کتبہ لکھنے کا عام رواج تھا اور کنوؤں اور عمارت کے کتبوں کے لئے پختہ اینٹیں تمام سندھ میں استعمال ہوتی تھیں۔ دوسرا یہ کہ سندھی کے ساتھ سرائیکی زبان سندھ اور سندھ کے شمالی بالائی خطہ (سرے) میں عام تھی وہ نہ صرف بولی جاتی تھی بلکہ تاریخی کتبوں کے لکھنے کے لئے بھی استعمال ہوتی تھی، جیسا کہ اس اینٹ کی عبارت سے اس کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ سندھی و سرائیکی گویا ایک ہی ملک کی دو زبانیں تھیں اور بطور خاص شمالی سندھ اور سرے (بالائی خطہ) میں دونوں کے قریبی رشتہ کی تصدیق قاضی قادن کے کلام (شعر) سے ہوتی ہے؛ جس کا بیان آئندہ ہوگا۔

تعلیمی اور سرکاری زبان:

چوتھے باب میں یہ بیان ہو چکا ہے کہ عرب حکومت کے بعد سومرہ دور میں بھی غالباً حسب دستور عربی بطور سرکاری زبان جاری رہی۔ ازاں سواء سومرہ دین اسلام کی طرف متوجہ ہوئے اس وجہ سے عربی کے ذریعے تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔ چونکہ سمہ قبائل بھی ابتداء ہی سے دین اسلام قبول کر چکے تھے اس لئے ان میں عربی تعلیم کا سلسلہ بھی قدیم دور سے رائج رہا۔ سومرہ دور کے آخر میں سمہ قبائل غوث بہاؤالدین زکریا کی تبلیغ و روحانی فیض سے دین اسلام کی طرف کچھ زیادہ ہی متوجہ ہوئے اور ان میں کئی صوفی درویش اور بزرگ لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے سندھ میں تبلیغ اسلام اور تعلیم کو عام کیا۔ اس ماحول میں عربی تعلیمی زبان کے طور پر رائج ہوئی۔ سمہ حکمرانوں نے ذاتی طور پر درسی کتب لکھوانے کے لئے کوششیں کیں، جس کا ثبوت اس دور میں 'منطق' پر لکھوائی گئی ایک درسی کتاب سے ملتا ہے، جو اتفاقاً زمانے کی دستبرد سے بچ گئی ہے

اور آج تک قلمی صورت میں موجود ہے(۱)۔

منطق کی درسی کتاب ''شمۃ فی المیزان'' کے مطالعہ کو مزید آسان بنانے کے لئے جام انڑ عرف محمد سکندر شاہ ثانی نے ۵۸/ ۸۵۷ھ (۱۳۵۶ء) کے لگ بھگ (۲) منگلور (کاٹھیاواڑ) کے استاد و عالم مولانا علاؤالدین (۳) سے استدعا کی کہ وہ اس کتاب کو از سرنو وضاحت (شرح) کے ساتھ مرتب فرمائیں، جس پر مولانا علاؤالدین نے ''الزبدۃ'' کے نام سے ''شمۃ فی المیزان'' کی شرح لکھی۔

کتاب کے مقدمہ میں مؤلف رقمطراز ہے:

''فقد سالنی من لا یسعنی ان اخالفه — الذی اقرّ بفضله الموافق والمخالف. و الاحری لمن یقصد فی حقه مدحا یناسب فضله ان یراعی شجر حساده و غیظ عداه، ان یری مبصر و یسمع واع — وهو الملک المعظم ذوالحلم والعلم والجود والکرم محمد المعروف بانر بن فتح خان بن طوغاچی بن جام لا زال له من التوفیق عصام و من التایید قوام — ان اکتب ما یجری مجرا الشرح للشمه فی المیزان لینفع به من یهتم بشانها من الخلان.''

[مجھے ایک ایسی ہستی نے کہا، جس کے انکار کی مجھے طاقت نہیں، جس کی فضیلت کے موافق و مخالف بھی قائل ہیں، اگر کوئی اس کی کما حقہ مدح کرنا چاہے تو اسے چاہئے کہ اس کے حاسدوں اور دشمنوں کی کدورت سے کنارہ کشی اختیار کرے تاکہ دوسروں کے لئے حقیقت صحیح طرح سے واضح ہو- وہ ہے ملک المعظم ذو الحلم و العلم صاحب جود و کرم محمد المعروف انڑ بن فتح خان بن توگاچی بن جام۔ خدا کرے کہ ہمیشہ اس کی ذاتی خوبیوں کے ساتھ توفیق شاملِ حال رہے اور مالک کی مدد اس کا سہارا ہو، اس نے مجھے حکم دیا کہ میں ''شمۃ فی المیزان'' کی شرح

---

(۱) 'الزبدۃ' جس کا ذکر ذیل میں آرہا ہے، وہ سندھ میں درسی کتاب کے طور پر پڑھائی گئی، جیسا کہ سندھ یونیورسٹی کے کتب خانہ میں محفوظ اس کتاب کے قلمی نسخہ پر کی گئی حاشیہ آرائیوں سے ظاہر ہے۔ اس کتاب کے تین مخطوطے لندن کی انڈیا آفیس لائبریری میں محفوظ ہیں۔ ایک نسخہ قاضیان کوٹڑی کے کتب خانہ میں ہے، گجرات کی طرف بھی یہ کتاب مقبول رہی اور اس کا ایک نسخہ احمد میاں اختر جوناگڑھی مرحوم کے کتب خانہ میں بھی موجود تھا جو راقم کی نظر سے بھی گزرا تھا۔

(۲) اس سمہ حکمران کے نام، لقب اور دور حکومت کے لئے دیکھئے ہمارا انگریزی میں تحقیقی مقالہ ''سندھ کے سمہ حکمرانوں کا سلسلۂ حکومت'' پاکستان ہسٹاریکل ریکارڈس اور آرکائیوز کمیشن کے دوسرے اجلاس (پشاور) کی روداد، پاکستان گورنمنٹ پریس، کراچی ۱۹۵۷ء

(۳) مصنف کا نام ''انڈیا آفیس لائبریری'' کے ایک قلمی نسخے کے پیچھے دیا ہوا ہے۔ (دیکھئے اس لائبریری کی ''عربی کتب کی فہرست'' لندن ۱۸۷۷ء، ص۱۵۶)

لکھوں تا کہ اس کی شایانِ شان اہتمام کرنے والے احباب اس سے نفع حاصل کرسکیں]۔(۱)

غالباً سمہ دور کے آغاز سے ہی فارسی، سرکاری زبان کے طور پر استعمال ہونے لگی، جس کا اہم سبب یہ تھا کہ اس سے تقریباً دوسو برس قبل فارسی دہلی کی مرکزی حکومت کی دفتری اور سرکاری زبان کی حیثیت سے کافی اہمیت حاصل کرچکی تھی، نیز صوبائی گورنروں کی دفتری زبان کی حیثیت میں وہ ہندوستان کے اکثر علاقوں میں عام کاروباری زبان کے طور پر رائج ہوچکی تھی۔ سمہ طاقت کے آغاز میں سندھ کے پڑوسی خطے - گجرات اور ملتان براہ راست دہلی کے ماتحت تھے اور وہاں کے گورنر سندھ کے سیاسی انقلاب - یعنی سومروں کے زوال اور سموں کی ابھرتی ہوئی طاقت - کو غور وفکر سے دیکھ رہے تھے۔ ملتان کا گورنر عین الملک ماہرو خاص طور پر سمہ سردار جام بھانبھنیہ کی سرکشی کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے، آخری سومرہ حکمران ہمیر ولد دودو کی ہمت افزائی کر رہا تھا اور ''اس کے وجود کے پودے کو حادثات کی تند و تیز ہواؤں سے بچا رہا تھا'' اور ساتھ ہی جام بھانبھنیہ اور اس کے حامیوں اور ساتھیوں کو خط و کتابت کے ذریعے متنبہ کر رہا تھا(۲)۔

اس عرصہ میں ایک مرتبہ شیخ الاسلام صدرالدین ملتانی اور مخدوم جہانیاں جہاں گشت نے درمیان میں پڑ کر کچھ شرائط پر طرفین (دہلی اور سندھ) کے مابین صلح کرانے کی کوشش بھی کی لیکن صلح نہیں ہوسکی۔ گورنر عین الملک نے سیوہن پر لشکر کشی کردی اور جام بھانبھنیہ نے اس لشکر کے ساتھ خط و کتابت کے ذریعے بات چلائی لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ گورنر عین الملک نے اس تمام سیاسی ہنگامہ کا اپنے بعض خطوط میں تذکرہ کیا ہے، جو اس نے بعض لیڈرانِ سندھ اور با اثر شخصیات کی طرف لکھے تھے؛ ان خطوط میں، اہلِ سندھ کی طرف سے اس کے نام لکھے گئے خطوط میں جام بھانبھنیہ کی سرکشی و حجت بازی اور سیوہن میں شاہی لشکر کی طرف اس کے مراسلات کا ذکر ہے(۳)۔

گورنر عین الملک کے مراسلات چونکہ فارسی میں ہیں اس لئے جام بھانبھنیہ اور دیگر سربراہانِ سندھ کی طرف سے مراسلت بھی فارسی ہی میں ہوئی ہوگی۔ یہ وہ قدیم ترین فارسی خط و کتابت ہے جو مرکزی حکومت دہلی کے گورنر اور سندھ کے سمہ حکمرانوں اور دیگر سرکردہ لوگوں کے درمیان ہوئی، جس کا پختہ تاریخی ثبوت موجود ہے۔ اس بناء پر کہا جاسکتا ہے کہ سمہ

---

(۱) اعجاز الحق قدوسی نے سید حسام الدین راشدی کے حواشی مکلی نامہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ: ''اس کتاب کے مقدمے میں اس جام کا نام اس طرح درج ہے: الملک المعظم محمد المعروف انر بن فتح خان بن صدرالدین بن طماچی بن جام'' تاریخ سندھ حصہ اول، ص ۴۶۵ (مترجم)

(۲) انشای ماہرو، مطبوعہ شعبہ تاریخ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ص ۷۷۸

(۳) انشای ماہرو، مطبوعہ شعبہ تاریخ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ص ۷۷۸

طاقت کے آغاز ہی سے فارسی، سیاسی معاہدات و مراسلات کی زبان تسلیم ہونے لگی۔ گورنر عین الملک کے خطوط میں یہ اشارہ بھی موجود ہے کہ 'جام جونہ' (یعنی جام بانبھنیہ کا چچا جام جونہ) اس وقت بھی سلاطینِ دہلی کی اطاعت کا خواہاں اور ہر شاہی فرمان تسلیم کرنے کے لئے تیار تھا؛ اسی لئے بعد میں جام بھانبھنیہ کو دہلی میں نظر بند رکھا گیا اور 'جام جونہ' کو سلطان فیروز کی طرف سے ٹھٹہ کا جام مقرر کیا گیا، جس نے علاؤالدین 'جام جونہ' کے لقب سے تقریباً ۷۷۷ھ سے ۹۱/۷۹۰ھ (۱۳۸۸ء) تک ٹھٹہ پر حکومت کی۔ اپنے دورِ حکمرانی میں اس نے ایک قدیمی بزرگ شیخ حاجی ابوتراب کے مزار پر ۷۸۲ھ (۱۳۸۰ء) میں گنبد بنوایا اور اس پر فارسی میں درج ذیل کتبہ لگوایا، جس کے شروع میں سلطان فیروز شاہ کا نام آداب و القاب کے ساتھ لیا گیا ہے اور اس کے بعد خود ''علاؤالدین جام جونہ'' کا نام درج ہے۔

بعہدِ شہریارِ دہر سلطان داورِ دوران
شہِ فیروز منصور و مظفر در صفِ میدان
بامر سرفرازِ سند خاصِ حضرت عالی
کہ پای قدر او اعلیٰ زِفر فرقدِ تابان
ستودن 'جام' جم سیرت 'علاؤالدین' دریا دل
کہ از ارزانی لطفش جہاں شد جملہ آبادان
برآمد اینچنیں گنبد معلّی کز صفا گوئی
بسانِ بیت مسعود آمد ست ازہارِ ایں ایوان
مقامِ شیخ حاجی بوترابی آں ولی اللہ
کہ بر درگاہِ او گردد روا حاجات خلق آسان
بسالِ ہفصد و ہشتاد و دو از ہجرتِ احمد
زعونِ ایزد و ذوالمن و الافضال والاحسان
بنا شد ثالثِ ماہ صفر ایں روضۂ میمون
بسعی کمترینِ بندگانِ موسیٰ بن شہیان(۱)

(۱) اعجاز الحق قدوسی نے بھی اس کتبہ کو نقل کیا ہے جس کے پہلے مصرع میں 'دوراں' کے بجائے (کذا) لکھا ہوا ہے اور دوسرے مصرع کے آخر میں 'میدان' کے بجائے شاہاں کا لفظ ہے، اسی طرح تیسرے مصرع میں 'سرفرازِ سند' کے بجائے 'سرفراز ہند' ہے، پانچویں مصرع کا ابتدائی لفظ 'ستودہ' ہے اور چھٹے مصرع میں 'ارزانی' کے بجائے 'مہماتی' کا لفظ ہے اور آٹھویں مصرع میں 'مسعود آمدست ازہارِ' کے بجائے 'معمور آمدہ ست ازبار' کا جملہ ہے، بارہویں مصرع میں 'ایزد و ذوالمن' کے بجائے 'ایزد ذوالمن' ہے۔ دیکھئے تاریخ سندھ حصہ اول، ص ۴۵۰ (مترجم)

یہ کتبہ آج تک موجود ہے(ا)، اور سمہ دور حکومت کا سب سے قدیم کتبہ ہے، جو عربی کے بجائے فارسی میں لکھا گیا ہے۔ اس کتبہ سے ظاہر ہے کہ سمہ دور سے ہی سرکاری تحریروں اور یادگاروں میں فارسی زبان استعمال ہونے لگی اور وہ سرکاری زبان کی حیثیت سے ملکی کاروبار میں دخیل ہوئی۔

سمہ دور میں سندھی زبان کے روایتی ادب کا ذخیرہ:

سومرہ دور میں 'دودو-چنیسر'' کی رزمیہ داستان کے علاوہ، جسے سندھ کے سلیقہ مند شعراء اور راویوں، بھانڈوں اور بھاٹوں نے جذبۂ حب الوطنی سے گایا، باقی تمام داستانیں قصہ خوانی کے طور پر رائج ہوئیں۔ عمر- مارئی اور 'مومل - رانو' کے قصوں میں سومرہ بادشاہوں کی تعریف یا ان کی بہادری کے بجائے ان کی کمزوریوں کا پہلو نمایاں ہے اس لئے غالباً یہ قصے سمہ دور میں ہی آزادانہ طور پر گائے گئے۔ بعض تاریخی علامات اور عام مروج مقامی روایات کی جانچ پھٹک اور ان پر غور وفکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سومرہ حکومت کے زوال کے وقت سمہ خوشحال اور بڑے زمیندار تھے۔ انہوں نے سیاسی استحکام کی خاطر عوام کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے دل کھول کر سخاوت کی جس وجہ سے لوگ ان کی طرف زیادہ مائل ہوئے۔ بھانڈ اور بھاٹ گویا اس دور کے اخبارات تھے، جنہیں سمہ زمینداروں نے خاص طور پر بسایا، اس لئے انعام کی لالچ اور امید پر بھانڈوں اور بھاٹوں نے ان کی سخاوت کو مشہور کیا اور ان کے نام و ناموس کو بڑھایا۔

سمہ دور میں بعض گزشتہ سمہ سربراہوں مثلاً جام لاکھو، جام جکھرو، جام اوٹھو جکھرانی، ہُنگر تھدیانی، وکیہ داتار، سپڑ جام وغیرہ کی سخاوت کے قصے مشہور ہوئے۔ سومروں کی بہادری کے کارناموں کے مقابلے میں بھانڈوں اور گویّوں نے 'جام لاکھو'، 'جام ابڑو سمہ'، 'جام پونیرو'، 'کارائڑ' سمہ جیسے سربراہوں کی دلیری کے کارناموں کو سراہا اور انہیں شہرت دی۔ دوسری طرف ان سلیقہ مند دانا لوگوں نے سومرہ دور کی عشقیہ داستانوں مثلاً جام لاکھو اور مہر رانی، جام لاکھو اور اوڈ قوم کی ایک عورت، جام اڈھو اور ہوتھل پری، جام جراڑ اور بُو بنا، جام تماچی اور نوری کے قصوں کو گایا اور مشہور کیا۔

نہیں کہا جاسکتا کہ ان قصوں اور داستانوں میں سے کون سا قصہ کس خاص دور میں معروف ہوا، سوائے 'جام تماچی اور نوری' کی داستان کے، جس کی بنیاد ہی سمہ دور میں پڑی۔ یہ داستان جام تماچی کے عرصۂ حکمرانی سے وابستہ ہے۔ تاریخی مطالعہ کی بنیاد پر کہہ سکتے ہیں کہ ''رکن الدین شاہ جام تماچی بن فیروز الدین شاہ جام انڑ نے پہلی مرتبہ سنہ ۷۶۸ھ سے ۷۷۷ھ (۱۳۶۶-۱۳۷۵ء) تک ''خیر الدین جام تو گاچی'' سے مل کر حکومت کی۔ اس کے بعد وہ نظر بند

(ا) چونکہ یہ فارسی زبان کا سندھ میں قدیم ترین تاریخی کتبہ تھا اس لئے راقم نے سندھ صوبائی میوزیم کے اعزازی ڈائریکٹر کی حیثیت سے اس اصل کتبہ کو میوزیم میں محفوظ کروادیا تھا اور اس کی ہو بہو نقل از سر نو اسی جگہ پر شیخ ابو تراب کے مقبرہ میں لگوادی تھی۔

ہوکر دہلی چلا گیا اور سلطان فیروز شاہ کی وفات کے بعد سندھ واپس آیا اور غالباً ۷۹۰/۹۱ھ سے ۷۹۴ھ (۱۳۸۸-۱۳۹۲ء) تک حکومت کرتا رہا(۱)۔ اس اعتبار سے نوری اور جام تماچی کی داستانِ محبت آٹھویں صدی ہجری (چودھویں صدی عیسوی) کے اواخر کی ہے۔

ہوشیار اور گُنی قسم کے بھانڈوں، بھاٹوں اور گویّوں نے نہ صرف سمہ سرداروں کی سخاوت و دلیری اور محبت کی داستانوں کو نئے سرے سے زندہ کیا بلکہ ان داستانوں کو ''فن قصہ خوانی'' کے طور پر بھی گایا اور گانے کی خاطر ''مُعمّوں'' کو ان قصوں اور داستانوں کے تانے بانے میں بُنا۔ ''مُعمّے'' ترتیب کے لحاظ سے دوہرے منظوم مصرعے ہیں جن میں قصہ کے کچھ خاص نزاکت کے مواقع کا مضمون سمایا ہوتا ہے۔ یہ نہیں معلوم کہ ''مُعمّوں کے ذریعے باتیں کرنا'' کب سے شروع ہوا؟ یا مُعمّوں سے قصے کس نے بنائے؛ البتہ سندھ کے سلیقہ مند شعراء اور راویوں کے زبانی اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصے اور کہانیاں زبانی روایت کے طور پر قدیم زمانے سے بھانڈوں، بھاٹوں، گویّوں اور دیگر سلیقہ مند شاعر راویوں کی زبانی چلتی آرہی ہیں، چھوٹے اپنے بڑوں سے انہیں سنتے اور سیکھتے آرہے ہیں۔ سموں کی سخاوت، دلیری اور عشقیہ داستانوں سے متعلق تقریباً دس - پندرہ قصے پرانے زمانے سے ہی رائج ہیں، اگرچہ ان میں سے اکثر کی واقعاتی بنیاد غالباً سومرہ دور میں پڑی، مگر فنِ قصہ خوانی کے اعتبار سے ان کے سانچے اور قالب سمہ دور میں ہی بنے۔ ان میں شامل وہ ''معمّے'' جو ہمیں موجودہ دور کے راویوں سے ملتے ہیں، اور جنہیں انہوں نے اپنے بڑوں سے سیکھا، وہ سب کے سب قدیم دور کے نہیں ہیں: اکثر 'مُعمّوں' میں الفاظ خواہ خیالات کی بناوٹ بہت بعد کی معلوم ہوتی ہے۔ خاص طور پر ایسے معمّے جن کے پہلے یا آخری مصرع کے درمیان میں قافیہ موجود ہے وہ اکثر بعد کے دور کے کہے ہوئے ہیں۔ مگر کچھ معمّے اپنی لفظی ترتیب اور معنوی لحاظ سے قدیم معلوم ہوتے ہیں اور وہ غالباً سمہ یا سومرہ دور کے ہیں۔ ہم اپنی موجودہ تحقیق کی بنیاد پر اتنا کہہ سکتے ہیں کہ ذیل کی مثالیں ان قدیم معمّوں کی ہیں جو غالباً سمہ دور میں بنائی اور گائی گئیں(۲)۔

سرفروشی کے متعلق معمّے:

سومرہ دور میں بھی سمہ سربراہوں نے دورانِ جنگ قابل فخر کارنامے سرانجام دے کر خود کو سرخرو کیا۔ جیسا کہ ''جام پُونڑہ'' نے گجروں پر چڑھائی کی اور جام ابڑو سمہ نے حفاظت و پناہ میں آنے والوں کو تحفظ دیا اور اس پر اپنا سر دے کر سرخرو ہوا۔ ایسے بہادروں کے کارناموں کو

---

(۱) دیکھیئے راقم کا تحقیقی مقالہ ''سندھ کے سمہ حکمرانوں کا سلسلۂ حکومت'' پاکستان ہسٹاریکل ریکارڈس اور آرکائیوز کمیشن کے دوسرے اجلاس (پشاور) کی روداد، پاکستان گورنمنٹ پریس، کراچی ۱۹۵۷ء، ص ۲۳-۲۱

(۲) تفصیلی مطالعہ کے لئے دیکھیئے لوک ادب تجویز کے تحت 'ڳاھڻ سان ڳالھيون'' اور ''عشقیہ داستان'' اور ''کارہائے سرفروشی'' کے بارے میں مرتب کردہ کتابوں پر مصنف کے لکھے ہوئے مقدمے۔

غالباً سومرہ دور میں ہی گایا گیا۔ ان مشہور جنگی کارناموں کے علاوہ دیگر سورما سربراہوں کی شجاعت کے کارناموں کو بھی گایا گیا، جن میں سے 'جام لاکھا' اور 'کارائڑو سمہ' کے متعلق متے کافی قدیم معلوم ہوتے ہیں۔

جام لاکھو:

سموں میں سے ''جام لاکھو'' غالباً قدیم تر سورما اور سخی سردار تھا۔ جو سومرہ دور، بارھویں صدی عیسوی میں، ایک اور روایت کے مطابق سومروں کے اوائلی عروج سے بھی پہلے دسویں صدی عیسوی میں ہوگزرا ہے(۱)۔ ''شاہ جو رسالو'' کے ''سُر ڈھر'' (ڈہر) اور دیگر رسائل میں جام لاکھو کی لوٹ مار اور بھاگوانوں پر حملوں کا ذکر موجود ہے(۲)۔

لاکھو بڑا سرکش سورما تھا: اس نے کہا کہ جو شخص بھی مجھے میرے باپ ''پھُل'' کے موت کی خبر سنائے گا میں اس کی زبان کٹوادوں گا، آخر ایک بھاٹ نے چالاکی و مکاری سے اسے یوں خبر سنائی کہ:

هڪ ڦل پسجن واڙيين، ٻئاجي ٻنيينْ ڏائَ
لاکا! آء مهراڻ، توري سُجو ڪاڇڙو

[یعنی (پھُل نام کا اب کوئی نظر ہی نہیں آتا، سوائے اس کے جو) ایک قسم کے پھُل (پھول) تو باڑیوں کی بیلوں میں اور دوسرے پھُل (پھُلا)(۱) بھٹیوں میں بھنتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لاکھو! مہران کی مانند آجا! تیرے بغیر 'کاچھڑو' ویران ہے]

کارائڑو سمہ:

کارائڑو سمہ، علاقہ کچھ میں ''گرڑیو اَبڑا سیو'' کے 'پینگھر جام' کا بیٹا تھا، وہ بڑا بہادر اور لٹیرا شخص تھا اور کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ بالآخر اس وقت کے حاکم کچھ اور اس کے وزیر نے ایک منصوبہ بنایا جس کے تحت ''کارائڑو'' قلعہ کے اندر گھیرے میں آگیا، اس نے قلعہ کے اوپر سے چھلانگ لگادی تو نیچے کھائی میں لگی ہوئی فولادی سلاخوں کی نوکوں پر جا گرا، جو اس کے پیٹ میں گھس گئیں۔ مرنے کے بعد اس کی گردن کاٹ کر بھیج دی گئی جس کو اس کی بہن نے جھولے میں ڈال کر جھلاتے ہوئے اس پر بین کیا کہ:

---

(۱) کچھ علاقہ کی روایت کی رُو سے ''لاکھو'' بکری سال ۹۷۶ یعنی نویں صدی عیسوی کے آخر میں پیدا ہوا۔ جس کا مطلب ہوا کہ وہ دسویں صدی میں جوان ہوا:

سنبت نو سؤ چاهتر، ٻيج تتي ڪارتڪ ماس
تهن ڏيهن لاکو جَنميو، سورج جوت پرڪاس

(۲) تفصیل کے لئے دیکھئے راقم کا کتابچہ ''لاکھو پھُلانی'' مطبوعہ سندھی مجلس، سندھ یونیورسٹی پریس سنہ ۱۹۵۷ء

(۳) سندھی میں پھُلا بمعنی بھنے ہوئے دانے بھی آتا ہے۔ (مترجم)

کارايل جي ڪوڏ، مون نگر سڀ نهارئا
پينگهي پائي لوڏ، سر سمي جام جو

[محبوب کی تلاش میں، میں نے تمام شہر دیکھ ڈالے،
(اب اُسی) سمہ جام کا سر جھولے میں ڈال کر جھلا رہی ہوں۔]

سخاوت کے متعلق مُعمّے:

سمہ سرداروں نے دل کھول کر سخاوت کی اور غریب وغرباء بلکہ نادانوں کو بھی انعامات اور خلوتیں عطا کیں۔ بھانڈوں، بھاٹوں اور گویّوں کو مالا مال کر دیا، جنہوں نے اپنے ان مربیوں اور ان کے بڑوں کو ''داتا'' کے طور پر تسلیم اور مشہور کر دیا۔ اس طرح سموں میں سے ''دس داتا'' مشہور ہوئے: لاکھو پھلانی، جکھر و اوڈھانی، ھُنگر تھدیانی، اوٹھو جکھرانی، سپّڑ چوٹانی، جسودن آگرو، جام ونجھر، وکیو داتار، رائے ڈیاچ اور جام کرن۔ بھانڈوں اور بھاٹوں نے ان فیاض لوگوں کی کہانیوں کو مُعمّوں میں گایا اور سراہا، جس کی مثالیں ذیل میں دی جاتی ہیں:

جام لاکھو اور سونا تقسیم کرنے والا سوداگر:

جام لاکھو کی سخاوت(۱) مشہور تھی، اس کی وفات کے بہت بعد کسی مسافر نے ''پُران دریا'' سے پوچھا کہ:

جهوني تون پراڻ، جُڳ ڇتيهه سنيرين
توکي ڏٺا هاڻ، لاکي جهڙا پَهيڙا

[اے پُران دریا! تو بہت قدیم زمانے سے ہے، تجھے چھتّیسوں (مطلب: لاتعداد) زمانے یاد اور تیرے دیکھے ہوئے ہیں۔ تو نے ''لاکھا'' جیسا کوئی قاصد (اپنے اوپر سے گزرنے والا شخص) دیکھا!]

پُران دریا نے جواب دیا کہ:

لاکا لکَ لنگهئا، اننڙ ڪروڙيون . اَٺ
هيم هيڙائو هيڪڙو، جو وري نه آيو مون وٽ

[''لاکھا'' تو لاکھوں آئے نیز کروڑوں ''اُنڑ''(۲) بھی آئے، لیکن سونے کا سوداگر ایک ہی میرے پاس سے گزرا، جو دوبارہ نہیں آیا۔](۳)

(۱) سمہ قوم کا مشہور بادشاہ ''جام لاکھو''
(۲) سندھ کے مشہور سمہ خاندان کے حکمرانوں میں سے حاکم کا نام جو 'جام انڑ' کے نام سے مشہور ہے۔ (مترجم)
(۳) ڳاهڻ سان ڳالهيون' کے مقدمہ 'ل' پر یہ شعر یوں ہے:
لاکا لک آئيا، انڙ ڪروڙيون اٺ   پر هيم هيڙائون هڪڙو، وري نه آيو مون وٽ (مترجم)

کہتے ہیں کہ 'جام لاکھو' جس وقت 'پران' دریا پر منزل انداز ہوا تو اس نے درختوں کو سرخ جوڑے پہنائے، لیکن سونے کا سوداگر جب ''پران'' کے کنارے منزل انداز ہوا تو اس نے وہاں کے درختوں اور پودوں پر سونے کے زیورات آویزاں کروائے جو اس نے واپس نہیں اتروائے۔

ورکیو داتار (داتا):

وکیو داتار سے ''سومنگ'' نامی گویّے نے بے موسم پیلو درخت کے پھل کا سوال کیا جس کے جواب میں وکیو نے اس سے کہا کہ:

انبن لڳي ڪيري، جارين لڳي چٽ

ور چارڻ، ماٺ ڪر، جيسين اچي وٽ

[کیری = کچے چھوٹے آم؛ چٽ = پیلو درخت کے پھل کے گچھے/خوشے، یعنی ابھی پیلو درخت کے پھل کچے ہیں جب تک اس کا موسم آئے تب تک انتظار کر]

جکھرو اوڈھانی اور اوڈھو جکھرانی:

جام اڈھو کا بیٹا جام جکھرو بڑا سخی شخص تھا، جس کے بارے میں بھٹائی صاحب نے بھی کہا ہے:

ڏمرجي تہ ڏي، پرچي تہ پَٽَ پري

جُنگ جکري ڪي، ٻئي چڱيون چِت ۾

[ناراض ہو کر بھی دیتا ہے، مصالحت اور راضی نامہ کرے تو میدان بھر ڈالے، بہادر اور بانکے پہلوان جکھرے کے قلب و دماغ میں دونوں اچھی سوچیں ہیں۔]

اس کی نسل سے ''جام اوڈھو'' پیدا ہوا، جو بڑا سخی مرد تھا۔ اس کے متعلق ایک قدیمی 'مُعَمّہ'' ہے:

اوني جي ڏانن، ڪيھون ابر لڳيون

رج پيئي راڻين، ڏاتار تِتِ ڏتجي وئا

[اوڈھو نے عطا اور بخشش (ڏِين) میں جو ریوڑ دیئے ان کے پاؤں سے اٹھنے والی دھول، بادلوں سے جا لگی]

اُس گرد میں رانیاں اور بڑے سخی لوگ بھی چھپ گئے

ھُنگر تھدھیانی:

''جام ساہڑ'' کی اولاد میں سے مشہور سخی شخص تھا۔ اس کے لئے کہا گیا:

تني تَجُ ڏناس، سمون ساهڙ پُٽِ ۾
پڊرو پر ڪنداس، هٽند تنديائي ٿئو

[''ساہڑ'' کی نسل میں 'سمہ' کو ٹھنڈا دودھ پلایا گیا
(اس کی نسل سے) ہُنُدتھدیانی بیرونی ممالک میں بھی مشہور ہوا۔]

عشق ومحبت کی داستانوں کے متعلق مُعَمّے:

'جام لاکھو' اور 'جام اڈھو' غالباً سمہ دور سے پہلے کے ہیں، ان سے منسوب ''جام لاکھو اور مہر رانی'' اور ''جام اڈھو اور ہوتھل پری'' کی داستانِ محبت قدیم دور سے مشہور تھی۔ ان داستانوں کو سمہ دور میں بڑے ذوق وشوق سے گایا گیا۔ ''جام تماچی اور نوری'' کی عشقیہ داستان کی بنیاد ہی سمہ حکومت کے ابتدائی دور میں پڑی، اس کے علاوہ ''بوبنا اور جراڑ'' کی داستان نے بھی غالباً سمہ دور کے آخر میں نشونما پائی۔ ان تمام داستانوں کی روایات میں معمائیں اور اشعار ہیں، جن میں سے بعض تو بہت قدیمی ہیں۔ یہاں پر ہم بطور مثال ''جام اڈھو اور ہوتھل پری'' کے قصے سے متعلق کچھ اس قسم کے معمائی اشعار پیش کرتے ہیں جو زبان کی ترتیب کے لحاظ سے قدیمی معلوم ہوتے ہیں اور غالباً سمہ دور میں کہے گئے ہیں۔ جام اوڈھو کی بھابی اس پر فریفتہ ہوگئی لیکن جام اوڈھو نے اپنی پاک دامنی کو برقرار رکھا، بعد میں جس وقت جام اڈھو ملک چھوڑنے لگا تو اس کی حیران و پریشان افسردہ بھابی نے آہ وزاری کرتے ہوئے کہا کہ:

اتر سيگهون ڪيئون، ڏونگر ڏمريا
هينڙو ڦتڪي مڇيَ جيئن، ساجن سنيريا

[شمال سے تند و تیز ہوائیں چلنے لگیں، پہاڑ پربت غضبناک ہوئے،
ساجن کی روانگی کی تیاری کی وجہ سے دل مچھلی کی طرح تڑپ رہا ہے۔]

ہوتھل پری نے جام اڈھو کی محبت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ:

اُڏا! توسين آر، ڪروسين نه سپ چمار
شل تر - ہابيھڙي ٿي مران

[اُڈھا! تیرے ساتھ رغبت ہے کاش! تو ساری زندگی افسردہ اور دھیما نہ ہو
(اگر ایسا ہو تو پھر) اللہ کرے کہ میں ریگستانی فاختہ بن کر مرجاؤں۔]

مزید کہا کہ:

وساريان نه وسرن، وسرڻ نه سيڻ
جي نه تمن نيڻ، تر - ہا پيھڙي ٿي مران

[بھلاتی ہوں تو بھی ساجن بھولتے نہیں، اگر آنکھیں نہ برسیں تو ریگستان کی فاختہ بن کر مرجاؤں]۔

اڈھو اور ہوتھل پری کی شادی ہوئی تو:

رڻ وڳڻ ماڍو و، ڇانيو ڏاڙهون ڏاک(۱)
اڍو هوٿل پرڻيا، سورج پري ساک

[بیابانی راستہ سرسبز و شاداب ہوگیا، انار و انگور سے ڈھک گیا
اڈھو اور ہوتھل کی شادی ہوئی، سورج گواہ بنا۔]

ہوتھل کو اڈھو کی یاد:

ڇپر تو تي ڇٽ، وٺي مينهن نه اجرن
ور جوين جا مٽ، نيڻ ڇتاريا نه ڇلن

[پہاڑ! تیرے نشان برسات سے مٹتے نہیں
اپنی بیویوں کے محبوب واپس آ، آنکھیں راہیں دیکھتے ساکت ہوگئی ہیں۔]

ہوتھل پری کا 'اڈھو' کو چھوڑ جانا:

چڙهي پهڻ چڪاس، اڍي ڪي ٿي اُتهين
قلين جهڙي نار، ويئي نڳامري نڪري

[پہاڑوں پر چڑھ چکا (ہوتھل) کو دیکھنے کے لیے
پھول جیسی بیوی، بدنصیب نکل کر چلی گئی۔]

اڈھو کو ہوتھل پری کی جدائی کا غم:

پاڻي مٿي پن، جِينءَ ٿو ٻڏي اپڙي
تينءَ هوٿل منهنجو من، لوڙهي وڏو لهرين

[جس طرح سطحِ آب پر درخت کا پتّا ڈوبتا تیرتا ہے، اے ہوتھل! میرا من بھی اسی طرح (غمِ فراق کی) لہروں میں آیا ہوا ہے۔]

ہوتھل کو 'اڈھو' کا غمِ فراق:

ڪاٺي ڪاءِ ڪِيونءَ، جِينءَ سُرو سانگهيڙو ڪري
منهنجو تينءَ هنيون، اڄ اڍي ڪاڏئو

[جس طرح گھُن لکڑی کو کھا کر کھوکھلا کر دیتا ہے میرا اندر بھی اسی طرح ''اڈھو'' نے کھوکھلا کر دیا ہے۔

(۱) ایک اور روایت میں ''رڻ ہر ڪريو ماڏوو، وڇائي ڏاڙهون ڏاک'' ہے۔

یہ سب سمہ دور کے روایتی ادبی ذخیرہ کی چند مثالیں ہیں، جن میں اس دور کی بہادری، سخاوت و محبت کی داستانیں مذکور ہیں۔ ایک تو حاکموں اور سربراہوں کی سخاوت، دوسرا: گویّوں، بھانڈوں اور بھاٹوں کو انعامات کی امید اور تیسرا: سندھی زبان میں بیان کی قوت و قصہ خوانی کی بڑھتی ہوئی صلاحیت۔ ان تینوں نے روایتی ادب کے ذخیرہ میں بڑا اضافہ کیا۔ بھانڈوں، بھاٹوں اور گویّوں نے نہ صرف ان قصوں اور کارناموں کو ازسرِ نو زندہ اور ملک بھر میں مشہور کیا بلکہ مُعمّوں اور اشعار کو ان داستانوں کے تانے بانے میں بُن کر انہیں خاص اہتمام سے گایا بھی اور یوں انہوں نے سندھی زبان میں قصہ خوانی کے فن کو عروج پر پہنچادیا۔

ماموئیوں کے اشعار:(۱)

ماموئیوں کے شعر بھی سمہ اوائلی دور کے اس روایتی ادب کے سلسلے میں شامل ہیں، مگر وہ واقعات کے اعتبار سے 'نیم تاریخی' حیثیت رکھتے ہیں۔ ذیل میں اشعار پر تنقیدی نگاہ سے روشنی ڈالی جاتی ہے۔

عام روایات میں بہت سارے اشعار 'ہفت تن' (سات) ماموئیوں کی طرف منسوب ہیں، مگر ان کی ترتیب اور معنی سے ظاہر ہے کہ ان میں سے بہت سارے اشعار بعد کے دور کے ہیں۔ البتہ درج ذیل دو شعروں کے مضمون کے اندرونی اسلوب سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ غالباً سومرہ حکومت کے زوال اور سمّوں کے ابتدائی دورِ عروج کے ہیں(۲)۔

---

(۱) سندھی میں ''مام'' کے معنی ہیں خفیہ وصف، رمز، راز، بھید، اشارہ، سُدھ، علامت، اطلاع، خبر وغیرہ۔ ماموئی: 'مام' سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں: رمز و کنایہ میں بات کرنے والا۔ قدیم دور میں سندھ کے سات ماموئی فقیروں کے اشعار مشہور ہیں۔ (مترجم)

(۲) ان اشعار کی ترتیب کے متعلق اس کتاب کے پہلے ایڈیشن میں جن خیالات و امکانات کو زیر بحث لایا گیا تھا، ان پر نظر ثانی کی گئی ہے اور گزشتہ تین دہائیوں میں مزید تحقیق و معلومات کی بنیاد پر ضروری ترمیم کی گئی ہے۔ اس اعتبار سے موجودہ متن کو مستند سمجھنا چاہئے۔ عام طور پر یہ اشعار یوں پڑھے جاتے ہیں:

(۱) هاڪ وهندو هاڪڙو، پهندي ہند اروڙ
بِهه، ميجي ۽ لوڙهه، سمي ويندي سوڪڙي
(۲) ننگر جي آڌار، متان ويهجو ماڙ هٺا
پراڻا پرار، نوان اڏجنو نجهرا

زبان سے ظاہر ہے کہ ان اشعار کا یہ تلفظ اس پچھلے دور کا ہے، روایت کے مطابق یہ اشعار 'ساموئی' یا ٹھٹہ میں پڑھے گئے، لیکن لفظ ''پهندي'' ٹھٹہ کی زبان کے مطابق نہیں۔ مختلف روایات میں 'سمي ويندي سوڪڙي' 'سمي ايندي سوڪڙي' یا 'سمي ايندا سوڪڙي' کے الفاظ ملتے ہیں حالانکہ معنوی اعتبار سے سب کا مقصد ایک ہے۔

ہاکڑہ دریا کے دوبارہ رواں ہونے کی روایت ہمیں خطۂ بہاولپور سے بھی ملتی ہے۔ وہاں 'مروٹ' کے قدیم قلعہ کے حکمران سومرہ تھے۔ ان کے بعد ''سوڑھا رائے'' وہاں کا حاکم یا امیر بنا۔ سومروں کے کسی حامی نے اپنے جذبات کا اس طرح اظہار کیا:

هَڪڙا ڦير پي وَهسِي، نديان وَهْسَن سير
نہ جاپا نہ جمسي، سوڍا راء امير

[ہکڑا پھیر بھی وہسی، ندیاں وَہسن سیر
نہ جایا نہ جمسی، سوڑھا راء امیر۔]

[دریائے ہاکڑہ بہتا رہے گا ندیاں بھی جوش و خروش سے رواں رہیں گی، ''سوڑھا رائے'' نہ پیدا ہوا، نہ پیدا ہوگا]۔
(دیکھئے! مضمون ''اکبر اعظم اور بہاولپور: عمر کوٹ اور مروٹ'' رسالہ ''العزیز'' بہاولپور ماہ فروری سنہ ۱۹۴۱ء، ص:۳۸)

۱- هاڪ وهي هاڪڙو، ڀڳي بند اروڙ
ٻهَه، مڇي ۽ لوڙ، سمي ويندا سوکڙي
['ہاکڑہ' ہمیشہ بہتا رہے، 'اروڑ' کا بند ٹوٹ گیا
کنول گٹا اور مچھلی، سموں کی طرف بطور سوغات جاتے رہیں گے۔]

۲- جمَ ويهجا ماڙهئا! ننگر جي آذار
پراڻا پرار، نوان اَڏجا نِجهڙا
[لوگو! ایسا نہ ہو کہ 'ننگر' (ٹھٹہ) کے سہارے جا کر رہو
اس پار نئے جھونپڑے جا کر بسانا۔]

ان اشعار کا مضمون سمجھنے کے لئے تاریخی پس منظر کو سمجھنا ضروری ہے۔ تقریباً چوتھی صدی ہجری کے وسط میں اروڑ کے مقام سے دریا کے رخ میں تبدیلی آئی(۱) جس کی وجہ سے دریا کا اہم دھارا تبدیل ہو کر بکھر کے قریب اور بعد میں نیچے سیوہن اور ٹھٹہ کی طرف سے بہنے لگا اور قدیمی اہم دریا ہاکڑہ (مشرقی نارہ) میں پانی کم ہونے لگا۔ اس کے بعد آئندہ تین سو سالوں میں -یعنی آٹھویں صدی ہجری (چودھویں صدی عیسوی) کے وسط میں- پورا دریا گھوم کر بکھر اور سیوہن سے بہنے لگا اور ہاکڑہ (نارہ) کی حیثیت محض ایک خود رو نہر کی رہ گئی۔ اس لئے نیچے کی طرف دریائے سندھ کے قدیم رخ پُران اور ہاکڑہ ڈھورو کے میدان غیر آباد ہوگئے اور ٹھٹہ کے اطراف و اکناف زیادہ سرسبز و شاداب ہوگئے۔ یہی سبب تھا کہ سیوہن اور ٹھٹہ کے سمہ زمینداروں نے زور پکڑا اور ''وگہ کوٹ''، ''روپاہ'' اور ''عمر کوٹ'' کے سومرہ مرکزی خطے کی شادابی ماند پڑنے اور سومروں کی مالی حالت کمزور ہونے لگی(۲)۔ سموں کی ابھرتی طاقت کے مقابلہ میں آخری سومرہ حاکم ہمیر بن دودو(۳) کو سلطان فیروز شاہ تغلق کی

(۱) روہڑی کے نزدیک دریائے سندھ کے ایک چھوٹے جزیرہ میں 'خواجہ خضر' کی خانقاہ کی مغربی دیوار میں ایک اینٹ نصب ہے جس پر فارسی میں 'کتبہ' لکھا ہوا ہے، جس میں 'درگاہ عالی' کے حروف سے سنہ ۳۴۱ھ کا عدد نکلتا ہے۔ اس کتبہ کی تصویر چھپ چکی ہے۔ (دیکھئے کزنس کی کتاب ''سندھ جا قدیم آثار'' کلکتہ ۱۹۲۹ء، ص:۱۴۵) کتبہ کے مضمون سے یہ خیال اخذ کیا گیا ہے کہ یہ شاید دریائے سندھ کے رخ بدلنے کی یادگار ہے۔ دیکھئے: (میجر راورٹی کی کتاب ''سندھ جو مہران'' ص:۴۹۲) تاریخ کے مادہ کا فارسی شعر یقیناً بعد کا ہے، مگر ممکن ہے کہ وہ کسی قدیم کتبہ کی جگہ پر لگوایا گیا ہو۔ ۱۹۴۳ء میں یہ کتبہ راقم نے خود دیکھا تھا مگر ۱۹۵۵ء سے دریا کے سیلاب کی وجہ سے وہ خانقاہ ڈوبنے لگی اور شاید بعد میں وہ کتبہ بھی ضائع ہوگیا۔

(۲) 'تاریخ طاہری' سے بھی اس حقیقت کی تصدیق ہوتی ہے۔

(۳) تاریخ طاہری کے مترجم وحشی نے ۷۵۲ھ میں سلطان محمد شاہ تغلق کی طرف سے طغی خان - جو دراصل سلطان کا غلام اور دربار سلطانی کے چوبداروں اور نقیبوں کا افسر تھا اور دولت آباد (دکن) کے معزول گورنر قتلغ خان کی سازش میں شریک تھا - کے تعاقب کے بیان میں لکھا ہے کہ: ۷۵۲ھ کے بعد سومروں کی باقی قوت میں بھی کمی آگئی اور دودو کا بیٹا ہمیر ان کا آخری حاکم تھا، جو دہلی کے سلطانی عاملین کی مدد سے چند برس یہاں کا حاکم رہا۔ تاریخ طاہری، ص:۲۸۶-۲۸۷ نیز سلطان فیروز شاہ کی طرف سے ملتان کے گورنر ''عین الملک ماہرو'' کی طرف سے سلطان کے نام ۱۳۵۲ء-۱۳۶۵ء کے عرصے کے دوران لکھے گئے ایک خط میں اس آخری سومرہ حکمران کا تذکرہ اور اس کی کمزوری اور بعد میں سلطان کی مدد سے نشو و نما پانے کا تذکرہ موجود ہے۔ مزید دیکھئے تاریخ سندھ حصہ اول، ص:۴۱۸-۴۱۹، نیز سومرہ حکمرانوں کی فہرست، ص:۴۲۸ ب، ۴۲۸ ج (مترجم)

طرف سے ملتان اور گجرات کے گورنر مدد کر رہے تھے اور سندھ میں سومروں کے بہی خواہ بھی انہی امیدوں پر سانس لے رہے تھے، جو ان اشعار میں ظاہر کی گئی ہیں، یعنی:

۱- خدا کرے کہ ہاکڑہ دریا دوبارہ تیزی کے ساتھ رواں ہو! عنقریب اروڑ والا بند ٹوٹ جائے گا! اور پھر (ٹھٹہ - سیوہن طرف کے سموں یا ان کے سردار) سمہ کی طرف کنول کے پودوں کی جڑیں، مچھلیاں اور کنول گٹا کی جڑیں تحفہ کے طور پر بھیجی جائیں گی (کیونکہ دریا ہاکڑہ کے دھارے سے تیزی کے ساتھ رواں ہوگا اور ٹھٹہ کی طرف اتنا پانی نہیں جائے گا کہ اس علاقہ میں کنول پودوں کی جڑیں، مچھلیاں اور کنول گٹا کی جڑیں پیدا ہوں)

۲- اے لوگو! (سموں کے آباد کردہ نئے) شہر ٹھٹہ (کی دولت مندی اور رونق) کی آس پر وہاں مت جا کر رہنا (کہ وہاں پانی بھی دستیاب نہیں ہوگا؛ ہاکڑہ دریا عنقریب لبریز ہوکر رواں ہونیوالا ہے، اس لئے بہتر یہی ہوگا کہ دریائے سندھ کے قدیم رخ 'پُران' کے اس پار اپنے نئے گھر جا کر بناؤ جہاں دوبارہ بڑی آبادیاں ہوں گی)

سندھ کی عام روایات کے مطابق ''ماموئیوں کے اشعار'' سمہ ابتدائی دور میں، جام تماچی کے عہد کی طرف منسوب ہیں۔ مختصر طور پر یہ روایت یوں ہے کہ سات درویشوں (ہفت تن) نے جام تماچی سے کہا کہ: اس کے تخت کے نیچے دولت و بخت کا جو محافظ سانپ ہے، اس کا رخ تبدیل ہوکر دہلی کی طرف ہوگیا ہے، اس لئے اس پر لوہے کے گرز لگوادیں تاکہ سانپ وہاں سے بھاگ کر نکل نہ جائے، شروع میں ان کی بات کا اعتبار نہیں کیا گیا لیکن بعد میں جب آزمائش کے طور پر ایک لمبا لوہے کا گرز زمین میں گاڑ کر نکالا گیا تو وہ خون سے تر ہوکر آیا۔ جس کی یہ تعبیر کی گئی کہ سانپ دہلی کی طرف سرکنے والا تھا اور اتفاق سے گرز اس کی دُم پر جا لگا تھا، لیکن جب گرز نکالا گیا تو اسے آزادی مل گئی اور سانپ دہلی کی طرف چلا گیا۔ اس لئے عنقریب یہاں تباہی آئے گی اور تخت دہلی کے حوالے ہوجائے گا۔

اس روایت کی بنیاد یقینی طور پر ان تاریخی واقعات پر ہے جو سمہ دور کے آغاز میں رونما ہوئے۔ دہلی کے سلاطین اور سندھ کے حکمرانوں کی کشمکش تقریباً چودھویں صدی عیسوی کے ابتدائی تیس سالوں میں شروع ہوچکی تھی (۱)۔

---

(۱) تغلقوں کے دور حکومت میں سندھ اور سلاطین دہلی کے درمیان پہلی کشمکش بہرام ایبہ کشلو خان گورنر سندھ ۷۲۷ھ/۲۷-۱۳۲۶ء اور سلطان محمد شاہ تغلق کے مابین ہوئی۔ جس کی وجوہات مؤرخین نے مختلف بیان کی ہیں۔ مزید دیکھئے تاریخ سندھ حصہ اول، ص:۳۸۵-۳۸۷ (مترجم)

اس کے بعد سلطان محمد بن تغلق نے ٹھٹہ پر چڑھائی کی۔ کیونکہ سندھ کے سومروں اور سموں نے گجرات کے ایک باغی ''طغی'' کو پناہ دی تھی۔ سلطان محمد بن تغلق اس چڑھائی کے وقت بیمار پڑ کر اپنے لشکر گاہ میں ٹھٹہ سے کچھ فاصلہ پر فوت ہوگیا(۱)۔

اس کے بعد سلطان فیروز شاہ نے سندھ پر چڑھائی کی، مگر پہلے حملہ کے وقت وہ اپنی کمزور حالت کی وجہ سے میدان چھوڑ کر گجرات کی طرف چلا گیا(۲)۔ بعد میں وہاں سے واپس آ کر ٹھٹہ کا محاصرہ کیا، لیکن ٹھٹہ کے جام بانبھیہ کی ہمت و جرأت کی وجہ سے کامیاب نہیں ہوسکا، بالآخر شیخ الاسلام صدرالدین ملتانی اور اُچ کے مخدوم جہانیاں ''جہاں گشت'' درمیان میں پڑے، جس کی وجہ سے جام بانبھیہ اور جام جونہ سلطان فیروز شاہ تغلق کے ساتھ دہلی چلے گئے، مگر پیچھے ملکی انتظام و انصرام جام بانبھیہ کے بھائی جام تماچی اور جام جونہ کے بیٹے جام تو گاچی کے ہی ہاتھ میں رہا۔ ان واقعات سے ظاہر ہے کہ اس کشمکش کے تمام معرکوں میں اہل سندھ سرخرو رہے اور تخت بخت سمہ جاموں کے حوالے رہا، مگر دہلی جانے کے بعد جام جونہ اپنوں کے خلاف ہوگیا، اس لئے دہلی کی طرف سے اسے تقریباً ۷۷۷ھ/ ۱۳۷۵ء میں سندھ پر لشکر کشی کے لئے بھیجا گیا اس نے آ کر تخت پر قبضہ کرلیا اور جام تماچی کو نظر بندی کی حالت میں دہلی بھیج دیا۔ اس واقعے کو یوں تعبیر کیا گیا کہ جام تماچی نے راز جاننے والے کاہنوں کا مشورہ نہیں مانا، جس کی وجہ سے بخت اور تخت کا محافظ سانپ دہلی کی طرف چلا گیا اور اس کے نتیجے میں جام تماچی نظر بند ہوگیا اور جام جونہ دہلی کے تابع کی حیثیت سے سندھ کا حاکم بنا۔ یہ 'ہفت تن' اور سانپ کی کہانی جام تماچی

---

(۱) سلطان نے ۲۱ محرم ۷۵۲ھ ۱۳۵۱ع کو وفات پائی۔ (مترجم)

(۲) سنہ ۷۶۶ھ (۶۵-۱۳۶۴ء) میں سلطان فیروز شاہ نے نوے ہزار سوار اور چار سو اسی ہاتھی، پانچ ہزار کشتیاں اور بے شمار پیادے لے کر ٹھٹہ پر چڑھائی کی۔ دریائے سندھ کی ایک جانب جام انڑ کا بھائی اور دوسری طرف جام انڑ کا بھتیجا جام بابینہ حکمران تھے۔ جام کے ساتھ بیس ہزار سوار اور چار لاکھ پیادے تھے۔ دورانِ جنگ ہی فیروز شاہ کے لشکر میں قحط اور جانوروں میں بیماری پھیل گئی جس سے تقریباً تین چوتھائی لشکر کے گھوڑے مر گئے، بالآخر فیروز شاہ سندھ کی اس مہم کو ادھورا چھوڑ کر عازمِ گجرات ہوا، راہ میں غلے کا قحط اور گھوڑوں کی وبائی بیماری مزید بڑھ گئی یہاں تک کہ لوگ بھوک کی وجہ سے چل نہیں سکتے تھے اور اہل لشکر مردار گوشت اور کچا چمڑہ کھاتے تھے اور بڑے بڑے سردارانِ فوج اور اراکین سلطنت پیدل چلنے پر مجبور ہوگئے۔ مزید یہ کہ وہ پورا لشکر کونجی رن (کچھ کا رن) میں پھنس گیا وہاں کی دشوار گزار راہ اور دیگر مشکلات کو جھیلتے ہوئے یہ لشکر چھ ماہ بعد گجرات پہنچا۔ گجرات میں امیر حسین نظام الملک کو معزول کر کے ظفر خان کو گورنر مقرر کیا اور پھر پوری تیاری کے ساتھ دوبارہ ٹھٹہ پر حملہ کرنے کے لئے روانہ ہوا اور وزیر اعظم کو زیادہ سے زیادہ فوج بھیجنے کا حکم بھجوایا، جس نے بدایوں، قنوج، سندیلہ، اودھ، جونپور، بہار، ترہت، مہوبہ، چندیری، دھار، دہلی، سامانہ، دیپالپور اور لاہور سے فوجیں روانہ کیں۔ (ماخوذ از ''تاریخ سندھ'' حصہ اول، ص: ۱۲۰، ۳۹۷-۴۰۳ (مترجم)

کے واقعات کی بازگشت ہے، جسے عام روایات میں دوسرے اشعار کے ساتھ ملادیا گیا ہے؛ مگر مذکورہ بالا اشعار کے مضامین کی اندرونی شہادت کی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ یہ اشعار کاہنوں کی پیشن گوئی نہیں بلکہ سمہ حکمرانوں کے ابتدائی عروج کے دور میں سومروں کے بہی خواہوں کی طرف سے پرانے حالات کی واپسی کی تمنائیں ہیں۔

سمہ دور میں سندھی زبان و ادب کے روایتی آثار مندرجہ بالا چار اہم عنوانات - سمہ سرداروں کی بہادری، سخاوت، عشقیہ داستانوں اور ماموئیوں کے اشعار - کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں، جن پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ سمہ دور کا یہ روایتی ذخیرہ سومرہ دور کے روایتی ادب کے سلسلے کی کڑی ہے۔ دونوں کی خصوصیات یکساں ہیں: یعنی قصے کہانیاں، جنگی واقعات اور عشقیہ داستانیں دونوں کا اہم موضوع ہیں؛ جن میں قول و قرار، کہاوتوں اور ضرب الامثال کی صورت میں سندھی الفاظ، اصطلاحات اور محاورات کو استعمال کیا گیا ہے۔ سندی "معّے" یعنی "دوہرے منظوم مصرعے" اس ادبی ذخیرہ کی روح ہیں۔

سمہ ابتدائی دور کی زبان اور شاعری کا تاریخی ذخیرہ:

ابتدائی سمہ دور کے روایتی ادبی ذخیرہ پر روشنی ڈالنے کے بعد ہم ابتدائی سمہ دور کے تاریخی ادبی سرمائے کا جائزہ لیں گے کیونکہ یہ خالص سندھی زبان کی ابتدائی اور اہم تاریخی دستاویز ہے۔

ا-سندھیوں کا ایک جنگی "رجز" یا نعرہ:

ابتدائی سمہ دور میں سندھی فوج کا ایک جنگی رجز، یا اہلِ سندھ کی ایک عام کہاوت ملتی ہے، جو تاریخی صحت کے اعتبار سے نہایت اہم ہے۔ اوپر بیان ہوچکا ہے کہ سلطان محمد بن تغلق نے سندھ پر حملہ کیا لیکن وہ ۷۵۲ھ/۱۳۵۱ء میں ٹھٹہ سے باہر ہی بیماری کے دوران فوت ہوگیا۔ اس کے بعد سلطان فیروز شاہ نے ۶۶/۱۳۶۵ء میں ٹھٹہ پر لشکر کشی کی۔ سندھی اور سلطانی افواج کے درمیان پہلے مقابلے کے بعد سلطان فیروز شاہ لشکر میں رسد کی قلت اور گھوڑوں میں وبائی مرض کی وجہ سے گجرات کی طرف چلا گیا، سلطانی لشکر کی روانگی کے وقت سندھ کے لشکر نے درج ذیل جنگی رجز یا جنگی نعرہ بلند کیا، جو بقول ہمعصر مؤرخ سراج عفیف، ٹھٹہ میں ضرب المثل کے طور پر مشہور ہوگیا کہ:

بابرکت شیخ پنو (پٹھو)

هک مئو، هک تتو (۱)

یعنی: پیر پٹھو کی برکت سے ایک مرگیا اور دوسرا ڈر کر بھاگ گیا۔(۲)

یہ سنہ ۶۶/۱۳۶۵ء کا ایک سندھی نعرہ یا ضرب المثل ہے اور تاریخی لحاظ سے نہایت اہم ہے۔

۲- جام تماچی کے لئے دعا یا پیشن گوئی کے اشعار:

اوپر بیان ہوچکا ہے کہ جام جونہ کی سازش کی وجہ سے جام تماچی سنہ ۱۳۷۵ء کے قریب سندھ سے نظر بند ہوکر دہلی چلا گیا اور اس کی غیر موجودگی میں ''جام جونہ'' علاؤالدین کے خطاب سے حکمران بنا(۳)، اسی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں جام جونہ کے لئے محبت نہیں تھی۔ جام جونہ نے تقریباً سنہ ۱۳۷۵ء سے سلطان فیروز شاہ کی وفات ۱۳۸۸ء تک حکومت کی۔ اس تمام عرصہ میں جام تماچی دہلی میں نظر بند رہا، اور اس کی غیر موجودگی میں لوگ جام جونہ کی حکومت سے تنگ آگئے۔ عام رعایا خواہ بزرگوں، درویشوں کی ہمدردی جام تماچی کے ساتھ تھی، وہ دعائیں مانگنے لگے کہ اللہ کرے جام تماچی واپس آکر ٹھٹہ کا بادشاہ بنے! اس عام جذبے کے تحت سندھ کے دو

---

(۱) ''تاریخ فیروز شاہی'' (تصنیف سراج عفیف سنہ ۸۰۱ھ) کے ایڈیشن (کلکتہ ۱۸۹۰ء، ص:۲۳۱) میں اس ضرب المثل کو اس طرح لکھا گیا ہے: ''بہ برکت شیخ تھبہ - اک سوا اک تھا''

پروفیسر ہوڑی والا نے اپنی کتاب "STUDIES IN INDO-MUSLIM HISTORY" ص:۳۲۳ پر ان الفاظ کو اس طرح پڑھا ہے: 'بہ برکت شیخ پتھا - اک سوا اک بھگا'' ظاہر ہے کہ ''تاریخ فیروز شاہی'' کے مطبوعہ نسخوں میں یہ الفاظ بگڑی ہوئی صورت میں دیے گئے ہیں مگر مؤرخ سراج عفیف نے اپنے اصل نسخہ میں یقیناً وہ صحیح لکھے ہوں گے۔ ہمارے خیال کے مطابق انہیں صحیح طرح سے یوں پڑھا جاسکتا ہے: ''بہ برکت شیخ پتھا - اک موا اک تتھا'' ''پتھا'' یعنی ''پٹھا'' (=پٹھو) اور ''تتھا'' یعنی ''ٹٹھا'' (=ٹٹھو = بدکا یا بدک کر بھاگا)

لیکن مصنف سراج عفیف کہتا ہے کہ یہ مقولہ ٹھٹہ میں مشہور ہوگیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اہل ٹھٹہ کی زبان سندھی تھی، ان کا یہ مقولہ بھی اصل سندھی ہی میں ہوگا، جسے ''تاریخ فیروز شاہی'' کے مصنف نے اپنی زبان میں ادا کیا۔ اس لئے اگر اسے سندھی میں ادا کیا جائے تو یہ مقولہ اس طرح ہوگا: ''بابرکت شیخ پنو ۔ هک مئو، هک تتو'' اس کی تصدیق بعد میں مرید خان بلوچ کے رجزیہ نعرہ سے بھی ہوتی ہے۔

(۲) اعجاز الحق قدوسی نے اس کہاوت کو یوں لکھا ہے:

''برکت شیخ پٹھا، اک موا اک تتھا''

مزید لکھتے ہیں کہ: نثر میں یہ اردو کا پہلا فقرہ ہے جو سندھ میں بولا گیا۔ تاریخ سندھ حصہ اول، ص۴۰۲ (مترجم)

(۳) ص: ۱۴۸ پر دیکھئے جام جونہ کا لگوایا ہوا فارسی کتبہ جو سلطان فیروز شاہ کے ذکر حکمرانی سے شروع ہوتا ہے۔ اس میں جام جونہ کا لقب علاؤالدین بتایا گیا ہے۔

درویشوں - سامونی کے بزرگ شیخ حماد جالی اور کھیر کے درویش نوح ہوتھیانی - نے جام تماچی کی واپسی اور اس کے والیِ تخت ہونے کے متعلق بطور دعا پیشں گوئی کرتے ہوئے سندھی میں شعر اور کچھ الفاظ کہے، جن کے متعلق پہلا حوالہ ہمیں ''حدیقۃ الاولیاء'' کتاب (فارسی) میں ملتا ہے، جو ٹھٹہ کے سید عبدالقادر حسینی نے سنہ ۱۰۱۶ھ میں تصنیف کی۔ البتہ اس کتاب کے متن میں وہ سندھی شعر یا الفاظ درج نہیں ہیں۔ جو اس موقع پر بزرگوں کی زبان سے ادا ہوئے تھے؛ اس لئے ان کے متعلق آج تک کچھ بھی معلوم نہیں ہوسکا ہے۔ حسنِ اتفاق کہ ہمیں ''حدیقۃ الاولیاء'' کے ایک (قلمی نسخہ) مخطوطہ(۱) کے حاشیہ پر، شیخ حماد جمالی کا سندھی شعر اور درویش نوح ہوتھیانی کے موزوں سندھی الفاظ لکھے ہوئے مل گئے، جو ذیل میں دیے جا رہے ہیں:

شیخ حماد کا شعر:

شیخ حماد بن رشید الدین جمالی سندھ کے اولیاء کبار میں سے تھے اور اُچ کے مشہور درویش شیخ جمال کے نواسہ تھے۔ موجودہ ٹھٹہ سے متصل ''سامونی'' کے دامن میں ان کی خانقاہ تھی۔ حدیقۃ الاولیاء کا مصنف لکھتا ہے کہ: ''جام تماچی اور اس کے فرزند صلاح الدین کو آپ سے بڑی عقیدت تھی اور وہ روزانہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ جام جونہ نے سازش تیار کی؛ جس کے مطابق خاموشی سے ان دونوں (تماچی اور اس کے بیٹے) کو دہلی بھیج دیا گیا، جہاں وہ نظر بند رہے۔ اتفاق سے بزرگ (شیخ حماد) نے ان دونوں کی غیر حاضری محسوس کر کے انہیں یاد کیا، مگر ان کے بارے میں کوئی بھی نہ بتا سکا۔ بعد میں بزرگ نے اپنا خاص آدمی بھیج کر ان کی حویلی سے معلوم کروایا(۲)؛ جس پر حویلی والوں نے بصد عجز و بیقراری تمام ماجرا بزرگ کو کہلوا بھیجا، جسے سنتے ہی شیخ حماد کو جوش آ گیا اور وہ بے قراری سے کھڑے ہوگئے اور اپنے حجرے میں ٹہلنے لگے اور سندھی زبان میں ایک شعر کہنے لگے، جس میں جام تماچی کے ساتھ محبت اور اس کے واپس آنے کی تمنا ظاہر کی گئی تھی۔'' جام جونہ نے جب وہ شعر سنا تو اسے بہت پریشانی ہوئی اور

---

(۱) یہ نسخہ ہمیں جناب قاضی فتح الرسول نظامانی ٹنڈو قیصر والے سے دستیاب ہوا۔

(۲) تحفۃ الکرام میں شیخ حماد جمالی کی طرف سے اپنے خاص آدمی کو بھیج کر جام تماچی اور اس کے بیٹے کے متعلق ان کے اہلِ خانہ سے معلومات حاصل کرنے کے بجائے یوں مذکور ہے: ''اس واقعے (باپ بیٹا دونوں کو قید کر کے دہلی بھیجنے) کے بعد تماچی کی والدہ ہر روز صبح کے وقت شیخ کی خانقاہ کو جھاڑو دینے کے لئے آتی تھی۔ ایک دن شیخ کی نظر اس بڑھیا پر پڑ گئی اور اس سے اس کے بیٹے اور پوتے کا احوال پوچھا۔ اس نے روتے ہوئے احوال عرض کر کے ان کی آزادی کے لئے منت سماجت کی۔ دیکھئے: تحفۃ الکرام سندھی ترجمہ، ص: ۳۶۷، طبع پنجم، مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ، جام شورو، ۲۰۰۴ء (مترجم)

شیخ حماد کے پاس آیا، مگر نا امید ہوکر واپس لوٹا(۱)۔ وہ سندھی شعر ''حدیقۃ الاولیاء'' کے مذکورہ بالا قلمی نسخے کے حاشیہ پر اس طرح لکھا ہوا ہے(۲)۔

جوڻو مت اوڻو، جام تماچي آءِ

سباجهي باجهه پيئي، توسين نتو راءِ!

[جام جونہ کم عقل ہے(جس نے ایسا کام کیا)۔ اے جام تماچی تو جلدی پہنچ۔ اللہ تعالیٰ راضی ہوا ہے کہ تمام ٹھٹہ (جام جونہ سے منحرف ہوکر) تیرا طرف دار ہوگیا ہے۔]

درویش نوح ہوتھیانی کی دعا:

آٹھویں صدی ہجری کے آخر میں ''کھیر انی'' کے علاقہ میں ''کھیر'' قبیلہ کا ایک نامور درویش ہوتھیانی رہتا تھا(۳)۔ جن کی خانقاہ حیدرآباد- ہالا راستے پر 'کھیر' گاؤں سے تقریباً دو میل شمال-مشرق میں واقع ہے۔ ''حدیقۃ الاولیاء'' کے مصنف لکھتے ہیں کہ:

''جس وقت جام تماچی اور جام صلاح الدین سندھ میں پہنچے اور ''کھیر'' گاؤں سے گزرے تو وہاں انہوں نے شیخ نوح ہوتھیانی کو مویشیوں کا ریوڑ چراتے ہوئے دیکھا۔ اس موقع پر ایک شخص ان کے ریوڑ کی طرف بڑھا، جس پر شیخ نوح نے اسے کہا کہ: 'بحکم جام تماچی میرے مویشیوں کے ساتھ دست درازی نہ کر' جام تماچی اور اس کا بیٹا شیخ کی یہ بات سن کر بہت متعجب ہوئے اور آگے بڑھ کر درویش سے کہا کہ: ملک کا والی اب تک تو جام جونہ ہے اور جام تماچی دار

---

(۱) میر علی شیر قانع نے ''تحفۃ الکرام'' (ص:۲۰۷-۴۵۹، سندھی ترجمہ، مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ ۱۹۵۷ء) میں یہی ذکر ''حدیقۃ الاولیاء'' سے نقل کیا ہے اور روایت میں کچھ اضافہ بھی کیا ہے۔ حدیقۃ الاولیاء کے مصنف کی طرح میر علی شیر نے بھی اصل سندھی شعر درج نہیں کیا۔

نوٹ: ترجمہ کرتے وقت کتاب کا چوتھا ایڈیشن ۱۹۹۹ء پیش نظر ہے، اس میں صفحہ نمبر ۲۰۷-۴۵۹ نظر آرہا ہے اور تحفۃ الکرام سندھی ترجمہ کا ایڈیشن صاف طور پر ۱۹۵۷ء لکھا ہوا ہے۔ اس لئے تحفۃ الکرام سندھی ترجمہ کے اصل ایڈیشن کی طرف رجوع کیا جس کا پانچواں ایڈیشن اس وقت میرے روبرو ہے، جس سے معلوم ہوا کہ: ۱- تحفۃ الکرام سندھی ترجمہ کا پہلا ایڈیشن ۱۹۵۷ء میں نہیں بلکہ ۱۹۷۵ء میں آیا تھا۔ ۲- متن کا مذکورہ حوالہ صرف ایک مقام پر ص ۳۶۸ پر ہے۔ دیکھئے: تحفۃ الکرام سندھی ترجمہ، طبع پنجم، دسمبر ۲۰۰۴ء (مترجم)

(۲) دیکھئے حدیقۃ الاولیاء متن ص:۵۳، حاشیہ × ب مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد سنہ ۶۷ء۔ یہ شعر اگرچہ قاضی فتح الرسول نظامانی کے قلمی نسخہ کے حاشیہ پر درج ہے۔ لیکن مطبوعہ حدیقۃ الاولیاء میں اس شعر کے مفہوم سے بھی قدرے واضح مفہوم کی حامل یہ عبارت موجود ہے: شیخ ازیں سخن ناملائم بجوشید وفرمود کہ: ایں پارچۂ زمین را حوالۂ ما ساختہ اند و ما ایں متاع کثیف را حلقۂ طوقِ گردنِ آن سگ یعنی تماچی ساختہ ایم۔ جام از شنیدن ایں کلام بہ سامت و ملال برخاست۔ ص:۵۳-۵۴، یعنی شیخ اس کی سخت کلامی سے جوش میں آگئے اور فرمانے لگے کہ: زمین کا یہ خطہ ہمارے حوالے کیا گیا ہے اور ہم نے اس غلیظ متاع کو اس کتے یعنی تماچی کی گردن میں بطور حلقہ پہنا دیا ہے۔ جام یہ بات سن کر افسردگی اور ملال کے ساتھ کھڑا ہوگیا۔ (مترجم)

(۳) ''حدیقۃ الاولیاء'' میں انہیں ''درویش نوح کھیر'' لکھا گیا ہے۔ آپ ''کھیر'' قبیلہ سے تھے۔ مگر آپ کے والد کا نام ''ہوتھی'' تھا اسی وجہ سے ''نوح ہوتھیانی'' کے نام سے مشہور ہوئے اور آج تک اسی نام سے پکارے جاتے ہیں۔

الخلافہ دہلی میں نظر بند ہے پھر آپ یہ کس طرح کہہ رہے ہیں کہ جام تماچی کا حکم ہے! درویش نے کہا کہ مجھے جام تماچی کا تو علم نہیں، البتہ دو تین دنوں سے میں چرند و پرند اور درختوں وغیرہ سے یہ صدا سن رہا ہوں کہ جام تماچی کا حکم ہے۔ یہ بشارت سن کر انہیں بہت خوشی ہوئی اور انہوں نے درویش کو اپنا تمام احوال سنادیا اور مقصود کے حصول پر اپنی طرف سے نذرانہ مقرر کیا"(۱) غالباً اسی موقعہ پر درویش نے انہیں دعا دی تھی کہ "فتح تمہاری ہوگی"۔ حدیقۃ الاولیاء کے مذکورہ مخطوطہ کے حاشیہ پر بتایا گیا ہے کہ: کہتے ہیں کہ درویش نوح نے اس موقع پر یہ شعر پڑھا:

جوٹو وڃي جھوري (جھورے) ماريو
جام تماچي شهرين چاڙهيو(۲)

[جام جونہ کا قصہ تمام کردو اور جام تماچی کو ملک کا بادشاہ بناؤ۔]

حدیقۃ الاولیاء کا وہ مخطوطہ جس کے حاشیہ پر شیخ حماد جمالی کا شعر اور درویش نوح ہوتھیانی کے موزوں الفاظ دیے ہوئے ہیں، وہ سنہ ۱۲۴۰ھ کا لکھا ہوا ہے(۳)۔ شیخ حماد کا شعر اس کتاب کے لکھنے والے کاتب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے؛ جس کا مطلب یہ ہوا کہ پچھلے قریبی دور میں تیرہویں صدی ہجری کے نصف تک یہ شعر سندھ میں بعض بڑے بوڑھوں کو یاد تھا جو کاتب تک پہنچا اور اس نے وضاحت کی خاطر اسے حاشیہ میں لکھ دیا۔ درویش نوح ہوتھیانی کے الفاظ کسی دوسرے کاتب کے مگر بہت پہلے کے لکھے ہوئے ہیں۔

شیخ حماد نے یہ شعر جام تماچی کے سندھ میں آنے سے پہلے کہا تھا جبکہ درویش نوح ہوتھیانی کے دعائیہ الفاظ اس وقت کے ہیں جب جام تماچی سندھ میں پہنچ چکا تھا اور ٹھٹہ جاتے ہوئے کھیر سے گزرا تھا۔ تاریخی لحاظ سے جام تماچی نے غالباً سلطان فیروز شاہ کی وفات (۱۸ رمضان ۷۹۰ھ/۱۳۸۸ء) پر دہلی کو چھوڑا(۴)؛ جس کا مطلب یہ ہوا کہ شیخ حماد کا شعر سلطان

---

(۱) حدیقۃ الاولیاء (مخطوطہ)، میر علی شیر قانع نے تحفۃ الکرام میں (سندھی ترجمہ ص:۳۹ اور ۴۵۸، مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ ۱۹۵۷ء) یہی بیان حدیقۃ الاولیاء سے لیا ہے، لیکن درویش نوح کے دعائیہ کلمات کا ذکر نہیں کیا۔

(۲) اصل رسم الخط "جھُرِی ماریو" اور "شھرین چڑیو" ہے۔ (دیکھیے حدیقۃ الاولیاء کا مقدمہ ص ۸۸)

(۳) حدیقۃ الاولیاء کے مقدمہ میں مذکورہ نسخہ کا سنِ کتابت ۲۱ جمادی الثانی ۱۲۴۷ھ لکھا ہوا ہے۔ دیکھیے حدیقۃ الاولیاء، مقدمہ، ص ۸۶ (مترجم)

(۴) حدیقۃ الاولیاء میں جام تماچی کے دہلی چھوڑنے بلکہ بالفاظ دیگر دہلی کے قید سے خلاصی پانے کا عجیب بیان لکھا ہے، جس میں شیخ حماد جمالی کی کرامت کا پہلو نمایاں ہے نیز اس وقت یعنی جام تماچی کے دہلی چھوڑتے وقت سلطان فیروز تغلق کے زندہ ہونے کا بیان صراحت سے موجود ہے۔ حدیقۃ الاولیاء کے الفاظ یوں ہیں:

(بقایا اگلے صفحے پر)

فیروز شاہ کی تاریخ وفات سے پہلے کا اور درویش نوح ہوتھیانی کے دعائیہ الفاظ اس تاریخ سے کچھ بعد تقریباً سال ۷۹۰ھ کے آخر (۱۳۸۸ء) میں کہے گئے ہیں۔

۳- خوجہ جماعت کے پیروں کے گنان:

خوجہ برادری کے اولین پیر چودھویں صدی عیسوی میں ایران سے ہندوستان آئے تقریباً ۷۷۵ھ سے ۹۰۰ھ کے سوا سو سالہ عرصہ میں وہ گجرات، سندھ اور ملتان کے خطوں میں اسماعیلی فرقہ کی تبلیغ کرتے رہے۔ ان کے جانشینوں نے اپنی تبلیغ میں ہندی، سندھی، کچھی-سندھی اور گجراتی میں منظوم ہدایات اور نصائح کو استعمال کیا، جنہیں اس فرقہ کی اصطلاح میں 'گنان'(۱) کہا جاتا ہے۔ خوجہ برادری کے ہاں یہ 'گنان' سندھ میں اور سندھ سے باہر زبانی طور پر رائج ہیں، نیز کچھ کے پاس 'خوجہ رسم الخط' میں بھی لکھے ہوئے ہیں۔ آج کل جو 'گنان' زبانی روایات اور قلمی کتابوں میں ملتے ہیں، ان کی تاریخی صحت کے بارے میں یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا، کیونکہ ایسا کوئی بھی قدیم مستند قلمی نسخہ موجود نہیں جس سے تصدیق ہوسکے کہ یہ 'گنان' اصل بڑے پیروں کے کہے ہوئے ہیں اور انہی کے دور میں یا کچھ عرصہ بعد لکھ کر محفوظ کرلئے گئے تھے۔ علاوہ زبانی روایات اور کچھ تھوڑے سے 'گنانوں' کے، جن میں (ان گنانوں کے) کہنے والے کا نام دیا گیا ہے، اور یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ کون سے 'گنان' کس پیر نے کہے؛ یا جس زمانے میں جس بھی پیر نے یہ 'گنان' کہے اس وقت لفظ بلفظ ان کی ترتیب اور صورت کیا تھی؟

آج جب یہی 'گنان' مختلف لوگوں سے سنے جاتے ہیں یا مختلف تحریروں میں دیکھے جاتے ہیں تو ان میں الفاظ کی ہیر پھیر واضح طور پر موجود نظر آتی ہے۔ سندھ میں موجود خوجوں

(گزشتہ سے پیوستہ) ''صباح پگاہ ایں خبر را بہ خلیفہ دہلی رسانیدند۔ ایشاں بےتسویف و تاخیر جمی کثیر از شہسواران نامور و یکہ تازان کارزار مسلح و مکمل ساختہ درعقب ایشاں رواں گردانید۔'' حدیقۃ الاولیاء، ص:۵۴-۵۵

ترجمہ: علی الصبح یہ خبر خلیفۂ دہلی کو پہنچادی گئی۔ انہوں نے بغیر کسی ڈھیل اور تاخیر کے اپنے نامدار شہسواروں کی ایک بڑی جماعت جو جنگی مہارت رکھتی تھی، اسے مسلح و مکمل کر کے ان کے تعاقب میں روانہ کیا۔

اس بیان سے ''جام تماچی کے سلطان فیروز کی وفات پر دہلی چھوڑنے کی تائید نہیں ہوتی بلکہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ سلطان زندہ تھا'' واللہ اعلم بالصواب۔ (مترجم)

(۱) ہندوستان کے خوجوں پر لکھنے والے محقق اَیوناف نے اپنی ایک انگریزی کتاب میں 'گنانوں' کو ان زبانوں یا ان کی آمیزش کے ساتھ رچا ہوا بتایا ہے:

The literature of the Indian Khoja branch of the Ismailis "which is not very extensive, requires a sound knowledge of Sanskrit, and specially of the modern dialects, such as Sindhi, Kachhi and Gujrati in which the sacred ginans are Written" (W.Ivanow: A Guide of Ismaili Literature, Royal Asiatic Society, London, 1993, P: 15.

کے ہاں عام طور پر جو گنان مروج ہیں ان پر سندھ میں ان کی مقامی مادری زبان کا رنگ غالب ہے۔ کچھ 'گنان' اس قدر صاف سندھی میں ہیں کہ وہ گزشتہ قریبی دور میں ہی منظوم کردہ معلوم ہوتے ہیں۔ غالبًا یہ کہنا درست ہوگا کہ دراصل بعض 'گنان' گجراتی، کچھی، سندھی یا ہندی کے الگ الگ لہجوں میں اور بعض کسی دو ایک لہجوں کی آمیزش کے ساتھ رچے ہوئے تھے، لیکن بعد میں ہر علاقہ کے رہنے والوں نے انہیں اپنی اپنی مقامی مادری زبان کے مطابق پڑھا اور یاد کیا۔ بہرحال یہ مسئلہ مزید تحقیق طلب ہے، اور چونکہ اس وقت ہمارے پاس دوسرا کوئی خارجی مأخذ موجود بھی نہیں اس لئے خودخوجہ جماعت کی روایت کو پیش نظر رکھ کر ہی کچھ نتائج قائم کیے جاسکتے ہیں۔

'گنان' شاید اصل میں لفظ 'گیان' (روحانی یا الٰہی علم) کی تبدیل شدہ صورت ہے۔ خوجہ جماعت کے عقیدے کے مطابق یہ ان کے روحانی پیشواؤں کے کہے ہوئے پوتر منظومات ہیں، جن میں ہدایت ونصیحت سمائی ہوئی ہے۔ ان کے بعض پیروں کے نام سے منسوب کتابوں کے عنوانات میں 'سلوک' اور 'نان' کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ پیر صدرالدین اور شمس الدین کی طرف منسوب کتاب کا نام 'سلوک نان' یا 'سلوک نانو' ہے اور پیر امام شاہ کی کتاب کا نام ''جوگیشور عبدونا گنان'' ہے۔ اس کے علاوہ دیگر پیروں کے نام سے منسوب اور غیر منسوب ایک سو منتخب گنانوں کے کئی مجموعے ہیں، جو محض 'گنان' کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ لیکن وہ 'گنان' کس نے کہے اور کب کہے؟ یہ ایک تحقیق طلب مسئلہ ہے جس کا صحیح جواب ملنا مشکل ہے۔

تاریخی اعتبار سے زیادہ مشکل مسئلہ یہ ہے کہ جن پیروں سے یہ گنان منسوب ہیں، ان کی ولادت و وفات کی تاریخیں غیر یقینی ہیں۔ پیر صدرالدین، اس کے بیٹے پیر حسن کبیر الدین اور اس کے بڑے بیٹے شمس الدین اور دوسرے بیٹے امام شاہ اور امام شاہ کے بیٹے نرمحمد کی طرف 'گنان' یا بعض دیگر تحریرات منسوب ہیں، مگر ان تمام کے حالات زندگی مبہم اور غیر یقینی ہیں۔ نرمحمد کی کتاب ''ست وینی جي ویل'' میں جو آخری سن اور سال دیے گئے ہیں وہ ۱۵۱۶ء اور ۱۵۲۰ء کے مساوی ہیں۔ ان آثار وعلامات کے مطابق خوجوں کے یہ پیر سمہ دور میں گزرے ہیں۔

پیر صدرالدین کی طرف منسوب گنان:

پیر صدرالدین ایران کے شہر ''سبزوار'' میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے اور وہاں سے اپنے فرقہ کی تبلیغ کے لئے ہندوستان آئے، جہاں ان کی سکونت و تبلیغ تقریباً سنہ ۷۷۱ھ کے بعد شروع ہوئی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ انہیں یہاں کی مقامی زبانوں میں مہارت حاصل کرنے اور 'گنان' کہنے میں یقینا کچھ عرصہ لگا ہوگا اور جلد از جلد بھی تقریباً ۷۷۵ھ کے بعد ہی انہوں نے 'گنان' کہے ہوں گے۔ اس لئے پیر صدرالدین ۔کے گنانوں کا عرصہ ۷۷۵ھ سے رجب ۸۱۹ھ

(اس کی وفات) تک سمجھنا چاہیے۔ مرزا قلیچ بیگ(۱) اور دیگر مصنفین نے پیر صدرالدین کی طرف منسوب گنانوں میں سے کچھ گنان اپنی کتابوں میں دیے ہیں اور غالباً زیادہ معتبر یہی گنان ہیں جن میں مختلف زبانوں کی آمیزش ہے۔ مثلاً درج ذیل گنان(۲) اسی قسم کے ہیں:

۱- چيتن هارا تمهين چيتجو
ڪريو خوب ڪمائي
انتڪال ايڪلا چلٹا
ساتهہ ڪوئي باپ نہ مائي

۱-[عقلمندو! خیال رکھو خوب کمائی کرو]
[اگلے جہان اکیلے جانا ہے ساتھ میں ماں باپ نہیں جائیں گے]

۲- من مها بلونت هٹہ
جودھ زوراور جان

۲-[نفس بہت طاقتور ہے پہلوان ہے، زور آور ہے]

۳- مت ٽيو آئين پنجن ڪا داسي
پانڌيڙا پنٿ سِريوو

۳-[پانچ کا غلام مت ہونا(۳)، مذہب کے مسافر مذہب (اپنی راہ) پر چلتے رہو]۔

مختلف زبانوں کے ملاپ اور آمیزش والے اس طرح کے گنانوں کے علاوہ کچھ دوسرے مکمل طور پر سندھی میں کہے گئے گنان بھی خوجہ جماعتی روایت کے مطابق پیر صدرالدین کی طرف منسوب ہیں۔ اس قسم کے سندھی گنان سنہ ۱۹۵۲ء میں اسماعیلیہ ایسوسی ایشن کراچی کی شائع کردہ کتاب ''اسماعيلي آغا خاني فرقہ جا مبلغ دائي'' (کراچی ۱۹۵۲ء) اور ٹنڈو محمد خان سے نکلنے والے ماہنامہ ''میراث'' (جلد۱، نمبر۴، ۱۹۵۲ء) میں شائع ہوئے تھے(۴)۔

---

(۱) دیکھئے ''تحفۂ اسماعیلیہ'' مطبوعہ حیدرآباد ۱۹۲۲ء، ص:۵۷-۵۸
(۲) نمبر۱ اور نمبر۲ کے لئے دیکھئے ''اسماعيلي آغاخاني فرقہ جا مبلغ داعي'' اسماعیلی ایسوسی ایشن پاکستان، کراچی ۱۹۵۲ء، ص:۶۴ اور نمبر۳ کے لئے دیکھئے غلام علی الانا کا مضمون ''سومرن جي دور جي سنڌي شاعري'' رسالہ مہران جلد۹، نمبر۱،۲، مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ، حیدرآباد
(۳) یعنی نفسانی خواہش، غضب، حرص، فریب اور تکبر سے دور رہنا (مترجم)
(۴) ''میراث'' کے گنان بعض اضافوں کے ساتھ دوبارہ غلام علی الانا نے اپنے مضمون ''سومرن جي دور جي سنڌي شاعري'' (رسالہ مہران جلد۹، نمبر۱،۲، مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ) میں بھی شائع کئے، مگر ان میں موجودہ سندھی تلفظ (ہجے) کو برقرار رکھنے کے خیال سے الفاظ میں غیر مناسب تبدیلی کی گئی ہے۔

ہم مذکورہ بالا ماٗخذ کے مطابق وہ سندھی گنان ذیل میں درج کر رہے ہیں اور حاشیہ میں مختلف املاؤں کے فرق کو م (=مبلغ دائی) ث (=میراث) اور غ (=غلام علی الانا) کی علامات سے ظاہر کرتے ہیں:

(۱)

۱-اُٿي الله گهُرين نه بندا، تون سُتين سڄي رات
نَڪا جهوري جيوَ جي بندا نڪو ثمر ساٿ
شاه مڃيئڙو تن، جي صبوحڙي جاڳن

[اے بندے! اٹھ کر تو اللہ طلب نہیں کرتا، تو ساری رات سوتا رہا
نہ روح کی فکر ہے تجھے اے بندے! نہ ہی تیرے ساتھ کوئی زادِ راہ ہے
شاہ کو ان ہی لوگوں نے تسلیم کیا، جو صبح کے وقت جاگتے ہیں۔]

۲- جي صبوحڙي نه جاڳيا، تن حورون ڏين نه هٿ
سي هئه هئه ڪندا، هٿ هٿندا، جئن هاري وڃائي وٽ
شاه مڃيئڙو تن، جي صبوحڙي جاڳن

۳- ٻانها تو جو تڪيو، ڪنداڙو ڪوڙ
پسي رَتا گلڙا ٻانها! مَ وڃاءِ مور
شاه مڃيئڙو تن، جي صبوحڙي جاڳن

[جو لوگ صبح کے وقت بیدار نہیں ہوئے، انہیں حوریں ہاتھ نہیں دیں گی
وہ ہائے ہائے کریں گے، ہاتھ ملیں گے، جس طرح مزارع فصل کاشت کرنے کے لئے سینچائی کو ضائع کردے شاہ کو ان ہی لوگوں نے تسلیم کیا، جو صبح کے وقت جاگتے ہیں۔]

[بندے! تیرا تکیہ بیشمار کانٹوں والا ہے
اے بندے! سرخ پھول دیکھ کر شگوفے اور کونپلیں، یا اصلِ زر، پونجی ضائع مت کر
شاہ کو ان ہی لوگوں نے تسلیم کیا، جو صبح کے وقت جاگتے ہیں۔]

---

(۱) ذیل کے بند جواب کے ساتھ بطور 'اپدیش' (نصیحت، مشورہ، نیک صلاح) استعمال کئے گئے ہیں۔ 'م' کے مطابق جواب یوں ہے: "صاحب جو مڃيئڙو انهن تي، جيڪي صبح جو جاڳن" پہلے تین مصرعوں میں سے 'م' میں صرف پہلا اور دوسرا مصرعہ دیا گیا ہے اور 'ث' میں صرف پہلا اور تیسرا مصرعہ دیا گیا ہے، 'غ' نے یہ تینوں مصرعے نقل کیے ہیں، نیز چوتھے مصرع کا بھی اضافہ کیا ہے اس کے علاوہ 'غ' نے اس کے بعد (۲) اور (۳) کے تحت دیے گئے دو دو شعر بھی اس 'اپدیش' کے مصرعوں کے طور پر لکھے ہیں، جس کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آرہی۔ (دوسرے مصرع) میں 'م' نے پہلی سطر یوں دی ہے:
"جيڪي صبح جو نه جاڳيا، تن کي حورون نه ايندين هٿ"

(۲)

ڪَپِھتياڻيَ ڪَتيو جڏين سُتو سارو لوڪ
تنه پانجي ڪتي مان وڌو ڳِچيَ ڳاڙھو ٽوڪ

جيڙوڻيءَ تيڙو اُگھيو ڀائيو! جي هوند ڪتيائين
سُيان سرتين وچ ۾ ملي مرڪيائين

[کپاس کاتنے والی نے اس وقت کاتا، جب سارا لوک سو گیا
اس نے اپنے کاتے ہوئے میں سے، اپنی گردن میں سرخ گہنا ڈال دیا۔]

اگر اس نے کاتا ہے تو جیسا تیسا بھی مقبول و منظور ہو گیا اے بھائیو!
کل (بروزِ قیامت) اس نے سہیلیوں کے درمیان مل کر مسکرا دیا

(۳)

ڪوٺا، منڊپ، ماڙيون، گھر، گھوڙا، ڀَنڊار
ڪِين نه نيا پاڻ سين، جِيوَ چِلَنتي وار

[کوٹھے، کچے مکانات، بالا خانے، گھر وندے، گھوڑے، توشہ خانے
روح نکلتے وقت کوئی بھی اپنے ساتھ لے کر نہیں گیا۔]

ڀَڻي پير صدرالدين آئينْ سُڻو مومن وِيرُ
اَلک چِتو تني کي، جني سڃاتو 'شاه' پير

[وحشت زدہ حیران و پریشان پیر صدرالدین کی پُرلطف بات سنو مومنو!
جنہوں نے شاہ پیر کو پہچانا، وہ قیامت کے روز خدا کے ہاں نجات پا جائیں گے۔]

---

(۲) یہ دو شعر پہلے 'م' میں شائع ہوئے۔ بعد میں انہیں 'غ' نے نقل کیا۔ 'م' میں لفظ 'توڪ' کے بجائے 'موڙ' دیا ہوا ہے، نیز 'م' میں 'جڏين' 'پانجي' 'جيڙو' اور 'تيڙو' کے بجائے 'جڏهن' 'پنهنجي' 'جهڙو' اور 'تهڙو' لکھے ہوئے ہیں۔ 'م' میں یہ شعر الگ دیا ہوا ہے لیکن 'غ' نے یہ دونوں شعر اوپر (۱) کے تحت مصرعوں کے طور پر لکھے ہیں۔

(۳) یہ دو شعر صرف 'غ' نے لکھے ہیں لیکن اوپر (۱) کے تحت مصرعوں کے طور پر درج کئے ہیں جو غالباً اصلیت کے لحاظ سے درست نہیں ہے۔ کیونکہ ان کا وزن جداگانہ ہے۔

(۴)

ڪيڙيون اڏائين گدماڙيون، تين ڪيڙا رڪائين چِتَ
نيهي نِينديء ڏوڙ ۾، توتي لتون ڏيندا مِتَ
سڻ وڻجارا، هو يار! هِي من هَروئڙو ٿو جهولي

[کیسے ہی عالیشان بالا خانے تعمیر کروا، اور کیسے ہی نقش و نگار بنوا دوست و احباب تجھے خاک کے حوالے کریں گے اور رشتہ دار پاؤں سے تجھے دبائیں گے اے سوداگر یار، سُن! یہ مَن اندیشوں میں ڈوب رہا ہے]۔

(۵)

جاڳو جاڳو ڀائڙا، رين وهائي

[بھائیو! جاگو، جاگو، رات ختم ہونے والی ہے۔]

ظاہر ہے کہ مندرجہ بالا 'گنان' صاف سندھی یا سندھی کے کچھی لہجہ میں رچے ہوئے ہیں۔ پہلا گنان ایک طرح کی کتھا (مذہبی نصیحت) ہے، جس کے دو مصرعوں کے بعد جوابِ مصرعہ ہے۔ ممکن ہے کہ پہلے دو مصرعے اصل میں پرانے "سندھی شعر" ہوں جن کے آخر میں، بعد میں کسی وقت 'جوابِ مصرع' ملا لیا گیا ہو۔ دوسرا اور تیسرا گنان 'سُر' 'کاپاتی' کے بنیادی 'سندھی شعر' ہیں جو نسبتاً قدیم معلوم ہو رہے ہیں۔

پیر حسن کبیر الدین:

پیر حسن کبیر الدین ۲۲ شعبان بدھ کے روز سنہ ۷۴۲ھ کو پیدا ہوئے اور نویں صدی ہجری کے آخری نصف میں بمقام اُچ وفات پائی (☆) اس لئے ان کی طرف منسوب 'گنانوں' کا زمانہ اندازاً آٹھویں صدی ہجری کے نصف آخر سے نویں صدی ہجری کے نصفِ اول تک شمار کیا جاسکتا ہے۔ درج ذیل 'گنان' ان کے نام سے منسوب ہیں:

(۱)

آشاجي شري اسلام شاه تخت بيٺا
تاري دين هوا رحمان جي

(۴) یہ بند اور آخری جواب صرف 'غ' نے لکھے ہیں۔

(۵) یہ مصرعہ 'غ' نے نقل کیا ہے۔

(☆) تواریخ میں بڑا اختلاف ہے: نرمحمد نے اپنی کتاب "ست وینی" میں وفات ماہ صفر ۸۵۳ھ (۱۴۴۹ء) لکھی ہے۔ اُوناف نے اپنے انگریزی مضمون "گجرات کا امام شاہی فرقہ" (رائل ایشیاٹک سوسائٹی بمبئی شاخ کا جرنل، جلد ۱۲، سال ۱۹۳۶ء، ص:۳۹) میں وفات کا سال ۸۷۵ھ (۱۴۷۰ء) دیا ہے۔ مولوی محمد خلیل الرحمان برہانپوری نے اپنی "تاریخ برہانپور" (تصنیف ۱۳۱۶ھ-۱۸۹۸ء) میں حسین کبیر الدین کی وفات کا سال ۸۹۶ھ (۱۴۹۱ء) لکھا ہے

(۱) چنارا: "نور مبین حبل اللہ المتین" ص:۵۰۰

سر بندھ لئے گردئے متکے دیدھا
تارے سر اُگھاڑو کرے، نر بیٹھا

[جب سے حضرت اسلام شاہ تخت نشین ہوا، اس وقت سے دینِ خدا کا فیض جاری ہوا، (پیر حسن کبیر الدین نے) جب امام کو دستار نذرانہ کی تب وہ اپنی مرضی سے سَر ننگا کر کے (تخت پر) بیٹھا تھا]

(١)

ناریون تمھاریون آنتي (آنتے) گھٹیون
مُجھہ سریکیون (سَرِیکھیوں) لاکو (لاکھو) ئي لاک (لاکھ)
تُمھن ھٹہ الک نرنجن
ھم چیئیي ذرڙي خاک

[تیری داسیاں بہت ساری ہیں، میرے جیسی تو لاکھوں ہیں؛ تو ہی دیکھے جانے سے پاک ہے، میں تو مٹی و خاک ہوں]

متذکرہ بالا 'گنان' پیر صدرالدین کے بیٹے حسن کبیر الدین کے ہیں، جو سندھ میں پیدا ہوئے اور پلے بڑھے مگر اس کے باوجود بھی زبان میں آمیزش ہے؛ اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ پیر صدرالدین نے خالص سندھی زبان میں 'گنان' کہے ہوں گے۔ البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ پیر صدرالدین کے اصل 'گنانوں' پر سندھی خوجوں کی اپنی زبان کا رنگ چڑھ چکا ہو۔ پیر صدرالدین سے پہلے کسی بھی داعی کے کہے ہوئے 'گنانوں' میں سندھی زبان کے الفاظ اور محاورات کی تلاش بہرحال بے سود ہے(☆)۔

پیر حسن کبیرالدین کے متذکرہ بالا 'گنانوں' میں سے پہلے 'گنان' میں فقط ''سر اگھاڑو کري'' کا محاورہ سندھی ہے۔ البتہ دوسرا گنان زبان کے لحاظ سے اہم ہے، کیونکہ اس کے پہلے دو مصرعے سندھی زبان کے خالص کچھی محاورہ (لہجہ؟) میں رچے ہوئے ہیں۔ پیر صدرالدین اور پیر حسن کبیرالدین کے 'گنان' پرانی سندھی شاعری کے مطالعہ کے لحاظ سے اہم ہوسکتے ہیں مگر ان

---

(١) ''اسماعیلی آغا خانی فرقہ جا مبلغ داعی'' ص:٨٠

(☆) غلام علی الانا نے اپنے مضمون میں داعی ''ست - ور نور'' یعنی سید نورالدین اور داعی پیر شمس الدین سبزواری ملتانی کی طرف منسوب کلام درج کیا ہے، اور لکھا ہے کہ سید نورالدین کے کلام میں سندھی الفاظ ملتے ہیں۔ جیسا کہ داعی نورالدین سنہ ٦٤٢ھ میں ہندوستان میں تبلیغ کے لئے آیا، اس لئے غلام علی الانا نے اپنے مضمون کا عنوان بھی ''سومروں کے دور کی سندھی شاعری'' رکھا ہے۔ (رسالہ مہران، جلد ٩، نمبر ١، ٢، ص:١٤٨-١٥٦) علمی تحقیق کے لحاظ سے سومرہ دور کے داعیوں کے کلام کو ''سندھی شاعری'' کہنا درست نہیں ہوگا۔

کی تصدیق کے بارے میں کسی علمی نتیجہ پر پہنچنے کے لئے 'گنانوں' کے تمام ذخیرہ پر تحقیق لازمی ہے۔ اس تحقیق کی بنیاد صرف قدیم تر گنانوں اور اس کے مستند قلمی نسخہ پر ہی رکھی جا سکتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ پیر صدرالدین نے چالیس حروف پر مشتمل ''سندھی زبان کا ایک رسم الخط تیار کیا''(۱) جسے 'چہل حرفی' یا 'خوجکی سندھی' کہا جاتا ہے۔ اس کے لئے بھی 'خوجہ جماعت' کی متفقہ روایات اور مأخذ کی تحقیق ضروری ہے: پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ رسم الخط پیر صدرالدین نے بنایا تھا یا بعد میں کسی دوسرے داعی نے؟ دوسری بات یہ کہ پیر صدرالدین کی دعوت کا دائرہ وسیع تھا، اس لئے یہ قرینِ قیاس ہے کہ انہوں نے ''چالیس حروف'' پر مشتمل کوئی ایسا رسم الخط تیار کیا ہو جس میں تمام زبانوں مثلاً گجراتی، کچھی، ہندی خواہ خوجکی سندھی میں نصیحتیں اور گنان لکھے گئے ہوں۔ لیکن یہ کہنا کہ انہوں نے یہ رسم الخط 'سندھی زبان' کیلئے بنایا تھا، اس دعویٰ کے لئے علمی تحقیق اور تصدیق کی ضرورت ہے۔

''سمہ آخری دور کی زبان میں شاعری کا مستند مواد''

۱- پیر مراد شیرازی کا منظوم دعائیہ جملہ (۸۹۱ھ):

سید حسین عرف شاہ مراد، ٹھٹہ کے شیرازی سادات میں سے مشہور درویش ہو گزرے ہیں۔ محمد صالح ولد ملا زکریا ٹھٹوی نے سنہ ۱۱۴۰ھ میں کتاب ''معارف الانوار'' فارسی زبان میں لکھی(۲) جس میں انہوں نے ان بزرگ کی سوانح و کرامات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ سید مراد ۱۲ ربیع الاول سنہ ۸۳۱ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲ ربیع الاول سنہ ۸۹۳ھ میں جام نندہ کے دور میں وصال فرمایا۔

۸۹۱ھ/۱۴۸۶ء میں شاہ مراد کے بھتیجے اور داماد سید جلال (پیر مراد کے بھائی سید علی شیرازی اول کے فرزند) کے گھر بیٹا پیدا ہوا، جس کا نام 'سید علی' (ثانی) رکھا گیا۔ یہ صاحب زادہ شاہ مراد کا نواسہ بھی تھا، اس کی ولادت پر خوش ہو کر پیر مراد نے دعائیہ طور پر کہا: ''الله، او ياتي! ڏيئي وڏي جمارا''(۳) یہ سنہ ۸۹۱ھ کا ایک منظوم دعائیہ جملہ ہے، جس میں پہلی مرتبہ ''الف اشباع' کا قافیہ 'جمارا' نظر آ رہا ہے۔

---

(۱) یہ دعویٰ پہلی مرتبہ غلام علی الانا نے اپنے مضمون ''سومرن جي دور جي سنڌي شاعري'' (رسالہ مہران جلد۹، نمبر۱،۲) میں کیا ہے لیکن یہ دعویٰ علمی تحقیق و تصدیق کے بجائے محض لکھنے والے کی اپنی خوش فہمی کا نتیجہ ہے۔

(۲) کتاب کا نام ''معارف الانوار فی بیان فضائل سید الابرار و ائمہ اطہار و احوال قطب المختار'' ہے۔ جس کا قلمی نسخہ ہم نے مولوی محمد حسین صاحب مرحوم ٹھٹوی کے ہاں ۱۲ نومبر ۱۹۵۳ء کو دیکھا اور مطالعہ کیا۔ یہ بیان اسی کتاب سے لیا گیا ہے۔

(۳) ''معارف الانوار'' کا قلمی نسخہ جو ہم نے ٹھٹہ کی جامع مسجد کے پیش امام مرحوم مولوی محمد حسن کے پاس دیکھا: اس میں ''او ياتي ڏيئي وڏي جمارا'' لکھا ہوا تھا لیکن جیسا کہ فعل 'ڏيئي' (تجھے دے) کا فاعل ہونا ضروری ہے اسی لئے 'او' (حرفِ ندا بمعنی اَے، اَرے) کے لحاظ سے شروع میں 'الله' کا نام ہی ہو سکتا ہے۔

۲- شیخ عبدالجلیل چوہڑ شاہ کی محفل سماع میں پڑھا گیا سندھی شعر:

شیخ الشیوخ عبدالجلیل، جو کہ عرفِ عام میں 'شیخ چوہڑ'(۱) کے نام سے مشہور تھے اور روحانی فیض کی وجہ سے آپ کا لقب ''قطب العالم'' تھا، نویں صدی ہجری میں ضلع رحیم یار خان (بہاولپور ڈویژن) کے قدیم شہر ''موی مبارک'' کے ایک بڑے صوفی درویش ہو گزرے ہیں۔ شیخ عبدالجلیل، سلطان بہلول لودھی (۱۴۵۱-۱۴۸۹ء) کے داماد تھے۔ حسب نسب کے اعتبار سے وہ ''مومبارک'' کے مشہور ولی شیخ ''حمیدالدین حاکم'' کی پانچویں پشت سے تھے۔ حضرت حاکم کی غوث بہاؤالدین زکریا ملتانی کی دختر کے ساتھ شادی ہوئی تھی، جس کی وجہ سے حضرت حاکم کے خاندان و اولاد کا غوث بہاؤالدین زکریا کے خاندان و اولاد کے ساتھ رشتہ داری اور طریقت کا گہرا رشتہ تھا(۲)۔ اسی وجہ سے غوث بہاؤالدین کے سندھی مریدین و معتقدین کا حضرت حاکم کی اولاد کے ساتھ بھی تعلق بڑھا۔ شیخ عبدالجلیل کے دربار میں سماع کی محفلیں ہوتی تھیں، جن میں سندھ کے خوش الحان ذاکر، فارسی اور سندھی کلام سریلی آواز میں بڑے سوز سے گاتے تھے۔ سماع کی ان مجالس کا ذکر شیخ عبدالجلیل کی سوانح عمری اور ملفوظات کی کتاب ''تذکرہ قطبیہ'' میں موجود ہے۔ یہ کتاب ان کے مرید جمال الدین ابوبکر الہ آبادی نے سنہ ۴۷/۹۴۶-۹۵۲ھ (۱۵۴۰-۱۵۴۵ء) کے عرصے میں لکھی۔ 'تذکرہ قطبیہ' سنہ ۱۳۷۱ھ میں شائع ہوئی تاہم اصل عبارت کو سمجھنے کے لئے ہم نے اصل قلمی نسخہ کا مطالعہ کیا(۳) جو ۲۷ محرم سنہ ۱۱۸۵ھ کا لکھا ہوا ہے۔ درج ذیل بیان کا مدار اس قلمی نسخہ پر ہے، حالانکہ بطور تصدیق مطبوعہ کتاب کے حوالے بھی دیے گئے ہیں۔

'تذکرہ قطبیہ' کے حوالہ جات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت غوث صاحب کے بعد حضرت

---

(۱) ڈاکٹر خواجہ عابد نظامی ''چوہڑ شاہ بندگی'' کا مطلب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ''پیر غلام دستگیر نامی نے تاریخ جلیلہ (دوسرا ایڈیشن، ص ۱۰۷) میں حضرت فرخ بخش کی کتاب ''الجلیل'' کے حوالہ سے لکھا ہے: چوہڑ ریاست بہاولپور میں عام نام ہے۔ ہندی لغت میں اس کے معنی ہیں ''شکار کو تدبیر سے قابو میں لانے والا'' حضرت نے چونکہ اپنے نفس کو مجاہدہ و ریاضت سے اللہ تعالیٰ کی بندگی کے لئے رام کرلیا تھا، اس لئے خلقِ خدا میں چوہڑ شاہ بندگی کے لقب سے معروف ہوئے۔ قطب العالم آپ کا خطاب ہے''۔ دیکھئے: 'لاہور میں اسلام کے سفیر' ص: ۹۷، الفیصل ناشران و تاجران کتب، اردو بازار لاہور، طبع اول مئی ۲۰۰۰ء (مترجم)

(۲) دیکھئے ''تاریخ جلیلہ'' مصنف غلام دستگیر نامی مرحوم، طبع دوم لاہور، ۱۳۸۰ھ/۱۹۶۰ء، ص ۵۸-۹۱

(۳) ''تذکرہ قطبیہ'' حضرت عبدالجلیل چوہڑ شاہ کی اولاد میں سے پیر غلام دستگیر نامی مرحوم نے - جو لاہور میں حضرت عبدالجلیل کی درگاہ کے متولی بھی تھے - عالمگیر پریس لاہور سے سنہ ۱۳۷۱ھ میں درگاہ کی طرف سے شائع کروایا۔ نامی مرحوم ایک عالم فاضل نیک دل اور صوفی درویش تھے۔ انہوں نے ۲۱ دسمبر ۱۹۶۱ء کو لاہور میں وفات پائی۔ ہماری آپ کے ساتھ ۱۹۵۵ء سے شناسائی بلکہ دلی محبت تھی۔ انہوں نے راقم کے علمی شوق سے متاثر ہو کر ''تذکرہ قطبیہ'' کا واحد قلمی نسخہ جو آپ کے خاندانی آثار میں سے تھا میرے حوالہ کیا، جس کا میں نے لاہور میں بیٹھ کر مطالعہ کیا اور اس کے اوراق کی تصویریں بنوائیں۔

شیخ رکن الدین کے وقت سے لے کر سماع کی محافل کے اہم گائک سندھی تھے، جنہوں نے ملتان سے بالائی علاقہ پنجاب اور دہلی تک سماع کی محافل کو شہرت دی اور ان محافل میں سندھی اور فارسی کلام گایا۔ اس دور میں ''حسن سندھی' نامی سماع کا مشہور گائک تھا، جسے حضرت رکن الدین کے مرید شیخ عثمان نے ایک محفل میں کہا کہ: ''میر حسن! کچھ سنائیے!'' اس نے معذرت کی لیکن شیخ عثمان نے اسے مجبور کیا، جس پر اس نے خواجہ سعدی شیرازی کے اشعار سے آغاز کیا(۱)۔ دہلی میں حضرت شیخ نظام الدین اولیاء کے پاس حسین سندھی نامی 'قوال' رہتا تھا جس کے سرود سے حضرت شیخ پر وجد طاری ہوجاتا تھا(۲)۔ اس ابتدائی دور سے تقریباً ڈھائی سو برس بعد شیخ عبدالجلیل کے دور میں بھی سندھ کے سماع کرنے والے گائکوں کا سلسلہ پورے عروج پر تھا۔ سماع کے ان سندھی سرخیل گائکوں کو اس وقت کی اصطلاح میں 'قوال' یا 'ذاکر' کہا جاتا تھا۔ سماع کی یہ محافل لاہور میں نیز لاہور سے باہر پنجاب کے دیگر خطوں میں بھی ہوتی تھیں۔ کچھ سندھی بزرگوں نے ان علاقوں سے بھی اوپر جاکر 'کانگڑہ' کوہستان کو آباد کیا تھا اور شیخ عبدالجلیل بھی وہاں جاتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ 'کوہستان کانگڑہ' میں افغانوں کے 'جلورا ابراہیم' نامی گاؤں میں تشریف لے گئے، وہاں ایک درویش شیخ احمد سندھی رہتے تھے، جو بہت اثر و رسوخ والے تھے۔ وہ شیخ عبدالجلیل کے (ملتان کے بزرگوں کے ساتھ ان کی نسبت کی وجہ سے) معتقد بنے۔(۳)

ایک مرتبہ شیخ جلال گجر (۴) حضرت شیخ عبدالجلیل کو دعوت دے کر اپنے گاؤں 'ہانڈو گجر' لے آئے۔ جہاں سماع کی محفل منعقد ہوئی، جس میں سندھی سماع کرنے والے ذاکروں میں سے کسی نے فارسی اشعار ترنم سے گائے اور اس کے ساتھ ایک دوہا (غالباً سندھی) بھی پڑھا، جسے سن کر حضرت شیخ پر وجد طاری ہوگیا اور اسی جذبہ کی حالت میں ان کے فیضِ نظر سے تین سو افراد نے اسلام قبول کرلیا۔ سماع کی اس محفل کے تذکرے میں خاص طور پر وضاحت کی گئی ہے کہ

---

(۱) 'تذکرہ قطبیہ' ص:۱۳۶-۱۳۷، نیز ص:۱۳۸ پر حسن سندھی کا نام درج ہے۔

(۲) تذکرہ قطبیہ، ص:۱۳۶-۱۳۷

(۳) تذکرہ قطبیہ، ص۱۳-۱۴

(۴) شیخ جلال گجر اصل میں ہندو تھے، ان کا آبائی نام 'راموں' تھا۔ ایک مرتبہ ان کی بیوی اپنے گاؤں 'ہانڈو گجر' سے دہی بیچنے کے لئے کشتی کے ذریعے لاہور آئی تو راوی کے کنارے پر اس کی ملاقات حضرت شیخ عبدالجلیل سے ہوگئی۔ حضرت شیخ نے نورِ باطن سے دیکھ لیا کہ اس دہی میں سیاہ مردہ سانپ موجود ہے۔ آپ نے اس عورت کو اس کی منہ مانگی رقم دے کر اس سے وہ برتن تڑوادیا۔ اس حقیقت کے انکشاف پر عورت بہت حیران ہوئی اور واپس آکر اپنے شوہر کو سارا واقعہ سنایا۔ اس واقعے نے راموں گجر کو بہت متاثر کیا، بالآخر وہ شیخ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوکر مسلمان ہوگیا۔ شیخ صاحب نے راموں گجر کا اسلامی نام 'شیخ جلال' تجویز فرمایا، جو بعد میں شیخ صاحب کی صحبت میں رہ کر بڑا صاحبِ کمال، اللہ کا ولی بن گیا۔ ملخص از: لاہور میں اسلام کے سفیر، ص۹۶ (مترجم)

سندھی قوالوں کو 'ذاکر' کہا جاتا تھا(۱)۔ سندھی 'قوال' یا 'ذاکر' ان محافل میں فارسی کلام کے ساتھ سندھی کلام (بیت، مولود، کافیاں) گاتے تھے، جسے حاضرین سمجھتے تھے: اس کا مطلب یہ ہوا کہ سندھی اس دور میں ان محافلِ سماع کی ایک اہم زبان تھی۔ شیخ عبدالجلیل خود سندھی جانتے تھے اور کبھی کبھار سرائیکی زبان بھی سندھی لہجے میں گاتے تھے۔ 'تاریخ جلیلہ' میں ایک واقعہ مذکور ہے، جس کے مطابق حضرت شیخ کے اپنے قریشی رشتہ داروں نے انہیں قتل کرانے کی منصوبہ بندی کی لیکن ان کے بجائے انہوں نے ایک ڈوم (میراثی) کو مار ڈالا جس پر:

اس احوال کے مشاہدہ سے تبسم فرما کر یہ ہندی کلمات سندھی زبان میں زبان سے ارشاد فرمائے:

"لڳي لڄ قريشيان، ماري ڏوم فقير" (۲)

[میراثی فقیر کو قتل کر کے قریشیوں کو شرم آنی چاہئے۔]

'تذکرہ قطبیہ' میں شیخ عبدالجلیل کا ایک شعر دیا گیا ہے جو نہ صرف سندھی لہجہ بلکہ سندھی زبان ہی میں کہا ہوا ہے۔ دوسرا ایک سندھی شعر ان کی محفل سماع میں پڑھا گیا اور تیسرا سندھی شعر ان کی وفات کے بعد ان کے مقبرے میں (لاہور میں) ایک محفل سماع میں پڑھا گیا وہ اشعار یہ ہیں:

۳۔ حضرت شیخ عبدالجلیل چوہڑ کا کہا ہوا سندھی شعر:

اس شعر کا اصل رسم الخط کافی الجھا ہوا ہے(۳) لیکن ہمارے خیال میں درج ذیل طریقے سے پڑھنا زیادہ مناسب ہوگا:

---

(۱) اصل عبارت اس طرح ہے:

ہم دراں محفل یکی از قوالان سندی کہ آنھارا 'ذاکر' می گویند، ترانہ ایں بیت خواند

کشتہ شدہ گان لب خونخوارہ معشوق

تا روز قیامت ہمہ رنگین کفنانند

وبرابر اُو یکی این دوہڑہ بخواند [کہ درج نیست]۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

بہ ہر بیگانہ کہ نظر ایشاں افتاد از سِلک یگانہ ہائی حق گشتند۔

سی صد کسی در ہمان حین باسلام مشرف گشتند [تذکرہ قطبیہ، ص:۱۲۳]

(۲) 'تاریخ جلیلہ' مصنف پیر غلام دستگیر نامی مرحوم، طبع دوم لاہور، ۱۳۸۰ھ/۱۹۶۰ء

(۳) اصل عبارت اس طرح ہے:

ہم دراں محفل یکی از قوالان سندی کہ آنھارا 'ذاکر' می گویند، ترانہ ایں بیت خواند

کشتہ شدہ گان لب خونخوارہ معشوق

تا روز قیامت ہمہ رنگین کفنانند

وبرابر اُو یکی این دوہڑہ بخواند [کہ درج نیست]۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

بہ ہر بیگانہ کہ نظر ایشاں افتاد از سِلک یگانہ ہائی حق گشتند۔

سی صد کسی در ہمان حین باسلام مشرف گشتند [تذکرہ قطبیہ، ص:۱۲۳]

محمد گهٽ گهٽِ رهيو روم تن [من] ماڻهه
هو تان هنئون ناڻه، هُن ري هي ناڻه

[حضرت محمد ﷺ میرے تن من میں سمائے ہوئے ہیں: یہ محبوب اس (عاشق) سے الگ نہیں اور ان کے سوا یہ (وجود ہی نہیں)۔]

۴- شیخ چوہڑ کی محفل سماع میں دوہے کے طور پر پڑھا گیا سندھی شعر:

'تذکرہ قطبیہ' کے مصنف لکھتے ہیں کہ "ایک مرتبہ دیگر بزرگ اور خود مصنف جمع ہو کر قطب العالم شیخ چوہڑ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو وہاں سماع کی مکمل تیاریاں تھیں۔ بعد میں جیسے ہی محفل شروع ہوئی تو "سندھی ذاکرین" میں سے ایک نے یہ 'دوہا' پڑھا:

جو گهڙي سوني، ڪو جو قهر ڪلاچ ۾
خبر ڪونه ڏي، ري ڪجاڙي رنديو(۱)

[جو بھی (گرداب میں) داخل ہوتا اسے اچک لیتا، 'کلاچ' کے گرداب میں کوئی ایسا غضب تھا جو معلوم ہی نہیں ہو رہا تھا کہ جال کہاں جا کر پھنستا ہے۔]

(یہ دوہا سنتے ہی) حضرت بندگی قطب العالم شیخ چوہڑ پر وجد طاری ہو گیا اور کھڑے ہو کر رقص کرنے لگے۔

۵- شیخ عبدالجلیل چوہڑ کی وفات کے بعد سماع میں پڑھا گیا شعر:

شیخ چوہڑ قطب العالم کے بھتیجے شیخ علی بری جو سماع کے دوران وجد کی کیفیت میں گویا اڑتے تھے، ان کے بارے میں تذکرہ قطبیہ کا مصنف لکھتا ہے کہ: "ایک دن حضرت قطب العالم (شیخ چوہڑ) کے روضہ منور میں محفل سماع ہوئی اور درویش رقص کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک

---

(۱) اصل رسم الخط (تذکرہ قطبیہ، ص۱۴۳) اس طرح ہے:
محمد کتھ کتھ رہیو روم تن ماتھ
ہونا ہن ہونہ نا ہن ہون ماتھ ہن ری ہن نا ہن
پہلی سطر میں 'تن' کے بعد 'من' کا لفظ چھوٹ گیا ہے۔ دوسری سطر کے الفاظ اس طرح درست ہوں گے:
ہونا = ہوتا = ہوتان
ہن ہو = ہن ہون = ھننون (= ہن کان بمعنی: اس سے)
نا ہن = ناتھ = نانہ
ہون ماتھ = کاتب کی غلطی کی وجہ سے یہ لفظ اضافی لکھا ہوا ہے
ہن ري = ہن ری (اس کے بغیر)
ہن نا ہنہ = 'ہن' (اُس) کے بجائے 'ہی' (یہ) پڑھنا چاہئے = ہی نانہ (یہ نہیں)

''رسالہ قطبیہ'' میں دیئے گئے سندھی زبان کے دوہے جو ایک مجلس سماع میں سندھی ذاکران نے پڑھے تھے

158-ب

"رسالہ قطبیہ" میں دیئے گئے ایک مجلس سماع میں گائے گئے سندھی دوہے

درویش نے ایک ذاکر سے آکر کہا کہ کوئی لَے/سُر سنایئے تاکہ درویش خوش ہوں۔ اس ذاکر نے عرض کیا کہ: عزیزو! یہ فقیر صرف اس جماعت (محفل) میں گائے گا جس میں شیخ بری موجود ہوگا، کیونکہ میری ان سے سچی محبت ہے۔ اس پر ایک درویش نے اس سے کہا کہ: تم گاؤ، اگر شیخ بری سے تمہاری سچی محبت ہے تو شیخ از خود آجائیں گے۔ جس پر اس ذاکر نے 'حسینی مقام' (راگ) کی لے میں یہ سندھی دوہے گائے:(۱)

چران تہ چڪن چاڪ، وِهان (تہ) وه سِنْجِري
ماء! منهنجي ڏيل سين، سورن ڪِي اوطاق
جيئن تون جانا پاڪ، آسا بند اڙين جو.

[ہلتا (حرکت کرتا) ہوں تو زخم ہرے ہوتے ہیں، بیٹھتا ہوں تو زہر پیدا ہوتا ہے (ہائے) اماں! میرے جسم میں غموں نے گھر کرلیا ہے، پاک محبوب! تو ہی بے وسیلوں کا آسرا ہے۔]

من ڪَي لو (چ) فراق، اسان هون نہ ڌار ٿيئي
سڪون پريان ساڪ، رب ڏکائي ڪڏهين.(۲)

[روح کو فَراق کی (ان کی) جستجو، ہم سے جدا نہیں ہوتی
محبوب کو ترس رہے ہیں، کب رب دکھائے گا۔]

مندرجہ بالا اشعار میں سے پہلا شعر قطب العالم شیخ چوہڑ کے سالِ وصال ۹۱۰ھ/۵-۱۵۰۴ء سے پہلے کا ہے۔ اور آخری دو شعر جس محفل سماع میں پڑھے گئے وہ قطب العالم شیخ چوہڑ کی وفات (۹۱۰ھ/۵-۱۵۰۴ء) کے بعد اور 'تذکرۂ قطبیہ' کی تصنیف (۱۵۴۵-۱۵۴۰) سے پہلے منعقد ہوئی۔ اس اعتبار سے یہ اشعار سنہ ۱۵۰۴/۵ - ۱۵۴۰/۴۵ء کے درمیانی عرصہ میں سماع کی محفلوں میں پڑھے گئے۔ ممکن ہے کہ یہ اشعار اس دور کے یا اس سے بھی پہلے کے کسی شاعر کے کہے ہوئے ہوں۔

---

(۱) 'تذکرہ قطبیہ' لاہور ۱۳۷۱ھ، ص ۱۳۱

(۲) 'تذکرہ قطبیہ' مطبوعہ لاہور ۱۳۷۱ھ، ص ۱۳۶، کاتب کے اصل لکھے ہوئے الفاظ کی بنیاد پر ہم نے مذکورہ بالا اشعار کو یوں ہی سمجھا ہے جیسا کہ درج کیا گیا ہے۔

(۱) اس شعر کا دوسرا امکانی تلفظ یوں ہے:

من ڪي لنو فراق، اسان هوت ڌار ٿئي
ڪوَن سپيريان سانڪ، رب رڪائي ڪڏهين.
(یا "سُڪئون پريان ساڪ، رب رڪائي ڪڏهين"
یا "سِڪئون پريان ساڪ، رب رڪائي ڪڏهين")

سمہ دور کے بالکل آخر کا شعر:

سنہ ۹۲۷ھ/۱۵۲۱ء کے اختتام پر سمہ دور حکومت کا خاتمہ ہوا۔ ہمیں اس سال کے بعد کے بھی کچھ اشعار ملتے ہیں، نیز کچھ ایسے شاعر بھی ملتے ہیں جنھوں نے اس سال کے بعد وفات پائی؛ اس کے باوجود ان اشعار کو سمہ دور میں شمار کیا جاسکتا ہے کیونکہ وہ شعراء جن کی ولادت و تربیت سمہ دور میں ہوئی انہیں ہم سمہ دور کے آخرین شعراء میں شمار کرسکتے ہیں۔ ذیل میں ہم سب سے پہلے سید حیدر سنائی کے ایک شعر، مخدوم احمد بھٹی کے روبرو محفلِ سماع میں پڑھے گئے ایک شعر اور شیخ بھریہ کی زبانی اسحاق آہنگر کے شعر کا ذکر کریں گے۔ اس کے بعد مشہور و معروف شاعر قاضی قادن کے اشعار پر روشنی ڈالیں گے۔ اس بزرگ نے سمہ حکومت کے خاتمے کے بعد وفات پائی مگر اس کی ولادت و تربیت سمہ دور میں ہوئی، اس لحاظ سے اُسے سمہ آخری دور کا شاعر کہا جاسکتا ہے۔

۱-سید حیدر سنائی کا شعر:

سید حیدر اپنے دور میں ساداتِ سن کے سرابراہ تھے اور مخدوم بلال کے شاگردوں میں سے ایک باعمل عالم تھے۔ سمہ حکومت کے خاتمے کے نو سال بعد سنہ ۹۳۶ھ میں وفات پائی۔ خاندانی روایت کے مطابق جب ان کے بھائی سید میاں جراڑ شہید ہوئے تو سید حیدر نے درج ذیل شعر کہا:

گئونْ گَتو ڪير ڪٽي، ڪڻ پاڌوين پاڻ

تون ٻيلي سڀڪھين، تو ٻيلي رحمان(۱)

[دلدل میں پھنسے ہوئے کو کون اٹھائے گا، بندھے ہوؤں کو خود ہی اٹھا

تو سب کا مددگار ہے، تیرا مددگار رحمان ہے]

۲-مخدوم احمد بھٹی کے روبرو محفلِ سماع میں پڑھا گیا شعر:

مخدوم احمد ہالا کنڈی (پرانا ہالا) کے درویش مخدوم اسحاق بھٹی کے فرزند تھے۔ مخدوم اسحاق، غوث بہاؤالدین زکریا کے سلسلہ کے مرید تھے۔ مخدوم احمد ایک بڑے ولی اور درویش تھے اور سماع کو طرف بہت زیادہ مائل تھے۔ ایک مرتبہ ایک عالم بڑی عقیدت کے ساتھ ان سے ملنے کے لئے آیا لیکن اسے یہ جان کر بہت ہی رنج ہوا کہ مخدوم صاحب سماع کا ذوق رکھتے ہیں۔ مخدوم احمد نے اس سے ملنے کے بعد کہا کہ: ''یہ سماع نفس کو خوش کرنے کے لئے نہیں، بلکہ سوز و

(۱) جناب غلام مرتضیٰ شاہ سید (جی ایم سید) کی کتاب ''خاندانی شجرا'' سے لیا گیا۔

درد بیدار کرنے کے لئے ہے(۱)۔ بعد میں مخدوم احمد اس عالم کو اپنے حلقۂ سماع میں لے گئے جہاں پر اس عالم کو اس قدر سوز و درد پیدا ہوا کہ اسی حالت میں اس سے نماز ہی قضا ہوگئی(۲)۔

اس کے بعد وہ عالم ہمیشہ کے لئے صاحبِ حال بن گئے۔ مخدوم احمد پر ذکر و سماع کی محافل میں ناقابلِ بیان حالت طاری ہوجاتی تھی۔ عمر کے آخری دور میں وہ نیرون کوٹ تشریف لے گئے، جہاں پر ایک محفلِ سماع کے دوران ذکر و وجد میں مشغول رہے۔ اس موقع پر ذاکر (گانے والے) نے ایسے سوز و گداز اور سریلی آواز سے گایا کہ اس کے سنتے ہی اس درویش نے جان جانِ آفریں کے حوالے کی، بعد میں ان کا جنازہ ہالا کنڈی لایا گیا(۳)۔ وہ سال ۹۳۶ھ تھا جس میں آپ نے وفات فرمائی۔

مذکورہ بالا بیان 'حدیقۃ الاولیاءٗ' کے مصنف سید عبدالقادر کا ہے۔ جسے بعد میں علی شیر قانع نے 'تحفۃ الکرامٗ' میں بھی نقل کیا ہے(۴)۔ لیکن دونوں مصنفین نے یہ واضح نہیں کیا کہ وہ کوئی سندھی شعر تھا جسے سنتے ہی مخدوم احمد وصال فرما گئے۔

پرانا ہالا کے بھٹی بزرگوں کی خاندانی روایت کے مطابق وہ 'سندھی' شعر تھا۔ مخدوم

---

(۱) حدیقۃ الاولیاء میں مخدوم صاحب کی اس عالم سے ہونے والی گفتگو یوں درج ہے:
''مولوی! ایں سماعے کہ شنیدند آن سماع نیست کہ در شریعت منہی است بلکہ ایں ماتم کدہ و حلقۂ تعزیت است! یکے نظر دراں خواہی گماشت۔''
مولوی صاحب! جس سماع کے متعلق آپ نے سنا ہے وہ ایسا سماع نہیں کہ شریعت میں اس کی منع ہو بلکہ یہ تو ماتم کدہ اور حلقۂ تعزیت ہے، ایک نظر اسے دیکھ تو لیں۔ (حدیقۃ الاولیاء، ص۹۲ (مترجم)

(۲) حدیقۃ الاولیاء میں ہے کہ بعد میں جب اس عالم سے لوگوں نے کہا کہ آپ تو اس حال (سماع اور وجد) کے مخالف تھے پھر کیا ہوا کہ آپ سے نماز بھی قضا ہوگئی؟ جس پر اس عالم نے یوں جواب دیا: مارا از دیدن سماع جاذبۂ شوق دَر رَبود و راہ بعالم بالا کشود۔
مخدوم را دیدم کہ فرق مبارک وے بعرش می سائید و از حال وے قدوسیاں ذوق و حالت می ورزیدند، مارا از تشاہدِ حال اصلاً افاقتِ احوال خویش نبود۔ (حدیقۃ الاولیاء، ص:۹۳)
سماع دیکھتے ہی ہمیں جذبۂ شوق نے لے لیا اور عالم بالا کا راستہ کھل گیا، میں نے دیکھا کہ مخدوم صاحب کے سر کی مانگ عرش سے لگ (گھس) رہی تھی اور اس کے حال سے قدوسیان (فرشتے) ذوق اور حالت کی مشق کر رہے تھے۔ ہمیں حال کے مشاہدے کی وجہ سے اپنے احوال سے افاقہ ہی نہیں ہو رہا تھا۔ (مترجم)

(۳) حدیقۃ الاولیاء میں ہے کہ: و از حاملان نعش وے چنیں منقول شد کہ: ہرگاہ جنازہ وے برداشتہ می آوردند، آواز ذکر جلی از وے جہراً می شنیدندے، و ہرگاہ وے را جائے فرود می آوردندے ساکت می گشت۔ یعنی ان کی نعش اٹھانے والوں سے منقول ہے کہ جس وقت وہ لوگ آپ کی نعش کاندھوں پر اٹھاتے تو نعش سے ذکر کی آواز آتی رہتی اور جہاں کہیں نعش نیچے رکھتے تو وہ آواز بند ہوجاتی۔ (حدیقۃ الاولیاء، ص۱۰۰ نیز تذکرۂ مشاہیر سندھ، حصہ اول، ص:۲۷ (مترجم)

(۴) یہ بیان سید عبدالقادر اپنی کتاب 'حدیقۃ الاولیاءٗ' (مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ ۱۹۶۷ء، ص:۹۰-۱۰۰) میں لائے ہیں اور وہاں سے 'تحفۃ الکرامٗ' (سندھی ادبی بورڈ ۱۹۵۷ء، ص:۳۷۷-۳۷۸ اور ص:۳۸۰-۳۸۱) میں میر علی شیر قانع نے نقل کیا ہے۔ میر علی شیر نے لکھا ہے کہ وہ ذاکر سنار تھا۔

عبدالعلیم نے اپنی کتاب میں، جو انہوں نے ۱۲۱۸ھ میں لکھی، بتایا ہے(۱) کہ: ''قابل اعتماد لوگوں سے سنا ہوا ہے کہ وہ شعر سندھی زبان میں تھا اور وہ یہ ہے: [اصل الفاظ اس طرح ہیں: ''آں بیت کہ مصنف رحہ ذکر آں کردہ است از زبان ثقات چنیں مسموع است کہ آں بیت بزبان سندھی بود و ھمیں است - بیت'']

سڏ سجائي پرينءَ جو، وانگي جي نه ورن
ڪوڙي دعوي دوست جي، ڪجاڙي ڪي ڪن!

[محبوب کا بلاوا پہچان کر بھی جو لوگ دلی چاہت کے ساتھ واپس نہ لوٹیں وہ دوستی کا جھوٹا دعویٰ کیوں کرتے ہیں؟]

شعر سنتے ہی مخدوم صاحب عالم جاودانی میں پہنچ گئے۔ اس کے بعد 'ذاکر' نے یہ شعر پڑھا [''لحہ شنیدن از دار فانی بعالم جاودانی رسیدند - بعد ازاں ذاکر ایں بیت گفت'']

سرڏيئي ست جوڙ ڪنهن پر ڪلالن سين
مرٽا منهن مَ موڙ، اڄ وٽي تي وڏ لهي

[جان دے کر بھی مے خانہ والوں کے ساتھ سودا (بیوپار، تجارت) بنا
موت سے منہہ مت موڑ، آج کٹوری (چھوٹا ساغر) بڑی قدر و قیمت والی ہے۔]

ظاہر ہے کہ یہ دونوں شعر مخدوم احمد کے سالِ وفات ۹۳۶ھ/۳۰-۱۵۲۹ء میں ایک محفلِ سماع میں پڑھے گئے لیکن یہ معلوم نہیں کہ یہ شعر کس کے ہیں۔ البتہ یہ واقعہ سمہ حکومت کے خاتمے (۹۲۷ھ) کے نو سال بعد کا ہے، اس لئے یقینی طور پر یہ شعر سمہ دور کے (یا اس سے بھی کچھ پہلے کے) کسی اہلِ دل شاعر کے ہیں۔

۳- اسحاق آہنگر (لوہار) کا شعر:(۲)

حدیقۃ الاولیاء کے مصنف سید عبدالقادر لکھتے ہیں کہ شیخ ''بھریہ ویرداس'' جو اصل میں ہندو تھے اور بعد میں مسلمان ہوئے، اپنی آخری عمر میں وہ 'گنجا ٹکر' کے دامن میں سکونت پذیر

(۱) مخدوم عبدالعلیم بن مخدوم نعمت اللہ کی کتاب ''کشف الاسرار'' (شرح کتاب اسرار الوحی کہ مسمیٰ بکشف الاسرار است) بروز جمعہ بتاریخ ۲۱ محرم سنہ ۱۲۱۸ھ میں لکھ کر مکمل ہوئی۔ ہم نے یہ قلمی کتاب مرحوم میاں محمد بھٹی کے پاس دیکھی اور اس کتاب کے متن سے وہ اشعار نقل کئے۔ ڈاکٹر مرحوم داؤد پوتہ نے یہ بات زبانی طور پر بھٹی بزرگوں سے سنی تھی، جسکی بنیاد پر انہوں نے یہ اشعار اپنے مضمون میں لکھے تھے۔ دیکھئے مضمون ''سندھی علم ادب'' رسالہ ''عام راء'' کراچی ماہ اپریل ۱۹۵۰ء؛ رسالہ ''نئیں زندگی'' کراچی ماہ مئی ۱۹۵۰ء؛ سندھ مسلم کالج مخزن فروری ۱۹۵۱ء؛ نیز مضمون ''سندھی قدیم شاعری'' رسالہ ''نئي زندگي'' ماہ ستمبر ۱۹۵۸ء

(۲) اسحاق آہنگر موجودہ حیدرآباد کے باشندہ اور ۱۴ویں - ۱۵ویں صدی کے شاعر تھے۔ دیکھیئے: 'سندھی ادب جي مختصر تاریخ' ص:۴۷ (مترجم)

ہوگئے تھے۔ سید عبدالقادر بھی غالبًا ان سے ملنے وہیں پر گئے تھے، اس ملاقات کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ: ''درویش سلوک کے مفہوم پر مبنی ایک سندھی شعر الحان سے پڑھ رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ نہ جانے یہ شعر ان کا اپنا ہے یا کسی دوسرے کا! ابھی میرے دل میں یہ خیال آیا ہی تھا کہ میری طرف دیکھ کر فرمایا: ''یہ شعر اسحاق آہن گر کا ہے''(۱)

میر علی شیر قانع نے ''تحفۃ الکرام'' میں یہی بیان 'حدیقۃ الاولیاء' سے نقل کیا ہے لیکن 'حدیقہ' کے مصنف کی طرح اسحاق آہن گر کا یہ سندھی شعر اس نے بھی درج نہیں کیا(۲)۔

''حدیقۃ الاولیاء'' کے مصنف نے شیخ بھریہ ویرداس کا سن وفات ۹۳۰ھ بتایا ہے جبکہ تحفۃ الکرام میں یہ 'نہصد و سہ' یعنی ۹۰۳ لکھا ہوا ہے۔ حدیقۃ الاولیاء سنہ ۱۰۱۶ھ میں لکھی گئی اور اس کے مصنف خود شیخ بھریا ویرداس سے جا کر ملے تھے(۳)۔ اب گر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ شیخ بھریا کی وفات مصنف حدیقہ سے چھیاسی برس یا ایک سو تیرہ برس پہلے ہوئی ہے(۴) تو اس صورت میں وہ (حدیقۃ الاولیاء کے مصنف) ان سے کس طرح ملے ہوں گے؟ یہ سوال اپنی جگہ پر درست ہے لیکن اگر تحفۃ الکرام کے بقول شیخ بھریا کی وفات ۹۰۳ھ میں ہوئی ہے تو پھر اسحاق آہنگر، جس کا شعر شیخ بھریا ویرداس پڑھ رہے تھے، وہ سمہ دور کا شاعر ہوا، مگر 'حدیقۃ الاولیاء' خواہ 'تحفۃ الکرام' کے مصنفین نے اسحاق آہن گر کا وہ سندھی شعر درج نہیں کیا ہے۔ البتہ 'حدیقۃ الاولیاء' کے مصنف کے بیان سے یہ یقینی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اس شعر میں تصوف کے معنی سمائے ہوئے تھے۔

سنہ ۱۹۵۰ء سے پہلے ہم نے درج ذیل شعر اپنی ایک بیاض میں قلمبند کیا تھا اور وہاں یہ بتایا گیا تھا کہ یہ شعر شیخ حماد کا ہے(۴)

---

(۱) حدیقۃ الاولیاء مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ، ص:۲۳۲

(۲) ''تحفۃ الکرام'' سندھی ترجمہ (سندھی ادبی بورڈ ۱۹۵۷ء، ص:۴۴۷-۴۴۸)

(۲) حدیقۃ الاولیاء کے مصنف نے شیخ موصوف سے ملاقات کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے: ''دمؤلف ایں کتاب نیز شرفِ ملازمت ایشاں مشرف گشتہ بود'' (حدیقۃ الاولیاء، ص: ۲۳۲) یعنی اس کتاب کے مؤلف کو بھی ان سے شرف ملاقات حاصل تھا۔ (مترجم)

(۳) یعنی اگر حدیقۃ الاولیاء کے مصنف کے بقول شیخ بھریا ویرداس کا سالِ وفات ۹۳۰ھ تسلیم کیا جائے تو حدیقۃ الاولیاء کی تکمیل تصنیف کے سال ۱۰۱۶ھ تک چھیاسی برس کا عرصہ بنتا ہے، وہ بھی اس صورت میں کہ مصنف حدیقۃ الاولیاء کی ان سے ملاقات اُسی (۹۳۰ھ) سال تسلیم کی جائے۔ نہ صرف یہ بلکہ مصنف حدیقہ کا سالِ وفات بھی کم از کم ۱۰۱۶ھ فرض کیا جائے۔ ورنہ تحفۃ الکرام کے مصنف کے بقول اس کا سالِ وصال ۹۰۳ھ تسلیم کرنے سے یہ عرصہ بڑھ کر، کم از کم ایک سو تیرہ سال (۱۱۳)، یا اس سے بھی زیادہ ہوسکتا ہے۔ (مترجم)

(۴)- (۴) یہ شعر ہم نے سندھی زبان کے متعلق اپنے مضمون میں لاڑکانہ کانفرنس کے موقع پر لکھا تھا جو بعد میں ''تحفہ لاڑکانہ'' ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا۔

تيان مان جهرڪ، وهان سڄڻ جي سپ تي
ماڻَ ڪرن ڊِرڪ، ٻولي ٻاجهارِيَ سين

[میں چڑا بن کر محبوب کے چھاج پر بیٹھوں
کاش کہ وہ اڑانے کے لیے ہی پُر رحم آواز میں 'ڈِرْ (پھُر) کہہ دیں۔]

جیسا کہ شیخ حماد جمالی کا شعر ایک قلمی نسخہ کی تصدیق سے دستیاب ہو چکا ہے(۱)، اس لئے کہا جائے گا کہ یہ شعر شیخ حماد کا نہیں ہے۔ سنہ ۱۹۵۸ء میں ڈاکٹر داؤد پوتہ مرحوم نے اسی شعر کو اسحاق آہن گر کا شعر شمار کیا ہے(۲)۔

سمہ دور کے کچھ شعراء کے اشعار شاہ کریم کے ملفوظات 'بیان العارفین' میں ملتے ہیں جو شاہ کریم نے مختلف مواقع پر پڑھے۔ دوسروں سے زیادہ اشعار قاضی قادن کے ہیں جس کا تفصیلی تذکرہ ہم آئندہ کریں گے۔ ملفوظات میں تمام اشعار شاہ کریم کے اپنے نہیں، مزید تحقیق کے بعد ہی معلوم ہوسکے گا کہ وہ کس کے ہیں؟ سرِ دست یہ کہا جاسکتا ہے کہ قاضی قادن کے اشعار کے علاوہ تین ہندی 'شعر' اور دیگر چھ سندھی 'اشعار'(۳) دوسرے شعراء کے ہیں۔ ان چھ اشعار میں سے تین شاہ کریم کے ہمعصر درویشوں کے ہیں(۴)۔ باقی درج ذیل تین اشعار غالباً شاہ کریم سے کافی پہلے کے شاعروں کے ہیں، جنہیں اگر قاضی قادن کا ہمعصر تسلیم کیا جائے تو پھر ان اشعار کو سمہ آخرین دور میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

۴- شاعر پراڑ کا شعر:

یہ شعر ''شاہ کریم بلڑی وارے جو کلام'' ص:۵۵ پر موجود ہے اور شاہ کریم کا اڑتالیسواں (۴۸) شعر شمار کیا گیا ہے۔ اس میں ''پراڑ'' کو ''پَراڑ'' کرکے پڑھا گیا ہے(۵) اور اسی غلطی کی وجہ سے اس شعر کو شاعر پراڑ کے بجائے شاہ کریم کی طرف منسوب کرلیا گیا ہے۔ یہ شعر یقینی طور پر ''پراڑ'' قوم کے قدیم شاعر کا ہے(۶) جسے شاہ کریم نے بطور مثال پڑھا:

(۱) دیکھئے صفحہ: ۱۶۷ پر حاشیہ:۱ (مترجم)

(۲) دیکھئے ان کا مضمون ''سندھی قدیم شاعری'' رسالہ ''نئی زندگی'' ماہ ستمبر ۱۹۵۸ء

(۳) تفصیل کے لئے دیکھیے ''شاہ کریم بلڑی وارے جو کلام'' تصحیح ڈاکٹر داؤد پوتہ مطبوعہ ۱۳۵۶ھ/ ۱۹۳۷ء جس میں تین ہندی اشعار ۲۷، ۹۹ اور ۱۰۸ صفحات پر اور چھ سندھی اشعار ۲۰، ۵۵، ۶۱، ۶۹، ۸۳ اور ۱۱۱ صفحات پر درج ہیں۔

(۴) ایضاً ص: ۲۰، ۶۹ اور ۸۳

(۵) 'پُراڑ' کے لفظی معنی ہیں: پرلا کنارہ، اُس کنارے، اس پار، اس کی ضد 'اورار' یا 'اوراڑ' (الف پر زبر یا پیش کے علاوہ، خفیف تلفظ کے ساتھ) ہے۔ دیکھیے: جامع سندھی لغات، جلد دوم، ص ۱۹۷، جلد اول، ص ۲۹۱ (مترجم)

(۶) جس وقت مرحوم داؤد پوتہ سے تبادلہ خیالات ہوا تو آپ نے تسلیم کیا کہ واقعی یہ شعر شاہ کریم کا نہیں ہے۔ داؤد پوتہ صاحب نے اپنے مضمون ''سندھی قدیم شاعری'' رسالہ 'نئی زندگی' ماہ ستمبر ۱۹۵۸ء، ص:۸ پر تسلیم کیا ہے کہ یہ شعر 'پراڑ' نامی شاعر کا معلوم ہوتا ہے۔

چندن چور ڪريندي، رَتو مُهُ ڪُهاڙ
سڄڻ ڏڄڻ نه ٿيي، جي رُسي سَوْ وار
پَروڙيو پراڙَ، ته ڪَرَهيدي قرب ٿيي

[چندن لکڑی کاٹتے ہوئے کلہاڑی کا مُنہ سرخ ہوجاتا ہے
دوست کبھی دشمن نہیں ہوگا، خواہ سو بار ناراض ہی کیوں نہ ہو
پراڑ کو آگہی ہوئی ہے کہ جھگڑنے سے پریت پیدا ہوتی ہے]

۵- ایک شعر جس کے معنی کے متعلق مریدوں نے سوال کیا:

شاہ کریم سے ان کے مرید مختلف مواقع پر دوسرے شعراء کے اشعار کے معنی پوچھتے تھے اور آپ یوں فرماتے تھے کہ فلاں (کوئی درویش) یہ شعر کہتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شعر کہنے والا شاہ کریم کا ہمعصر ہے۔ درج ذیل شعر کے بارے میں صرف اتنا بتایا گیا ہے کہ ''حضرت پیر سے اس شعر کے معنی پوچھے'' شعر بھی اصلی بنیادی ترتیب کی صورت میں ہے اور گویا 'مُعمّہ' کے طور پر کہا گیا ہے۔ اس سے گمان پیدا ہوتا ہے کہ یہ شعر پرانے زمانے سے رائج تھا اور زبان زد عام تھا اسی لئے مریدین نے شاہ کریم سے اس کے معنی پوچھے۔ یہ شعر ''شاہ کریم بلڑي وارے جو کلام'' کے ص:۶۱ پر موجود ہے۔

ڪارين ڪَنين ڪڪڙا(۱) ڪَرَهَ ولاڙ وَڃَن
ويلو ڪن نه وچ ۾، نه اوڳار ڀڄن

[سیاہ کانوں والے سرخی مائل اونٹ (اپنی طاقت اور حیثیت کے مطابق) تیزی سے چلتے ہیں۔]
درمیان میں کھانے کے لئے رکتے ہیں، نہ ہی جُگالی کرتے ہیں

۶- قوال کا سماع میں پڑھا گیا شعر:

درج ذیل شعر کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ ''شاہ کریم'' ایک دن زمانۂ جوانی میں سماع کر رہے تھے کہ اتفاقاً قوال نے یہ شعر پڑھا:

اکڙيون ملير ۾، جني راتو ڏينهن
عمر آسائن سين، هاڻي ڪندي ڪيئن

(۱) ڈاکٹر عبدالغفار سومرو صاحب کی تحقیق کے ساتھ شائع شدہ بیان العارفین میں یہ لفظ 'ڪڪڙين' (ککڑین) ہے۔ نیز مطبوعہ مخطوطہ میں بھی ایسے ہی ہے۔ دیکھیے: ''بیان العارفین وتنبیہ الغافلین'' سندھی ترجمہ، ص۹۰، فارسی مخطوطہ، ص۱۱۶ (مترجم)

[دن رات جن کی آنکھیں 'ملیر' کی طرف ہیں
اب ان امیدواروں (توکل رکھنے والوں) کے ساتھ عمر! تُو کیا کرے گا؟]

شاہ کریم ۲۰ شعبان سنہ ۹۴۴ھ میں، یعنی سمہ حکومت کے ۱۷ سال بعد پیدا ہوئے۔ قاضی قادن کی وفات (۹۵۰ھ) کے وقت(۱) ان کی عمر ۱۵ سال تھی۔ ان کے دور جوانی میں جس وقت انہیں سماع کا شوق تھا، ان کی عمر تیس پینتیس سال ہوسکتی ہے: یعنی وہ محفل سماع ۹۷۵ھ کے لگ بھگ یا سمہ حکومت کے خاتمہ کے تقریباً اڑتیس برس بعد منعقد ہوئی۔

اس شعر کی بنیادی ترتیب سے بھی ظاہر ہے کہ یہ شعر اُن اڑتیس برسوں سے پہلے کا، یعنی سمہ دور کے کسی اہل دل شاعر کا تھا جسے قوال نے سماع کے موقع پر پڑھا۔ لیکن اگر قوال نے کسی ہمعصر شاعر کا ہی شعر پڑھا ہوتو بھی وہ شاعر شاہ کریم سے عمر میں بڑا ہی ہوگا جس کا شعر شاہ کریم کی محفل سماع میں پڑھا گیا ہوگا اور جسے سنتے ہی شاہ کریم کو"اس قدر وجد وشوق پیدا ہوا کہ سَر اور کاندھوں پر پہنا ہوا لباس اتار کر قوال کو دے دیا اور آپ برہنہ پشت حجرہ میں تشریف لے گئے"(۲) تحقیق و تصدیق کے اعتبار سے مذکورہ بالا اشعار کے مقابلے میں قاضی قادن کے شعر ہمیں بڑی تعداد میں اور الگ الگ ماخذ سے ملتے ہیں جن سے اس دور کی زبان کے متعلق مزید صحیح نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں۔ اب ہم قاضی قادن کی زبان اور اشعار پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالیں گے۔

قاضی قادن کے اشعار اور زبان:

قاضی قادن سندھی زبان کے پہلے شاعر ہیں: وہ کلاسیکی سندھی شاعری کے باوا آدم ہیں۔ وہ پہلے مشہور شاعر ہیں جن کے سب سے زیادہ اشعار ہمیں پوری تصدیق کے ساتھ لکھے ہوئے ملتے ہیں، جن کے ذریعے اس دور کے علاقۂ بکھر کی سندھی زبان پر روشنی پڑتی ہے۔ قاضی صاحب

---

(۱) تحفۃ الکرام سندھی ترجمہ، ص۲۹۲، طبع پنجم میں قاضی صاحب کا سنِ وفات ۹۵۸ھ درج ہے۔ نیز اعجاز الحق قدوسی نے تاریخ سندھ حصہ دوم ص۱۰۳ پر تاریخ معصومی، فارسی، ص۲۰۱-۲۰۲ کے حوالے سے بھی قاضی صاحب کا سنِ وفات ۹۵۸ھ (۱۵۵۱-۵۲ء) تحریر کیا ہے۔ (مترجم)

(۲) شاہ کریم بلڑی والے کے کلام کا دیا ہوا حوالہ، ص:۸۲-۸۳، ممکن ہے کہ یہ شعر شاہ کریم کے کسی ہمعصر شاعر کا ہو۔
[میرے پاس اس وقت ڈاکٹر عبدالغفار سومرو صاحب کی تحقیق و ترجمہ اور تشریحی حوالہ جات سے شائع شدہ بیان العارفین کا نسخہ موجود ہے، جس کے آخر میں سید علی میر شاہ کے پاس موجود قلمی نسخہ بھی طبع شدہ ہے۔ جسے ضیاء الدین بن گل محمد کاتب نے ۲۹ رمضان سنہ ۱۲۲۸ھ کو لکھ کر مکمل کیا ہے۔
یہ مطبوعہ مخطوطہ نہایت خوشخط اور واضح ہے۔ شاہ کریم کا یہ واقعہ ترجمہ ص:۱۳۷ اور متن ص:۱۷۰-۱۷۱ پر موجود ہے۔ (مترجم)]

کی تاریخی حیثیت اور علمی ادبی عظمت کے باوجود، ان کی ولادت، ابتدائی تربیت اور تفصیلی سوانح حیات ابھی تک تحقیق طلب ہیں(۱)۔

پچھلے دور کی تحریروں میں ان کا نام 'قاضی قاضن' لکھا ہوا ہے لیکن بالکل ابتدائی اور زیادہ معتبر مأخذ میں 'قاضی قاذن' لکھا ہوا ہے(۲) اور قاذن درحقیقت 'قادن' کی دوسری صورت ہے۔ حال ہی میں ان کے اشعار کا ایک بڑا ذخیرہ دیوناگری رسم الخط میں لکھا ہوا ملا ہے جس میں دو مقامات پر ان کا نام درج ہے اور وہ 'کاجی کادن' کے تلفظ میں لکھا ہوا ہے۔ اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا نام 'قاضی قادن' تھا۔ 'قاضن' ہوتا تو 'کاجی کاجن' کر کے لکھا جاتا(۳)۔

قاضی قادن بن قاضی ابوسعید بن زین الدین بن قاضی قادن کو علم اور عہدہ قضاء گویا ورثے میں ملے تھے۔ ان کے آباء و اجداد سیوہن اور ٹھٹہ کے باشندے تھے۔ ان کے پر دادا قاضی ابوالخیر پہلے شخص تھے جو بکھر میں آ کر مقیم ہوئے(۴)، اور قاضی قادن بھی غالباً بکھر ہی میں پیدا ہوئے اور پلے بڑھے۔ اس لئے سکونت کے اعتبار سے انہیں ''قاضی قادن بکھری'' کہنا زیادہ مناسب اور درست ہوگا۔ شاہ کریم کے ملفوظات سے معلوم ہوتا ہے کہ قاضی قادن علاقۂ بکھر کے

---

(۱) قاضی قادن کے حالات سب سے اول، 'تاریخ معصومی' میں ملتے ہیں۔ جن کی بنیاد پر مرحوم ڈاکٹر داؤد پوتہ نے ''قاضی قاذن'' کے متعلق پہلے ''شاہ ڪريم بلڙي واري جو ڪلام'' کے (حاشیہ، ص:۲۵ پر) ایک مختصر نوٹ لکھا، اس کے بعد رسالہ ''نئی زندگی'' ماہ ستمبر ۱۹۵۰ء میں ''قاضي قاضن سيوهاڻي'' کے عنوان سے ڈاکٹر صاحب موصوف کا مضمون شائع ہوا۔

(۲) ''تاریخِ معصومی'' (فارسی) کے متن میں قاضی قاذن لکھا ہوا ہے (ص:۲۰۰-۲۰۴) مگر میر معصوم کا خود نوشتہ تاریخ معصومی کا نسخہ موجود نہیں جس سے اس نام کا اصل رسم الخط معلوم کیا جا سکتا۔ البتہ سندھ کے ایک اور بزرگ محمد رضا ٹھٹوی نے شاہ کریم کی سوانح اور ملفوظات کے بارے میں ''بیان العارفین'' کتاب لکھی اور اس کے اصل نسخے کی بنیاد پر ڈاکٹر داؤد پوتہ مرحوم نے ''شاہ کریم بلوی والے کا کلام'' مرتب کیا جو ۱۹۳۷ء میں طبع ہوا، اس میں چار مقامات (ص:۲۶، ۸۷، ۹۴ اور ۱۱۲) پر یہ نام ''قاضی قاذن'' لکھا ہوا ہے، ایک مقام (ص:۲۸) پر ''قاذن (قاضن)'' اور ایک مقام (ص:۲۶) پر ''قاضن'' ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ سندھ کے جن بزرگوں کے پیش نظر قاضی صاحب کے اشعار تھے انہوں نے ان کا نام ''قاذن'' لکھا ہے جو صحیح ہے۔ ''قاذن'' محض ''قادن'' ہی کی دوسری صورت ہے۔ فارسی میں 'دال' کو 'ذال' کر کے پڑھا جاتا ہے (مثلاً استاد اور استاذ) اور یہ اصول لغت میں بھی تسلیم شدہ ہے نیز سندھی میں بھی یہ اثر قبول کیا گیا ہے (مثلاً خدمت اور خذمت)

(۳) ہم نے اپنے ایک مضمون ''قاضي قادن جي نالي جي وضاحت'' (ماہنامہ پیغام، مارچ ۱۹۷۹ء، محکمہ اطلاعات سندھ کراچی سے شائع شدہ) میں اس مسئلے پر مزید تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

(۴) 'تاریخ معصومی' فارسی متن ص:۲۰۰-۲۰۲ (سندھی ترجمہ، ص:۲۳۸-۲۴۰، نیز دیکھئے 'تحفۃ الکرام' سندھی ترجمہ، ص:۳۵۳

(۵) 'بیان العارفین' میں شاہ کریم نے انہیں غالباً اسی وجہ سے ''قاضی قادن دربیلہ والے'' کہا ہے۔ دیکھئے 'بیان العارفین' سندھی ترجمہ، ص۲۶۱، از ڈاکٹر عبدالغفار سومرو، طبع اول ۱۴۲۲ھ/۲۰۰۲ء (مترجم)

شہر 'دربیلہ' (موجودہ ڈہرو ضلع نوشہرو فیروز) میں بھی کچھ وقت رہے(۱) جہاں کے ایک مجذوب مست درویش کا ان سے آمنا سامنا ہوا جس کی نظر اور توجہ سے وہ حقیقت کی طرف مائل ہوئے(۲)۔

میر محمد معصوم بکھری تاریخی اعتبار سے قاضی قادن کے قریب تر مصنف اور ان کے ہموطن ہیں اس وجہ سے ان کے حوالہ جات بھی کافی مستند ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ قاضی نے ''بڑی عمر میں'' اپنے عہدۂ قضا سے استعفیٰ دے دیا(۳)۔ اُس زمانے میں ''بڑی عمر'' کے اندازے کے پیش نظر قدرے یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ قاضی صاحب نے پچھتر سے اسّی برس کی عمر میں استعفیٰ دیا

---

(۱) ''شاہ کریم بلڑی وارے جو کلام'' تصحیح ڈاکٹر داؤد پوتہ، طبع ۱۳۵٦ھ/۱۹۳۷ء، ص۱۱۲-۱۱۳

(اس مجذوب مست شخص کے ساتھ قاضی قادن کی ملاقات کی تفصیل شاہ کریم نے یوں بیان فرمائی ہے: قاضی قادن اپنے دور کے بڑے عالم اور عقلمند انسان تھے۔ ان کا تعلق بکھر علاقہ میں دربیلہ شہر سے تھا۔ ایک دن انہوں نے سنا کہ کوئی ملامتی درویش مسجد کی محراب میں ننگا ہوکر قبلہ کی طرف پاؤں کرکے سویا ہوا ہے۔ قاضی صاحب دُرّہ اٹھا کر اس کے اوپر آکھڑے ہوئے تاکہ اسے ماریں۔ جب وہ اس ملامتی مجذوب کے پاؤں کی طرف سے کھڑے ہوکر درّہ مارنے کے لئے لپکے تو دیکھا کہ اس طرف اس مجذوب کا سر ہے، اسی طرح انہوں نے دوبارہ کوشش کی تو سر کی جگہ پر اس کے پاؤں نظر آئے، دوبارہ پاؤں کی طرف گئے تو وہاں بھی انہیں سر نظر آیا، اسی طرح جب بھی پاؤں کی طرف جاتے تو وہاں سر نظر آتا۔ یہ صورت حال دیکھ کر بہت حیران و پریشان ہوئے۔ اتنے میں اس درویش نے قاضی صاحب کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ: پاؤں جدھر چاہو ادھر کرو، لیکن اپنا دل سنبھالو! یہ سن کر قاضی صاحب نے درّہ ہاتھ سے چھوڑ دیا اور خدا کے طلبگاروں میں شامل ہوگئے، اس وقت قاضی صاحب نے یہ شعر پڑھا:

جوڳي جاڳايوس، سُتو هوس ننڊ ۾
تهان پوءِ تبوس، سندي پريان پيچري.

جوگی نے مجھے بیدار کردیا ورنہ میں تو اس سے پہلے نیند (خواب غفلت) میں تھا، اس کے بعد ہی میں راہِ محبوب پر چلنے لگا ہوں''۔

بیان العارفین کے مطبوعہ قلمی نسخہ میں دوسرا مصرع ''تهان پوءِ پيوس، پريان سندي پيچري'' واضح طور پر لکھا ہوا نظر آرہا ہے، ڈاکٹر سومرو صاحب نے کہیں سے تصحیح کرکے اسے ''تهان پوءِ تبوس، پريان سندي پيچري'' لکھا ہے اور دیکھئے فارسی متن، ص:۳۳۴ (مترجم)

''بیان العارفین'' سندھی ترجمہ، ص:۲٦۲-۲٦۳، از ڈاکٹر عبدالغفار سومرو، طبع اول ۱۴۲۲ھ/۲۰۰۲ء

(۲) تاریخِ معصومی، فارسی متن، ص:۱۲۰

(۳) قاضی عبداللہ بن قاضی ابراہیم۔ آپ مخدوم عبدالعزیز ابہری ہروی کے شاگرد تھے، اصل دربیلہ کے باشندے تھے۔ شاہ بیگ ارغون کے تسلط سندھ کے کچھ عرصہ بعد باغبان اور راوت میں رہے۔ شاہ حسن ارغون کے دور میں ۹۳۴ھ میں گجرات چلے گئے وہاں سے مدینہ شریف ہجرت کرگئے اور وہاں ہی وصال فرمایا۔ دیکھیے: تاریخ معصومی، مطبوعہ بمبئی ۱۹۳۸ء، ص۲۰۲-۲۰۳، تحفۃ الکرام سندھی ترجمہ، ص۲۹۷، مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ، طبع پنجم ۲۰۰۴ء، تاریخ سندھ حصہ دوم، ص:۱۰۳ (مترجم)

ہوگا۔ میر محمد معصوم ایک اور سندھی عالم ''دربیلہ کے شیخ عبداللہ متقی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ سنہ ۹۴۷ھ میں گجرات چلے گئے اور وہاں قاضی عبداللہ(۱) کی صحبت میں جا کر رہے، (اور بعد میں) مدینہ منورہ میں قاضی قادن کی صحبت میں رہنے لگے(۲)۔

اگر شیخ عبداللہ متقی دربیلہ سے(۳) روانہ ہوکر ۹۵۰ھ کے لگ بھگ مدینہ منورہ میں قاضی قادن کی صحبت میں رہے ہوں تو اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قاضی قادن نے ۹۴۷-۹۵۰ھ کے عرصہ میں عہدہ قضا سے استعفیٰ دیا اور ۹۵۰ھ کے لگ بھگ ان کی عمر کم از کم ۸۰ برس تھی۔ میر معصوم لکھتے ہیں کہ ''قاضی قادن نے ۹۵۸ھ میں وفات پائی'' اس کی تصدیق میر علی شیر قانع نے بھی 'تحفۃ الکرام' میں کی ہے(۴)۔ اس لئے کافی وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ قاضی قادن نے کم از کم ۸۸ برس کی عمر میں سنہ ۹۵۸ھ (۱۵۵۱ء) میں وفات پائی، اس لحاظ سے ان کی ولادت سنہ ۸۷۰ھ/ ۱۴۶۵ء تسلیم کی جاسکتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ قاضی قادن کی ولادت و تربیت جام نظام الدین عرف جام نندہ کے عہد (۸۶۶-۹۱۹ھ) میں ہوئی اور ارغونوں کے ہاتھوں سندھ میں سمہ حکومت کے خاتمہ کے سال ۹۲۷ھ میں ان کی عمر کم از کم ستاون (۵۷) برس تھی۔ یہ بالکل قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے؛ کیونکہ جام فیروز کے عہد میں شاہ بیگ کے حملوں تک قاضی قادن بہت اثر و رسوخ والے تھے اور غالباً بکھر کی قضاء ان کے حوالے تھی۔

طبقات اکبری کے مصنف نے لکھا ہے کہ شاہ بیگ ارغون نے بکھر کا قلعہ قاضی قادن سے لیا(۴) اگر یہ حوالہ درست ہے تو پھر یہ کہا جائے گا کہ جام فیروز کے ایام میں قاضی قادن بکھر میں مقیم تھے اور غالباً وہاں کے قاضی تھے یا بہت اثر و رسوخ والے تھے کہ شاہ بیگ کے حملے کے وقت وہاں کے رہنے والوں کی امان و سلامتی کی خاطر شہر کو سنبھالا اور محاصرہ کے وقت کچھ شرائط پر قلعہ شاہ بیگ کے حوالے کیا۔ یہ واقعہ غالباً ۹۲۵ھ کے اواخر کا ہے، جب شاہ بیگ نے پوری تیاری کے ساتھ سندھ پر لشکر کشی کی تھی۔ غالباً اس کے بعد قاضی قادن بکھر سے اپنے اہل وعیال کو لے کر ٹھٹہ آئے مگر وہاں سے شاہ بیگ نے بھی ٹھٹہ کا رخ کیا اور وہاں پہنچ کر ۱۱ محرم ۹۲۶ھ (۲ جنوری ۱۵۲۰ء) میں شاہ بیگ نے دریا عبور کیا اور 'ساموئی' کے میدان میں جنگ ہوئی، جس میں بالآخر افواجِ سندھ کے

---

(۱) تاریخ معصومی فارسی متن، ص:۲۰۴

(۲) شیخ عبداللہ متقی دربیلہ سے ۹۴۷ھ میں گجرات گئے تھے۔ دیکھیے: تحفۃ الکرام سندھی ترجمہ، ص ۲۹۸ (مترجم)

(۳) تاریخ معصومی فارسی متن، ص:۲۰۲، نیز 'تحفۃ الکرام' (سندھی ترجمہ سندھی ادبی بورڈ)، ص:۳۵۳

(۴) 'طبقاتِ اکبری' جلد۳، ص:۵۱۷

سپہ سالار 'دریا خان' شہید ہوئے اور شاہ بیگ نے ٹھٹہ پر قبضہ کرلیا۔ ۱۱ محرم سے ۲۰ محرم تک ارغون افواج نے ٹھٹہ کو خوب لوٹا (۱) اس عرصے میں قاضی قادن کے اہل و عیال بھی دوسروں کے ساتھ قید ہوگئے اور وہ نہایت پریشانی میں انہیں تلاش کرنے لگے۔ بالآخر شاہ بیگ کے پیش امام حافظ محمد شریف کی معرفت قاضی صاحب نے ایک عرضداشت بھیجی جس سے متاثر ہوکر شاہ بیگ نے فوج کو پوری طرح قابو میں رکھا اور قاضی قادن کو اختیار دیا کہ وہ جسے چاہیں اسے آزاد کروائیں (۲)۔ ممکن ہے کہ یہ پہلی مرتبہ قاضی قادن کا شاہ بیگ سے تعلق قائم ہوا ہو، لیکن شاید قاضی قادن پہلے بکھر میں شاہ بیگ سے مل چکے تھے، جس کی وجہ سے شاہ بیگ نے ان کی سفارش فراخ دلی سے قبول کی۔

اس کے بعد قاضی قادن نے سندھ سے جام فیروز اور دوسروں کی طرف سے شاہ بیگ اور مرزا شاہ حسن سے صلح و مفاہمت کی خاطر موقع بموقع کوششیں کیں اور شاہ بیگ کا بھی ان پر اعتماد تھا۔ حادثۂ ٹھٹہ (محرم ۹۲۶ھ) کے بعد غالباً قاضی قادن نے اپنا اہل و عیال بکھر کی طرف روانہ کردیا اور جس وقت شاہ بیگ ٹھٹہ سے سیوہن روانہ ہوا تو اس نے قاضی قادن کو بھی اپنے ساتھ لیا، درمیان میں ٹلٹی کے پاس دریا خان (۳) کے بیٹوں نے شاہ بیگ کے مقابلے کے لئے

(۱) بقول مصنف 'تاریخ طاہری' ''آخر شاہ حسن ٹھٹہ میں داخل ہوکر حرماں نصیبوں کے قتلِ عام پر اتر آیا۔ مغل سپاہ (ان کی حاملہ) عورتوں کے حمل ضائع کرواکر نیزوں پر چڑھا کر شہر کے گلی کوچوں میں پھرا کر، تمام لوگوں کو دکھا کر انہیں ڈراتے رہے، جو بھی ان کے سامنے آجاتا بغیر کسی تفتیش اور رحم دلی کے اسے تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے کردیتے۔ فیروز- ناپیروز- (ناکام و نامراد) ننگے پاؤں گجرات کی طرف بھاگ گیا۔

سمہ عورتیں اپنے بچے بغل میں دبا کر دریا میں جاکر ڈوب مریں، جو لوگ باقی بچ گئے مغلوں نے ان کے ہاتھ پاؤں باندھ کر قید خانے میں ڈال دیا۔ وہ ایسے ذلیل و خوار ہوئے کہ خدا کسی مؤمن یا کافر کو بھی یہ دن نہ دکھائے، یہ بربادی نہ صرف شہر کے لوگوں تک محدود رہی بلکہ تمام ملک تباہی میں آگیا۔ ''خرابی سند'' کی تاریخ بھی اسی دن سے اخذ کی گئی اور اس طرح سمہ آخرین حکومت ختم ہوگئی۔'' تاریخ طاہری، سندھی ترجمہ، ص:۷۰، مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ، جامشورو، طبع دوم ۱۹۹۵ء (مترجم)

(۲) اعجاز الحق قدوسی نے تاریخ معصومی، ص:۱۱۴ کے حوالے سے لکھا ہے کہ: ''۔۔۔۔۔۔ اس نے اس خط کے بعد شہر میں عام منادی کرادی کہ اب اہلِ ٹھٹہ کے مال و عیال کو کوئی ہاتھ نہ لگائے۔ پھر شاہ بیگ نے اپنے ترکش میں سے ایک تیر نکال کر قاضی قاضن کے حوالے کیا اور اپنے آدمیوں کو ان کے ساتھ کرکے کہا کہ وہ اسیرانِ جنگ میں سے جس آدمی کی طرف اشارہ کریں وہ آدمی ان کے حوالے کردیا جائے۔'' تاریخ سندھ جلد دوم، ص:۲۷، مطبوعہ مرکزی اردو بورڈ، لاہور ۱۹۸۵ء (مترجم)

(۳) یہ وہی دریا خان ہے جسے آج بھی اہل سندھ ''دولہ دریا خان'' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہ دراصل جام نندا کے وزیر لکھدیر کا غلام تھا، جو اصل میں سید زادہ تھا، اپنی خداداد صلاحیت اور ذہن رسا کے بدولت جام نندا کا وزیر بنا اور اسے ''مبارک خان'' کا خطاب ملا، نہ صرف یہ بلکہ جام نندا اسے اپنی اولاد اور رشتہ داروں سے بھی زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ جام نندا کے بعد اس کے بیٹے جام فیروز کی نالائقیوں کے نتیجے میں شاہ بیگ نے ۹۲۲ھ میں سندھ پر لشکر کشی کی اور سیوہن کی طرف باغبان علاقہ کو تاخت و تاراج کیا، وہاں سے لوٹ مار کرتا ہوا ۱۱ محرم ۹۲۴ھ کو ٹھٹہ پہنچا، جسکا مقابلہ دریا خان نے کیا۔ جب شاہ بیگ اسے شکست نہیں دے سکا تو اس کی طرف صلح کا پیغام بھیج کر مکاری سے گرفتار کرکے مروادیا۔ (ملخص از تاریخ سندھ، حصہ دوم، ص:۲۴-۲۶، مطبوعہ مرکزی اردو بورڈ لاہور، ۱۹۸۵ء، نیز تاریخ طاہری سندھی ترجمہ، ص:۶۳-۶۸، ۳۰۶-۳۰۷) (مترجم)

بڑا لشکر تیار کیا ہوا تھا جس پر شاہ بیگ نے قاضی قادن کو بھیجا کہ وہ انہیں جا کر سمجھائے اور صلح کی کوشش کرے مگر شاہ بیگ کے ساتھ رفاقت کی وجہ سے ان کا قاضی موصوف پر اعتماد نہیں رہا تھا جس کی وجہ سے انہوں نے قاضی قادن کی ملاقات سے انکار کر دیا(۱)۔اس کے بعد غالباً قاضی قادن شاہ بیگ سے رخصت ہو کر بکھر روانہ ہوا۔ ۹۲۷ھ کے آخری نصف میں جس وقت شاہ بیگ قلعہ سیوہن کی مرمت و حفاظت سے فارغ ہو کر بکھر کی طرف روانہ ہوا تو بکھر پہنچنے سے تین منزل پہلے ہی قاضی قادن اس سے آ کر ملا اور عزت و آبرو سے سرفراز ہوا(۲)۔بکھر سے ایک منزل فاصلہ پہلے ہی جام فیروز کی طرف سے شاہ بیگ کے لئے تحفے تحائف پہنچے(۳)، جو غالباً قاضی قادن کی معرفت پیش ہوئے۔ شاہ بیگ کے بکھر پہنچنے کے بعد قاضی قادن اپنے بھائیوں سمیت اس سے آ کر ملے، اس دوران دھاریچہ سرداروں کی سرکشی کے بارے میں شاہ بیگ نے ان کی رائے معلوم کرنا چاہی؛ قاضی قادن نے کہا کہ: ''یہ سرکش لوگ ہیں اور سختی کے بغیر امن قائم نہیں ہوگا'' (۴) جس پر شاہ بیگ نے ان سرداروں کو قتل کرنے کا حکم دیا(۵)۔

قاضی قادن ملک میں امن و امان اور صلح کے خواہاں تھے، اسی سلسلہ میں انہوں نے اپنی رائے دیانت داری سے پیش کی نیز اہل سندھ اور مغلوں کے درمیان صلح و مفاہمت کے لئے انہوں نے بہت کوشش کی۔ شاہ بیگ کی وفات (۲۲ شعبان ۹۲۹ھ/اگست ۱۵۲۲ء) کے بعد جس وقت مرزا شاہ حسن جام فیروز سے خفا ہو چکا تھا، اس وقت بھی مفاہمت کے لیے قاضی قادن حافظ رشید خوش نویس کے ساتھ، جام فیروز کی طرف سے مرزا شاہ حسن کے پاس تحفے تحائف لے کر گئے(۶)۔ مرزا شاہ حسن کے عہد میں قاضی قادن نے بکھر کا عہدہ قضا قبول کیا؛ وہ تقریباً ۹۳۰ھ سے ۹۴۷ھ-۹۵۰ھ تک بکھر کے قاضی رہے اور نہایت دانائی اور دیانت داری سے فیصلے کئے۔

(۱) تاریخ معصومی، فارسی متن، ص:۱۱۶-۱۱۷

(۲) تاریخ معصومی، فارسی متن، ص:۱۲۱

(۳) تاریخ معصومی، فارسی متن، ص:۱۲۱

(۴) اس موقعہ پر تاریخ معصومی نے قاضی قاضن کا شاہ بیگ کو دھاریچوں کے متعلق دیا گیا مشورہ نقل کیا ہے، جس میں قاضی قاضن نے نہایت ہی لطیف پیرائے میں شاہ بیگ کو نہ صرف ان سرداروں کے قتل کرنے کا مشورہ دیا بلکہ اپنے وطن کے متعلق ستعاروں میں جس پالیسی کو آئندہ مرتب کرنے کا اسے مشورہ دیا وہ غیر حب الوطنی اور اہلِ وطن سے بے وفائی کی وہ مثال ہے نس نے ان کے دامن کو باوجود ان کے تقدس اور صاحبِ علم و فضل ہونے کے تاریخ میں ہمیشہ کے لئے داغدار کر دیا۔

''تاریخ معصومی میں ہے کہ انہوں نے کہا کہ: زمین ایں ولایت سیلاب است۔ خار بسیار دریں زمین می روید۔ بل خارکنی ہمیشہ در دست باید گرفت۔ یعنی یہ ملک سیلابی ہے اور یہاں کانٹے بہت پیدا ہوتے ہیں اس لئے کانٹے صاف کرنے کا ہتھیار ہمیشہ ہاتھ میں رکھنا چاہئے۔'' دیکھیے: تاریخ سندھ، حصہ دوم، ص:۴۰ (مترجم)

۵) تاریخ معصومی، فارسی متن، ص:۱۲۳

۶) تحفۃ الکرام، سندھی ترجمہ (سندھی ادبی بورڈ، ص:۱۴۷

اس کے بعد ضعیفی کی وجہ سے انہوں نے عہدہ سے استعفیٰ دیا اور بکھر کی قضا ان کے بھائی قاضی نصراللہ کے حوالے ہوئی۔ ۹۴۷ - ۹۵۰ھ کے لگ بھگ وہ حج پر روانہ ہوئے اور غالباً مدینہ منورہ میں ہی ۹۵۹ھ/۱۵۵۱ء میں وفات پائی(۱)۔

قاضی قادن کے اشعار اور ان میں سمائے ہوئے فکر و معنیٰ کو سمجھنے کے لئے ان کی قابلیت، شخصیت اور ارادت کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ میر محمد معصوم لکھتے ہیں کہ ''قاضی قاضن حافظِ قرآن، قرأت و تجوید کے ماہر، حدیث، تفسیر اور اصولِ فقہ کے عالم تھے۔ انشا پردازی میں اپنے دور کے پیشوا تھے۔ علم ریاضی سے بھی اچھی طرح واقف تھے اور انجینئری میں مہارت رکھتے تھے۔ تصوف سے باخبر تھے اور سلوک و طریقت کی راہ میں بہت ریاضتیں کیں۔ سیر و سفر بھی بہت کئے اور حرمین کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ سید محمد جونپوری، جو کہ 'میراں مہدیؑ' کے لقب سے مشہور تھے، ان کے مرید اور معتقد تھے، اسی وجہ سے علماء شریعت ان پر طنز و ملامت کرتے تھے۔ جب قاضی کے عہدے پر فائز ہوئے تو انہوں نے نہایت احتیاط، امانت و دیانتداری سے فیصلے کئے''(۲)

میر معصوم کے مندرجہ بالا بیان سے ظاہر ہے کہ قاضی قادن ذہین، عالم، نیک سیرت اور صاف دل صوفی تھے۔ یہی عکس ہمیں ان کے اشعار میں بھی نظر آتا ہے۔ سلوک و طریقت میں ان کی بزرگی و برتری کی وجہ سے ان کے اشعار دوسرے درویشوں اور بزرگوں کی زبان پر ورد و وظیفہ ہوگئے اور اسی وجہ سے وہ اشعار محفوظ بھی رہے۔ ان کی وفات کے وقت (۹۵۸ھ) شاہ کریم بلڑی والے کی عمر پندرہ برس تھی۔ شاہ کریم نے قاضی قادن کے اشعار بزرگوں سے سنے اور ان سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہیں اپنی محافلِ سلوک میں پڑھا۔

ان کے ملفوظات ''بیان العارفین و تنبیہ الغافلین'' میں بہت سارے اشعار بغیر نام کے دیے گئے ہیں اور نہیں کہا جاسکتا کہ کون سے اشعار کس کے ہیں؟ سات اشعار ایسے ہیں جن کے لئے بتایا گیا ہے کہ یہ قاضی قادن کے ہیں۔ لیکن کچھ اور اشعار بھی قاضی قادن ہی کے ہیں۔ مثلاً ایک شعر وہی ہے جسے غوثی کی کتاب ''گلزارِ ابرار'' میں ترجمہ کی صورت میں دیا گیا ہے(۳)۔ بیان العارفین کے مختلف مخطوطات میں [جن کے تقابلی مطالعہ کے بعد ڈاکٹر داؤ پوتہ مرحوم نے

(۱) تاریخ معصومی، فارسی متن، ص:۲۰۱-۲۰۲

(۲) تاریخ معصومی، فارسی متن، ص:۲۰۰-۲۰۲، نیز دیکھیے: تحفۃ الکرام سندھی ترجمہ، ص:۳۵۳

(۳) غوثی نے قاضی کے اشعار ۱۶۰۲ء کے لگ بھگ برہان پور میں سندھی علماء سے سنے۔ اس نے چار اشعار کا ترجمہ دیا ہے جو ذیل میں دیے گئے اشعار (۱، ۴، ۶، ۸) ہیں۔

'بیان العارفین' کا ایک معیاری متن شائع کیا(۱)]

قاضی قادن کے اشعار قدرے مختلف تلفظ سے دیے گئے ہیں۔ جن کے پیش نظر ان اشعار کو یوں پڑھا جاسکتا ہے:

۱۔ ڪنزَ قدوري، ڪافيانْ ڪي ڪونه پڑِ هئوم(۲)
سو پاڑهُ ٻئي ڪو هيو(۳) جنان پرين لڏوم

[کنز، قدوری اور کافیہ سے میں نے کچھ بھی نہیں پڑھا؛ وہ پڑھنا (پڑھنے کا طریقہ) دوسرا ہی ہے، جس سے میں نے اپنے محبوب کو تلاش کر کے حاصل کرلیا۔]

۲۔ لوڪان نَحْوُ صرفُ، مون مطالع سپرين(۴)
سوئي پڑهئو سو پڑهان، سوئي سو حرف

[لوگوں کے لئے تو صَرف اور نحو کا مطالعہ کافی ہے، لیکن میرا مطالعہ میرا محبوب ہے میں تو بار بار وہی 'حرف' (محبوب) پڑھتا رہتا ہوں۔]

۳۔ سيئي سيلَ ٿِئامَ، پڑهئا جي پاڻ لَءِ(۵)
آکر اڳيان ايري، واڳوئي ورئام(۶)

[جو حرف میں نے اپنے لئے پڑھے تھے وہ میرے لئے کانٹے بن گئے وہ حرف سامنے ابھر کر مگر مچھ بن کر پلٹے۔]

۴۔ سڄڻ منجهہِ هئامِ، مون ويٺي واءُ ٿئا(۷)
هيڏان هوڏانهن هٿڙا، هِيَئِن جاڙ وڏام (۸)

(۱) عمر بن محمد داؤد پوتہ ڈاکٹر ''شاہ کریم بلڑی وارے جو کلام'' حیدرآباد میں طبع اور بمبئی سے شائع شدہ، سنہ ۱۳۵۶ھ/۱۹۳۷ء۔ یہ سات اشعار وہی ہیں جو ''بیان العارفین'' میں قاضی قادن کے نام سے ذیل کے صفحات پر درج ہیں: ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۳۶، ۸۸، ۹۴ اور ۱۱۳ البتہ ایک شعر (ذیل میں دیے گئے اشعار میں نمبر ۸ اور بیان العارفین میں نمبر ۷۸) قاضی قادن کے نام کے بغیر ہے۔ لیکن غوثی نے اسے اردو ترجمہ میں درج کیا جس کا سندھی ترجمہ یوں ہے: ''سڀني زبانن ۾ 'لا' سان تنهنجي نفي ڪئي وئي آهي تہ بہ تون اڃان تائين پنهنجي اثبات جي ھويان آهين'' یعنی تمام زبانوں میں 'لا' کے ذریعے تیری نفی کی گئی ہے پھر بھی تو اب تک اپنی اثبات کے درپے ہے (دیکھیں: گلزارِ ابرار کا اردو ترجمہ 'اذکار الابرار' مطبوعہ آگرہ، ۱۳۲۶ھ، ص:۲۷۵)

(۲) اصل نام 'ڪافيا' ہے، 'ڪافيان' یعنی 'کافیہ' کتاب سے۔

(۳) اصل میں ایک تلفظ 'پارٺي هيو ڪو' اور دوسرا تلفظ 'سو پاڙهين ڪو هيو' ہے، 'پاڙهہ' یعنی پڑھنا یا پڑھنے کا طریقہ۔

(۴) دوسرا تلفظ: من مطالع
(۵) دوسرا تلفظ: پڑهنام جي پاڻان
(۶) دوسرا تلفظ: وٺام
(۷) دوسرا تلفظ: مون اُٿي وٺا اوٺا
(۸) دوسرا تلفظ: 'هنهي' یا 'هنٿڙي' اور 'جار'

[ساجن میرے اندر میں تھا، اور میرے بیٹھے بیٹھے غائب ہوگیا
حالانکہ میں اِدھر اُدھر بے مقصد ٹٹولتا رہا۔]

۵۔ سائر ڏيئي لَتَ، اوچي نيچي ٻوڙئي (۱)
هيڪائين (۲) هِڪُ ٿِئو، ويئي سڀ جِهَتَ

ترجمہ: دریا نے ایک دم تمام نشیب و فراز ڈبو دیے،
ہر طرف ایک جیسا ہوگیا، اور تمام اطراف گُم ہوگئے

۶۔ 'لا' لاهيندي ڪن ڪي، 'لا' مورهِين (۳) ناهه
'بالله' ري پريان، ڪَٿُ نه ڏسي (۴) ڪي ٻئو

[لفظِ 'لا' کہہ کر کس کس کا انکار کرے گا، 'لا' دراصل ہے ہی نہیں
بخدا، محبوب کے علاوہ دوسرا کچھ نظر ہی نہیں آتا۔]

۷۔ جوڳي جاڳايوس، سُتو هوس (۵) ننڊ ۾
تهان پوءِ ٿيوس، سندي پريان (۶) پيچري

[جوگی نے مجھے جگادیا، میں تو نیند میں سویا ہوا تھا
اس کے بعد ہی مَیں، اپنے محبوب کی راہ پر آیا۔]

۸۔ توکي توڙائين، 'لا' سين لاٿائون
اجان پڻ 'آئون'، واريو وجهين وچ ۾.

[تمام زبانوں میں 'لا' تیری نفی کی گئی ہے

---

(۱) دوسرا تلفظ: ٻوڙي (۲) دوسرا تلفظ: هيڪاڻي، هيڪاني.
(۳) دوسرا تلفظ: مورائين، مورانهين (۴) دوسرا تلفظ: ڪٿ نه ڏسجي
(۵) دوسرا تلفظ: هُئسِ (۶) دوسرا تلفظ: پريان سندي

ہمارے سامنے اس وقت ڈاکٹر عبدالغفار سومرو کی تحقیق و ترجمہ اور تشریحی حوالہ جات کے ساتھ مع قلمی اصل نسخۂ فارسی مطبوعہ موجود ہے، ہم اس سے یہی ساتوں شعر ذیل میں نقل کر رہے ہیں تاکہ مرحوم ڈاکٹر داؤد پوتہ صاحب کے پیش نظر ان تینوں قلمی نسخوں اور اِس موجودہ مطبوعہ قلمی نسخہ میں ان اشعار میں موجود چند ایک الفاظ کے تلفظ اور ترتیب کا فرق واضح ہو۔ جیسا کہ ڈاکٹر بلوچ صاحب نے بھی لکھا ہے کہ ان اشعار میں شعر:۸ قاضی قادن کے نام سے منسوب نہیں ہے البتہ غوثی صاحب نے برہانپور کے سندھی علماء سے شنید کی بنیاد پر اپنی کتاب ''گلزار ابرار'' کے اردو ترجمہ ''اذکار ابرار'' میں اسے بصورت ترجمہ درج کیا ہے۔ (مترجم)

(بقایا اگلے صفحے پر)

پھر بھی تو اب تک اپنی اثبات کے درپے ہے۔]

مندرجہ بالا اشعار جو کہ 'بیان العارفین' (۱) اور 'گلزار ابرار' کے مطابق ہیں، وہ درج ذیل وجوہات کے لحاظ سے نہایت اہم ہیں:

ایک تو یہ کہ یہ اشعار پختہ قدیم ماخذ، سندھ کے بڑے بزرگوں (شاہ کریم اور برہانپور کے

ملاحظہ فرمائیں ''بیان العارفین و تنبیہ الغافلین''، مطبوعہ بتعاون: حکومت سندھ محکمۂ اوقاف اور علامہ قاضی رسالہ تحقیق منصوبہ، اشاعت اول ۱۴۲۲ھ/۲۰۰۲ء، تحقیق و ترجمہ اور تشریحی حوالہ جات از ڈاکٹر عبدالغفار سومرو (مترجم)

ڈاکٹر عبدالغفار سومرو صاحب نے اپنے ترجمہ میں ان اشعار کو لکھتے وقت بارہ مقامات پر بعض الفاظ کا تلفظ قلمی مطبوعہ نسخہ سے جداگانہ لکھا ہے۔ اور ایسا کرنے کی انہوں نے کوئی وجہ بھی درج نہیں بتائی۔ ذیل میں سومرو صاحب کے جداگانہ تلفظ کو ہر شعر کے سامنے الگ کالم میں درج کر رہے ہیں اور قلمی نسخے کے اس اصل تلفظ کو پہلے کالم میں خط شیدہ کر کے ظاہر کر رہے ہیں:

اشعار	ترجمہ اور متن کے صفحے	سومرو صاحب کے تلفظ میں فرق
۱- ڪنز قدوري ڪافيا، ڪي ڪونه پڙهئوم	۴۱، ۵۵	ڪافيان
سو پاڙهه ٿي ڪي پيو، جيائن پرين لڌوم	۴۱، ۵۵	ڪو - جئان
۲- لوڪان نحو صرف، مِن مطالع سپرين	۴۱، ۵۶	مون
سوئي پڙهئو، سوئي پڙهان، سوئي سو حرف	۴۱، ۵۶	سو پڙهان
۳- سيئي سيل ٿيام، پڙهيام جي پاڻ لئه	۴۳، ۵۸	
اکر اکيان ايري، واڳو ٿي ويئام	۴۳، ۵۸	وريام
۴- سڄڻ منجهه هوام، مون ويني واءَ ٿيا	۵۲، ۷۰	هئام
هيڏان هوڏان هٿڙا، هيئن جاڙ وڌام	۵۲، ۷۰	
۵- 'لا' لا هيندي ڪَن ڪي، 'لا' مورهين ناه	۱۴۳، ۱۷۶	موراهين
بالله ربهٔ پريان، ڪٿ مَ ڏسي ڪين پيو	۱۴۳، ۱۷۶	نه ڏسجي ڪي
۶- سائر ڏيئي لت، اوچي نيچي پوڙئي	۱۴۳، ۱۷۷	
هيڪائين هيڪ ٿئا، ويئي سپ جهت	۱۴۳، ۱۷۷	ٿئو
۷- جوڳي جاڳايوس، سُتو هوس ننڊ ۾	۲۶۳ ،	
تهان پوءِ پيوس، پريان سندي پيچري	۲۶۳۳۳۳ ، ۳۳۴	تيوس، سندي پريان

(۱) ہماری رائے کے مطابق 'بیان العارفین' میں چھ دوسرے اشعار بھی قاضی قادن کے موجود ہیں، اگرچہ وہ ان کے نام سے درج نہیں کیے گئے۔

سندھی علماء) کے زبانی بیان کیے گئے ہیں اس لئے یہ زیادہ قابلِ بھروسہ ہیں۔ بلندی فکر اور حسن معنی کے لحاظ سے بھی وہ اعلیٰ اخلاقی و وجدانی شاعری کی بہترین مثال ہیں۔فنی لحاظ سے ہمیں ان اشعار میں 'بنیادی' دوہرے مطلع والے سندھی شعر سے لے کر 'مکمل' سندھی شعر تک ارتقاء کی تمام صورتیں ملتی ہیں۔ مثلاً پہلا شعر 'بنیادی' ترتیب والا ہے، جس کا قافیہ دونوں مصرعوں کے آخر میں آیا ہے۔ دوسرے شعر سے لے کر پانچویں شعر تک ایک نئی فنی تبدیلی کی ویسی ہی مثال موجود ہے، یعنی کہ پہلے مصرعے میں قافیہ آخر کے بجائے درمیان میں لایا گیا ہے۔ چھٹے شعر میں قافیہ پہلے مصرعہ کے آخر میں اور دوسرے کے درمیان میں لایا گیا ہے۔ ساتویں شعر کے دونوں مصرعوں میں قافیہ آخر کے بجائے درمیان میں لایا گیا ہے، جو ایک جدید نزاکت ہے۔ یہ فنی نزاکتیں جن کی وجہ سے شعر میں اندرونی ترنم پیدا ہوا، وہ غالباً سماع کی موسیقی کے سلسلے سے پیدا ہوئیں۔ آخری نزاکت کی پہلی مثال قاضی قادن کے دورِ عروج سے پہلے شیخ عبدالجلیل چوہڑ کی محفل سماع میں گائے گئے شعر میں ملتی ہے(۱)۔

جس سے گمان پیدا ہوتا ہے کہ یہ فنی نزاکتیں پہلے ہی شروع ہو چکی تھیں لیکن ان کی تمام مثالیں قاضی قادن کے علاوہ کسی دوسرے شاعر کے اشعار میں ایک ساتھ نہیں ملتیں۔

قاضی قادن کے یہ تمام اشعار شاہ کریم کے زبانی دستیاب ہوئے ہیں اسی وجہ سے وہ مجموعی طور پر 'لاڑی زبان' (زیریں سندھ) کے لہجہ میں ہم تک پہنچے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ زبان خالص سندھی ہے اور ان میں آئے ہوئے الفاظ و بیان کی ترتیب بہت گہری ہے۔لیکن جیسا کہ قاضی قادن بکھر ہی میں پیدا ہوئے اور پلے بڑھے اس لئے ان کی زبان بھی اسی خطے کی ہو سکتی ہے؛ یعنی ان اشعار کی اصل زبان اس دور کی 'سرے والی سندھی زبان' ہوگی۔ اس حقیقت کی تصدیق تازہ شائع شدہ کلام کے ذخیرہ سے ہوتی ہے جو قاضی قادن کے نام سے ایک الگ باب کے تحت دادو-پنتھی فقیروں کی ایک کٹیا میں رکھے ہوئے قلمی پستک میں لکھا ہوا ہے(۲)۔ اس میں اور دیگر ایسے مخطوطوں میں اس باب کا عنوان اور خاتمہ اس طور لکھا ہوا ہے:

عنوان:

"کاجي کادن جي کي ساکي سندي

اور پي ساڎان کي ساکي ايکتي"

---

(۱) دیکھئے! ص: ۱۸۴

(۲) دیوناگری رسم الخط میں لکھی ہوئی یہ پستک ہندوستان کے صوبہ ہریانہ کے ضلع بھوانی کے گاؤں رانیلا میں دادو-پنتھی بھگت ہری داس کی کٹیا میں رکھی ہوئی تھی اس میں تقریباً اڑسٹھ سادھوؤں 'سنتوں' کا کلام لکھا ہوا ہے۔ ایک باب کے تحت قاضی قادن اور دوسروں کے سندھی اشعار لکھے ہوئے ہیں، جنہیں دہلی کے سندھی ادیب 'ہیرا ٹھاکر' نے سندھی رسم الخط میں نقل اور اس پر غور و فکر کر کے "قاضی قادن جو کلام" کے عنوان سے دلی سے (پوجا پبلیکیشنز دہلی ۱۹۷۸ء) شائع کیا ہے۔

[قاضی قادن کا سندھی کلام اور دیگر فقیروں کا کلام جمع کر کے لکھا ہوا]

"ڏاکڻي سنڌي ياشاکي سرو ساڌان کي ايڪٽي"

[جنوبی (جنوب طرف کے اشعار) سندھی زبان کے تمام درویشوں کے اکٹھے لکھے ہوئے]

خاتمہ:

"کاجي کادن جي کي ساکي سمپورڻ سما پته"

[قاضی قادن کا کلام مکمل ہوا]

ان عبارات سے ظاہر ہے کہ اس باب کے تحت قاضی قادن اور 'دیگر فقراء' کے اشعار ایک ہی جگہ لکھے گئے ہیں، لیکن بیشتر اشعار قاضی قادن ہی کے تھے کیونکہ اول و آخر میں قاضی قادن ہی کے نام کو زیادہ اہمیت دی گئی۔ یہ ابھی صحیح طور پر معلوم نہیں ہوسکا ہے کہ 'رانیلا' والی پستک کب لکھی گئی، البتہ یہ پہلی پستک نہیں بلکہ کسی قدیم پستک کی نقل ہے۔ درویش دادو دیال (۱۵۴۴-۱۶۰۳ء) (۱)

---

(۱) مسلم یونیورسٹی علی گڑھ شعبہ اردو کے استاد محمد حسن نے دادو دیال کا زمانہ سمبت ۱۶۰۱-۱۶۶۰ بتایا ہے۔ ڈاکٹر تارا چند لکھتے ہیں کہ محسن فانی (اس سے مراد دبستان مذاہب کا مصنف ہے، حالانکہ اب یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ دبستان کا مصنف محسن فانی نہیں بلکہ ایرانی النسل کیخسرو اسفندیار ہے) کے بقول، دادو کپاس صاف کیا کرتا (یعنی دُھنا) تھا، وہ اکبر کے زمانے میں گزرا ہے اور مارواڑ کے ایک گاؤں نارائنا میں پیدا ہوا تھا۔ مسٹر ولسن (WILSON) کا بھی یہی خیال ہے۔ لیکن ولسن کا کہنا ہے کہ دادو احمد آباد میں پیدا ہوا اور عمر کے ۳۷ویں سال یہیں سے نرائنا گیا اور آخر دم تک وہیں رہا۔ مسٹر فرکوہار (Farquhar) اور اور ٹریل (TRAILL) نے اس کا سال ولادت ۱۵۴۴ء بتایا ہے اور لکھا ہے کہ وہ برہمن خاندان سے تھا اس کے برعکس مسٹر سدھارکر دویدی (Sudharkar Dwived) کا کہنا ہے کہ وہ چمار یا موچی تھا، اس کا خاندانی پیشہ کنویں سے پانی نکالنے کے لیے چمڑے کے ڈول (Mot) بنانا تھا، اس کا پہلا نام مہابلی (Mahabali) تھا، اپنی پہلی بیوی کے انتقال کے بعد اس نے دنیاوی امور سے قطع تعلق کرلیا اور (کبیر کے بیٹے) کمال کا چیلا بن گیا۔ دادو نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ راجپوتانہ میں گزارا، اس نے اجمیر، دہلی، امبر اور دوسرے مقامات کی سیاحت کی۔ کہا جاتا ہے کہ دادو شہنشاہ اکبر کی خدمت میں بھی باریاب ہوا تھا۔ وہ ۱۶۰۳ء میں نرائنا میں فوت ہوا، اس کے شاعرانہ مقولے پانچ ہزار اشعار پر مشتمل ہیں، جنہیں ابواب میں تقسیم کردیا گیا ہے۔ ہر باب میں کسی اہم مذہبی سوال کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ ان اشعار کی زبان ملی جلی برج بھاشا اور راجستھانی ہے۔ بعض اشعار پنجابی میں ہیں۔ کچھ ریختہ میں اور چند بگڑی ہوئی فارسی میں۔

محمد حسن لکھتے ہیں کہ انہوں نے اپنا ایک الگ حلقہ قائم کیا جو دادو پنتھی کے نام سے مشہور تھا اور ابھی تک جے پور کے قریب دادو پنتھی پائے جاتے ہیں۔ ان کا انتقال جے پور سے ۲۰ میل کے فاصلے پر نرانا مقام پر ہوا ہے اور یہ جگہ ابھی تک دادو پنتھیوں کا مرکز بنی ہوئی ہے۔ دبستان مذاہب میں ہے کہ: اس نے اپنے پیروؤں کو بت پرستی سے منع کیا اور جلالی حیوانات کا گوشت چھوڑنے کا حکم دیا اور جاندار کو تکلیف دینے سے احتراز کیا لیکن عورت اور بیوی کو چھوڑ دینے اور دنیاوی کاموں سے کنارہ کش ہونے کا حکم نہیں دیا بلکہ لوگوں کو ترک اور تعلق کے بارے میں اختیار دے دیا، اہلِ ترک اور اہلِ تعلق دونوں قسم کے لوگ اس کے مرید ہیں۔ جب ان میں سے کوئی آدمی مرجاتا ہے تو مردہ کو چوپایہ پر سوار کرا کے جنگل میں چھوڑ دیتے ہیں کہ اب یہی بہتر ہے کہ درندے اور چوپائے اسے کھا کر آسودہ ہوجائیں۔ دادو کی مذہبی تعلیمات کے بارے میں تمدنِ ہند پر اسلامی اثرات، ص: ۳۸۳-۳۹۱ ملاحظہ فرمائیں

(بقایا اگلے صفحے پر)

یقینی طور پر قاضی قادن کے اشعار سے متاثر ہوا، اور اس نے یہ اشعار یا تو اپنی زندگی میں لکھے اور لکھوائے، یا پھر اس کے پیروکاروں نے لکھے اور محفوظ کیے۔ رانیلا کی پستک کے علاوہ تین دوسری پستکیں بھی موجود ہیں جن میں ایک الگ باب کے تحت قاضی قادن اور دوسروں کے اشعار لکھے ہوئے ہیں۔ جو سمبت سال ۱۷۴۵، ۱۸۰۲ اور ۱۸۰۵ء میں لکھی گئیں۔ سب سے قدیم پستک دادو کے بڑے چیلے رجب (RAJJAB) نے سمبت ۱۷۴۵ میں لکھی جو جے پور میں رکھی ہوئی ہے جس میں اس باب کے تحت ایک سو اٹھارہ (۱۱۸) کے بجائے دو سو تینتالیس (۲۴۳) اشعار لکھے ہوئے ہیں(۱)۔ دادو دیال اور شاہ کریم ایک ہی دور کے تھے لیکن شاہ کریم وطن اور زبان کے اعتبار سے قاضی قادن کے زیادہ قریب تھے اس لئے ان کے ملفوظات 'بیان العارفین' میں قاضی قادن کے جو اشعار ہیں وہ زیادہ صحیح اور لائق تصدیق ہیں۔ ہم نے بیان العارفین میں درج قاضی قادن کے اشعار کی زبان، شاعری اور معنوی معیار کو پیش نظر رکھ کر رانیلا گاؤں کی کٹیا میں رکھی ہوئی پستک کے باب کے تحت درج شدہ اور بعد میں دہلی سے ''قاضی قادن جو کلام'' کتاب میں مطبوعہ تمام اشعار کو بڑی سوچ بچار سے پرکھا اور اس پہلی 'پرکھ' (جس پر اب بھی نظر ثانی کی ضرورت ہے) کے مطابق اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مجموعی ۱۱۲ اشعار میں سے زیادہ سے زیادہ ۷۷ اشعار ایسے ہیں جو قاضی قادن کے ہوسکتے ہیں(۲)۔ اشعار کے اس بڑے ذخیرے سے قاضی قادن کی سندھی زبان، یعنی سولہویں صدی عیسوی کے دور میں بکھر علاقہ کی برے والی زبان کے یقینی اور پختہ آثار و علامات اور اشارے ملتے ہیں جن کی بنیاد پر ہم درج ذیل نتائج پر پہنچے ہیں:

۱- اس خطہ میں سندھی اور سرائیکی زبانیں ساتھ ساتھ رائج تھیں اور قاضی قادن نے غالباً کچھ اشعار سرائیکی میں بھی کہے۔ مثلاً:

هَر هَر فال كَرينديَانْ راڌِيْ گئي وِها
وَج پُچو سانوڻ سُتِيان، لابي (لاَبے) لنگهڻ آَ.

(گزشتہ سے پیوستہ) دیکھئے:

۱- دبستانِ مذاہب، تصنیف کیخسر و اسفندیار، اردو ترجمہ، ص۲۲۳، مطبوعہ ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور، طبع اول ۲۰۰۲ء

۲- ہندی ادب کی تاریخ، تصنیف: محمد حسن، مطبوعہ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی طبع چہارم ۱۹۹۳ء، ص:۶۸

۳- تمدنِ ہند پر اسلامی اثرات، تصنیف: ڈاکٹر تارا چند، اردو ترجمہ، ڈاکٹر محمد مسعود احمد، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور، طبع دوم جون ۲۰۰۲ء، ص:۳۸۱-۳۸۲ (مترجم)

(۱) اس پستک کی نقل ہم نے دہلی میں شری راجہ رام شاستری کے پاس دیکھی تھی۔

(۲) تفصیل کے لئے دیکھئے ہمارا مضمون ''قاضي قادن جا بيت، نئين تحقيق جي روشنيءَ ۾''، سندھی ادبی بورڈ کی طرف سے شائع شدہ رسالہ مہران نمبر۴، اکتوبر - دسمبر ۱۹۷۸ء، ص:۱۱۲-۱۴۸

[فصل بونے کے موسم میں جھاڑ جھنکار صاف کرنے اور بیج ڈالنے کے بجائے وسوسے کرنے اور شگون تلاش کرنے کی خاطر ہر وقت فال ڈالنے والوں (کا یہ حال ہوگیا کہ) فصل بونے کا وقت گزر گیا (جو اس طرح غفلت کرتے ہوئے) ساون کے موسم میں سوجاتے ہیں، ان سے جا کر کٹائی کے وقت (جب دوسرے لوگ نیا اناج پیتے اور کھاتے ہیں) بھوک اور فاقہ کی خبر پوچھو۔]

۲- اس دور کی 'سِرے' کی زبان میں سندھی اور سرائیکی کا فطری تعلق تھا: یعنی سرائیکی عبارات میں کچھ سندھی الفاظ (جیسا کہ مذکورہ بالا شعر میں 'وڃ' = جا کر) اور سندھی عبارات میں کچھ سرائیکی الفاظ (جیسا کہ 'ڏونهين' = دونوں) جڑے ہوئے تھے۔ قاضی قادن کے سندھی اشعار میں بھی سرائیکی زبان کی آمیزش کے آثار ملتے ہیں۔ مثلاً:

۱- تسان نہ اسان جيتري = اوهان کي نہ اسان جيتري (آپ کو ہمارے جتنا نہیں)

۲- سيي جيان تِکيان = سڀ زبانون تکيون (سب زبانیں تیز)

۳- راڏي اجاڙين = پوکيل پوک برباد ڪن (اگائی ہوئی فصل برباد کریں)

۴- سڄڻ ڏڄڻ ڏيک ڪي = سڄڻ کي (ظاهري طرح) دشمن واري حالت ۾ ڏسي ڪري (ساجن کو (ظاہری طرح) دشمن کی حالت میں دیکھ کر

۳- لفظِ 'آءٌ' (= میں) کے بجائے 'مان' (مَانْ = میں) کا لفظ سِرے والی زبان میں موجودہ 'صورتوں' اور 'حالتوں' کے مطابق استعمال ہوتا تھا۔ مثلاً:

'مان کي سڄڻ گڏيو' = مون کي سڄڻ گڏيو (مجھے ساجن ملا)

'جتي هوئڻ مان پرين' = جتي منهنجا پرين هجن (جہاں میرے دوست ہوں)

قاضی قادن نے 'آئون' (= میں) فقط 'آپِّ' (آپے=خود) کے معنی میں اسم کے طور پر استعمال کیا ہے۔ قاضی قادن کے اشعار میں لفظ 'ڪاٿي' (کاتھے= کہاں، حرف ظرف) بھی آجکل کی زبان والا ہے۔

۴- 'جمع' کی صورت بھی ہوبہو موجودہ صورت وہی 'آن' والی تھی، جیسا کہ قاضی قادن کے اشعار میں 'جمع' کی درج ذیل صورتیں استعمال ہوئی ہیں:

زيران = زيرون (زیر جمع کا صیغہ)

زبران = زبرون (زبر جمع کا صیغہ)

آيتان = آيتون (آیتیں)

ٻانهانْ = ٻانهون (بازو، جمع)

دانهان = دانهون (چیخ و پکار)

ليهان = ليهون (لکیریں، محبتیں، لکڑی کے تختے، دل میں ترس، لحاظ)

کتبيان = ننڍڙا ڪتاب (کتابچے) — پريان = پرين (محبوب، جمع کا صیغہ)

سپيريان = سپرين (ساجن، دوست) — پاٹيچيان = پاٹي پيون = اوليون

مِران = متا (سَر، جمع) — ٻيڙيءَ جون (کشتی کے چپو)

ڄيان = ڄيون (زبانیں) — مَڪريان = مَڪريون = ٻيڙيون (کشتیاں)

مُهان = منهن (رُخ، مکھ، چہرہ)

۵- ہم دوسرے باب کے آغاز میں، 'فتح نامہ' میں موجود 'برہمن خاندان' کے دور کی زبان کی اضافی تراکیب کے مطالعہ سے اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ: ''اس دور میں شاید حروفِ اضافت جداگانہ استعمال میں نہیں آئے تھے'' (ص:) قاضی قادن کے اشعار کی زبان سے اس نتیجے کی پوری تصدیق ہوتی ہے کیونکہ قاضی قادن کے اسّی سے زیادہ شعری ذخیرہ میں 'جو' 'جي' 'جا' 'جون' کے حروفِ اضافت انتہائی قلیل بلکہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ان کے بجائے قبل از اسلام دور کی مشترکہ ترتیب کے ساتھ ذیلی اضافی تراکیب موجود ہیں۔

رب پرتيان = رب جا پرتل (= رب کے حوالے) ('کلام مطبوعہ دہلی' شعر نمبر ۱۵)

ڪنولان ڪر = ڪنولن گلن جي پرگھور (= کنول کے پھولوں کی پرورش) (ایضاً، ۱۹)

جر سالور = جر جا سالور (= پانی کے مینڈک) (ایضاً، ۱۹)

پريان پور = پرين جا پور (= محبوب کی یادیں) (ایضاً، ۵۰ جہاں پر 'پريان جا پور' لکھا ہوا صحیح نہیں ہے)

سمر تات = سمر جي تات (= سامانِ سفر کی یادآوری) (ایضاً، ۸۰)

ترهي تات = ترهي جي تات (= سہارے کی یادآوری) (ایضاً، ۸۱)

مون سيڻ = منهنجا سيڻ (= میرے تعلق دار) (ایضاً ۲۵-۲۶)

مون سيڻن = منهنجي سيڻن (= میرے تعلق داروں نے) (ایضاً، ۴۲)

مون هٿ = منهنجي هٿ (= میرے ہاتھوں میں) (ایضاً، ۷۵)

تو در = تنهنجي در (= تیرے دروازے پر) (ایضاً، ۵۵)

لاهوتيين = لاهوتين جو (= سنیاسیوں کا) (ایضاً، ۱۵)

آکڙيين = آکڙين جو (= آنکھوں کا) (ایضاً، ۴۷)

اس قدر زیادہ تعداد میں مشترکہ اضافی تراکیب سے ظاہر ہے کہ قاضی قادن کے دور تک برے والی سندھی زبان میں جداگانہ حروف اضافت کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا۔

٦- جداگانہ حرف جر، مثلاً: کي (کھے=کو)، مان (ماں=سے)، لاءِ (= کے لئے)، وٹ (وٹِ=پاس، کے پاس، قریب)، تي (تے=پر) اگرچہ استعمال ہوئے ہیں لیکن ان کی تعداد کے مقابلے میں 'مشترکہ تراکیب جر' کی تعداد زیادہ ہے۔ مثلاً:

جيان = جتان کان (جہاں سے)

لوکان = لوک لاءِ (دنیا کے لئے)

تهان = تنهن کان (اس سے)

آکاسان = آکاس تان، کان (آکاش سے)

سجٹان = سجٹن کي (سجنوں کو)

پاٹان = پاٹ لئي، پاٹ سان، پاٹ جو (پنهنجو) (اپنے لئے، اپنے سے، خود کا، (اپنا)

کيٹان = کين (انہیں یا ان سے)

سيٹان= سيٹن کي (تعلق داروں، رشتہ داروں کو)

پيچري = پيچري تي، ۾ (پگڈنڈی پر، میں)

صرافين = صرافن وٹ (صرافوں کے پاس)

پير = پير سان (پیر کے ساتھ)

ڈونگرين = ڈونگرن ۾ (پہاڑوں میں)

٧- 'جان ئي' (جاں ئی =جڈهن کان= جب سے) اور 'تان ئي' (تاں ئی= تڈهن کان = تب سے) کی تراکیب وہی ہیں جو موجودہ شمالی سندھی زبان میں استعمال ہوتی ہیں۔

جان ئي پاران پڈرو، بڈائون سو سڈ

مون هنيڑو تان ئي کيو سپريان سان گڈ

(جب سے ارواح نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ''الست بربکم'' کا فرمان سنا میں نے تب سے ہی اپنا دل مالک سے لگالیا)

٨-اس دور میں کچھ خاص الفاظ استعمال میں آتے تھے جو اب استعمال نہیں ہوتے مثلاً

مَئن = مِڑن - گڈ ٿين (جمع ہوں، اکٹھے ہوں)

ميئي = مڑيئي - سب (سبھی، سب)

تگا، تگانِ = تن کان (ان سے)، یہ لفظ دراصل ('تن کنا' یا 'تن گِنا' کا خفیف مشترکہ تلفظ ہے۔ پستک کا اصل تلفظ 'تلگان' ہے، لیکن صحیح تلفظ تگان ہے۔ پاٹيچي ج پاٹيچيان۔ پانی میں کشتی کو چلانے کے لئے اولی جمع اوليون = چپو۔

قاضی قادن کے اشعار سے اس دور کی سندھی زبان کے الفاظ، اصطلاحات اور نحوی تراکیب کے ان آثار کے علاوہ زبان میں اعلیٰ فکر اور گہرے تصورات، مختلف نفسیاتی کیفیات اور دیگر نت نئے موضوعات کے بیان کی بڑھتی ہوئی صلاحیت کی تصدیق ہوتی ہے۔

شاعری کے اعلیٰ اخلاقی مضامین اور عوامی شاعری کے موضاعات کو ملانے کا سلسلہ اگرچہ پہلے سے شروع ہوچکا تھا مگر وسیع پیمانے پر ان کا سنگم پہلی مرتبہ قاضی قادن کے اشعار میں ملتا ہے: انہوں نے عام قصوں اور زندگی کے عام مشاغل کے قالب میں اعلیٰ فکر و معانی کو سمودیا اور خواص کی فکر خاص کو عوام کے عام ذوق کے ساتھ پیوستہ کردیا۔ سندھی شاعری میں اس رجحان ساز بنیاد کو قاضی قادن نے اس قدر پختہ کردیا کہ ان کے بعد آنے والے بڑے بڑے شعراء نے انہی بنیادوں پر شعر و ادب کی عمارت تعمیر کی اور موضوعات کی وسعت سے سندھی زبان میں قوتِ بیان کو عروج پر پہنچادیا۔ قاضی قادن سندھی کلاسیکی شاعری کے باوا آدم تھے۔ انہوں نے اپنے خالص سندھی اشعار میں توحید و یقینِ کامل، اعلیٰ اخلاق و سچی چاہت و محبت کا درس دیا اور کئی نئے معنوی مضامین اور عام موضوعات کو اپنے اشعار میں بیان کیا؛ اور توحید و یکتائی، وحدت و کثرت، پیار و محبت اور اعلیٰ انسانی اخلاق جیسے معنوی اور نفسیاتی گہرے نکات کو زندگی کے عام ماحول اور مشاغل اور عام رائج باتوں اور افسانوں کی مثالوں کے ذریعے سمجھانے کی کوشش کی۔ موجودہ تحقیق کی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ سرکنڈے اور کنول، مہران اور ساگر، موتی اور ہنس، کنارا اور ٹھاٹ، ساحل اور سرکنڈا، بیڑا اور سمندر، رہبر اور معلم، زخمی اور طبیب، اونٹ اور اس کی الٹی عادت، چولہا اور آگ، غلط راہ رو اور خطاکار، بگلے اور پپیہے، تُرچی باز اور شیر، سورمے اور خنجر کا کھیل، جوگی اور درویش، سسئی اور **قاللہ اور مورڑو ملاح کے مچھیرے** بھائیوں اور ان کے والد اوباہیو۔ ان سب کی مثالوں کو قاضی قادن نے اپنے اشعار میں ذکر کیا اور ان کے متعلق اشاروں اور علامات کے لئے موزوں الفاظ اور اصطلاحات استعمال کیں۔ ان کی یہی مثالیں آگے چل کر اعلیٰ شاعری کا اہم موضوع بنیں۔

نتائج:

سمہ دور کے بارے میں مذکورہ بالا سلسلہ وار اور قدرے تفصیلی جائزے کے بعد ہم درج ذیل نتائج پر پہنچتے ہیں:

ا) سمہ دور میں عربی تعلیمی زبان رہی اور فارسی سرکاری دفتری اور کاروباری زبان کے طور پر استعمال ہونا شروع ہوئی۔ سمہ قبائل کی خالص سندھی زبان نے 'معیاری سندھی زبان' کی صورت میں ترقی کی۔

۲) سمہ دور میں سندھی زبان کی سرحدیں جنوب-مشرق میں کچھ اور گجرات کی طرف اور شمال میں بہاولپور اور ملتان کی طرف پھیلیں اور ان سرحدوں پر سندھی زبان کا دیگر پڑوسی زبانوں، خصوصاً گجراتی، بلوچی اور سرائیکی کے ساتھ میل جول شروع ہوا۔ مغرب کی طرف کوہستان اورلسبیلہ میں، جنوب کی طرف کچھ میں 'سندھی زبان' کے دو مقامی لہجوں یعنی 'کوہستانی اور بیلہ کی زبان' اور 'کچھی زبان' کی تشکیل ہوئی۔

ملتان کے جنوبی حصے کی زبان پر سندھی کا گہرا اثر پڑا، جس کی وجہ سے سرائیکی کا 'سندھی-سرائیکی' لہجہ وجود میں آیا جو جنوبی سندھ میں بھی رائج ہوا۔ بلوچستان کے مغربی اور مشرقی خطے کی بلوچی پر بھی سندھی زبان اثر انداز ہوئی اور اس آمیزش کی وجہ سے 'مغربی' اور 'مشرقی' بلوچی میں سندھی 'صوتیات' اور الفاظ داخل ہوئے۔ مغربی بلوچستان اور مکران کی طرف مخصوص مقامی بستیوں میں آباد سندھی قبائل کے 'جدگالی' (۱) لہجے نے جنم لیا۔

۳) ابتدائی سمہ دور، سومرہ دور کی طرح سندھی زبان کے قصوں اور معموں، کہاوتوں اور پیشین گوئیوں کا رومانی دور تھا جس میں سندھی شاعری بڑھ کر جوان ہوئی نیز روایتی قصوں، کہانیوں کے ذریعے زبان میں بیان کی صلاحیت بھی بڑھتی رہی۔

۴) سومرہ دور کی طرح سمہ دور کے آغاز میں سندھی زبان کی لسانی خصوصیات اور ادبی روایات سومرہ دور والی ہی رہیں۔

۵) سندھی نثر میں قوتِ بیان اور قصہ خوانی کی بڑھتی ہوئی صلاحیت کے باعث، سمہ دور میں سمہ سرداروں کی سخاوت اور بہادری کے نئے قصے اور عشقیہ داستانیں رائج ہوئیں اور 'معموں' کے ذریعے بھانڈوں اور بھاٹوں نے سندھی میں قصہ خوانی اور داستان گوئی کو ایک 'ادبی فن' کے درجے پر پہنچایا۔

۶) نثری داستانون کے ساتھ، سمہ دور میں سندھی شاعری نے معموں، رجز اور شعر کی صورت میں ترقی کی۔

درویشوں کی خانقاہوں اور صوفی بزرگوں کے سماع کی محافل اور صحبتیں اعلیٰ سندھی شاعری کے ابھرنے کے لیے ایک مؤثر ذریعہ ثابت ہوئیں۔ سمہ دور میں سندھی شاعری تاریخ کی روشنی میں نکھری اور اسی دور سے سندھی شاعری کے تاریخی دور کا آغاز ہوا۔

۷) سمہ دور میں قاضی قادن کے کلام میں 'سندھی شاعری' ہیئت و فن کے لحاظ سے تکمیلی

---

(۱) جدگال: ایک ذات یا قوم، جو اصل سندھی ہے، کلانچ، قلات، مکران اور ایرانی مکران کے صحرائی علاقے میں رہتے ہیں۔ (مترجم)

صورت کو پہنچی۔ اور اس کی بنیادی ترتیب میں قافیوں کی ہیر پھیر سے تبدیلی آئی اور پہلا 'سندھی شعر' جس کے دونوں مصرعوں کے درمیان قافیہ آیا وہ سنہ ۹۰۰ھ/۱۴۹۴ء کے لگ بھگ شیخ عبدالجلیل چوہڑ کی محفلِ سماع میں پڑھا گیا۔ گویا فنی لحاظ سے 'سندھی شاعری' میں تبدیلی سمہ دور میں رونما ہوئی اور تقریباً نویں صدی ہجری کے آخر میں وہ تکمیلی صورت کو پہنچی۔ فنی ترتیب اور معنوی لحاظ سے 'شاعری' کے نُمو کی تمام ارتقائی منازل قاضی قادن کے 'اشعار' میں ملتی ہیں۔

۸) الف اشباع کا قافیہ(۱) پہلی مرتبہ سمہ دور میں سنہ ۸۹۱ھ/۱۴۸۶ء میں پیر مراد شیرازی ٹھٹوی کے دعائیہ مگر موزوں مصرع - ''اللہ او یاتي ذیٹي وذي جمارا'' - میں ملتا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ الف اشباع کی ابتدا سمہ دور ہی میں ہوئی۔

۹) قاضی قادن کے اشعار سے ثابت ہوتا ہے کہ سندھ کے شمالی خطے میں 'سِــــرے والی سندھی زبان' رائج تھی جس کی کچھ خاص لسانی خصوصیات بھی تھیں۔

۱۰) اس دور میں سندھی اور سرائیکی کا ایک دوسرے سے زیادہ تعلق قائم ہوا اور شمالی سندھ میں یہ دونوں زبانیں گویا ایک ہی ملک کی زبانیں قرار پائیں۔ قاضی قادن نے غالباً سرائیکی میں بھی اشعار کہے اور سندھ میں وہ سرائیکی زبان کے پہلے شاعر قرار پائے۔

---

(۱) یہ عربی لفظ ہے۔ اس کا مادّہ 'شبع' ہے، جس کے معنی ہیں: سَیر ہونا، پیٹ بھرا ہونا - اصطلاح قواعد میں اشباع کہتے ہیں حرکت کو کھینچ کر پڑھنا کہ اس سے حرف پیدا ہوجائے-اور اصطلاح شعر میں اشباع کہتے ہیں۔ شعر میں زبر، زیر اور پیش کو پڑھنے میں لمبا کرنا کہ زبر بڑھ کر ''الف'' اور زیر بڑھ کر ''ی'' اور پیش بڑھ کر ''و'' ہوجائے۔ جیسے پیر مراد شیرازی۔ کے مصرعہ میں آخری لفظ ''جمارَ'' کی زبر کو لمبا کرکے ''الف'' کی آواز میں 'جمارا' پڑھا گیا ہے۔ یا مشہور نعتیہ قصیدہ، قصیدہ بُردہ شریف میں لفظ کُلِّهِمْ کے 'م' پر زیر کو لمبا کرکے پڑھا جاتا ہے، جس سے ''كُلِّهِمِیْ'' (ی) کی آواز پیدا ہوتی ہے۔ (مترجم)

مَــوْلَایَ صَــلِّ وَ سَــلِّــمْ دَائِــمًــا اَبَــدًا

عَــلٰــی حَبِیْبِکَ خَیْــرِ الْــخَــلْــقِ کُــلِّهِــمْ

باب ششم

سندھی اور فارسی کے بڑھتے ہوئے تعلق، سندھی اصطلاحات اور نثری جملوں کی وضاحت، سندھی کے ادبی و ثقافتی دائرے کی وسعت، روایتی ادب اور سندھی شاعری کے تحریری ذخیرہ میں اضافہ کا دور

(ارغون، ترخان اور ابتدائی مغلیہ دور: ۱۵۲۰ـ۱۵۹۰ع)

ارغون (۹۲۷ـ۹۶۲ھ/۱۵۲۰ـ۱۵۵۵ع)، ترخان اور ابتدائی مغل دور (۹۶۳ـ۱۰۰۰ھ/۱۵۵۶ـ۱۵۹۰ع) سندھ نیز ہندوستان میں فارسی زبان کی وسعت اور اثر و رسوخ کا دور تھا۔ فارسی زبان سرکاری دفاتر، انتظامی امور، خط و کتابت، تعلیم و تصنیف، ادب اور شاعری کی زبان کے طور پر وسیع پیمانے پر استعمال ہونے لگی۔ دوسری طرف مقامی ملکی زبانیں بھی اپنے تاریخی اور ارتقائی تقاضاؤں کے تحت اس دور میں عوامی اور مقامی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے زیادہ نمایاں طور پر ابھریں۔ بہ نسبت دیگر زبانوں کے سندھی پہلے ہی اپنے تاریخی اور ارتقائی اعتبار سے ایک اعلیٰ سطح پر پہنچ چکی تھی؛ اسلئے فارسی کے اثر و نفوذ کے باوجود، سندھی کی انفرادیت و افادیت قائم رہی۔ مقامی طور پر سندھ میں، فارسی اور سندھی کے مابین عمل اور ردعمل کا سلسلہ شروع ہوا، جس وجہ سے سندھی کی اہمیت میں اضافہ ہوا، سندھی اور فارسی الفاظ و اصطلاحات کا باہمی تبادلہ ہوا، اور فارسی عبارات اور ادب کا ایک دوسرے سے میل ہوا۔ سندھ کے سماع اور راگ کے سلسلے، جو اس سے پہلے والے دور میں پنجاب اور دہلی تک اثر انداز ہوچکے تھے، وہ اس دور میں مزید وسیع ہوئے، بلکہ عروج کو پہنچے۔ سندھی 'اشعار' اور 'قوافی' کے علاوہ سندھی نغمات اور راگوں کا اثر مشرق خواہ شمال ہندوستان (برہانپور، دہلی، آگرہ) تک پہنچا، جسکی وجہ سے زبان کی ثقافت کا دائرہ مزید وسیع ہوا؛ جنوب کی طرف سندھی زبان کاٹھیاواڑ اور گجرات تک پہنچی اور سندھی الفاظ گجراتی زبان میں رائج ہوئے۔ اس دور میں سندھی - سرائیکی کا ملاپ ہوا، نیز سندھی اور ہندی کی ادبی آشنائی کیلئے راہ ہموار ہوئی۔

سندھ میں سندھی زبان کی اپنے علاقے اور مقامی ماحول میں بعض اہم سماجی، اخلاقی اور علمی ضرورتوں کی تکمیل کیلئے سندھی 'زبان' کے مطالعے کی طرف خاص توجہ ہوئی۔ ایک طرف دینی

علماء نے سندھی مسلم عوام کی موت،شادی بیاہ،قسم ناموں،طلاق ناموں،دلی مدعاؤں اور اظہارِ عقیدہ کے مسائل کو سمجھنے سمجھانے کی خاطر سندھی میں رسمی طور پر استعمال ہونے والے الفاظ و اصطلاحات کو فقہی طور پر پڑھنا اور پرکھنا شروع کیا تو دوسری طرف سندھ کے صوفی بزرگوں اور درویشوں نے اپنے سندھی شاعری کے ذریعے عوام کی روحانی اصلاح اور اخلاقی تربیت کے سلسلہ کو فروغ دیا۔

اس باب میں درج بالا ان رجحانات اور سلسلوں پر روشنی ڈالی جائیگی جو اُس دور میں سندھی کی لغوی اور ادبی اہمیت،جغرافیائی وسعت، اور سندھی شاعری کے مستند ذخیرہ اور سندھی زبان کے تحریری سرمائے کی ترقی اور اس میں اضافے کیلیے کار آمد ثابت ہوئے۔

فارسی اور سندھی کا بڑھتا ہوا تعلق:

یہ دور پورے ہندوستان میں فارسی زبان کی وسعت اور فوقیت کا دور تھا۔اس دور میں فارسی کا ادبی،ثقافتی اور تحریری سرمایہ اپنے عروج کو پہنچا۔مغلیہ سلطنت میں فارسی شعر و ادب کا بڑے شوق سے مطالعہ شروع ہوااور ہر صوبے نے اسکی وسعت اور اضافے میں بھرپور حصہ لیا۔سندھ کے عالموں،ادیبوں اور شاعروں نے بھی اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کی بدولت فارسی کے علمی اور ادبی سرمائے میں اضافہ کے لیے نمایاں کارنامہ سرانجام دیا؛فارسی زبان و ادب کے مطالعہ ،شعر و شاعری اور تصنیف و تالیف میں سندھ کے علماء اور شعراء نے بڑا نام پیدا کیا۔اسکے علاوہ اس دور میں سندھی زبان بھی اپنے تاریخی ارتقاء کے مطابق ہر لحاظ سے ایسی منزل پر پہنچ چکی تھی کہ باوجود فارسی کے اثر ونفوذ اور افادیت کے، سندھ میں سندھی کی اپنی حیثیت اور افادیت کم ہونے کے بجائے مزید بڑھنے لگی۔ادبی اور لسانی لحاظ سے فارسی اور سندھی کا باہمی عمل اور ردعمل شروع ہوا:سندھ کے بارے میں فارسی زبان میں کتابیں لکھی گئیں؛سندھ کے افسانوی موضوعات اور سندھ کا مقامی ماحول فارسی شاعری اور ادب کا حصہ بنے؛سندھی الفاظ فارسی عبارات میں استعمال ہونے لگے، بلکہ فارسی تصنیفات میں سندھی اشعار اور عبارتوں کے پیوند بھی لگے۔

(الف) سندھ کے تاریخی اور ادبی مواد کا فارسی نثر اور نظم میں ظاہر ہونا:

آٹھویں صدی ہجری (چودھویں صدی عیسوی) ،سمہ دور حکومت میں سندھ میں فارسی کا استعمال بڑھنے لگا۔ارغون۔ترخان دور میں سرکاری دفاتر اور دستاویزات کے علاوہ تعلیمی نظام بھی باقاعدہ طور پر فارسی میں شروع ہوا۔مغل دور میں یہ سلسلہ مزید وسیع اور مستحکم ہوا۔ اسی دور میں سندھ کے متعلق، خصوصًا سندھ کی تاریخ اور سوانح کے سلسلہ میں فارسی کتابیں لکھی گئیں۔میر معصوم کی 'تاریخ سندھ'،میر طاہر محمد نسیانی کی 'تاریخ شہر ٹھٹہ' یعنی تاریخ طاہری، ادراکی بیگلاری کا

'بیگلارنامہ'، یوسف میرک کی 'مظہر شاہجہانی'، سید عبدالقادر کی 'حدیقۃ الاولیاء'، 'تذکرۃ المراذ' اور 'تحفۃ الطاہرین' وغیرہ معلوم و مشہور ہیں۔ دوسری طرف فارسی کے علمی، تعلیمی اور ادبی رجحانات کا سندھی کی ادبی روایت و لغت پر اثر پڑا۔ چونکہ اس دور میں سندھی کی اپنی انفرادیت قائم ہوچکی تھی، اس لئے خاص طور پر سندھ میں سندھ کی ادبی اور ثقافتی روایت اور سندھی لغت کا اثر فارسی تحریروں اور تصنیفوں پر پڑنا شروع ہوا؛ سندھ کے حالات و حکایات خواہ افسانے اور داستانیں فارسی نثر اور نظم میں قلمبند کی گئیں، نیز سندھی الفاظ و اصطلاحات کو فارسی تحریروں میں استعمال کیا گیا۔

دسویں صدی ہجری (سولھویں صدی عیسوی) میں جب ترخانوں نے سندھ کو ہمیشہ کیلئے اپنا وطن بنایا تو انہوں نے سندھ کی ادبی روایت کو فارسی میں منتقل کرنا شروع کیا۔ شاہ قاسم خان (شاہ زمان) کے بیٹے میر ابو القاسم سلطان نے لیلاں۔ چنیسر کی داستان کو شاعر 'ادارکی بیگلاری' سے فارسی مثنوی میں منظوم کروایا۔ جسے ''چنیسر نامہ'' نام دیا گیا۔ اسکے بعد مغل دور میں یہ سلسلہ مزید بڑھا: عمر۔ مارئی کے قصہ کو دہلی میں اکبر بادشاہ کے سامنے گایا گیا؛ ٹھٹہ کے شاعر مقیم نے مومل۔ میندھرہ کی داستان کو فارسی میں منظوم کیا اور میر محمد معصوم نے سسئی - پنہوں کی داستان کو مثنوی 'حسن و ناز' میں بیان کیا؛ میر طاہر محمد نسیانی نے لیلاں۔ چنیسر کے قصہ کو 'ناز و نیاز' کے عنوان سے فارسی نثر میں بیان کیا، نیز دیگر قصوں مثلاً سیف الملوک، عمر سومرو اور گنگا، عمر مارئی، اور دودو سومرو اور سلطان علاؤالدین کے قصہ کو اپنی تاریخ میں مختصر طور پر بیان کیا(۱)۔

(ب) سندھی الفاظ و اصطلاحات کا فارسی عبارات میں استعمال:

سندھ کی ادبی روایت سے نہ صرف سندھی افسانے اور داستانیں فارسی نظم اور نثر میں قلمبند ہوئیں بلکہ ان کے ساتھ سندھی الفاظ بھی مقامی فارسی تصانیف میں زیر بحث آئے: سندھی جملے اور عبارات فارسی تحریروں میں مستعمل ہونے لگے، جن میں سے کچھ کے معنی و مفہوم کی وضاحت کی گئی۔ اس قسم کی تصانیف کی نمایاں مثال وہ تاریخی کتابیں ہیں جو گیارھویں صدی ہجری (سولھویں صدی عیسوی) میں تصنیف ہوئیں: خاص طور پر میر طاہر محمد نسیانی کی ۱۰۳۰ھ (۱۶۲۱ع) میں تصنیف کردہ تاریخ طاہری؛ نیز اسی کے لگ بھگ ''ادراکی بیگلاری'' کا 'بیگلارنامہ' جو شاہ قاسم خان بیگلار کی سوانح حیات پر مشتمل ہے۔ مگر اسکے ساتھ اس دور کے کچھ تاریخی واقعات بھی اسمیں تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ میر طاہر محمد ٹھٹھ کے سادات خاندان سے تھے اور پیدائشی طور پر سندھ کے تھے

(۱) دیکھیے راقم کی تصحیح اور تشریح کے ساتھ شائع کردہ سید طاہر محمد نسیانی ٹھٹوی کی ''تاریخ بلدہ ٹھٹہ المعروف بہ تاریخ طاہری'' سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد سندھ، ۱۳۸۴ھ/۱۹۶۴ء ص ۳۲-۵۰

ان کی مادری زبان بھی سندھی تھی۔ دوسری طرف ''ادرا کی بیگلاری'' خاندان بیگلار سے وابستہ تھے جو تقریباً ایک صدی قبل دسویں صدی ہجری میں سندھ میں آیا تھا۔ ممکن ہے کہ ''ادرا کی'' سندھ ہی میں پیدا ہوا ہو یا بالکل چھوٹی عمر میں یہاں آیا ہو: بہرحال اس نے زندگی کا معتدبہ عرصہ سندھ ہی میں بسر کیا۔ میر طاہر محمد خواہ ادارکی دونوں فارسی زبان کے ادیب و شاعر تھے اور انھوں نے اپنی کتابیں بھی فارسی میں لکھیں۔ مگر اس دور میں سندھی ثقافت اور سندھی لغات کی اہمیت کا یہ اثر ہوا کہ انہوں نے اپنی تاریخی کتابوں میں سندھ کی ادبی روایات کا تذکرہ کیا اور اسکے ساتھ اپنی فارسی عبارات میں سندھی الفاظ اور جملے استعمال کیے نیز بعض الفاظ کے معنیٰ فارسی میں لکھے۔

۱- تاریخ معصومی: فارسی متن صفحہ ۳۱۸ (مرتب کردہ مرحوم ڈاکٹر داؤدپوتہ) : کن کوت (کھن کھوت) = ڪڻ ڳوت، دائيبندي (کن گوت = دانہ بندی)

۲- تاریخ طاہری میں سندھی الفاظ: ان الفاظ میں سے کچھ کے معنیٰ بھی سمجھائے گئے مثلاً (۱):

نار (صفحہ ۱۱۲،۲۷): ٹھٹہ کی زبان (سندھی) میں باریک 'نالے' کو کہتے ہیں۔

رین (= رڻ صفحہ ۴۲، ۶۷، ۱۰۲): یعنی فارسی میں 'چول' (بیاباں)

ماہ سقرو جمعو (ماہ پھر و جمعہ) (۵۲): یعنی مہینے کا پہلا جمعہ

ماہ سقرو سومار (ماہ پھر و سوموار) (۵۳): یعنی مہینے کا پہلا پیر کا دن

خان واہ (۵۸): 'واہ' یعنی 'نالہ آب' (= پانی کی چھوٹی نہر)

درج ذیل دیگر سندھی یا سندھی میں مستعمل الفاظ، فارسی عبارات میں لائے گئے:

چرخہ (۳۰) = چرخو

تکہ ، تیکہ (۳۲،۴۴) = تڪو۔ (ٹکو = نشان، زیور)۔ محسوس ہوتا ہے کہ اصل لفظ 'تیلہ' تھا جسے کاتبوں نے غلطی سے 'تکہ' یا 'تیکہ' کر کے لکھا، 'تیلہ' یعنی 'ٹیلہ' بمعنیٰ 'ٹیلو' (۲) صاحب تیکہ (۲۴۰): صاحب ٹیکہ یا صاحبِ نشان۔ اگر اصل میں 'صاحب تیلہ' ہو تو پھر 'صاحب ٹیلا' یا 'ٹیلے کا مالک'۔ یہ سب سے بڑے گدی نشین سردار یا حاکم کا لقب تھا۔ کگرالہ کا 'جام ہالہ'، 'صاحب ٹیلا' تھا۔

---

(۱) الفاظ کے سامنے لکھا ہوا عدد 'تاریخ طاہری' کے مطبوعہ فارسی متن کے صفحات کو ظاہر کرتا ہے۔ (فارسی متن راقم کا مرتب کردہ اور سندھی ادبی بورڈ کا شائع شدہ ہے)

کیرو (کھیرو) (۵۴): 'کیرہ' 'کھیرہ' (ایک تالاب کا سندھی نام یعنی 'تالاب شیریں' (= دودھ کی طرح میٹھا تالاب)

(۲) (ٹیلو = تخت، مسند، رعب، تجمل۔ مترجم)

کٹاری (۶۴) = ڪٽاري (کٹاری)

برچي (برچی) (۶۴) = ٻڇي (برچھی)

جري بوتي (۶۸) جڑی بوٹی

سوا لک (سوا لکھ) (۷۰) = 'سوالاکھ' (کا عطیہ جو کہ لاکھو دیتا تھا)

چوڪي (۷۶، ۸۰، ۱۱۲، ۲۴۵) = سرکاری طور پر مقرر کردہ پہرہ

پهرہ (۷۶) = پہرہ

ڪاڇھي (۱۰۲) = کاچھی، یعنی علاقہء کچھ کے

دٻو (۱۰۸، ۲۵۷) = ڈبہ، کنستر

جھروکہ (۱۱۸) = جھروڪو (جھروکہ) (جہاں پر حاکم بیٹھ کر رعیت کا سلام لیتا تھا)

سڪرتوت (۱۲۶) = 'شکرتوت' معنی عام بازاری آدمی

رين (۱۲۷، فارسی لفظ 'جوئبار' کے ساتھ لایا گیا ہے) = 'ریݨ' چھلیلی نہر سے پہلے قدرے نیچے کی طرف دریا کی ایک اہم خودرو نہر کا منبع

دوندي (۱۲۹) = ڈونڈی (کشتی کی ایک قسم)

لاهرہ (۱۳۰) = لہرو یا لاہری (کشتی کی قسم)

لَتہ (۳۷) = لتو (کاغذ یا کسی دوسری چیز سے بنا ہوا گول تکا جو بندوق بھرنے یا کسی اور سوراخ بند کرنے کیلئے استعمال ہو)

ناپہ (۱۴۴) = ''ٹھٹہ علاقہ کی زبان میں 'تخم نیلوفر' کو کہتے ہیں'' اصل معنی اسی طرح لکھا ہوا ہے۔ لیکن یہ درست نہیں۔ نیلوفر پھول میں سے ایک چھوٹا 'پھل' ہوتا ہے۔ جسکے اندرونی گودے کو 'مٹھال کا گبہ' کہتے ہیں؛ دوسرا 'گلِ نیلوفر' جس سے ایک بڑا سا کُم (کنول گٹہ کی جڑ) پیدا ہوتا ہے۔ جسکے گندھے ہوئے دانوں کے گودے کو 'ناپو' کہتے ہیں۔

هوم (۱۵۹) = ہندوؤں کا 'ہَون' (۱)

لاکو (لاکھو) (۱۸۸) بخت آور، عمدہ سندھی لقب (جو اکبر بادشاہ کیلئے استعمال ہوا ہے)

گھري (۲۰۶) = گھڑی (وقت کا ایک مقرر حصہ)

پهر (۲۰۶) = پہر (وقت کا ایک مقرر حصہ)

توبرہ (۲۲۳) = توبڑا، توبڑہ (گھوڑے کو اناج کھلانے کا تھیلا)

کھت (۲۴۶) = کھٹ = چارپائی

(۱) آگ کی پوجا، ہندوؤں کی ایک خاص عبادت، جسمیں منتر پڑھتے ہوئے آگ میں گھی ڈالا جاتا ہے۔ دیکھیئے فیروز اللغات اردو، ص:۱۴۵۸ (مترجم)

گات (۲۴۷)= گھاٹ

۳-بیگلارنامہ میں(۱) درج ذیل سندھی الفاظ یا نام فارسی عبارات میں لائے گئے ہیں:

رانا (۷۰) راڻو=رانا

رانائي (۶۹)=رانا،ٹھاکر ہونا (لقب)

گوني (۱۰۵،۱۳۷)=گوڻي 'گونی غلہ'=اناج کی بوری

لاهره (۱۰۶،۱۱۰،۱۱۳-۱۱۵) مرزا محمد باقی کی 'لاہرہ' کشتی

لور (۱۲۰-۱۲۱)=لوڑھ کنول بِکھا کی جڑ(۲)

جواري (۱۲۰)=جُوار (اناج کی قسم)

رين (۱۲۶)= رین دریا پھلیلی نہر سے پہلے قدرے نیچے کی طرف دریا کی ایک اہم خود رو نہر کا منبع

توبره (۱۳۸)=توبڑا،توبڑہ (گھوڑے کو اناج کھلانے کا تھیلا)

مرگھہ (۱۳۸،۱۶۰،۱۸۸) گھوڑے کا نام

جونجار (۱۵۹)= جھونجھار (بہادر،سورما،بہادری کا لقب)

وير (۱۶۷)= ئیر (بدلہ،خون وغیرہ کا)

کبوتر (۱۹۳)=ڪبوتر،گھوڑے کا نام

دونده (۲۰۰)= ڈونڈی (کشتی کی قسم)

طراز (۲۰۱)=تراز (کشتی کی قسم)

کیداره (۲۱۶)= 'کیڈارو' (گھوڑے کا نام،یعنی 'جنگ' یا 'جنگی'

لک سوا لک(۲۲۲)=لاکھ سوا لاکھ

بهت، چارن (۲۲۲)=بَھٹ، چارن (بھانڈ،گویا)

لار (۲۳۴)=لاڑ (سندھ کے پانچ طبعی خطوں میں سے ایک خطہ کا نام،جو سندھ کا جنوبی حصہ ہے اور نشیبی علاقہ ہے۔جنوب)

تويه (۲۷۰)=ٹویو(پانچ سیر اناج ناپنے کا ایک برتن)

کاسه (۲۷۰) = کاسو (غلہ بھرنے کا ایک پیمانہ،خروار کا ساٹھواں حصہ،تقریباً سولہ سیر کا ہوتا ہے)

---

(۱) راقم کی تصحیح سے شائع کردہ سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد سندھ ۱۳۹۱ھ/۱۹۷۱ء

(۲) اگر 'ڑ' پر زیر ہو تو اسکے معنی ہیں وہ لاٹھی جسکے سرے پر آہنی کڑے لگے ہوئے ہوں، اور اگر 'ڑ' پر پیش ہو تو اسکے معنی ہیں لاش، جنازہ، قبر نیز کنول کا پھل جو ترکاری کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ازانسواء مچھلی کی ایک خاص قسم کو بھی کہتے ہیں۔(مترجم)

۴- مظہر شاہجہانی میں درج ذیل سندھی الفاظ فارسی عبارت میں لائے گئے ہیں:

کن کوت (کھن کھوت)= ڳڻ ڳوت یا کٹ- ڳوت اور دانہ بندی (ایک بیگہ پر پانچ من)

ماري (٦٠)=ماڑی (مکان کی اوپر والی منزل، کوٹھا)

گانہ (٦٠)=گھاڻہ، گھاڻو (گھانہ، گھانو = کولھو)

مد (٦٩)=مڏ (لادنے کا سامان، اسباب کا ڈھیر)

جپر (٦٩)=چھپر

تر (٦٩)=تر، تُرہو (گھاس پھوس اور لکڑیوں سے بنایا ہوا چھپر جس سے کشتی کا کام لیا جائے، لٹھوں کا ٹھاٹھ جو کشتی کا کام دیتا ہے)

کم و لور (٧٠)= کُم اور لوڑھ (نیلوفر یا کنول مٹہ کی جڑ اور ایک خاص قسم کی مچھلی)

بہ (٧٠)=بھُ (ایک قسم کی ترکاری۔ کنول کے پودے کی سوراخ دار جڑ)

بد (٧١)=ٻِڊ (ایک قسم کی گھاس جو جھیلوں میں ہوتی ہے)

دیر (٧١)= ڏیر گاہ (ایک قسم کی گھاس جو پانی میں ہوتی ہے)

گورا، کارا (٨٧)= گورے اور کالے

کاسہ (١٨٢)=غلہ بھرنے کا ایک پیمانہ، خروار کا ساٹھواں حصہ

تویہ (١٨٢)=ٹویو (پانچ سیر اناج ناپنے کا ایک برتن)

شیھہ (٢١٢)=شينهن (شیر)

- اسم معرفہ

دیراؤں (٥٧)=ڏیرائون (ڈیریجہ قوم والوں کا علاقہ)؟

دنی پیایہ □=ڏني پسايو (دھنی پیایو- آدمی کا نام)

گرنگ □= گڑنگ (بہت بڑا، عظیم، بھاری، وزنی)

جاکلہ = چاگلہ

کاجہ=کاچہ، کاچو (کاچهہ، کاچھو)

(ج) سندھی اشعار کا فارسی میں ترجمہ ہونا:

اکبر اور جہانگیر کے دور میں تقریباً ۹۹۸-۱۰۲۲ھ (۱۵۹۰-۱۶۱۳ع) کے درمیان محمد غوثی گجراتی مانڈوی نے، قاضی قادن کے کچھ اشعار کا فارسی میں ترجمہ کیا، جنہیں قاضی قادن کی سوانح کے ساتھ انہوں نے اپنی کتاب 'گلزار ابرار' میں شامل کیا۔ محمد غوثی سنہ ۹۹۰ھ/۱۵۸۲ع میں گجرات گئے اور وہاں کے مشہور عالم وجیہ الدین گجراتی کے پاس تعلیم حاصل کی۔ چنانچہ انہوں نے گجرات

میں بزرگانِ سندھ کے حالات و واقعات بھی سنے ہوں گے۔لیکن انہیں اس سلسلے میں مزید معلومات اس وقت حاصل ہوئیں جب وہ گجرات سے برہانپور پہنچے جہاں پر حکیم عثمان بن عیسیٰ سندھی(۱) سے علم ریاضی کی تعلیم حاصل کی۔برہانپور اور اسکے آس پاس اس وقت سندھی علماء اور بزرگوں کا بڑا اثر و رسوخ اور نام تھا،اور انہوں نے اس وقت تک یقیناً سندھ اور سندھی زبان سے اپنا موروثی رشتہ برقرار رکھا ہوگا۔محمد غوثی سنہ ۹۹۴ھ/۱۵۸۶ء تک وہاں رہے اور اس عرصے میں انہوں نے درویش لدھو (لاڈ) سندھی سے سندھ کا مقبول عام راگ 'کافیاں' سنیں،جس کا ذکر انہوں نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔اسکے علاوہ توحید و تصوف کے خیالات پر مشتمل قاضی قادن کے اشعار بھی وہاں کے سندھی بزرگوں سے معنی سمیت سنے،جن سے وہ اس قدر متاثر ہوئے کہ قاضی قادن کی بزرگی اور درویشی کے تذکرہ کے ساتھ ان کے چار سندھی اشعار کا فارسی میں ترجمہ بھی درج کیا۔ان کی کتاب 'گلزار ابرار' فارسی میں ہے جو ابھی تک شائع نہیں ہوئی، البتہ اس کا اردو ترجمہ سنہ ۱۳۳۶ھ میں 'اذکار ابرار' کے نام سے آگرہ سے شائع ہوا ہے جس میں قاضی قادن کے ان اشعار کا اردو ترجمہ موجود ہے۔جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں سے تین اشعار تو وہی ہیں جنہیں تقریباً اُسی دور میں شاہ کریم نے بھی اپنی مجالس میں پڑھا اور بیان کیا،البتہ چوتھا شعر

---

(۱) شیخ فاضل علامہ عثمان بن عیسیٰ بن ابراہیم صدیقی بوبکانی سندھی برہانپوری، سیوہن سے چھ میل مغرب میں 'بوبک' نامی گاؤں میں پیدا ہوئے۔آپ مخدوم عبدالکریم میران ابن علامہ یعقوب بوبکانی کے تلامذہٗ ارشد سے تھے۔ ازانسواء آپ مولانا وجیہہ الدین علوی سے علومِ تصوف کا درس لیتے رہے، فقہ، اصول اور عربی قاضی محمود مورپی اور منطق و حکمت شیخ حسین بغدادی کے پاس پڑھی۔ سنہ ۹۸۳ھ میں آپ برہانپور تشریف لے گئے تو بادشاہِ وقت محمد شاہ ابن مبارک شاہ فاروقی نے آپ کو درس اور فتویٰ نویسی کے اعلیٰ منصب پر مامور فرمایا اور برہانپور سے باہر زرخیز اراضی کا ایک موضع آپ کے نام کردیا۔۹۸۳ھ سے ۱۰۰۸ھ تک آپ درس و تدریس فتویٰ نویسی اور تصنیف و تالیف میں مصروف رہے۔آپ کے شاگردوں میں بلند پایہ محدثین و مفسرین، یگانۂ آفاق مشائخ اور اہلِ تصانیف کی اکثریت ہے۔جن میں سے شیخ محمد غوثی، قاضی نصیر الدین بن شیخ سراج محمد بنانی، شیخ صالح سندھی، مختصر الوقایہ کے شارح اور عادل شاہ فاروقی ۹۸۴ - ۱۰۰۵ھ کے عہد میں برہانپور کی مسند قضا پر متمکن قاضی عبدالسلام سندھی اور حضرت شیخ یوسف بنگالی کے شاگرد اور داماد شیخ شکھ جی اور مسیح الاولیاء شیخ عیسیٰ جُند اللہ برہانپوری وغیرہ بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔آپ کی تصانیف میں سے تفسیرِ بیضاوی کا حاشیہ اور صحیح بخاری کی شرح بہت مفید کتابیں ہیں۔

اکبر بادشاہ نے خاندیس کی تسخیر کے لیے برہانپور اور قلعۂ آسیر کے اطراف اپنی افواج پھیلادیں، اُن دنوں آپ اپنی جاگیری موضع پر گئے ہوئے تھے، اس شورش کی وجہ سے آپ برہانپور واپس نہ آسکے اور اپنے موضع ہی میں مقیم رہے۔ چونکہ اس وقت ملکی نظام معطل ہو چکا تھا۔ اس نواح کے رہزنی پیشہ کولیوں نے مسلح ہوکر اس موضع پر تاخت کی اور مال و متاع لوٹ کر ماہ شعبان سنہ ۱۰۰۸ھ میں آپ کو اپنے سترہ ساتھیوں سمیت شہید کر ڈالا۔ دیکھیے:

۱) 'برہانپور کے سندھی اولیاء' ص: ۲۱۶-۲۲۱ مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ، جامشورو، طبع دوم ۱۹۸۷ء

۱۱) 'نزهة الخواطر' جلد پنجم، ص: ۲۹۳-۲۹۴ تصنیف سید عبدالحی حسنی، مطبوعہ طیب اکیڈمی، ملتان، ۱۴۱۲ھ/۱۹۹۲ء

۱۱۱) مقدمہ، المتانة فی المرمة عن الخزانة، ص ۳-۴، حاشیہ نمبر۲، از علامہ غلام مصطفیٰ قاسمی، مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ، کراچی، طبع اول ۱۳۸۱ھ-۱۹۶۲ء (مترجم)

نیا ہے، جسے گلزار ابرار کے مصنف نے درج کیا ہے۔

اصل اشعار اور ان کا ترجمہ ذیل میں دیا جاتا ہے۔

۱۔[کنز اور قدوری پڑھنے سے معرفت کی مہک ذرہ برابر بھی حاصل نہیں ہوئی اور حصول مطلب جو ہوا تو اس عالم کے پردے ہوا۔]

اصل شعر:

کنز قدوري، ڪافيا، ڪِيْ ڪونہ پڙھئوم
سو پار ٺي ڪو ٻئو جٺان پرين لڌوم

۲۔['لا' کس کو نفی کرتا ہے، جب ماسوائے حق، ہستی ہی نہیں رکھتا۔]

اصل شعر:

'لا' لاھيندي ڪن ڪي، 'لا' مورھين ناہ
بالله ري پرياہ، ڪَٿُ نہ ڏسي ڪو ٻئو

۳۔[ترجمہ: ہم جس کے مشتاق ہیں، اگر غور سے دیکھا جاوے تو وہ ہم ہی ہیں۔]

اصل شعر:

سڄڻ منجھہ ھئام، سون ويٺي واءِ تيا
ھيڏان ھوڏان ھتڙا، ھيٺين جاڙ وڏام(۱)

۴۔[تمام زبانوں میں کل 'لا' سے تیری نفی کی گئی ہے اور تو ہنوز اپنے اثبات کے درپے ہے۔]

اصل شعر:

توکي توڙائين، 'لا' سين لاٿائون
اجا پڻ 'آئون' وارئو وجھين وچ ۾

محمد غوثی کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے قاضی قادن کے گہرے معانی پر مشتمل بہت سارے اشعار سنے، کیونکہ وہ کہتا ہے کہ: (قاضی قادن کے) اس قسم کے خیالات (پر مشتمل اشعار) اسقدر زیادہ ہیں کہ انہیں احاطۂ تحریر میں نہیں لایا جا سکتا۔ (دوسرا یہ کہ) ہر بیان کا حقیقی لطف اسکی اصل زبان ہی سے مخصوص ہے، اور ترجمہ میں وہ لطافت قائم نہیں رہ سکتی (۲)۔

---

(۱) 'بیان العارفین و تنبیہ الغافلین' کے مطبوعہ فارسی متن میں، پہلے مصرعہ میں لفظ 'ھُوامُ' ہے، جسے ڈاکٹر عبدالغفار سومرو صاحب نے 'ھئام' اور دوسرے مصرعہ میں 'ھیئین' کے بجائے 'ھیئن' کرکے لکھا ہے۔ دیکھیے: ڈاکٹر سومرو صاحب کی تحقیق، ترجمہ اور تشریحی حوالہ جات کے ساتھ مطبوعہ بیان العارفین و تنبیہ الغافلین، ترجمہ، ص:۵۲ اور متن ص:۷۰ (مترجم)

(۲) 'اذکار الابرار' اردو ترجمہ 'گلزار ابرار' مطبوعہ آگرہ ۱۳۲۶ھ، ص۲۵، اس کتاب کا عکس 'اسلامک فاؤنڈیشن' کی طرف سے سنہ ۱۳۹۵ھ میں لاہور سے شائع ہوا ہے۔

(د) فارسی اور سندھی کی مشترکہ عبارات پر مشتمل کتابیں تصنیف ہونا:

اس دور میں سندھی کی اہمیت اس قدر بڑھ چکی تھی کہ بعض فارسی کتابیں سندھی عبارات اور اقتباسات کے ساتھ مخلوط کر کے لکھی گئیں یہ سلسلہ کب شروع ہوا؟ اسکے متعلق یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا،لیکن غالباً گیارھویں صدی ہجری (سترھویں صدی عیسوی) سے اسکا آغاز ہوا۔بعض مخصوص کتب کے مضمون و موضوع اس بات کے متقاضی تھے کہ مزید وضاحت کی خاطر کچھ مقاصد و معانی کو سندھی زبان میں بیان کیا جائے۔اس قسم کی کتابیں سندھی مصنفین ہی نے تصنیف کیں اور ان میں سے آج تک جو کتابیں معلوم ہوئی ہیں ان میں سے 'بیان العارفین' اور 'منہاج المعرفت' قابل ذکر ہیں۔

بیان العارفین:

میاں شاہ کریم اپنی زندگی میں مختلف مواقع پر اور مجالس میں اپنے مریدین اور حاضرین مجلس کو کچھ نصیحتیں کرتے تھے۔ان عمدہ نصائح،وضاحتوں اور تشریحات کو آپ کی وفات (۱۰۳۲ھ) کے چھ سال بعد سنہ ۱۰۳۸ھ میں ان کے مرید محمد رضا ٹھٹوی نے تلاش و تفتیش کے بعد جمع کیا۔میاں شاہ کریم گفتگو تو سندھی میں کرتے تھے لیکن چونکہ اس دور میں کتابیں فارسی میں لکھی جاتی تھیں اس لیے محمد رضا نے بھی اپنے مرشد کے ملفوضات کو 'بیان العارفین' (عارفوں کا بیان) کے نام سے فارسی نثر میں لکھا۔نصائح اور تشریحات میں میاں شاہ کریم موقع بموقع اپنے اور دوسروں کے سندھی اشعار پڑھتے تھے نیز دوسروں کی طرف سے پوچھے گئے اشعار کے معانی و مطالب بھی سمجھاتے تھے۔محمد رضا نے شاہ کریم کے ان اقوال و بیانات کا فارسی میں ترجمہ کیا،مگر چونکہ سندھی اشعار کی ایک خاص اہمیت تھی اس لیے اس نے ان کے فارسی ترجمہ کے ساتھ وہ اصل سندھی اشعار بھی اصل صورت میں درج کیئے۔موجودہ معلومات کے مطابق 'بیان العارفین' پہلی کتاب ہے جو سندھی اشعار کے پیوند کے ساتھ گیارھویں صدی ہجری کے نصف اول میں فارسی نثر میں تصنیف ہوئی اور آئندہ کیلئے اس قسم کی دیگر تصنیفات کے لیئے ایک مثالی کتاب قرار پائی۔

منہاج المعرفت:

گیارھویں صدی کے آخر میں 'اگھم کوٹ' کے عالم و عارف شاہ لطف اللہ قادری نے سنہ ۱۰۸۴ھ (۱۶۷۳ع) میں تصوف و طریقت کی رموز کو سمجھانے کے لیئے ایک خاص کتاب 'منہاج المعرفت' کے نام سے لکھی۔شاہ لطف اللہ عربی و فارسی کے بڑے عالم تھے اس لیے انہوں نے اس وقت کے علمی ماحول کی مناسبت سے اپنی کتاب بھی فارسی نثر میں لکھی اور اسے بیس ابواب میں

تقسیم کیا؛ اسکے ساتھ انہوں نے 'بیان العارفین' کی طرح یہ بھی مناسب سمجھا کہ ہر باب میں کوئی ایسا سندھی شعر، ضرور شامل کیا جائے جو متعلقہ باب کے مضمون کا اہم مقصد پورا/ واضح کرتا ہو۔ اس طرح گیارھویں صدی ہجری میں لکھی گئی یہ دوسری کتاب ہے جس میں فارسی نثر اور سندھی اشعار کی آمیزش ہے۔

سندھی الفاظ، اصطلاحات اور جملوں کے معنیٰ و مقصد کو سمجھنے کی طرف توجہ:

عرب-اسلامی دور میں کم از کم چوتھی صدی ھجری (دسویں صدی عیسوی) سے- جب عربی سندھی دونوں زبانیں ساتھ ساتھ استعمال ہونے لگیں اور عربی کے ساتھ سندھی کی علمی حیثیت مسلم ہوئی - سندھ کے علماء نے دینی فرائض، شرعی احکامات، نماز اور ادعیۂ خیر کے لئے عربی کے ساتھ ہم معنیٰ عمدہ سندھی الفاظ، جملے اور عبارات استعمال کرنا شروع کیں۔ یہ سلسلہ سومرہ اور سمہ دور میں روز افزوں رہا، یہاں تک کہ ارغون۔ ترخانی دور میں سندھ کے سب سے بڑے عالم، شرعی قوانین کے عارف اور تعلیمی ماہر مخدوم جعفر بوبکائی (۱) نے طلاق کیلئے سندھی میں عام مستعمل الفاظ اور جملوں کے معنیٰ اور مقصد کا شرعی قانون کی روشنی میں جائزہ لینا شروع کیا۔ طلاق کا مسئلہ ایک سماجی مسئلہ تھا اس لیے سندھ کے علماء نے اس پر مختلف طریقوں سے غور کیا: بعض نے سخت سزا یعنی مضبوط طلاق کی تائید کی تاکہ گھریلو جھگڑے کے وقت مرد حضرات اپنی بیویوں کے لیے ایسے الفاظ استعمال ہی نہ کرسکیں۔ مگر اکثر علماء نے انسانی کمزوری کے پیش نظر غصہ کے وقت زبان سے ادا کردہ کسی لفظ یا کھائی ہوئی قسم کو 'جذباتی' تصور کیا اور 'تین مرتبہ طلاق دینے کو 'ایک ہی مرتبہ' طلاق دینے کے مساوی قرار دیا۔

(الف) طلاق کیلئے استعمال ہونے والے سندھی الفاظ واصطلاحات:

مخدوم جعفر بوبکائی نے اس موضوع پر ایک خاص کتاب "حَلُ العقود فی طلاق السنود" (اہل سندھ کے طلاق کے مسائل کا حل) نامی کتاب لکھی، اور اپنی دیگر کتابوں میں بھی (۲) انہوں نے طلاق کے لیے استعمال ہونے والی سندھی اصطلاحات، مثلاً ''چھڈی'' اور ''چھڈیم'' (چھوڑ دی، میں نے چھوڑ دی) کی وضاحت کی اور اپنی طرف سے اسکے متعلق شرعی فیصلہ عربی میں تحریر کرتے ہوئے ان سندھی الفاظ و اصطلاحات کو استعمال کیا۔ آپ نے لکھا کہ:

---

(۱) موجودہ ضلع دادو میں 'بوبک' شہر کے مشہور عالم، استاد، فقیہ مخدوم جعفر بن مخدوم میران بن یعقوب، جنہوں نے دسویں صدی ہجری (سولہویں صدی عیسوی) کے آخر میں وصال فرمایا۔

(۲) مخدوم صاحب نے اپنی کتاب "المتانة فی مرمة الخزانة" (مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ) میں بھی اس مسئلے پر روشنی ڈالی ہے۔

"ان قال لِموطوئته چھڈی، چھڈی، چھڈی أو 'چھڈیم' ثلاث مراتِ واراد بالتکریر التاسیس دون التاکید لایقع الاالواحدة"(۱)

[اگر کسی شوہر نے اپنی بیوی کیلئے کہا کہ (میں نے یہ) 'چھوڑدی، چھوڑدی، چھوڑدی' یا تین مرتبہ اس نے یہ کہا کہ "میں نے چھوڑی، میں نے چھوڑی، میں نے چھوڑی" مگر اس طرح دہرا دہرا کر کہنے سے اگر اسکا مقصد اپنی بات پر زور دینا اور اسے واضح کرنا (تاسیس) تھا، نہ کہ (طلاق دینے کی خاطر اپنے) ارادہ کو پختہ کرنا (تائید)، تو اس صورت میں یہ 'ایک طلاق' (کے اعلان کے برابر) ہوگا]۔

ازروئے شرع پختہ طلاق تب ہوگی، جب کوئی شوہر سوچ سمجھ کر ٹھنڈے دماغ سے تین مرتبہ طلاق دینے کا اعلان کرے۔مگر بعض لوگ غصہ کی وجہ سے ایک ہی سانس میں تین مرتبہ "چھڈیم، چھڈیم، چھڈیم" کہہ دیتے اور بعد میں پشیماں ہوتے تھے۔مخدوم جعفر نے مندرجہ بالا وضاحت کی کہ ایسی حالت میں یہ اعلان تین مرتبہ نہیں، بلکہ 'ایک مرتبہ' کے برابر ہوگا: یعنی کہ یہ طلاق (صریح) نہیں ہوگی، بلکہ اسے طلاق بائن، (پہلے اظہار والی طلاق) کہا جائیگا۔

مخدوم جعفر نے ایک سماجی اور نفسیاتی مشکل کو شرع کی روشنی میں عملی طور پر حل کیا تا کہ جذبات سے مغلوب ہوکر تین مرتبہ 'چھڈی' یا 'چھڈیم' کہنے سے کسی کا گھر نہ اجڑے اور خانگی زندگی تباہ نہ ہو۔

زبان اور لغت کے لحاظ سے قابل غور بات یہ ہے کہ اصل عربی لفظ 'طلاق' کے معنی ہی ہے 'چھوڑنا' اور اس زمانے میں سندھ میں بھی 'طلاق دینے' یا کسی دوسری اصطلاح کے بجائے خالص سندھی اصطلاح (چھڈن) [چھوڑ دینا یا چھوڑنا] استعمال ہوا۔سندھی الفاظ و اصطلاحات کے معنی و مفہوم پر علمی، فقہی اور شرعی بحث کی یہ ابتدا تھی جو دسویں صدی ہجری (سولھویں صدی عیسویں) میں ہوئی اور رفتہ رفتہ زیادہ وسیع ہوئی۔مخدوم جعفر کے بعد سندھی علماء مختلف موضوعات سے متعلق سندھی کے نثری فقروں، جملوں اور عبارات کو زیر بحث لائے۔ ان مباحث اور وضاحتوں کا تعلق اسکے بعد کے کلھوڑہ اور تالپور امیروں کے دور سے ہے؛ مگر جیسا کہ موضوع ایک ہی ہے، ہم اسے ذیل میں مختصرًا بیان کرتے ہیں تا کہ سندھی بیدار مغز علماء کی اپنی مادری زبان کی اصطلاحات اور عبارتوں کی طرف دی جانے والی توجہ کا اندازہ کیا جاسکے، نیز اس دور سے سندھی کے نثری فقروں کے زیر بحث آنے کی تاریخ مرتب کی جاسکے۔

(۱) مخدوم جعفر کے یہ اصل الفاظ مخدوم محمد ہاشم نے اپنی کتاب "تمام العنایة" میں اسی طرح درج کئے ہیں۔یہی عبارت مختلف بیاضوں میں نقل ہوئی ہے، اور کہیں پر ان الفاظ کو 'چھڈی'، 'چھڈی'، 'چھڈیم یا چھڈیم' کی صورت میں لکھا گیا ہے۔

مخدوم جعفر کے بعد سندھ کے دیگر علماء نے بھی اپنی تحریروں، فتاووں اور بیاضوں میں سندھی الفاظ، اصطلاحات اور عبارات پر لغت اور معنی نیز شرعی حکم کی رو سے بحث کی، اور اس طرح تقریباً دسویں صدی سے تیرھویں صدی تک کے چار سو سالہ طویل عرصے میں سندھی الفاظ و اصطلاحات، نثری فقرے اور عبارات زیر بحث رہے۔

مخدوم حامد اگھمی (۱):

مخدوم حامد، مخدوم محمد ہاشم سے پہلے اور مخدوم جعفر بوبکائی کے بعد غالباً گیارھویں صدی (کے نصف آخر؟) میں ہو گزرے ہیں۔ مخدوم حامد پہلے فقیہ و عالم تھے جنھوں نے مخدوم جعفر سے اختلاف کیا۔ ان کے فتوی کے مطابق اگر کسی شخص نے شریعت کی 'بڑی قسم' کھائی تو وہ تین مرتبہ طلاق کے مساوی ہوگا نیز اگر اس نے تین مرتبہ سخن (وعدہ، عہد، قول اور اقرار) کیا تو وہ بھی 'طلاق صریح' کے برابر ہوگا (۲)۔

اس سلسلے میں مخدوم حامد اپنے ایک خاص ''رسالہ'' اور دیگر تحریروں میں درج ذیل سندھی الفاظ اور جملوں کو زیر بحث لائے:

۱- اگر غصہ میں کسی نے اپنے بیٹے سے کہا کہ:

تَکَرَ ماٹہِ کي طلاق آهي (۳)

(تکَر ماڑِنہہ کھے طلاق آہے)

[اصل رسم الخط: 'تکَرُ مَانِہ کھے طلاق آھے']

(گویا کہ تیری ماں کو طلاق ہے)

اس جملے میں مخدوم حامد نے لفظ 'تکر' کے معنی بتاتے ہوئے کہا کہ: لفظ 'تکر' سندھی زبان میں عربی لفظ 'کَاَنَّ' (= گویا کہ) کے مساوی ہے۔

۲- کچھ لوگ قسم اٹھاتے وقت لفظ 'طلاقوں' (یعنی طلاقیں) (اصل لفظ: طلاقُن) استعمال

---

(۱) مخدوم حامد 'اگھم کوٹ' کے تھے، جس وجہ سے کبھی کبھار انہیں ''ساکن قلعہ اگھم'' لکھا گیا ہے۔ ''قلعہ اگھم'' یا 'اگھم کوٹ' کو آج کل ''اگھا مانو'' کہا جاتا ہے۔ اس تاریخی شہر کے آثار موجود ہیں جن میں شاہی جامع مسجد کی سنگی دیواریں اور مخدوم محمد اسماعیل سومرہ کا مزار قابل ذکر ہیں۔

(واضح ہو کہ ''اگھم کوٹ یا اگھا مانو'' حیدرآباد سے تیس میل جنوب مشرق کی طرف واقع تھا، جسے ''اگھم لوہانہ'' نے تعمیر کروایا تھا۔ دیکھیے: تعلیقات معصومی فارسی ص ۳۱۴ بحوالہ تاریخ سندھ حصہ دوم صہ ۴۴ حاشیہ نمبر ا۔

''قدیم سنڌ، ان جا مشهور شهر ۽ ماڳ'' طبع سوم، ص: ۸۸ (مترجم)

(۲) ''اگر مردے از اہل ایں دیار گفت کہ سوگند کلان است اگر فلان کار کنم۔ بعد فعل امر محلوف علیہ زوجہ او بہ سہ طلاق مطلق گردد'' (مخدوم حامد اگھمی)

(۳) ماخوذ از بیاض منسوب بمخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی۔ جو کہ سندھ یونیورسٹی کی لائبریری میں محفوظ ہے۔

کرتے تھے جیسا کہ: تجھے طلاقیں ہوں؛ مخدوم حامد نے سمجھایا کہ:

سندھیوں کی اصطلاح میں لفظ 'طلاقیں' دو خواہ جمع (کے عدد) کے معنی میں آتا ہے (اس لیے لفظ 'طلاقیں' کہنے سے لازمی طور پر تین، عدد مراد نہیں لیے جائینگے)۔

مخدوم رحمت اللہ ٹھٹوی:

اگر کسی شخص نے بیوی سے لڑائی کے وقت غصہ میں آکر تین مرتبہ کہا کہ: توکي ڇڏئم، توکي ڇڏئم، توکي ڇڏئم (توکے چھڈیم توکے چھڈیم توکے چھڈیم = تجھے میں نے چھوڑ دیا، تجھے میں نے چھوڑ دیا، تجھے میں نے چھوڑ دیا) (۱) [اصل رسم الخط یوں ہے: توکي چھڈئم توکي چھڈئم توکي چھڈئم] ایسی صورت میں تین طلاقیں ہونگی یا ایک؟ مخدوم رحمت اللہ ٹھٹوی نے اسکا یہ جواب دیا کہ یہ تین طلاقیں ہوئیں اور طلاق صریح ہوگئی۔

حافظ احمد:

انہوں نے اپنی تحریر میں یوں وضاحت کی کہ: لفظ 'چھڈ ی' (اصل: چھڈی) سندھ کے کچھ علماء کی رائے کے مطابق 'طلاق صریح' کے برابر ہے، مگر اکثر علماء کے فتوی کے مطابق ایک 'طلاق بائن' کے برابر ہے، جیسا کہ (مخدوم جعفر بوبکائی کی کتاب) 'حل العقود' میں ہے۔ البتہ ٹھٹہ کے علماء اور فضلاء کا معمول اس طرح ہے کہ: اگر کوئی شخص ایک مرتبہ 'چھڈ ی' کہے تو اسے انو سر تو نکاح کرنا پڑیگا، اور اگر تین مرتبہ ('چھڈ ی') کہے تو پھر طلاق صریح ہوگئی۔

مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی (وفات ۱۱۷۴ھ/۱۷۶۰ھ):

مخدوم صاحب نے اس مسئلے سے متعلق ایک تفصیلی رسالہ لکھا (۲) اور دیگر تحریروں میں بھی اسے واضح کیا۔ مخدوم صاحب نے اپنے رسالہ میں یہ سوال اٹھایا کہ: اگر کوئی سندھ کا باشندہ اپنی بیوی سے تین مرتبہ کہے کہ: مون فلاڻي ڇڏي (میں نے فلاں عورت چھوڑی) [اصل رسم الخط: من فلاني چھڈي] تو اس صورت میں کیا لازم آئیگا؟ آپ نے اسکا جواب یوں دیا کہ: سارا دارومدار کہنے والے کی نیت اور ارادہ پر ہے۔ اگر اس کی نیت تین طلاقوں کی تھی تو یہ صریح طلاق ہوئی اور اگر اسکی ایسی نیت نہ تھی تو پھر ایک 'طلاق بائن' ہوگی۔ یہ اس لئے کہ لفظ 'چھڈ ی' ایک 'کنایہ' ہے اور 'طلاق بائن' کے برابر ہے۔ (کتاب "تمام العنایة")۔

سنہ ۱۱۵۶ھ (۱۷۴۳ء) میں مخدوم محمد ہاشم کی ایک تحریر میں بھی ان الفاظ پر بحث کی گئی

---

(۱) سندھ یونیورسٹی کی لائبریری میں محفوظ 'بیاض' سے اخذ کردہ، سید علی محمد شاہ (وفات ۱۹ محرم ۱۲۸۷ھ ۱۸۷۰ء) دائرہ والے نے اپنی "بیاض سندھی" میں مخدوم رحمت اللہ کی خود نوشتہ تحریر سے عبارت نقل کی ہے جسمیں سندھی الفاظ کا رسم الخط توکي ڇڏئم (توکے چھڈیم) ہے۔

(۲) اس رسالے کا نام "تمام الغاية فی الفرق بین الصریح والطلاق بالکنایة" ہے۔

ہے۔اس وقت سوال یہ کیا گیا تھا کہ سندھی مسلمانوں میں سے اگر کوئی شخص اپنی بیوی کے لئے تین مرتبہ کہے کہ:''میں نے فلاں چھوڑ دی، میں نے فلاں چھوڑ دی، میں نے فلاں چھوڑ دی'' [اصل الفاظ تحریر میں یوں ہیں :من فلاني چهڏي من فلاني چهڏي من فلاني چهڏي] تو اس حالت میں اس پر کیا لازم آئے گا؟ مخدوم صاحب نے جواب میں فرمایا کہ:اگر اس نے تین طلاق کی نیت کی تو طلاق پختہ ہوگئی اور عورت دوسرے سے نکاح کر لیگی۔لیکن اگر اس نے کسی بھی مرتبہ پر (یعنی یہ لفظ کہتے وقت) ایسی نیت نہیں کی تو پھر طلاق بائن واقع ہوئی اور از سرِنو نکاح پڑھا جائیگا۔یہ اس لئے کہ: سندھی زبان میں کنایات (الفاظ کے معنوی اشارات) کو'عربی کے کنایات' کی طرح ہی فیصل کرنا پڑے گا۔ سندھیوں کی زبان میں لفظ 'چھڈی' [اصل:چهڏي] 'کنایہ' ہے، صریح (واضح معنی والا) لفظ نہیں۔سندھی زبان میں اس قسم کی دوسری کئی مثالیں موجود ہیں(۱)۔

مخدوم غلام محمد اور مولوی عبدالرحیم:

انہوں نے بھی ایک شخص اسماعیل کے درج ذیل الفاظ پر فیصلہ دیا۔اسماعیل نے اپنی بیوی کو غصہ سے کہا تھا کہ:

'توکي طلاقڻ ڦٽوکيم'(۲)

(توکھے طلاقنڑ پھٹو کیُمْ')

[یعنی مُطَلَّقہ! میں نے تجھے چھوڑ دیا۔]

(ب) سندھی میں قسم کھانے کی صورت میں طلاق کا فیصلہ:

بعض لوگ قسم کھالیتے تھے،جس وجہ سے ناچاقی پیدا ہوتی تھی جسے روکنے کے لئے ابتدا میں عالموں نے طلاق کا فیصلہ دیا،لیکن بعد میں ایسے الفاظ پر مزید غور وفکر کے بعد زیادہ منصفانہ شرعی فیصلے کئے گئے۔مخدوم حامد اتھی نے کسی شخص کی طرف سے اٹھائی گئی ایسی قسم کے بارے میں شرعی فیصلہ دیا:''مون کي وڏو سُنهن آهي جي هيُ چائنٹ تنهنجي لنگهان''۔

[اسکا اصل رسم الخط یوں ہے:'منکهي وڏو سهہ آهي جي هي چائوت تهجي لنکهيان] (میرے پر بڑا حیف ہے اگر میں تیری یہ چوکھٹ عبور کروں) یعنی کسی نے اپنے کسی رشتہ دار عزیز کو غصہ سے کہا کہ: مجھے بڑی قسم ہے کہ آج کے بعد تیری یہ چوکھٹ عبور کر کے تیرے

---

(۱) اصل عبارت یوں ہے:فی کنایات لغة یکون حکم کنایات العربیه ....ان لفظ چهڏي فی لسان اهل السند کنایة لا صریح ....ولهذا نظائر کثیرة فی اللسان السندیة ۔

(۲) اصل رسم الخط یوں ہے:''توکي طلاقن پهٿو ڪيئم''

گھر نہیں آؤنگا۔'بڑی قسم' سے اس زمانے میں مراد 'بڑی شرعی قسم' ہوتی تھی۔ جس شخص نے ایسی قسم کھالی اور پھر اس قسم کو توڑ دیا تو، اسپر طلاق واجب ہوجاتی۔ مخدوم حامد اٹھی سے پوچھا گیا کہ: اگر کوئی شخص اپنے ساتھی کو غصہ کی وجہ سے یہ کہے کہ: ''مون کي سنہ وڏو آھي'' (مجھے بڑی قسم ہے)[اس کا اصل رسم الخط یوں ہے: منکھی سہ وڏو آھي] جو تیرے گھر کھانا کھالوں، اور بعد میں وہ کھانا کھالے اور قسم توڑدے تو اس پر طلاق لازم آئے گی یا نہیں؟ یا کوئی شخص یوں کہے کہ: ''مون کي شرع جو سنّہ آھي'' [اس کا اصل رسم الخط یوں ہے: منکھي شرع جو سہ آھي] (مجھے شریعت کی قسم ہے) جو فلاں کام کرلوں، بعد میں اس شخص نے وہ کام کرلیا تو اس پر کیا فتویٰ لاگو ہوگا؟

یا اگر کوئی شخص کہتا ہے:

''مون ہیڙ پا ھنجي چڏي'' [مُوں ہَیڑ پا ہَنجی چھڈی]

[اصل رسم الخط یوں ہے: مون ہیڙ پا ھجي چھڏي. (ہیڙ معنی بیوی)][یعنی میں اگر فلاں کام کروں تو میں نے اپنی بیوی چھوڑی] تو اس پر کیا فتویٰ لاگو ہوگا؟

مخدوم حامد اٹھی نے اسکا یہ جواب لکھا کہ: مرحوم شیخ احمد کے بیان اور مرحوم ضیاء الدین کی تحریر کے مطابق 'شرع کی قسم' اٹھانے سے 'طلاق بائن' واقع ہوگی۔ 'چھڈ ی' (چھوڑ دی) کہنے سے بھی علماء دربیلہ کے فتوی کے مطابق ایسا ہی (طلاق بائن) ہوگا، لیکن علماء ٹھٹہ کے فتوی کی رو سے 'طلاق صریح' واقع ہوگی۔(۱)

مخدوم عثمان متعلوی (وفات ۲۰ ذی الحج ۱۲۱۹ھ/ ۱۸۰۵ء):

مخدوم عثمان ٹیاروی نے سندھی میں کھائی گئی ایسی قسم پر مزید غور وفکر کیا اور اس کے متعلق اپنے فتوی میں ایک شرط یہ عائد کی کہ اس قسم کے قول یا قسم سے طلاق تب لازم آئے گی جب شوہر نے اپنے الفاظ کو خصوصی طور پر اپنی بیوی کے ساتھ متعلق کیا ہو، بصورت دیگر طلاق واقع نہیں ہوگی۔ مثلاً ''اگر کسی مرد نے سندھی زبان میں کہا کہ: 'مجھے تین طلاقیں اگر میں یہ کام کروں'(۲)

اور پھر اس نے وہ کام کرلیا تو طلاق لازم نہیں ہوگی کیونکہ اس نے (ان الفاظ میں) طلاق کو اپنی بیوی کے ساتھ متعلق (منسلک) نہیں کیا [یعنی بیوی کا اس نے ذکر نہیں کیا]۔

---

(۱) اصل الفاظ یوں ہیں: ''از تقریر مرحوم احمد و تحریر مرحوم ضیاء الدین مفہوم شد کہ مراد از 'سوگند شرع' طلاق بائن و از 'چڏي' نزد علماء دربیلہ ہمیں مراد است و نزد علماء تتہ طلاق صریح۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ حررہ الفقیر حامد''

(۲) اصل عبارت یوں ہے: ''لو قال الزوج باللغة السندية 'مون کي ٽي طلاقون جي ھي کم کريان' ثم فعل ذالک الفعل لم يقع الطلاق لانه لم يضف الطلاق الى الامرأة''

میاں عبدالواحد متعلوی:

بعد میں علماء ٹیاری نے مخدوم عثمان کے فیصلہ کو قائم رکھا اور میاں عبدالواحد نے اپنی درج ذیل عبارت میں تفصیل کے ساتھ سمجھایا کہ اس قسم کے الفاظ کہنے سے قسم لاگو ہوگی اور نہ ہی طلاق واقع ہوگی:

جيکو چوء ته جي فلانو کم کئم ته منکي مصحف چکندو
که منتي که منپٺيا مصحف که الحمد که کلمو آه ته
ڪرن سان ان کمجي قسم نه پوندو پر سببانه
تعظيم ڏين مصحف که الحمد ک کلميجي کنهکار
ٿندو تنهکري اگيا الله تعاليٰ جي سچ سان توبهٔ استغفار کري ١٢ ميان عبدالواحد متعلوي

میاں عبدالواحد کا یہ فتوی اڈیرولعل کے مشہور عالم سید علی محمد شاہ (وفات ۱۹ محرم ۱۲۸۷ھ/۱۸۷۰ء) نے اپنے قلمی 'بیاض سیدی' میں اسی طرح نقل کیا ہے۔ نہیں کہا جاسکتا کہ اصل عبارت کا رسم الخط یہی تھا یا سید علی محمد شاہ نے اسے اس طرح لکھا۔ البتہ موجودہ رسم الخط میں یہ عبارت اس طرح ہوگی:

جيڪو چوي ته جي فلاڻو ڪم ڪيم ته مون کي مصحف چڪندو ڪِ مون تي، ڪِ مون پٺيان، مصحف ڪِ الحمدڪِ ڪلمو آهه ته ڪرڻ سان ان ڪم جي قسم نه پوندو پر سببان نه تعظيم ڏيڻ مصحف ڪِ الحمدڪِ ڪلمي جي گنهگار ٿيندو. تنهنڪري اَگيان الله تعاليٰ جي سچ ساڻ توبهه ۽ استغفار ڪري.(۱)

مخدوم عبدالواحد نے مزید وضاحت اس طرح کی کہ:

قسم کی تین اقسام ہیں: ایک لغو، دوسری غموس، تیسری منعقد۔ قَسم کی اس پہلی قِسم کی رُو سے قَسم نہیں ہوگی۔ اسی طرح دوسری قسم کی رو سے بھی قسم واقع نہیں ہوگی لیکن اس تیسری قِسم کی قسم دلانے والا دوزخی ہے اور اس میں توبہ و استغفار لازم ہے۔ اور اقسام قسم کی تیسری قِسم کی رو

(۱) مصحف چکندو مصحف چکھیگا = قرآن شریف جلائیگا؛ ڪِ = یا، مون تي = میرے اوپر، میرے خلاف؛ مون پٺيان = میرے پیچھے، میرے خلاف؛ استغفار = بخشش کے لیے دعا۔ '۱۲' کے عدد سے مراد یہ ہے کہ یہاں پر اصل عبارت ختم ہوئی یا مکمل ہوئی۔

(جو شخص کہے کہ اگر فلاں کام میں نے کیا تو مجھے مصحف چکھیگا یعنی جلائے گا یا مجھ پر یا میرے خلاف مصحف یا الحمد یا کلمہ ہے تو اس کام کے کرنے سے اس پر قسم لازم نہیں آئیگا البتہ مصحف یا الحمد یا کلمے کی تعظیم نہ کرنے کی وجہ سے وہ گنہگار ہوگا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کے سامنے خلوص دل کے ساتھ توبہ و استغفار کرے۔)

سے تمام صورتوں میں یہ قسم واقع ہو جائے گی(۱)۔ [بیاض سیدی] مندرجہ بالا عبارات کے رسم الخط خواہ ان میں استعمال شدہ الفاظ و اصطلاحات سندھی رسم الخط اور عام زبان کے مطالعہ کے لحاظ سے اہم ہیں؛ مگر اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ سندھی علماء نے فتاوے اور شرعی فیصلے پہلے عربی میں، اس کے بعد عربی اور فارسی میں اور بالآخر سندھی میں لکھنے شروع کیے۔ سندھی نثر کی یہ اوائلی عبارتیں تھیں جو کہ ضبط تحریر میں لائی گئیں۔

(ج) سگائی کے وقت کہے گئے جملے:

مخدوم عبدالواحد سیوستانی کی بیاض میں درج ذیل سندھی گفتگو اور اس کے متعلق مخدوم صاحب کا شرعی فیصلے لکھا ہوا ہے کہ: مخدوم جعفر بوبکانی کی کتاب 'متانہ' (۲) کی تصدیق کے مطابق درج ذیل صورت میں نکاح کا حکم لاگو ہوگا۔

لڑکی کے والد نے سندھی زبان میں نوجوان سے کہا کہ: ''ابا یار مُھْجا سيْ مِلکَ تُھْجِيْ مُن کرني سا کيْ'' [ابا يار منهنجا، شيْ (نياڻي) مِلڪ تنهنجي مون ڪرڻي سا ڪئي]

[میرے بیٹے! جو چیز (بیٹی) تیری ملکیت میں دینی تھی وہ دے دی۔]

سامنے سے اس نوجوان نے بھی سندھی زبان میں یوں جواب دیا کہ:

''مُنْ مٿي تي ۔ جِي''

[= میں نے اپنے سَر تسلیم کی۔]

تب لڑکی کے والد نے دوبارہ اس نوجوان کے ماں باپ سے سندھی میں کہا کہ:

''هارِ وِسيَاهُ''

[هاڻِ وِسهيا = اب یقین آیا]

مندرجہ بالا گفتگو واقعی دو فریقوں کے درمیان ہوئی یا مخدوم صاحب نے اسے بطور مثال

---

(۱) اصل میں ھيڪڙو (ہیکڑو = ایک) کے بجائے 'ھیکرو' ہے۔ ٻيم = دوسرے میں؛ ڏآرندر = دلانے والا؛ دوزخم = دوزخ میں؛ ٽي قِسم = تیسری قسم

(۲) اس کتاب کا مکمل نام ''المتانة فی مرمة الخزانة'' ہے۔

یہ کتاب فقہی ابواب پر مشتمل ایک ضخیم کتاب ہے۔ دراصل یہ کتاب گجرات کے مشہور حنفی عالم قاضی جگن المتوفی ۹۲۰ھ کی کتاب ''خزانة الروایات'' کی تصحیح و تنقیح ہے۔ کیونکہ قاضی جگن کی خزانۃ الروایات احناف کے نزدیک غیر معتبر روایات کی وجہ سے غیر مستند کتاب تصور ہوتی تھی۔ علامہ بوبکانی نے اس سے کمزور روایات نکال کر اور غیر معتبر مسائل کو حذف کرکے ان کی جگہ پر ''مفتیٰ بھا'' مسائل اور قوی روایات درج کرکے علماء کے نزدیک اسے محقق اور مستند کتاب بنادیا۔ جس کے بعد سندھ کے بڑے بڑے علماء مثلاً مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی، قاضی محمد اکرم نصرپوری اور مخدوم عبدالواحد سیوستانی وغیرہ نے اس کتاب سے استشہاد کیا۔ یہ کتاب علامہ غلام مصطفیٰ قاسمی صاحب کی تحقیق اور تعلیقات اور مبسوط مقدمہ کے ساتھ سندھی ادبی بورڈ، کراچی کی جانب سے سنہ ۱۳۸۱ھ-۱۹۶۲ء میں شائع ہو چکی ہے۔ (مترجم)

پیش کیا البتہ یہ الفاظ مخدوم صاحب ہی کے دور کے ہیں یعنی ان کے سالِ وفات (دسویں صدی ہجری کے آخر) سے پہلے کے ہیں، جن پر شرعی نقطۂ نظر سے سوچا گیا اور فیصلہ دیا گیا۔

(د) وہ الفاظ جن کے کہنے والے کو مسلمان تسلیم کیا جاسکے:

سندھ کے اکثر قبائل پرانے وقتوں سے ہی اسلام قبول کر چکے تھے، باقی دیگر غیر مسلم قبائل میں سے بھی بعض تمام کے تمام کنبے یا کچھ تنہا افراد اسلام قبول کرتے رہے۔ ابتدا میں لوگ اسلام کا اقرار کس طرح کرتے تھے وہ معلوم نہیں، لیکن مغلیہ حکومت کے آخر سے لے کر تالپور امراء کے دور (یا اس سے بھی بعد) تک ایک طریقہ یہ تھا کہ غیر مسلم شخص کسی بھی طرح سندھی میں بالواسطہ طور پر ایسا اظہار کرتا تھا جس سے اس کے اپنے ارادے کے ساتھ مسلمان ہونے کی تصدیق ہوتی تھی، لیکن اس طرح کی نیت وارادے کی تصدیق کرنے کے لیئے سندھ کے علماء نے غیر مسلم کے ان کہے ہوئے جملوں پر غور وخوض کیا تاکہ صرف سچی نیت ہی سے اس طرح کے جملے کہنے والا شخص اسلام میں داخل شمار ہو۔ اس سلسلے میں درج ذیل قسم کے سندھی الفاظ اور جملے کم از کم بارہویں صدی ہجری/سترہویں صدی عیسوی سے زیرِ بحث رہے۔

☆ ایک ہندو شخص نے آکر بتایا کہ فلاں گاؤں کے ہندوؤں سے میں نے بات کی اور میں نے انہیں بتایا کہ:

اَوَانْ وانِيکِيَ وانِيَ کا جُدا آهيان

[= اوهان (جي) واڻکيُ واڻيُ کان جدا آهيان] تمہارے ہندوانہ گروہ سے میں جدا ہوں۔

مندرجہ بالا جملے میں لفظ ''واڻي'' کی تشریح کی گئی کہ: سندھی زبان میں اس کے معنی 'زمرہ' یا 'جماعت' ہے(۱)۔

☆ ایک سوال پوچھا گیا کہ: ایک مسلمان نے دورانِ گفتگو یہ کہا کہ: آسمان اور زمینیں خدا اور خدا کے رسول

کی ہیں۔ جس پر وہاں بیٹھے ہوئے ایک غیر مسلم نے کہا کہ:

''اَوُنْ پِڻ اُنهِم جُوءِ آهيان''

[= آئون پڻ انهين (انهن ٻنهي) جوئي آهيان]

(میں بھی انہی دونوں کا ہوں)

(۱) 'بیاضِ ہاشمی' (راقم کی لائبریری کا قلمی نسخہ)

اس صورت میں ان الفاظ کہنے سے اسے مسلمان کہا جاسکتا ہے یا نہیں؟ اس کا یہ جواب دیا گیا کہ: ایسی صورت میں فقط شرعی ثبوت کے بعد ہی اسے مسلمان کہا جاسکتا ہے۔

مزید یہ کہ اس جملہ میں موجود لفظ 'انهين' (أنهم) کے مفہوم کی یوں وضاحت کی گئی کہ: سندھی زبان میں لفظ 'انهين' اسم اشارہ خواہ ضمیر دونوں کے لئے مشترکہ طور استعمال ہوتا ہے.اور اسم اشارہ 'ذات' یا
'وصف' دونوں پر صادق آتا ہے(۱)۔

☆ اگر کوئی غیر مسلم شخص کسی مسلمان سے مخاطب ہو کر درج ذیل الفاظ کہے تو کیا وہ مسلمان ہوا یا نہیں؟

"تہ آء پاڻَ تابع پيغمبرُ جو آهيان"

[= آءُ پاڻ تابع پيغبرُ جو آهيان = کہ میں خود پیغمبر کا تابع ہوں]

☆☆☆

آن تو جِهروْ آهيان دَيريَ شهر مَينْ
[= اَنْ (آءُ) تو جهڙو آهيان ديري جي شهر ۾]
[= میں تجھ جیسا ہوں دیرہ شہر میں]

☆☆☆

يمان مُنْجو جاءِ آهي [= ايمان منهنجو جاءِ آهي]
[= ایمان میرا ٹھکانے ہے]

☆☆☆

بي ايمان تُنْ آهيْ آءُ سانْ ايمان آهيان
[= بي ايمانہ تون آهين آءُ ساڻ ايمانَ آهيان]
[= بےایمان تو ہے میں ایمان سے ہوں]

☆☆☆

اَنَا راهوْ اَوْ اَوْتَه اَوْ دَهْرِي
اَنَا راهو اَوْ اُنَر اَوْ اَوْ تَہْ

(۱) اصل عبارت یوں ہے: "لئن لفظ 'اُنِهِمْ' فی لسان السندية مشترک بين اسم الاشارة والضمير و اسم الاشارة اخذ فيه الذات مع الوصف" بیاض عبدالواحد سیوہانی، لائبریری سندھ یونیورسٹی

[=آءُ راهو يا اوٺو يا ڏاهري آهيان، آءُ راهو يا انڙ يا اوٺو آهيان]
[= میں راہو یا اوٹھو یا ڈاہری ہوں
میں راہو یا انڑ یا اوٹھو ہوں]

☆☆☆

'دعا ڪجاء تا الله تعالي منڪي پڻ ايمان جي سلامتي ڏي'
[= دعا ڪجانءِ ته الله تعاليٰ مون کي به ايمان جي سلامتي ڏئي]
[= دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ مجھے بھی ایمان کی سلامتی عطا فرمائے]

کسی غیر مسلم کی زبان سے اس قسم کے الفاظ ادا ہونے کی صورت میں علماء کے درمیان اختلاف رہا۔ ہنگورجہ کے مخدوم عبدالرؤف اور بعض دیگر علماء کی نظر میں ایسا شخص مسلمان ہو چکا۔ لیکن اکثر علماء اس سے کلی طور پر متفق نہیں ہوئے۔ 'بوبک' کے مخدوم حامد، نصرپور کے علامہ عبدالرحمٰن نے (اس طرح کے الفاظ کہنے والے کی نیت و ارادہ کے ثبوت کے لئے) مزید تشریح کی، نیز مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی نے فتویٰ دیا کہ اس قسم کے ادا کیے گئے جملوں کی صورت میں الفاظ کے مقصد کو متعین کرنا ضروری ہوگا (کہ کہنے والے کا اصل مقصد یا ارادہ کیا ہے)۔

ملتان اور اس سے بھی اوپر پنجاب تک سندھی زبان کے ثقافتی دائرہ کا وسیع ہونا:

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ سمہ دور میں سندھ کے قوالوں اور ذاکروں نے ملتان سے لے کر پنجاب میں لاہور تک اپنے دلپذیر نغمات سے محافل سماع برپا کیں اور وہاں کے اہل دل صوفیاء اور بزرگوں کے حلقوں کو سندھی زبان سے روشناس کرایا۔ سندھ میں سماع کا سلسلہ سومرہ دور میں ساتویں صدی ہجری (تیرہویں صدی عیسوی) سے شروع ہوا اور آئندہ تین سو برس میں وہ اپنے عروج کو پہنچا۔ سندھ کے قوالوں اور ذاکرین نے سندھی منظوم اصناف 'ابیات' (اشعار) اور 'قوافی' یا سندھی موسیقی کے نغمات خصوصاً 'کافی راگ' کو محافل سماع کے ذریعے سندھ اور ملتان کے مرکزی خطہ اور اوپر کی طرف پنجاب تک مشہور و متعارف کروایا۔ انہوں نے غوث بہاؤالدین زکریا اور شیخ فریدالدین مسعود گنج شکر (۱۱۷۵-۱۲۶۵ع) کی محافل سماع میں نغمہ سرائی کی۔ امیر خسرو جو کہ کم از کم پانچ برس (۶۷۸-۶۸۳ھ) ملتان میں رہے، وہ بھی وہاں کی محافلِ سماع سے متاثر ہوئے اور انہوں نے سندھی قوالوں کے گائے ہوئے ''کافی راگ'' کو دہلی تک پہنچایا۔ اس کے بعد سلسلۂ سماع غوث صاحب کے جانشینوں، خلفاء اور معتقدین کے حلقوں میں جاری رہا اور آئندہ دو سو برس تک ذاکرین اور قوال ہی اس کے سالار رہے۔

پندرہویں/ سولہویں صدی عیسوی میں انہوں نے لاہور میں شیخ عبدالجلیل اور ان کے جانشینوں کے حلقوں میں محافل سماع بپا کیں اور فارسی کے ساتھ سندھی کلام گایا۔ اسی دور میں کچھ سندھی بزرگوں اور درویشوں نے مشرقی ہندوستان میں برہانپور کو آباد کیا تھا جہاں پر انہوں نے سماع کا سلسلہ قائم کیا۔ وہاں کے ایک ذاکر درویش 'لاڈ' یا 'لدھو سندھی' (۱۵۲۳-۱۵۹۸ء) سندھی کافیاں ایسے سوز گداز سے گاتا کہ نہ صرف خود بے خود ہوجاتا بلکہ سامعین بھی محو و مسرور ہوجاتے تھے۔ اسی دور میں قاضی قادن کے اشعار سندھ سے باہر برہانپور تک مشہور ہوئے۔

اسی دور میں سندھ میں سماع کا سلسلہ وسیع ہوا اور دسویں گیارہویں صدی ہجری (۱۵/۱۶ویں صدی عیسوی) کے عرصے میں وہ عروج کو پہنچا۔ 'ہالہ کنڈی' کے بھٹی بزرگ، حضرت بہاؤالدین زکریا کے خلفاء و مریدین تھے، جو سماع کا بڑا ذوق رکھتے تھے یہاں تک کہ درویش مخدوم احمد بھٹی نے سال ۹۳۶ھ/۱۵۳۰ع میں سماع کے سوز و گداز میں ہی وصال فرمایا۔ ٹھٹھ میں سید میاں علی شیرازی ثانی (۸۹۱-۹۸۱ھ/۱۴۸۶-۱۵۷۳ء) محافلِ سماع کے سالار تھے اور مکلی کی خانقاہوں پر سماع کراتے تھے۔ دوسری طرف میاں شاہ کریم (۹۴۴-۱۰۳۲ھ/ ۱۵۳۷-۱۶۲۳ء) کے حلقہ میں سندھی ذاکرین اور قوالوں نے سندھی اشعار، کافیوں اور کلام کو بڑے سوز و گداز سے گایا؛ ایک مجلس میں میاں شاہ کریم ان کے سماع و سرود سے اس قدر متاثر ہوئے کہ بطور قدر دانی اپنی دستار اور چادر اتار کر قوال کو پیش کردی۔ اسی دور میں میر محمد معصوم بکھری کے بڑے بھائی میر محمد فاضل نے سندھی کافی کو دہلی اور آگرہ کی طرف متعارف اور مشہور کرایا اور وہاں کے درباری گویوں کو سندھ کے 'کافی راگ' سے روشناس کرایا۔ 'ذخیرۃ الخوانین' (سال تصنیف: ۵۱-۱۶۵۰ء) کے مصنف شیخ فرید بکھری نے لکھا ہے کہ میر محمد فاضل ''سندھی زبان کی قافی نہایت عمدہ گاتے اور اس میں انہیں مقبولیت حاصل تھی'' (۱)۔ ظاہر ہے کہ 'قافی' سندھی زبان کا 'شعر' خواہ 'راگ' تھا۔

مندرجہ بالا حوالہ جات سے ظاہر ہے کہ ساتویں سے گیارہویں صدی ہجری (تیرہ سے سترہویں صدی عیسوی) کے چار سو سالہ طویل عرصے میں سندھی 'شعر' اور 'قافی' نظم یا سندھ کا 'کافی راگ' سندھ اور ملتان سے باہر شمال کی جانب پنجاب (لاہور) تک، مشرق کی جانب برہانپور تک، اور وسط ہندوستان میں دہلی اور آگرہ تک مشہور ہوئے۔ ''ذخیرۃ الخوانین'' کے سندھی مصنف کے علاوہ ۱۶/۱۷ویں صدی میں باہر کے دوسرے مصنفین و محققین نے بھی تسلیم کیا کہ سندھ کا خاص راگ 'کافی' ہے اور یہ نہایت شیریں اور پر سوز راگ ہے۔ مصنف محمد غوثی جنہوں

---

(۱) شیخ فرید بکھری: ''ذخیرۃ الخوانین'' پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی، ۱۹۶۱ء جلد اول، ص: ۲۰۱ ''شعر زبان سندی از تمام کافی بہ کمال فصاحت گفت و قبولیت داشت''

نے اپنی کتاب ''گلزار ابرار'' (سال تصنیف: ۱۷۰۵-۱۶۱۳ء) میں شیخ 'لدھو سندھی' کے برہانپور میں سوز و گداز سے 'کافیاں' گانے کا ذکر کیا ہے، لکھتے ہیں کہ: 'کافی' سندھ کے مقبول راگوں میں سے ہے(۱)۔ ابوالفضل نے اپنی مشہور کتاب 'آئین اکبری' میں راگ کے متعلق ایک تحقیقی باب لکھا ہے؛ اور ہر ملک اور ہر صوبے کے مخصوص مقامی راگ کا نام دیا ہے، اس نے واضح طور پر تحریر کیا ہے کہ 'کافی' خاص سندھ کا راگ ہے جس میں مہر و محبت کا جادو سمایا ہوا ہے(۲)۔

۱۳ویں سے ۱۷ویں صدی عیسوی تک سندھی 'اشعار' اور 'قافیوں' نیز سندھی راگ 'کافی' کی یہ دیس بدیس شہرت صوفی علماء اور اہل دل درویشوں کی محافل سماع کے ذریعے ہوئی، نیز ان کے حالاتِ زندگی اور ملفوظات میں سماع اور راگ، کلام اور قافیوں، اشعار اور دوہوں کا ذکر آیا ہے۔ 'سندھ کا راگ کافی' اس دور میں اس قدر مشہور و مقبول ہوا کہ اس کا اثر نہ صرف سندھ اور پنجاب کے مسلمان صوفیاء اور درویشوں پر پڑا بلکہ دیگر پیشوایانِ عقائد پر بھی اس کا اثر ہوا۔ مثلاً ایک طرف لاہور کے صوفی درویش سید شاہ حسین (۱۵۳۹-۱۵۹۳ء) (۳) نے اپنے جذبات و

(۱) ''اذکار الابرار'' اردو ترجمہ ''گلزار ابرار'' مطبوعہ آگرہ، ۱۹۳۶ء، ترجمہ کے اصل الفاظ یوں ہیں: ''کافی سندھ کے مقبول راگوں میں سے ہے''، ص:۴۴۳

(۲) ''وآنچہ در سند گویند 'کافی' نام بود درو بسا افسون مہر و محبت [دیکھیے آئین اکبری، تصحیح ایچ بلخمن، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۷۷ء، جلد سوم، ص:۱۲۴]

(۳) آپ کے والد کا نام شیخ عثمان تھا، جو لاہور کے ٹکسالی دروازے سے باہر ''تل بگھ'' محلے میں سکونت پذیر تھے اسی محلے میں سن ۹۴۵ھ/ ۱۵۳۸ء میں آپ کی ولادت ہوئی۔ آپ کے جد اعلیٰ ''کلس رائے'' یا باختلاف روایت ''کلجس رائے'' قوم 'ڈھڈی' نے فیروز شاہ تغلق کے عہد (۱۳۵۱-۱۳۸۸ء) میں اسلام قبول کیا۔ بعض حضرات کے بقول آپ ذات کے 'جلاھا' تھے آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے محلے کی مسجد کے امام حافظ ابوبکر سے حاصل کی، دس سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا، بعد میں تفسیر، حدیث اور فقہ کی کتابیں بھی پڑھیں اور مشہور صوفی بزرگ حضرت شیخ بہلول دریائی (حضرت امام بری شاہ لطیف کے مرید اور خلیفہ، چنیوٹ ضلع جھنگ میں مدفون) سے بیعت ہوئے، جنہیں سیاحت کے دوران مشہد (ایران) میں حضرت سیدنا امام رضا کے مزار سے شاہ حسین کو لاہور آکر بیعت کرنے کا حکم ملا تھا۔ چھتیس برس کی عمر میں مشہور عالم شیخ سعد اللہ لاہوری سے تفسیر مدارک پڑھنے لگے، آیت مبارکہ: و ما الحیوٰۃ الدنیا الا لھو و لعب کی تفسیر پر پہنچتے ہی آپ پر مجذوبانہ کیفیت طاری ہوگئی اور اپنی تمام کتابیں مسجد کے کنویں میں ڈال کر کتب سے باہر آگئے اور ایک طویل عرصے تک مجذوبیت اور بے خودی کی کیفیت میں رہے، اس کے باوجود بھی عوام و خواص انہیں خدا رسیدہ ولی سمجھتے تھے۔ ایک روایت کے مطابق اس دور کے فاضل اجل علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی محشی تفسیر بیضاوی نے آپ سے مرید ہونے کی درخواست کی لیکن شاہ حسین نے انہیں ہاتھ جوڑ کر یہ کہتے ہوئے ٹال دیا کہ: مولانا! کیوں مجھے شہر میں خوار کرنا چاہتے ہیں!

ڈاکٹر سید نذیر احمد نے ایک روایت یہ بھی لکھی ہے کہ شاہ حسین زندگی کے آخری ایام میں اس جذب اور سرمستی سے دوبارہ سلوک کی طرف لوٹ آئے تھے اور شریعت کی پابندی کو اپنے اوپر لازم کر لیا تھا۔ آپ نے جمادی الثانی ۱۰۰۸ھ/ ۱۵۹۹ء میں وصال فرمایا اور آپ کے نومسلم مرید مادھو لال آپ کے جانشین ہوئے، آپ کا مزار باغبان پورہ لاہور میں مرجع خلائق ہے۔

دیکھیے: 'لاہور میں اسلام کے سفیر' ص: ۱۲۱-۱۴۳

'پنجابی زبان و ادب' ص: ۱۰۸-۱۱۲

خیالات کا اظہار 'کافیوں' کے ذریعے کیا تو دوسری طرف بھگت بابا گرو نانک نے اپنے کلام میں 'کافی' نظم اور راگ کو اختیار کیا اور سندھ کی روایت کی رو سے اس نظم کو سندھی محاوروں (لہجوں؟) میں رنگنے کی کوشش کی۔

سکھ گرؤں کے کلام میں سندھی الفاظ اور فقرے:

'آد گرنتھ' یا 'آد بیڑ' جسے 'شری گرو گرنتھ' بھی کہا جاتا ہے، سکھوں کی پوتر پوتھی (مقدس کتاب) ہے۔ جسے سکھوں کے پانچویں گرو ارجن دیو نے اکبر بادشاہ کے دور میں سنبت ۱۶۶۱(۱) مطابق ۱۶۰۴ء میں مرتب کیا: یعنی کہ اس میں اس نے گرو نانک اور اس کے بعد کے دیگر تین گرؤں، دیگر بھگتوں، ڈوموں کا اور اپنا کلام جمع کیا۔ گرو نانک (۱۴۶۹-۱۵۳۹ء) سمہ دور کے آخر میں تھا، لیکن اس نے سمہ دور کے اختتام کے ۱۹ سال بعد ارغون دور میں انتقال فرمایا۔ اس کے جانشین، یہاں تک کہ گرو ارجن، جس کا کلام 'گرو گرنتھ' میں شامل ہے، وہ بھی تاریخ سندھ کے مطابق ارغون-ترخان دور ہی میں ہو گزرا۔ اس لحاظ سے 'گرو گرنتھ' میں جمع کردہ کلام کا ذخیرہ بھی اس دور کا یا اس سے بھی پہلے کا ہے، کیونکہ 'بھگت' جن کا کلام گرنتھ کے 'بھوگ'(۲) کے حصے میں شامل ہے ان میں سے کچھ پہلے ہو گزرے ہیں؛ کبیر اور بابا فرید کو بھی بھگت لکھا گیا ہے اور ان کا کلام 'بھوگ' کے حصے میں شامل کیا گیا ہے۔

'گرو گرنتھ' میں شامل کلام میں سنسکرت، ہندی، راجھستانی، پنجابی وغیرہ زبانوں کے الفاظ، اصطلاحات، فقروں اور مصرعوں کا بڑا ذخیرہ موجود ہے، مگر اس کے کچھ حصوں میں سرائیکی اور دوسرا منظوم کلام بھی شامل ہے جس میں سندھی الفاظ اور فقرے موجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس دور میں سندھی اور سرائیکی زبانوں کی اہمیت کے پیش نظر ہی گرونانک اور دوسروں نے سرائیکی اور سندھی رنگ میں کلام کہنے کی کوشش کی۔ گرو نانک سے دو اڑھائی سو سال پہلے کا دور مسلم صوفیاء اور درویشوں کے اثر و رسوخ کا دور تھا، جس میں لوگوں کی روحانی و اخلاقی تربیت کی خاطر ذکر و سماع (راگ) کے سلسلے جاری رہے؛ اسی دور میں سندھی ذاکرین نے 'قافیاں' اور اشعار گائے، اور صوفی درویشوں کی محافلِ سماع کے ذریعے سندھی اشعار اور قافیاں یا سندھ کا راگ 'کافی' اور دیگر نغمات ملتان سے اوپر پنجاب تک مشہور ہوگئے۔ گرو نانک پر بھی صوفی درویشوں کے اسی ماحول کا اثر ہوا۔ ''جنم ساکھی'' میں درج سکھوں کی ایک عام روایت کی رو سے، گرو نانک خود علاقۂ

---

(۱) اصل الفاظ یوں ہیں: ''سوچي پتر پوٿي دا تتڪرا راگان کا سمت ١٦٦١ متي ڀادو ودي ايڪم پوٿي لک پهچني ''یعنی کہ سنبت ۱۶۶۱ کے ماہ بھادوں میں پوتھی لکھ کر مکمل ہوئی۔

(۲) پرشاد = تبرک، نذر، دیوتاؤں پر چڑھاوا (مترجم)

شکارپور میں آیا تھا(۱)۔ اگر یہ روایت درست ہے تو پھر شمالی سندھ میں آنے اور وہاں کچھ ایام قیام کرنے کے دوران گرو نانک سندھ کی قافیوں، کلاموں اور سندھ کے راگوں سے متاثر ہوا۔ 'گرو گرنتھ' کے کلام میں بھی فکری لحاظ سے سندھ کے راگ کی روایت کا اثر نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ مثلاً 'کافی' جو کہ اصل میں خالص سندھی نظم 'قافی' ہے جس سے 'کافی' راگ پیدا ہوا(۲)، وہ 'گرو گرنتھ' میں دی گئی بعض نظموں کے لیے بطور عنوان لائی گئی ہے؛ دوسرا یہ کہ جن اکتیس راگوں کے نام 'گرو گرنتھ' میں آئے ہیں، ان میں سے کم از کم چودہ راگ ایسے ہیں جو یا تو سندھ-ملتان کے علاقے میں پیدا ہوئے اور پروان چڑھے، یا انہی علاقوں میں زیادہ مقبول ہوئے۔ ان میں سے ماجھ، بھاگڑا (وہاگڑو)، سورٹھ، دھنا سری اور پربھاتی بطور خاص سندھ کے راگ ہیں؛ دوسری طرف سُر سری راگ، سارنگ، آسا، تلنگ، جیتسری، بلاول، رامکلی اور بسنت سندھ اور ہند کے وہ مشترک راگ ہیں جو سندھ خواہ ہند میں مقبول ہوئے اور عام رائج ہوئے (۳)۔

ذیل میں 'آد گرنتھ' یعنی 'گرو گرنتھ' میں شامل گرو نانک اور گرو ارجن کے کلام میں سے کچھ نظمیں دی جاتی ہیں، جن میں سرائیکی کی آمیزش سے سندھی الفاظ اور فقرے استعمال کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ بابا فرید کے دوہوں (جن کی ترتیب میں خالص سندھی 'شاعری' کا اثر نمایاں ہے) کے زیرِ اثر سِکھ گروؤں نے بھی اپنے بعض دوہوں میں 'وسطی قافیہ' کی ترتیب اختیار کی ہے۔

☆ گرو نانک کی کافی:

'گرو گرنتھ' کے حصہ چہارم میں (جو اکتیس راگوں کے عنوان سے مزین ہے) 'راگ مارو' کے اختتام پر 'کافی' کے عنوان سے گرو نانک کے نو عدد دوہے درج ہیں جن میں سے پہلے دو 'مطلع' کے طور پر اور اس کے بعد سات دوہے گویا مصرعوں کے طور پر لائے گئے ہیں۔ ان دوہوں کی لڑی کا عنوان 'کافی' محض رسمی ہے، اور غالباً سندھی 'کافی' کے سنے ہوئے نام کے تتبع

(۱) ساکھی نمبر: ۱۶۶ میں بتایا گیا ہے کہ: ''پھر گرو نانک شکارپور کی سرزمین میں آئے وہاں نور نشتر (؟) نامی قسائی (قصاب) ذات کا ایک شخص بکریاں چرا رہا تھا، اسے دعا دی۔ داؤد نامی شخص ایک غالیچہ بُن کر لے آیا اسے گرو نے کہا کہ: یہ کُتی کے بچوں (پلّوں) پر ڈال دو کہ وہ سردی سے مر رہے ہیں اور انہیں چُوری اور ملیدہ (چورما) بھی کِھلاؤ تو تمہاری آس بر آئے۔ داؤد کی یہ آس تھی کہ: میرے گھر اولاد زیادہ ہو اور میں سکھی ہو جاؤں۔ گرو نے اس سے کہا کہ سادھوؤں کی خدمت کرتے رہو۔'' [''سَبْ ٹُوں وڈی جنم ساکھی سمت نانک شاہی ۴۷۰ بھائی بالا والی''، بکرمی ۱۹۹۶، جے-ایس سنت سنگھ اینڈ سنز، تاجران کتب، چوک متی لاہور، بار سوم (۱۹۳۹ء)۔]

(۲) دیکھیے ہماری کتاب ''سندھی موسیقی جی مختصر تاریخ'' مطبوعہ شاہ عبداللطیف بھٹ شاہ ثقافتی مرکز، بھٹ شاہ حیدرآباد ۱۹۷۸ء، ص:۶۶-۹۳

(۳) ایضاً

میں ہے، کیونکہ 'مطلع' کے بعد لائے گئے دوہوں کے قوافی 'مطلع' والے دوہوں کے قافیوں سے نہیں ملتے۔ مگر چونکہ مقصد سندھی صنف 'کافی' کو لانا تھا، اس لئے اس کی زبان میں بھی سندھی الفاظ اور فقرے استعمال کیے گئے۔ ذیل میں اس 'کافی' کا مطلع اور اس کے بعد لائے گئے سات دوہوں میں سے پانچ دوہے درج کیے جاتے ہیں(۱)۔

''مارو کافی محلہ ۱، گھر ۲''

(مطلع)

۱- آوو وڃو ڏُمُٽِيْ ڪِٿِي مِترْ ڪريو
۲- ساڏن ڍوئي نه لهي(۲) واڍي ڪيون ڍِيري(۲) هو
۳- ميڏا مَن رَتا آپٽي(۲) پِرْ نال
۴- هُونْ گهول، گهمائي ڪَنْيِيْ(۲)، هڪ پوري نَدَرْ نِهال

(مصرع)

۵- پيئيڙي ڏُهاڳِڻيْ، ساهُرڙي ڪِيون جاءُ
۶- مَيگَلْ اوگڻ مُٺڙِي، بِنْ پِرْ جهور مَراءُ
۷- پهيئڙي پِرْ سَمُلانْ، ساهُرڙي گهر واسْ
۸- سُک سَرَنْدُ سُهَاڳِڻيْ، پِر پايا گُڻ تاس
۹- ليق نِهاليْ پَٽ ڪي، ڪاپَڙ انگ بڻاءِ
۱۰- پِرْ مُنِي ڏُهاڳِڻيْ تِن ڏُکِي رَيْڻ وِهاءِ
۱۱- ڪِتِي چِکو ساڏڙي، ڪِتِي ويس ڪَريو
۱۲- پِر بِن جو بَن باد گِيَمْ، وَهڏِيْ جهُورِينديْ جهوريو
۱۳- تُو پاوَن تو جيهِيانْ، مُو جيهيان ڪِتيانْ
۱۴- نانڪ نه ويچڙي، تِن سَچي رَتيڙيانْ

(۱) ہم نے ابتداء میں یہ متن فارسی-اردو خط میں ''آدگرنتھ'' کے مطبوعہ متن (طابع سنگھ برادرز، بازار مائی سیوں، امرتسر) میں پڑھا اس کے بعد ۱۹۶۴ء میں، چندی گڑھ یونیورٹی کے بھائی ہرنام سنگھ 'شان' راقم سے لندن میں ملے اور 'سکی-پنجوں' کے بارے میں اپنے مقالۂ ڈاکٹریٹ کے لیے کچھ دنوں تک مسلسل معلومات حاصل کرتے رہے۔ اس عرصہ میں 'آدگرنتھ' کے 'گرمکھی متن' (بڑے سائز کے چودہ سو تیں صفحات پر مشتمل ''آدسری گروگرنتھ صاحب کا'' سنہ ۱۸۹۲ء مطبوعہ لاہور) میں سے اس 'کافی' خواہ ذیل میں آئے ہوئے دیگر نظموں کے تلفظ اور معنی کے بارے میں اس سے تصدیق کی گئی، اگرچہ بعض معانی کے متعلق ابھی تک کامل اطمینان حاصل نہیں ہوا۔ یہ 'کافی' آدگرنتھ کے صفحات نمبر ۱۰۱۴-۱۰۱۵ پر موجود ہے۔

(۲) یائے مجہول کے ساتھ ہے۔ (مترجم)

الفاظ کے معنی:

۱- ڊمٽي - ڈومنی عورت (؟) ڪتي متر ڪريو = کتنے رشتہ دار بنائے

۲- ڊوئي =خبر؛ واڍي =رنڈوہ، بیوہ، اکیلی عورت؛ ڪيون ڌيري هو = کیسے صبر کرے

۴- گهول گهمائي = قربان جاؤں؛ ڪَنيي ڪيتي = پرزے پرزے کردیا؛ هڪ پوري =ایک گھڑی؛ ندر =نظر؛ نهال =نظر کر، دیکھ

۵- پيئڙي ڏهاڳڻي = پیارے (شوہر) کی جدائی، بیوگی

۶- ميگل = غافل

۷- پهيئڙي پر =محبوب کا پیغام یا قاصد؛ سملان = مجھے یاد آتا ہے

۸- سک سرند =سُکھ والی؛ گڻ تاس =سُکھاؤ کا خزانہ

۹- ليڦ = لحاف؛ نهالي = بچھائی؛ ڪاپڙ انگ بٹاء = کپڑے بدن پر پہنے

۱۰- ريڻ = رین = رات

۱۱- ڪتي = کتنے؛ ساڏڙي = طعام

۱۲- جو بن باد گيم = جو بن میرا برباد ہوگیا؛ وهڏي = بڑے؛ جهوريندي جهوريو = درد نے زخمی و بے قرار کردیا

۱۳- تو پاوَن = تجھے راس آئیں؛ توجيهان = تجھ جیسی؛ موجيهيان ڪتيان = مجھ جیسی کتنی]

مطلع کا ترجمہ:

۱- آجا کر ڈومنی عورت نے کتنے رشتہ دار بنائے

۲- سادھوؤں نے خبر گیری نہیں کی، اکیلی (بیوہ) عورت کس طرح صبر کرے

۳- میرا مَن اپنے محبوب کے ساتھ رچ بس (مانوس ہو) گیا ہے

۴- پُرزے پُرزے ہوکر قربان ہوجاؤں، ایک لحہ کے لیے نظر اٹھا کر تو دیکھ

مصرعوں کا ترجمہ:

۵- شوہر کی دکھیاری سسرال کیسے جائے

۶- غافل، خراب لچھنوں میں گرفتار، بغیر محبوب کے گھُل کر مرجا

۷-سسرال کے گھر لباس پہن کر مجھے محبوب کا پیغام یاد آتا ہے
۸-سُکھ والی سُہاگن نے محبوب کے سُبھاؤ (خصلت) کا خزانہ پالیا
۹- ریشمی لحاف بچھا کر بدن پر کپڑے پہنے
۱۰-محبوب کی طرف سے بدقسمت، منحوس کی رات دُکھی بسر ہوتی ہے
۱۱- کتنے ہی طعام چکھو، کتنے ہی لباس پہنو
۱۲-محبوب کے بغیر میرا شباب برباد ہوگیا، بڑی بے قراری نے غمگین کردیا
۱۳- تجھے تجھ جیسیاں راس آئیں، مجھ جیسی کتنی ہی ہیں
۱۴-نانک انہیں کوئی فراق نہیں جنہوں نے راتیں سچے مالک کے ساتھ گزاردیں

اس 'کافی' میں مطلع اور مصرعوں کی بنیادی ترتیب موجود ہے مگر اس میں ایک تو مطلع کی بناوٹ مختلف ہے؛ دوسرا یہ کہ مطلع اور مصرعوں کے اوزان اور قافیے ایک دوسرے سے نہیں ملتے۔ گویا ہر مصرع کا وزن مختلف ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ سندھ اور ملتان تک محافل سماع اور سندھی ذاکرین کے ذریعے قافیوں اور اشعار کا غلغلہ شمالی پنجاب تک پہنچا، اس لیے اس نظم میں کسی حد تک 'کافی' کے مطلع اور مصرعوں کی ترتیب کو اختیار کیا گیا؛ نیز اسے سندھ اور ملتان کی سرائیکی-سندھی زبان کی آمیزش سے آراستہ کیا گیا۔ سرائیکی کے ساتھ درج ذیل الفاظ اور فقرے ایسے ہیں جو آج تک سندھی میں استعمال ہو رہے ہیں۔

واڍي =وانڈھی = بیوہ؛ نهال = نہار = دیکھ؛ جهور مراء = جھری مر = گھُل کر مرجا؛ پهيٽڙي ٻر سنيران (سملان) =محبوب کا پیغام مجھے یاد آتا ہے، ساهرڙي گهر واس، = ؛ ويس ڪريو = لباس پہن کر، سسرال کے گھر لباس پہن کر؛ وهڏي جهوريندي جهوريو = وڈے جھورنڑے (درد) جھوریو = بڑے درد نے زخمی و بے قرار کردیا۔

☆ گرو ارجن کے سلوک:(۱)

گرو ارجن (۱۵۶۳-۱۶۰۶ء) کے بعض سُلوکوں میں بھی سندھی الفاظ اور فقرے شامل ہیں:

(۱) سلوک: اسے سنسکرت میں شلوک کہتے ہیں جس کے معنی ہیں کہاوت، کہت، شعر، قطعہ، شعر کا ٹکرا، گیت، دوہا، رباعی، مصرعہ، نظم، شعرگوئی، شاعری، دوسطری شعر۔ اور سلوکت کے معنی ہیں محبت، قرب، رغبت، راحت، پاسخاطری، سالکی، طریقت، فقیری وغیرہ
دیکھیے: جامع سندھی لغات، جلد چہارم، ص:۱۶۴۵

(الف) راگ جیتسری کے وار(۱) 'سلوکاں نال' میں بیس 'پوڑیاں' (۲) ہیں اور ہر 'پوڑی' کے آخر میں 'سلوک' ہیں جن میں سے پہلا سنسکرت میں اور دوسرا سرائیکی-سندھی رنگ میں رچا ہوا ہے۔ بطور مثال ان میں سے ذیل کے آٹھ اشعار دیے جاتے ہیں(۳)۔

۲: (۲) (۴) مُک تلي (۵)؛ پَير اپري (۵) وسَندو ڪو تڙي ٿاء

نانڪ سو ڌڻي ڪِيون وساريو، اڌري جس دي ناءِ

[مُنہ نیچے، پاؤں اوپر (بچہ ماں کے پیٹ میں) رہتا ہے گندی سی جگہ پر (جب اس کا جنم اس طرح سے ہوتو پھر) نانک! اس مالک کو کیوں بھلایا، جس کے نام نجات سے ہے۔]

۳: (۲) هَبْ رنگ ماڻي (۵) جِس سنگ، تِيسيو لائيي (۵) نِه

سو سُه بند نه وِسرو، نانڪ جِن سُنْدر رچيادہ

[جس کی وجہ سے سب رنگ (نعمتیں) حاصل کر رہا ہے، اس سے لو لگا اس مالک (سُہ = شوہر) کو ایک (بند = گھڑی) لمحہ بھی مت بھلاؤ، اے نانک! جس نے سندر صورت (دہ = بدن) بنائی ہے۔]

۴: (۲) تِتْڙيا سا پريت، جولائي بِيَنِ سِئو

نانڪ سچي پريت، سائين سيتِيْ رَتيا

[وہ پریت ٹوٹ گئی جو دوسروں سے لگائی، نانک! سچی پریت (ان کی جو) مالک کے ساتھ رچ بس گئے۔]

اور سُلوک: کے معنی ہیں برتاؤ، طرزِ عمل، رویہ، صوفی۔

دیکھیے: 'جواہر اللغات' اردو، ص:۴۴۴

راہ روی، نیک روی، راستہ، طریقہ

دیکھیے: 'فرہنگِ عامرہ' ص:۳۴۴

اور فیروز اللغات میں ہے کہ اس لفظ کے عربی میں معنی ہیں راستہ چلنا، راہ طے کرنا۔ اور اردو میں معنی ہیں برتاؤ، طرزِ عمل، رویہ، دوستی، محبت، امداد، بھلائی، نیکی، نیک روی، حق تعالیٰ کا تقرب چاہنا، تلاشِ حق۔

دیکھیے: فیروز اللغات اردو، ص:۸۰۷

حمید اللہ شاہ ہاشمی پنجابی زبان کے مشہور اصنافِ سخن کے تحت ''شلوک'' کے متعلق لکھتے ہیں: بزرگوں اور صوفیائے کرام کے اندازِ سخن کو ''بول'' یا ''شلوک'' کہتے ہیں۔ ہیئت کے اعتبار سے یہ بیت (دو مصرعوں یا دو سے زیادہ مصرعوں کا شعر) یا شعر ہیں جن میں درویشانہ خیالات بیان کیے جاتے ہیں۔

دیکھیے: پنجابی زبان و ادب، ص:۹۲-۹۳ (مترجم)

(۱) وار= کسی کی تعریف کا گیت، بھجن۔ (مترجم)

(۲) پوڑی =شعر کا رکن، مصرع کی دو چار لفظی سطر۔ (مترجم)

(۳) پہلا ہندسہ 'پوڑی' کے عدد کو ظاہر کرتا ہے اور بریکٹ والا عدد 'سلوک' کا ہے۔

(۴) ۲ (۲) اس کا مطلب یہ ہے کہ دوسری 'پوڑی' کا دوسرا نمبر سلوک

(۵) یائے مجہول کے ساتھ ہے۔ (مترجم)

۹: (۲) اِيڌَڻُ ڪيتو مُو گھڻا، پوري ڌِنَيمُ پاءِ
مَنُ وَسندڙو سَچ سُهُ، نانڪ هَبي ڏکڙي اُلاه

[میں نے ایندھن بہت جمع کیا، آگ اسے میں نے کم دکھائی، مَن سچے مالک کے ساتھ آباد ہوا تو اے نانک! سب دکھ ختم ہوگئے۔]

۱۰: (۲) پيکندَڙو(۱) ڪِيُ پُلُ، تُمانُ دِسَمُ سُهٹا
اڍنا لهندڙو مُلهه، نانڪ ساڻ نه جلي مايا

[دیکھنے کی بھول، کہ اندرائن بھی مجھے خوبصورت نظر آیا، وہ آدھی قیمت بھی حاصل نہیں کرے گا، اے نانک! دولت ساتھ نہیں چلے گی۔]

۱۱: (۲) لگڙا سو نه، مَن منجهاء رتيا
وڌڙو سچ ٿوڪ، نانڪ مٺڙا سو ڏٺي

[ایسا عشق و محبت ہوا کہ اندر ہی سے مَن (عشقِ الٰہی میں) رنگین ہوگیا۔]

سامانِ سچ کا میں نے سودا کیا، اے نانک! وہ مالک بہت میٹھا ہے (میں نے یہ سچ کا سودا پسند کیا)

۱۳: (۲) سيتڙا مَن مَنجهاءُ، پلڪ نه ٿيوي پائرا
نانڪ آسڙي نيائي، سدا پيکندو سچ ڏٺي

اندر میں (ایسا) مَن اختیار کر کہ ایک لمحہ کے لیے بھی راز فاش نہ ہو، نانک! ہمیشہ سچ کے مالک کو دیکھنے والا ہی آرزو پوری کرے گا۔

۱۵: (۲) قِيم نه سَکَان پاءِ، سَک مِتي هو پاري
نانڪ سا ويلڙي پرواڻ، جت ملندڙو ماء پري

[قیمت نہ دے سکوں، وہ تخمینہ (اندازے) سے باہر ہے: نانک! وہ اچھی گھڑی (موقعہ) ہوگی جہاں میرا محبوب ملیگا۔]

(ب) راگ 'مارو جی وار(۱)' کے تحت کچھ 'سلوک' دیے گئے ہیں ان میں بھی سرائیکی-سندھی رنگ موجود ہے۔

---

(۱) پیکن (پیکھن) کے معنی ہیں دیکھنا اور پیک (پیکھ) کے معنی ہیں دیدار یا ملاقات۔ یہ الفاظ سندھ میں پرانے دور سے مستعمل تھے، جیسا کہ شاعر امید علی شاہ کے درج ذیل شعر (شاہ عنایت جو کلام، سر دھناسری، فصل ۵، شعر۲/ب) سے ظاہر ہے

آهيدائي اُجرو، سند ۾ سونهي شيخ
اسانهنجو اميد علي چٹي آمي پر سان پيک
وجيو ڏهاڙي ڏيک، ڪوُنريجي قتال کي.

آگے اسی کلام کے کچھ اور بھی فقرے آئے ہیں، مثلاً چڏيو هب آپ، (چھڈیو ہب آپ = ساری خود سری چھوڑ دی)، وکر، (وکھر = سوداگری کا مال)، رکندڙ رب آپ (رکھندڑ رب آپ = رب خود رکھے گا)۔

مثلاً:

۱- تُو چَوْ سجڻ مَيڏيا، ڏيئي سيس اُتار
نيڻ مَهنجي تَرسدي، ڪَڏِ پسي ديدار
[تُو کہہ تُو میرے ساجن، تجھے اپنا سر اتار کرُوں
میرے نَین ترس رہے ہیں کب تیرا دیدار کروں گ۔]ا

۲- نيهو مَهنجا توُ نال، بيا نيهو ڪُوڙا وي ڏيک
ڪَپڙ پيوگ ڏَراوَڻي، جڇڙ پِرِيْ نه ڏيکُ
[میرا عشق تیرے ساتھ ہے، دوسرا عشق جھوٹا دکھاوا ہے
کپڑے اور عیش ڈراؤنے ہیں، جب تک محبوب نہ دیکھا جائے۔]

۳- اُٺي جهالُو ڪَنتڙي(۱)، هونْ پَسي توء ديدارُ
ڪاجَلُ، هارُ، تَمول رَسُ، بِن پَسي(۲) هَبْ رَس ڇارُ
[صبح سویرے اٹھ کر تیرا دیدار کروں/کرتا ہوں
کاجل، ہار، پان کے بغیر (محبوب) دیکھنا سب بیکار ہے۔]

۴- جي تُو مِترْ اَسادڙا، هڪ پوري نه ويڇوڙ
جِيو مَهنجا توء موهِيَا، ڪَڏْ پَسِي جاني توڙ
[اگر تو ہمارا مِتر (مخلص، دوست) ہے تو ایک لمحہ بھی بچھڑ کر نہ جا
مَن میرا تو نے موہ لیا، وہ نہ جانے کب محبوب کو دیکھے گا۔]

راقم نے 'گرو گرنتھ' میں سے مندرجہ بالا چار سلوک منتخب کئے تھے، اس کے بعد 'خالصہ ٹریکٹ سوسائٹی' امرتسر کی جانب سے گرمکھی میں ''ڈکھنے مارو وار-محلہ ۵'' کے عنوان سے شائع کردہ ایک کتابچہ سے ماخوذ درج ذیل سلوک نظر سے گزرے، وہ بھی سندھی-سرائیکی رنگ میں رچے ہوئے ہیں(۱)۔

☆ جا مُو پَسي هَٺِ ۾، پِرِيْ مَهنجو نالِ
هَيي ڏُک لاهِيَا، نانَڪ ندرِ نهالِ
[جیسے ہی میں نے اپنے اندر میں دیکھا (جھانکا) تو (وہاں) میرا محبوب میرے ساتھ تھا،
اسی دیکھنے نے اے نانک! سارے دکھ ختم کردیئے۔]

---

(۱) آدگرنتھ: راگ مارو کی وار، محلہ ۵: ڈکھنے محلہ ۵، ص:۱۰۹۴
(۲) یائے مجہول کے ساتھ ہے۔ (مترجم)
(۳) یہ کتابچہ بھائی لابھ سنگھ اینڈ سنز نے وزیر ہند پریس امرتسر سے طبع کرواکر شائع کیا۔ ہم نے یہ کتابچہ اپنے دوست محترم عین الحق فرید کوٹی کے ہاں لاہور میں مؤرخہ ۲۷ جولائی ۱۹۷۸ء کو دیکھا، انہوں نے بتایا کہ میں نے یہ سلوک اسی کتاب سے لئے ہیں۔ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ آدگرنتھ-گرو گرنتھ کے متن میں ہو بہو اسی طرح لکھے ہوئے ہیں یا ان کا تلفظ کسی اور طرح بھی ہوسکتا ہے۔ 'جنم ساکھی' میں بھی اسی قسم کا کلام موجود ہے، مگر وہ 'آدگرنتھ' میں موجود نہیں ہے۔

☆ ڪپڙ ڀوگ بڪار اي هِيي هي چار
خاڪ لوڙيدا تن کي، جو رتي ديدار
[کپڑے عیش بیکار، یہ تمام کے تمام کچھ بھی نہیں
انہیں خاک چاہئے (مزید کیا چاہئے) جو لوگ دیدار سے (مالامال) رنگین ہوگئے۔]

☆ جاڻو وسندو منجھِي، پَڇاڻو ڪو هيڪڙو
تي تني پڙدا نَهي، نانڪ جي گور پيتيا
[یوں سمجھو کہ وہ مَن میں ہی بستا ہے لیکن اُسے پہچانتا کوئی ایک ہی ہے، اے نانک! وہ ان لوگوں سے پوشیدہ نہیں جنہوں نے گُرو کو پرکھا، یا گُرو کو دان دیا۔]

☆ لوڻُ لوئي ڊٺ، پياس نه بُجهي مُو گهٽي
نانڪ سي آکڙيان بياني، جِني ڊِسَندو مو پِري
[میں نے کوئی پَرتَو دیکھا مگر میری زیادہ پیاس نہیں بجھی، نانک! وہ آنکھیں دوسری ہیں جن سے میرا محبوب دیکھا جاسکے۔](۱)

'مارو جی وار' کے لفظی معنی ہیں 'مارو کی تعریف' اور اصطلاحی معنی ہیں 'ساجن کی تعریف' (ڈھولا-مارو کے لحاظ سے) یا 'محبوب کی تعریف' (رہن سہن کے لحاظ سے)؛ دوسرا معنی ہے 'مارُو (=سادہ لوح، غریب) آدمی کی تعریف' یا 'مارُو (سادہ لوحوں، غریبوں کے) دیس کی تعریف'، کیونکہ اس کے بعد دوسرا لفظ 'ڏکني' (ڈکھنے) ہے، یعنی 'جنوبی' یا 'جنوبی ملک کے'۔ ایک لحاظ سے پنجاب سے نیچے جنوبی ملک سندھ ہی ہے۔ بہرحال اس دور میں سندھ اور سندھی زبان کی اہمیت شمال میں پنجاب تک مسلّم ہوئی اور سندھی زبان جاننے کا دائرہ مزید وسیع ہوا جس کا ثبوت 'آدگرنتھ' میں آئے ہوئے مذکورہ بالا الفاظ، فقروں نیز 'کافی' عنوان کا استعمال ہے۔

سندھی زبان اور ادبی ثقافت کا علاقہ کچھ سے نیچے جنوب کی طرف کاٹھیاواڑ اور گجرات تک وسیع ہونا:

کچھ ملک، سندھ اور کاٹھیاواڑ-گجرات کا درمیانی دہانہ/بندرگاہ تھا۔ تاریخی دور سے قبل جب سندھو ندی کی مشرقی شاخ 'کوری کی خلیج/کھاڑی' میں گرتی تھی، اس وقت 'موئن جو دڑو' (مُردوں کا ٹیلہ) کی قدیم سندھی تہذیب گجرات تک پہنچی، جس کے آثار وہاں 'لوتھل' سے ملے ہیں۔ تاریخی لحاظ سے آٹھویں صدی عیسوی سے سندھ اور کچھ دونوں ایک ہی اسلامی تہذیب کے

(۱) مسٹر بھیرومل نے اس شعر کو یوں لکھا ہے:

لوڻُ لوئي ڏٺ، پياس نه ٻجهي مون گهٽي
نانڪ سي آکڙيان ٻين، جن ڏسندو مان پري

دیکھیے: ''سنڌي ٻولي جي تاريخ''، مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ، طبع ششم ۲۰۰۴ء، ص: ۲۱۵ (مترجم)

مرکز بنے، نیز کچھ کے تجارتی، سیاسی اور سماجی تعلقات سندھ کے ساتھ مضبوط ہوئے۔ سومرہ دور میں سندھی اقوام، بالخصوص سندھ کے سمہ قبائل نے کچھ کو اپنا مسکن بنالیا اور بعد میں سمہ دور تک پورے کچھ کی مقامی زبان سندھی بن گئی اور وہاں کے مقامی ماحول میں سندھی زبان کا 'کچھی محاورہ/لہجہ' ایک نئی صورت میں نمودار ہوا۔

سمہ دور میں سندھی کی عوامی روایات، قصے اور کہانیاں سندھ اور کچھ کے بھاٹوں اور بھانڈوں کے ذریعے کچھ اور کاٹھیاواڑ تک پہنچیں اور مقامی طور پر بھی وہاں سندھی اشعار اور متے (چلیپائی، یا کہانی میں موقع کے دوہے) منظوم ہوئے۔ سندھ کے لوہانوں (لوہانہ ایک ذات کا نام ہے) کے 'برہم بھانڈ' اور سندھ کے سموں کے 'ڈونگر بھانڈ' اور ان کے علاوہ مسلمان ڈھاڈھی(۱) اور مراثی ہمیشہ کے لئے کچھ میں رہائش پذیر ہوگئے جنھوں نے وہاں سندھ کی ادبی روایت اور سندھی ثقافت کو مشہور و متعارف کرایا اور سندھی زبان تمام کچھ میں رائج ہوئی اور وہاں کے مقامی 'کچھی محاورہ/لہجہ' کی صورت میں بولی جانے لگی۔ 'کچھی سندھی' لاڑی سندھی کے زیادہ قریب ہے۔

چودھویں صدی عیسوی کے تقریباً درمیانی عرصے میں کچھ میں سمّوں کی ایک شاخ 'جاڑیجوں' کی سرداری کا سلسلہ شروع ہوا اور آخرکار جاڑیجہ راؤوں نے 'بھج' (بِج) (۲) کو اپنا دارالحکومت بنایا۔ ایک شجرہ نسب کے مطابق جام 'رتہ رائیدھن' کے تین بیٹے تھے: اوٹھو، جس کی اولاد میں سے بھج کے راؤ پیدا ہوئے؛ دوسرا 'دیدؤ' جس کی اولاد سے جاڑیجوں کی ایک اور اہم شاخ نکلی؛ تیسرا 'گجن' جس کی نسل سے 'جام نگر' کے جام پیدا ہوئے۔ سنہ ۱۵۳۷ء میں گجن کی اولاد سے جام راول نے اپنے چچیروں میں سے 'بھج' کے 'راؤ ہمیر جی' کو قتل کردیا، جس وجہ سے اس نے کچھ کو خیرآباد کہا اور سنہ ۱۵۳۹ء میں کاٹھیاواڑ اور ہالار کے علاقہ میں ایک نیا شہر 'نواں نگر' کے نام سے جا کر قائم کیا، جو بعد میں جام راول اور اس کی اولاد میں سے 'جاموں' کے لقب کی نسبت سے 'جام نگر' کے نام سے مشہور ہوا۔

اس طرح سولہویں صدی عیسوی میں سندھی بولنے والے جاڑیجہ جاموں نے اپنا سیاسی اثر ورسوخ کاٹھیاواڑ تک وسیع کردیا اور سندھی زبان کچھ سے بھی آگے ہالار اور وہاں کے اہم شہر جام نگر تک پہنچ گئی۔ اس دور میں اور اس سے قبل سندھ اور کچھ کے سندھی بولنے والے دیگر قبائل مثلاً سمہ، سومرہ، بلوچ، جونیجہ، میمن اور خوجے وغیرہ انجار، رادھن پور، پالھن پور اور آگے کاٹھیاواڑ اور گجرات (بڑودہ) تک پہنچ گئے، اور ان کے ساتھ سندھی زبان بھی وہاں پہنچی۔ ارغونوں سے

(۱) ڈھاڈھی: مراثیوں کی ایک ذات کا نام ہے۔ کماچ اور چوتارا پر گانے والے فقیروں کی ذات۔ دیکھیے: جامع سندھی لغات، جلد سوم، ص ۱۳۸۴ (مترجم)

(۲) 'بھج' کچھ کا اہم شہر اور دارالحکومت تھا۔ (مترجم)

شکست کھانے کے بعد سندھ کے حکمران جام فیروز اور اس کے قریبی رشتہ داروں وغیرہ نے ہمیشہ کے لیے جا کر احمد آباد کو بسایا۔

کچھ-کاٹھیاواڑ اور گجرات میں رہنے والے سندھی قبائل نیز سندھ اور کاٹھیاواڑ کی بحری تجارت اور سندھی ملاحوں کے ذریعے کئی سندھی الفاظ گجراتی میں رائج ہوئے۔مثلاً (۱)۔

سندھی	گجراتی	اردو معنی	سندھی	گجراتی	اردو معنی
پلو	پلا	عمدہ	کیھہ (دز، رٺي)	کیہ	گرد، دھول
ویلو	بیلا	ایک وقت کا	ڏانتڙي	درانتي	درانتی
		کھانا، روٹی،	ماڙي	ماڙي	کوٹھا
		کھانے کا وقت	گُڏي	گُبدي	گڑیا، پُتلی
		حافظہ، عقل، ہوش	ماسي	ماسي	خالہ
سُرت	سرت	مٹھی	بنرو ـ بنري	بنرا	دولہا - دلہن
مُٺ	مُوٹ	رشک، حسد	کَل	ـبنري	کھال، چمڑی،
رِیس	ریس	زبان		کل	پالن ہار
ڄيڀ	جیب	حد، انتہا	پالڻهار		پیراک، تیراک
انت (چيهہ)	انت	لاج	تارُو	پالنهار	کپڑا
پت (لڄ)	پت	جزیرہ، ٹاپو	لٽو، لٽا	تارو	تعویذ، گلے کا
ٻيٽ	بیٹ	تجارت، اسباب	تائٽ، تائيٽ	لتا	زیور
وڻج	بنج	تجارت		تائٽ	
		ہڈی			
			رَتو (ڳاڙهو)		سرخ
هڏو	هاڏ		تتو (گرم)	راتا	گرم
				تاتا	

(۱) ۱۹۳۸ء-۱۹۴۱ء تک کیا چار سال کا عرصہ بی ای کی تعلیم کی غرض سے جھوتا گڑھ میں قیام کیا، اس عرصہ میں کتنے ہی الفاظ کا پتہ پڑا جو سندھی اور گجراتی میں مشترک۔ تھے۔ دیکھیں ''کفات جعفری'' تصنیف اشرف ندوی پبلشر بمبئی ۱۹۶۲ء۔

ہڈ (سڈ)		بُوجھ، سمجھ، فہم	کارو (لوٹ وارو)	کارا	کھاری، شور،
پار (پریون	ہڈ	اُس طرف، اس	جھوڑو (وارن جو)	جوڑا	جھنڈ، بالوں کا گچھا
کنارو)		پار	پاڑو	پاڑا	کرایہ
	پار	مویشی، چوپایہ	ماندو	ماندا	تھکا ہوا، بے حال،
ڈور		قبولیت، منت،			تھکاوٹ
باس	ڈور	نذر			سے چور
	باس	شہرت، دبدبہ	سدا	سدا	سدا، ہمیشہ
ھاک		بغل، پہلو	نوتو (نقصان)	نوتا	نقصان، خسارہ
کچ (بغل)	ھاک	کوکھ، پہلو، پیٹ	ڏھتو	دھوتا	نواسا
کُکَ	کاک	نمک	ناتو	ناتا	ناتا، تعلق
لوݨ	کوک	شلوار	گھڙو ـ گھڙي	گھڙي	مٹکا، سبوچہ، ٹھلیا
سُٿڻ	لُون،	نام	سائين	سائين	جناب، صاحب، مالک
ناںُ ـ نانوُ	نون	سایہ	ڏوئي	دوئي	لکڑی کا چمچہ
چانُ ـ چانوَ	سوتھن	قسم	انڪل (انداز)	انڪل	اندازاً، تقریباً
سُنھن	نانوُ	عورت	ٽڪڙي	تکڙي	پیشانی پر پہننے کا ایک
مائي	چانه	بخت، نصیب،			زیور
پاڳ	سونھ	مقدر	اَنُ	ان	اناج
کنگھه	مائي	کھانسی	ڳبرو	گھبرو	گبرو، نوخیز
چم	پاگ	کھال، جلد چمڑا			
	کانگه				
	چم				

لغات اور الفاظ کے علاوہ کچھ کے بھانڈوں، گویّوں اور ڈھاڈھیوں نے سندھ کے عوامی
ں کہانیوں، پہیلیوں/معموں اور اشعار کو کچھ، ہالار اور اس سے بھی آگے کاٹھیاواڑ اور گجرات
، پہنچایا، اور اس طرح سندھی کے ثقافتی دائرہ کو اس دیس میں وسعت دی۔

راج عرف فقیر پُران ناتھ کے سندھی سلوک (۱):

مہر راج، جاڑیجہ جاموں کے شہر "نواں نگر" (جام نگر) میں ۱۶۱۸ء میں پیدا ہوا۔ وہ جام

ران ناتھ سے متعلق احوال، دہلی کے دانا ادیب سرگوامی ہنر اداس دولت رام سے بذریعہ خطوط دستیاب احوال اور انہی
یک مطبوعہ مضمون "۱۶ - ۱۷ اصدی جو سندھی سنت کوی" (جو کہ پہلے بھارت کے اخبار "ہندواسی" میں مورخہ ۴/ جولائی
ء کو چھپا اور بعد میں ایک مستقل کتابچہ کی صورت میں شائع ہوا) سے اخذ کیا گیا، نیز بعد میں راقم کے دورۂ دہلی (آخر
۱۹۷۰ء) کے دوران "پران ناتھ پرچار مرکز" سے دستیاب ہوا۔

کے دیوان (بڑے وزیر) کیشو ٹھاکر کا بیٹا تھا۔ اس کی والدہ سندھی تھی جس کا نام 'دھن -بائی' تھا، اس لئے مہرراج کی مادری زبان 'سندھی' تھی۔ اس کی ذہنی اور مذہبی تربیت بھی سندھ کے ایک سادھوسنت نے کی، جس کا اصل نام 'دیو چندر' تھا جو بعد میں 'سامی نجانند' کے نام سے مشہور ہوا۔

دیو چندر سندھ کے ترخان حکمرانوں کے دور میں سنہ ۱۵۸۱ء (۱۱-اکتوبر) کو عمرکوٹ میں پیدا ہوا، لیکن بعد ازاں ۱۶۰۶ء میں وہاں سے نقل مکانی کر کے ہمیشہ کے لئے نواں نگر (جام نگر) میں سکونت پذیر ہوگیا۔ مہرراج کی سندھ کے اس سنت کے ساتھ دوستی اور محبت ہوگئی، یہاں تک کہ وہ اس کا چیلا بن گیا اور اسے اپنا گرو تسلیم کرلیا۔ سندھی زبان میں سندھ کے صوفیوں اور سنتوں کے سلوک اور اشعار، کہاوتیں اور نصیحتیں اس نے پہلے پہل اپنے سندھی گرو سے سنیں جن کا نوجوان مہرراج پر بڑا اثر ہوا۔ بعد میں وہ اپنے سندھی گرو کی معرفت سندھ کے بعض تاجروں کے ساتھ بصرہ (عراق) گیا جو اس زمانے میں تجارتی مرکز تھا۔ وہاں اس نے عربی سیکھی اور کسی اللہ والے کی صحبت میں قرآن شریف بھی پڑھا۔ اس کی واپسی کے بعد سامی نجانند (دیو چندر عمرکوٹی) ۷۴ برس کی عمر میں ۱۶۵۵ء (۵-ستمبر) کو جام نگر شہر میں فوت ہوگیا، جہاں ان کی یاد میں 'کھیجرا' مندر قائم ہوا۔ اس وقت مہرراج کی عمر ۳۷ برس تھی۔ گرو کے سدھارنے کے بعد مہرراج نے اپنے خالق سے لو لگا کر فقیری کی راہ اختیار کرلی اور گرو کے آستانے کو آباد کیا اور خود 'پران ناتھ' کے لقب سے مشہور ہوا۔ سندھ میں ٹھٹہ کی طرف اس کی آمد و رفت رہتی تھی۔ سنہ ۶۸-۱۷۶۷ء میں جب وہ سندھ آیا تو مسلسل دس ماہ تک ٹھٹہ میں سکونت پذیر رہا، اور بھائی لال داس اس کا چیلا بنا جس نے بعد میں اس کی سوانح حیات بھی لکھی۔ سامی پران ناتھ (مہرراج) ۲۹/ جون ۱۶۹۴ء کو فوت ہوا۔

سنت پران ناتھ خدا کی وحدت کا قائل موحد درویش تھا، اس نے اپنے پیچھے کویتا کا ایک بڑا ذخیرہ چھوڑا، جو آج تک جام نگر شہر میں محفوظ و موجود ہے۔ اس درویش نے ۱۸۷۵۸ سلوک کہے، جو گجراتی، سندھی، ہندی اور ہندوستانی میں ہیں۔ ہندی میں ایک بڑی کتاب 'قیامت نامہ' لکھی، جسکا عربی میں خلاصہ بھی تحریر کیا۔ عربی زبان (مگر ہندی رسم الخط) میں تصنیف کردہ یہ 'قیامت نامہ' بھی موجود ہے۔ ستر برس کی عمر میں سنہ ۸۹-۱۶۸۸ء میں اس نے 'سندھی بانی'(۱) کہی جس میں ۵۸۴ اشعار اور ۱۶ 'رباعیاں' شامل ہیں۔ کاٹھیاواڑ میں سندھی شعر کا اتنا بڑا ذخیرہ،

(۱) یہ لفظ سنسکرت کے لفظ ''وانی'' کا بگاڑ ہے، جس کے معنی ہیں آواز؛ صدا، بولی، تعریف، ستائش۔ اور ''بانی'' کے معنی ہیں وعظ، تقریر، فقیروں کی صدا، گرو کے منہہ سے نکلا ہوا بول، خدا کی تعریف۔ رباعی طرز کے ہندی گیت۔

دیکھیے: جامع سندھی لغات، جلد اول، ص: ۴۶۰

فیروز اللغات اردو، ص: ۱۴۰۴،۱۷۵ (مترجم)

اُس دور میں سندھی ادب و ثقافت کے وسیع دائرہ کا ایک نمایاں نشان اور تاریخی یادگار ہے۔

'سندھی بانی' جو کہ طبع ہوکر شائع ہوچکی ہے(۱) اس میں شامل کلام کی ترتیب اور زبان سے ظاہر ہے کہ یقیناً وہ اُسی دور کی ہے، نیز یہ بھی ظاہر ہے کہ پران ناتھ نے اپنی 'سندھی وانی' صوفیانہ رنگ میں کہی ہے۔ ذیل میں دیئے گئے اشعار کا مرکزی موضوع، ارواح کا اپنے رب سے جدا ہونے کے بعد درد و فراق، اپنی کوتاہیوں کا اعتراف اور مالک سے رحم اور دَیا کی طلب ہے۔

'سندھی وانی' کے اشعار سندھی زبان کے خالص 'کچھی محاورہ/لہجہ' میں ہیں اور اسی لہجہ میں کہے گئے ہیں؛ مگر وہ دیوناگری رسم الخط میں لکھے گئے ہیں، اور بعض مقامات پر (دیوناگری رسم الخط کی وجہ سے یا خود کاتب کی اپنی تحریر کی وجہ سے) کچھ الفاظ صحیح طرح سے نہیں لکھے ہوئے۔ مثلاً 'تھ' کے تلفظ کو 'تتھ' کرکے لکھا گیا ہے، جیسا کہ 'اتھن' یا 'متتھے'، حالانکہ کچھی لہجہ کے مطابق بھی ان الفاظ کا تلفظ 'اُتھن' یا 'اُتھیَن' اور 'مُتھے' ہے، اسی طرح 'کھے' کو 'کے' لکھا گیا ہے۔ بعض مقامات پر کچھ ہُو بہو (یعنی وہی) الفاظ مختلف صورتوں میں لکھے گئے ہیں، مثلاً: 'چونان'، 'چُہان' اور 'چُو ان'، 'ڈنیون'، اور 'ڈنو'؛ 'اِنھَین' اور 'اِنئِي'، 'عرش' اور 'عرس'؛ 'فرمان' اور فرمان (پھرمان)

'سندھی وانی' کے دس اشعار(۲) اصل تلفظ کے مطابق مگر ضروری اصلاح کے ساتھ ذیل میں دیئے جاتے ہیں تاکہ اس دور میں علاقۂ کچھ کی 'سندھی زبان' کا صحیح اندازہ ہوسکے۔ کئی درستگیوں کو نیچے حاشیہ میں ظاہر کیا گیا ہے۔

سندھی زبان کے کچھی لہجہ کے مطابق اشعار کا اصل رسم الخط:

آخَرَ وِيَرا اُٿڻَ جِيْ، آنٿينْ رُوحينْ(۳) ڇڏيجا راندَ
اُٿي وِچَ عرشَ جي، کوڏَ ڪَري(۴) مِڙوُنْ ڪاند(۵)

☆☆☆

ڏَٿِيْ مُوْهِجي رُوحَ جا، هانٿي چُوئانْ ڪِينْ ڪَري
روحَ ڪي ڏِنو پَر ڏيهڙو، ڇٺو سو دِل ڏري(۵)

☆☆☆

(۱) ''شری مہامتی پران ناتھ پرنیت' سندھی وانی (معنی سمیت)'': شری سندر داس کے دوران لکھی ہوئی اور اصل نسخہ کی بنیاد پر ترجمہ شدہ۔ ایڈیٹر شری ماتا بدر جایشوال، ریڈر ہندی بھاگ الٰہ آباد یونیورسٹی: طابع ''شری پران ناتھ پرکاش'' شری کرشن پرنامی مندر 'شکتی نگر' دہلی۔ اس میں کُل ۵۸۴ اشعار اور ۱۶ رباعیاں شامل ہیں۔

(۲) سورگباشی جترامداس دولت رام نے از راہ مہربانی 'سندھی وانی' کے ابتدائی بیس اشعار 'ہیرے ٹھاکر' کے ہاتھوں دیوناگری سے عربی رسم الخط میں تحریر کرواکر ارسال کیے، جن میں سے ذیل میں دیئے گئے اشعار کے نمبر یہ ہیں: ۱، ۲، ۷، ۸، ۹، ۱۵، ۱۶، ۱۸، ۱۹ اور ۲۰

(۳) پہلے مصرعہ میں 'روحیں' اور دوسرے مصرعہ میں لفظ 'ڪري' یائے مجہول کے ساتھ ہے۔ (مترجم)

(۴) اصل اتٿڻ (اٿڻ) لتتهڻ (اتهڻ)، انٿي، (اٿي) اُنتھی (اُٹھی) اور 'عرس' (عرش) ہے۔

(۵) اصل میں 'روح ڪي ڏنيون' (روح کے ڈنیوں)

مُون مَنگِي آن ڏيکارئي، ڪَرِئان گالَ ڪيئي
هَانئي چورائيِن تہ چُوئان تي، گالَ گَريْ تي پَيئي(۱)

☆☆☆

تَرَ سائيِنْ تہ تَرسانْ، مُونْ ڪي مُونْ مَنجھانْ ڪِي نہ سريو
سيَ گاليُونْ آنْ جي هٿَ ۾، جاٽي تِيَنِهہ ڪريو(۲)

☆☆☆

سِڪائيِنْ تہ سِڪانْ، مُون ۾ سڪڻ نہ ڪينْ
رُو هوندِس تيهي(۳) حال ۾، آئيِنْ رَڪندا جِينْ(۴)

☆☆☆

هِئِنْ چڙھائيِنْ تون تہ سيَ سُک هِئونْ جھَلي
جي سُکَ ڏِئِينْ ميهرَ ڪري تہ پِيئو ڪيرُ پَلي (۵)

☆☆☆

تُون رَسائيِنْ تہ رَسن، توکي پَسَنِ نيڻَ
ڪوڙُ تِئي ڪَنَنَ ڪي، تُوهجَا سُئَنِ مِٺڙا وينَ(۶)

☆☆☆

وِهاري وَتَ اوڏڙي، مِٿي ڏنو پَرَ ڏيھہ
ڏِسانْ نَہ سُئِنان گالڙي، ڪِيْ ڪَرِئانْ چُوئانْ ڪيکيہ(۷)

☆☆☆

جي اَرواحِينْ عرشَ جِيُون، سي سَبَ مون ڏانْ نِهارِين
اَئُونْ پَسانْ آنْ ڏُونْ، هي بِيئيُونْ جَرَهَارِين(۸)

---

(۱) اصل میں 'چورائِي تہ چوان تي' (چورائے تہ چوان تھی) ہے۔ یہاں پر 'تھ' کو 'تھ' ہی کے تلفظ کے ساتھ لکھا گیا ہے۔
(۲) اصل 'ترسائِي' اور 'موھڪي' (= مون ڪي) 'ترسائے' اور 'موکے' (= مُون کے) ہے۔
(۳) یائے مجہول کے ساتھ ہے۔ (مترجم)
(۴) اصل 'سڪائِي'، 'تبھي' اور 'انئي' (ایئن) ('سکائے'، 'تیہے' اور 'اِنئے' (اِئیں)
(۵) اصل 'چڙھائي' اور 'ھو' (چڑھاننی اور ہو)
(۶) اصل 'تو ترسائين ترسڻ' 'توکي بسڻ نيڻ'؛ (دوسری سطر میں) 'ڪنن ڪي'
(۷) اصل 'متئي' (مٿي) متھے یعنی اوپر۔
(۸) اصل 'ارواھين عرس جيون' اور 'موڏان' (دوسری سطر میں) 'اَن اڏون' (= آنْ ڏون)

تو لِکیو فرمانَ ہر، مُون عرش دِلِ مومِنَنِ
سي سُٽي ويڻ فرمانَ جا، مُون جِي جهَلي دِلِ رُوحَن (۱)

لاڑ (جنوبی سندھ) کے سندھی لہجہ کے مطابق یہی اشعار ذیل کے طور پر پڑھے جائیں گے، اگرچہ 'ویرا'، 'چوماں'، 'ڈیکارئي'، 'روھوندس' اور 'میھیر' کے تلفظات بھی زیریں علاقۂ لاڑ میں اب تک رائج ہیں۔ دوسری طرف 'ائین' (آپ) اور 'آنْ' (آپ) 'بالائی علاقہ لاڑ' میں زیادہ رائج ہیں۔ 'چڈیجا' یا 'چڈجائو' ہالہ کے آس پاس والے علاقہ میں زیادہ بولے جاتے ہیں۔ منگی (مانگی)، ھے (ھی=یہ) اور 'ارواحین' (ارواحوں) ان تینوں الفاظ کا تلفظ شمالی سرے والی زبان میں کچھ زیادہ ہی ہے۔ اگرچہ 'ارواحین' کا تلفظ کوہستان اور بیلہ کی زبان میں بھی موجود ہے۔

مندرجہ بالا اشعار علاقۂ لاڑ کے لہجہ میں اور ان کا ترجمہ:

۱- آخر وير اٿڻ جي، آئينْ روحَ چڈيجا راندِ
اٿي وچ عرش جي، ڪوڏ ڪري مِلون ڪانڌ

[آخر اُٹھتے وقت اے روح! تو کھیل کود چھوڑ دینا
عرش کے درمیان کھڑے ہوکر جذب ومحبت سے گلے ملیں۔]

۲- ڏٺي منهنجي روحَ جا، هاٺي چوان ڪيئن ڪَري
روحَ ڪي ڏِنوَ پرڏيهڙو، چٺو سو دل ڏري

[میری روح کے مالک! اب میں کس طرح کہوں!
آپ ہی نے تو روح کو جلاوطن کردیا (فراق دیا)
آپ ہی دل سے سوچ کر انصاف کریں۔]

۳- مون منگي آنْ ڏيکارِي، نہ ڪريان ڳالهہ ڪيهي
هاٺي چَوَرائين تہ چوان تي، ڳالهہ ڳري تي پيئي

[میں نے مانگی آپ نے دکھائی، میں کیا کچھ کہوں
اب تُو کہلواتا ہے تو کہتی ہوں کہ بات بہت بھاری ہوگئی!۔]

۴- ترسائيين تہ ترسان، مون ڪي مون مِنجهان ڪي نہ سريو
سڀ ڳالهيون آنْ جي هٿ ہر، جائيَ تيئن ڪريو

(۱) اصل دونوں سطروں میں 'فرمان' 'عرس' (عرش)، 'مومن' (مومِن)، دوسری سطر میں 'موجو' (= مون جو)

[تُو روکے تو رک جاؤں، مجھے خود سے کچھ بھی نہ بن پڑا
تمام باتیں (اختیارات) آپ کے ہاتھ میں ہے جس طرح آپ چاہیں کریں۔]

۵- سيکارئين ته سِکان، مون ۾ سکڻ نه ڪيئنْ
رهنديس تيهي حال ۾، آئينْ رکندا جيئنْ
[آپ سکھائیں تو میں سیکھوں، مجھ میں تو سیکھنے کی طاقت ہی نہیں
میں تو اسی حال میں رہوں گی جس میں آپ مجھے رکھیں گے۔]

۶- هِنئين چڙهائين تون، ته سڀ سک هِنئون جهلي
جي سک ڏئين مِهرَ ڪري ته ٻئو ڪير پلي
[تُو اگر دل میں بسالے تو دل تمام سکھ حاصل کرلے
اگر تُو مہربانی کر کے سکھ دے تو دوسرا کون روکے۔]

۷- تون رسائين ته رسَنِ، توکي پَسنِ نيڻَ
ڪوڏَ ٿئي ڪنن کي، تنهنجا سٹن مٺڙا ويڻَ
[اگر تُو پہنچادے (وصال کرادے) تو پہنچ جائیں، نین تجھے دیکھ لیں
کانوں میں خوشخبری پہنچے، تیری شیریں باتیں (طعنے اور کوسنے) سنیں۔]

۸- ويهاري وٽِ اوڏڙي، مٺي ڏِنوَ پرڏيهه
ڏسان نه سُڻان ڳالهڙي، ڪيئن ڪريان چوان ڪنهن کي
[مجھے بالکل نزدیک بٹھا کر پھر آپ نے مجھے جلاوطن کردیا
دیکھتی ہوں نہ سنتی ہوں کیا کروں کس سے کہوں؟]

۹- جي ارواحينْ عرش جيون، سي سڀ مون ڏانهه نهارين
آئون پسان آنْ ۾ ڏونه، هي بينيون جَرَ هارين
[عرش پر موجود روحیں میری طرف دیکھ رہی ہیں
میں آپ کی طرف دیکھتی ہوں اور یہ (ارواح) آنسو بہا رہی ہیں۔]

۱۰- تو لکيو فرمان ۾، مون عرشُ دلِ مومنن
سي سٹي ويڻ فرمان جا، منهنجي جهلي دل روحن
[تو نے اپنے فرمان میں لکھا ہے کہ مؤمنوں کا دل میرا عرش ہے
فرمان کے یہ بول سن کر ارواح نے میرا دل تھام لیا۔]

راجھستانی علاقوں تک سندھی زبان وثقافت کا اثر ونفوذ:

سندھ کی مشرقی اور جنوب - مشرقی سرحدیں صدیوں سے راجستانی سرحدوں کے ساتھ متصل رہی ہیں۔ عرب دورِ حکومت میں ایک عرصے تک یہ خطے سندھ کی حکومت کے ساتھ ملحق تھے: یعنی جیسلمیر، باڑ میر سے لے کر نیچے ماروڑا کے مرکزی شہر بھیلمال تک سندھ کی ثقافت کا اثر ہوا۔ طبعی لحاظ سے بھی سندھ کے مشرقی اور جنوب -مشرقی خطوں خواہ پڑوسی راجھستانی خطوں کے حالات ایک جیسے تھے جس کی وجہ سے لوگوں کے دھندوں، پیشوں اور رہن سہن میں یکسانیت رہی۔ سندھ کی کئی قومیں اور قبائل ان خطوں میں جاکر بس گئے اور راجستھان کے ٹھاکروں، سوڈھوں اور بھٹیوں نے آکر سندھ کو آباد کیا۔ اس سے ایک تو دونوں طرف کی اقوام و قبائل کے درمیان گہری میل جول ہوئی دوسرا سندھی اور راجھستانی زبان کے ملاپ سے ایک نئی زبان کو جنم ملا، جسے آج ہم 'ڈھاٹکی' کہتے ہیں۔ دونوں طرف کی قوموں کے قدیم ملاپ کا اہم مرکز سندھ میں شامل وہ اراضی تھی جسے 'کھاوڑ' کہا جاتا ہے۔ موسمِ برسات میں اس اراضی میں گھاس بہت ہوتا تھا اور قدیم دور سے راجستان کی طرف کے بھاگوان لوگ بھی ہر سال ساون رت میں مویشی لا کر کھاوڑ میں آکر رہتے۔ سندھ میں کھاوڑ کی موسمی برسات اور ہریالی اور آسودگی کی یادیں آج تک دعاؤں کے ساتھ چلتی ہوئی آئی ہیں:

ڍَٽَ وٺو، پٽ وٺو، وٺو ڪاوڙ ڪارو
سک وسي ٿي سنڌڙي، پيرن جو پاڙو
قادر ڪامارو، والي تون وسائيين

(ڈھٹ وٹھو، پٹ وٹھو، وٹھو کھاوڑ کھارو(۱)
سُکھُ وسے تھی سندھڑی، پیرن جو پاڑو
قادر کامارو، والی تُونُ وَسائِیینُ)

[ریگستان میں بارش ہوئی، بیابان (پارکر) میں بارش ہوئی، کھاوڑ اور اس کے گاؤں کھارو میں بارش ہوئی، پیر فقیروں کا پڑوس سر زمین سندھ شاد آباد ہوئی۔ اے مولا!- کامارو کو تو شاد آباد رکھ۔]

کھاوڑ کی طرف بھاگوانوں کے اس تاریخی کوچ اور آپس کی میل ملاقات اور سکونت سے وہاں نئی 'ڈھاٹکی زبان' وجود میں آئی؛ جو آج تک کھاوڑ کی خاص زبان ہے؛ اور وہ 'کنٹھے' میں بھی

(۱) علاقہ کھاوڑ میں ایک گاؤں کا نام۔

رائج ہے۔ 'کھاوڑ' کا تمام علاقہ اونچا تھا، اس لئے 'پَٹ' (=نشیبی) کے مقابلہ میں اسے 'ڈھٹ' کہا گیا۔ لیکن یہ اس علاقے کا صفاتی نام تھا؛ اصل نام کھاوڑ ہی ہے، جو قدیم دور سے لے کر تالپور دور تک سندھ میں شامل رہا(۱)۔

تقسیم کے وقت تک اس علاقہ میں مرکزی بڑے قبائل درج ذیل آباد تھے: (ہندوؤں میں سے) سوڈھا ٹھاکر، (مسلمانوں میں سے) سمیجہ، راہوما، نُہڑیا، سنگراسی (مسلمان)، ڈوہٹ (مسلمان) اور بعض دیگر قبائل۔ 'ڈھاٹکی زبان' کا بنیادی ڈھانچہ سندھی ہی ہے، لیکن اس کے لباس میں راجستانی رنگ بھرا ہوا ہے۔

'ڈھاٹکی زبان' قدیم دوْر سے سندھ اور راجستان کی ثقافتوں کو ملانے والی درمیانی کڑی ہے۔ کچھ راجستھانی کہاوتیں اور ضرب الامثال، حکیمانہ اقوال اور عوامی افسانے ڈھول - مارئی وغیرہ ڈھاٹکی ہی کے ذریعے سندھ میں رائج ہوئے: دوسری طرف سندھ کی مثالیں اور کہاوتیں، داستانیں اور افسانے بلکہ بیت اور شعر راجستھان کی طرف رائج ہوئے۔ راجستھان کے علاقے میں آباد سندھی اقوام و قبائل نے سندھی زبان کو وہاں مشہور و متعارف کیا۔

سندھ کے اولیاء اور درویشوں کے کلام کا راجستانی خطوں کے ان فقیروں، بھگتوں، سادھوؤں پر اثر ہوا جو تپسیا اور بھگتی عقائد کے پیروکار اور خالق کی وحدت کے قائل اور موحد تھے۔ خاص طور پر سندھ کے بڑے عالم و عارف اور صوفی قاضی قادن (۱۴۶۵-۱۵۵۱ء) کے کلام کا، راجستان کے درویش دادویال (۱۵۴۴-۱۶۰۳ء) پر بڑا اثر ہوا۔ دادویال نے نہ صرف قاضی قادن کے ابیات سے متاثر ہو کر خود سندھی وائی اور اشعار کہے بلکہ اس کے پیروکار بھگتوں اور فقیروں نے قاضی قادن کے اشعار راجستان اور راجستان سے باہر تک مشہور کر دیے۔

دادودیال کا سندھی کلام:

ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں کہ قاضی قادن کے اشعار سندھ اور سندھ سے باہر ہند میں بھی مشہور ہوئے اور ان میں پنہاں، خالق کی وحدانیت، انسانی اخلاق کی بلندی، سچی محبت اور سچائی کے اسباق کا بڑا اثر ہوا۔ قاضی قادن کے ان بے مثال اشعار کو سندھ میں خاص طور پر میاں شاہ

---

(۱) سندھ میں تحصیل عمرکوٹ کے دو تپوں میں سے دینور کا نصف اور کپلور کا کچھ حصہ، تحصیل کھپرو کا جنوب - مشرقی کچھ حصہ، تحصیل چھاچھرو کا گڈھڑ و سرکل یعنی تین تپے: پارنو، ڈاہلی اور خود گڈھڑو۔ سندھ سے باہر ہندوستان کی سمت میں 'حیسین در'، سُودرو، گرہاب اور رامسر کا حصہ- آج کل ڈھاٹکی زبان درج ذیل حدود کے درمیانی خطہ میں بولی جاتی ہے۔ اگرچہ وہ خاص طرح سے ھاوڑ کی اہم زبان ہے۔ شمال میں 'بڈو باڑو' (بدھو باڑو) جہاں جودھپور، جیسلمیر اور سندھ کی سرحدیں ملتی ہیں، جنوب میں باکھاسر (تحصیل ننگر پارکر) مشرق میں چھوٹن پہاڑ (ہندوستان) اور مغرب کی طرف عمرکوٹ۔

کریم، راجستھان میں دادو دیال اور مشرق ہندوستان میں برہانپور کے رہنے والے سندھی بزرگوں نے مشہور کیا۔

دادو کے متعلق 'دبستان مذاہب' کے مصنف لکھتے ہیں کہ وہ ایک 'ندّاف' یعنی روئی دھننے والے (دُھنا) کے گھر میں پیدا ہوا۔ عام روایت کے مطابق وہ احمد آباد میں پل بڑھ کر جوان ہوا اس کا اصل نام داؤد یار تھا اور سامھر کے درویش شیخ بڈھن صوفی کی دعا سے صاف دل صوفی بن گیا۔ رفتہ رفتہ اکثر ہندو سادھو اور سَنت اس کی عقیدت میں آئے اور اپنے عقیدہ کی رو سے اسے ہندو سمجھنے لگے نیز مسلمان بھی اس کے حلقہ میں داخل تھے اور بنگال میں مسلمان بھی اسے مانتے ہیں۔ دادو کے مریدین میں رجب پٹھان نامی ایک شخص بڑا درویش صفت تھا جس کے اشعار بہت مشہور ہیں۔

میاں شاہ کریم (۱۵۳۸-۱۶۲۳ء) اور دادو دیال (۱۵۴۴-۱۶۰۳ء) ہمعصر تھے۔ اس دور میں سندھ سے باہر بھی کچھ اور درویش مثلاً قاضی محمود (گجرات) احمد، کالُو، ہلُو، سمن اور دوسرے (۱) بھی اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ ان درویشوں کے دوہے اور اشعار سندھ میں مقبول اور شاہ عبداللطیف بھٹائی کے زمانے تک مشہور رہے: وہ دوہے اور اشعار خود شاہ صاحب نے بھی پڑھے یا ان کے روبرو پڑھے گئے اور بعد میں شاہ صاحب کے رسالہ کے سُر ''بیراگ ہندی'' کے تحت لکھے گئے۔ اس سُر کے تحت دادو دیال، سمن اور کالو کے دوہے ان کے نام سے دیے گئے ہیں۔ ہم نے احمد کے ہندی - آمیز دوہے اور درویش دادو کے کچھ سندھی اشعار کافی عرصہ پہلے سنے تھے لیکن اس وقت یہ یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ دادو دیال نے بھی سندھی میں شعر کہے ہوں گے۔ دادو دیال اپنے وقت کا ایک بڑا بھگت اور درویش کوی تھا، اس نے بہت سارے اشعار کہے جنھیں اس کے چیلوں نے جابجا مشہور کر دیا؛ مگر اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اس کے بعد کئی اور لوگوں نے بھی ان کے نام سے دوہے بنا کر مشہور کر دیے۔ ان کے اصل صحیح کلام کو صرف ان کے دوہوں کی ترتیب اور اسلوبِ بیان ہی کے ذریعے کسی حد تک پرکھا جا سکتا ہے۔ سندھ میں دادو دیال کے مشہور اشعار اکثر ان کے نام سے ہی شروع ہوتے ہیں۔ مثلاً شاہ صاحب کے 'رسالہ' کے سر 'بیراگ ہندی' کے تحت دیے گئے ان کے یہ دو شعر:

۱- دادو دعويٰ ڇوڙدي، بن دعويٰ دن ڪٽ ·
ڪتني سودي ڪرگئي، اس پاساري ڪي هٽ

(۱) ان اشعار کو تحریر کرتے ہوئے فی الوقت یہی نام ذہن میں آ رہے ہیں، حالانکہ ہم نے اندرونِ سندھ کئی مجالس و محافل میں دوسرے درویشوں کے دوہے بھی سنے ہیں۔

[دادو دعویٰ چھوڑ دے، بن دعویٰ دن کٹ
کتنے سودے کر گئے، اس پنساری کے ہٹ]

۲-دادو دعويٰ ڇوڙ دي، تو هو وي خير ڪا خير
ناڪِسي ڪي دوستي، ناڪِسي ڪا بير

[دادو دعویٰ چھوڑ دے، تو ہووے خیر کا خیر
نا کسی کی دوستی، نا کسی کا بَیر]

دادو دیال پر قاضی قادن کے کلام کا بڑا اثر تھا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ قاضی قادن ہی دادو دیال کے روحانی رہبر تھے۔ اگرچہ قاضی قادن پہلے ہو گزرے مگر ان ہی کے انمول اشعار نے دادو دیال کو خالق کی وحدانیت کی طرف زیادہ مائل کیا اور اس نے فقیری اور درویشی اختیار کرلی، اس لئے اس نے اپنا کلام قاضی قادن کے اشعار سے متاثر ہو کر ہی کہا۔ دادو دیال کے دوہے اور دوسرا کلام سندھ میں (تیس چالیس برس پہلے) اور اس سے بھی زیادہ راجستھان کی طرف زیادہ رائج تھا۔ کچھ کتابوں میں ان کا کلام قلمبند بھی ہوچکا ہے(۱) اور حال ہی میں ہندوستان کے ہریانہ صوبے کے گاؤں رانیلا میں دادو پنتھی بھگت ہریداس کی قائم کردہ مٹھ سے تقریباً ۶۹ فقیروں درویشوں کا کلام قلمی صورت میں ملا ہے، جس میں قاضی قادن، دادو دیال اور دوسروں کا کلام مختلف عنوانات کے تحت لکھا ہوا ہے۔ قاضی قادن کے کلام کے باب کے تحت بھی کچھ اشعار دادو دیال اور دوسرے شاعر درویشوں کے شامل ہیں، جن سے ظاہر ہے کہ دادو دیال نے قاضی قادن کے کلام سے متاثر ہو کر اشعار کہے۔ قاضی قادن کا ایک شعر تھا:

اکيون آڪاساه، فوجون ڪري اُلَتيُونْ
سوڙهي ڳلي منجهاه، سوجهي پِري لهنديون

[آنکھیں آسمان سے (محبوب کو دیکھنے کے لیے) مل کر جوش و جذبہ سے اتری ہیں، وہ تنگ گلی میں سے بھی انہیں ڈھونڈھ لیں گے۔]

جس پر دادو دیال نے شعر کہا:

دادو! اکيون پسڻ ڪي پِري، اُلَتيان منجهه
جتي بيٺو ما پِري نهاريندو هنجهه(۲)

(۱) مثلاً پرشو رام چترویدی کی کتاب ''دادو گرنتھا ولی'' (مطبوعہ ناگری پرچارک سبھا) اور شری ناگر کی کتاب ''گجرات کے سنتوں کی وانی''

(۲) دیکھیے اسی باب میں دادو دیال کے اشعار۔

[اے دادو! محبوب کو دیکھنے کے لیے آنکھیں اندر (وہاں پر) اُتریں
جہاں پر میرا محبوب ہنس (جیسا خوبصورت) کھڑا ہوا دیکھ رہا ہے۔]

اسی باب کے تحت کچھ اور بھی اشعار غالبًا دادو دیال ہی کے ہیں، جن پر ہم آئندہ روشنی ڈالیں گے(۱)۔ دادو دیال غالبًا سندھ میں کافی عرصہ رہے اور انہیں سندھی زبان سے اچھی واقفیت تھی۔ انہوں نے اکثر کلام راجستانی، ہندی زبانوں میں کہا تاہم سندھی میں بھی کافی اشعار کہے۔ چونکہ وہ کثیر الکلام اور اکثریتی مذہب کا مشہور شاعر اور درویش ہوگزرا ہے، اس لئے دیگر مشہور شعراء کی طرح اس کے کلام میں بھی بعد میں باہر کا (خارجی) کلام خلط ملط ہوگیا: یعنی اس کے بعد دوسروں نے ان کا نام استعمال کرکے دوہے، اشعار بلکہ سندھی 'وائیاں' بھی ان ہی کے نام سے مشہور کردیں(۲)۔ دادو دیال کے کچھ ابیات ذیل میں دیئے جاتے ہیں:

۱- دادو! جهاتي پائي پس پِري، هاٹي لاءِ مَ وير
ستَ سيوئي هليو، پوءِ پسندُون ڪير
[دادو! جھانک کر محبوب کو دیکھ، اب دیر مت کر
تمام قافلہ چلا گیا، بعد میں کسے دیکھے گا]

۲- دادو! غافل چو وتين، منجهين رب نهار
منجهيئي پِيُ پاٹ جو، منجهيئي ويچار
[دادو! کیوں غافل رہتا ہے، اندر میں رب کو دیکھ
اندر ہی میں خود کا مقصود ہے، اندر ہی میں غور وفکر کر]

۳- دادو! غافل چو وتين، آهي منجهه الله
پِري پاٹ جو پاٹ سين، لهي سيوئي ساء
[دادو! غافل کیوں رہتا ہے، اللہ اندر میں ہے
اپنا محبوب اپنے ساتھ ہے، ہر ایک لذت حاصل کرتا ہے۔]

---

(۱) دونوں اشعار کیلیے دیکھیۓ ''قاضی قادن جو کلام'' مطبوعہ دہلی ۱۹۷۸ء، ص۱۱، ۶۰ قلمی پستک ''سنتوں کی وانی'' جس سے یہ اشعار لیے گئے ہیں، اس میں یہ دونوں شعر ایک دوسرے کے آگے پیچھے لکھے ہوئے ہیں: یعنی قاضی قادن کے شعر کے بعد گویا اسی معنی میں دادو دیال کا شعر لکھا ہوا ہے۔

(۲) یہ اشعار ہمیں ہندوستان سے ہیرے ٹھاکر سے دستیاب ہوئے، ہیرے سے ہمیں دادو دیال کے کچھ سندھی ابیات اور وائیاں بطور نمونہ موصول ہوئیں۔ اشعار کی ترتیب اور زبان دادودیال والی ہی تھی؛ لیکن 'وائیاں' جن میں نام تو دادو دیال کا تھا، ان کی زبان زیادہ سے زیادہ ستر سال پہلے کی محسوس ہورہی تھی۔

۴- دادو! جینْ تیل تِلن ۾، جِینْ گَند قلن
جِینْ مکِٹ کیر ۾، تِینْ رب رھن

[دادو! جس طرح تِلوں میں تیل اور پھولوں میں خوشبو ہوتی ہے
جس طرح دودھ میں مکھن ہوتا ہے، ویسے ہی رب (انسان کے اندر) رہتا ہے]

بہرحال سندھ کے صوفی بزرگوں کی برکت سے، بیرونِ سندھ کے درویشوں پر ان کا اثر ہوا، یہاں تک کہ بعض بھگتوں اور درویشوں نے سندھی زبان کے الفاظ اور جملے اپنے کلام میں استعمال کیے، اور کچھ درویشوں نے دادو دیال کی طرح سندھی زبان سے اچھی خاصی واقفیت حاصل کی اور اسی میں کلام کہا۔ دادو دیال کے سندھی کلام کے ذریعے، سندھی زبان اور اس کا ادب و ثقافت، خاص طرح سے راجستانی علاقوں تک پہنچے اور معروف ہوئے۔

زبان کے روایتی ادب کے ذخیرہ میں اضافہ:

ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ سومرہ دوز میں سندھی زبان کے قصوں، کہانیوں کے ادب کی بنیاد مضبوط ہوئی۔ سمہ دور میں صرف نوری اور جام تماچی کی نئی عشقیہ داستان کا اضافہ ہوا؛ مگر اس کے ساتھ دلیروں، سخی لوگوں اور عشاق کی چھوٹی بڑی باتوں کو از سرِ نو اٹھایا گیا اور واقعات کو گانے اور قصہ خوانی کے فن کو عروج پر پہنچایا گیا۔ یہ ادبی اور فنی روایت اپنی جاذبیت اور عام مقبولیت کی وجہ سے سمہ دور کے بعد بھی جاری رہی۔ 'واقعات گانے' کے فن کی ترقی سے کچھ نئی باتیں اور نئی داستانیں پیدا ہوئیں اور کچھ گزشتہ داستانیں مزید مشہور ہوئیں۔ اُن میں سے ''ہمّوں اور دولہہ دریا خان'' اور ''بوبنا اور جراڑ'' کی عشقیہ داستانیں اور ''بڈامانی پُرڈ'' کی دلیری کا کارنامہ خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

دولہہ دریا خان اور ہمّوں راٹھوڑ:

روایتی طور پر یہ داستان اپنے آثار و علامات کی بنیاد پر جام نظام الدین کے دانشمند اور دلیر سپہ سالار دریا خان کی شخصیت سے متعلق ہے۔ ممکن ہے کہ دریا خان نے راٹھوڑ قبیلے کی ہمّوں نام کی حسین لڑکی کے ساتھ بڑی دھوم دھام سے شادی کی ہو اور دریا خان کی زندگی ہی میں وہ بہت مشہور ہوگئی ہو۔ لیکن سنہ ۹۲۷ھ (۱۵۲۰ء) میں جب دریا خان ارغون لشکر سے بڑی بہادری کے ساتھ مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہوا تو ہر جگہ اس کی دھوم مچ گئی اور وہ شہرت کے بامِ عروج کو

پہنچ گیا۔ اس کی شہادت کے بعد اس کی ذاتی خوبیوں اور باتوں اور اعلیٰ کارناموں کو اس طرح بیان کیا گیا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ افسانے بن گئے(۱)۔

دریا خان کا ہموں کے ساتھ شادی کا قصہ خاص طور پر عوام میں ایک دلپذیر داستان کی صورت میں معموں کے ذریعے گایا جانے لگا(۲)۔ مثلاً

گابرَ! گابا ڏبرا تنهنجا هِڏي سائي گاه
ڪَ چوڙيلن چوئيا، ڪَ مُئي اٿن ماء
نڪي چوڙيلين چوئيا، نڪي مُئي اٿن ماءُ
سي ڪيئن مچن مچ ڪري جن ڄام ندي جو ڊاءُ

[اے گابر! تیرے بچھڑے اس قدر ہریالی ہوتے ہوئے بھی کمزور کیوں ہیں، کیا لمبے بالوں والی عورتوں نے انہیں نچوڑ لیا ہے، یا ان کی ماں مرگئی ہے؟ لمبے بالوں والی عورتوں نے انہیں نچوڑا ہے نہ ہی ان کی ماں مری ہے وہ کیسے موٹے ہوں جنہیں جام ندہ کا خوف ہو۔]

ساقی عورت اور میخوار:

ساقی عورت اور میخواروں کی داستان میں قدیم ایرانی مَے فروشوں اور میخانوں کے ماحول کا تخیل سمایا ہوا ہے(۳)۔ یہ قصہ کسی قدیم دور سے ہی سندھ میں رائج تھا، لیکن میخانہ کے ماحول اور مے خواروں کی نفسیاتی کیفیت کی مشکل ترتیب کی وجہ سے یہ بات عوام میں کوئی زیادہ مشہور نہیں ہوسکی۔ ارغون - ترخان - مغلیہ دور میں فارسی شاعری کے عروج کی وجہ سے مئے اور میخانہ،

(۱) جیسا کہ دریا خان کی ابتدائی زندگی کے متعلق کوئی بھی یقینی تاریخی بیان موجود نہیں، اس لئے نہ صرف عام افراد کے لئے بلکہ خاص لوگوں کے لئے بھی اس کی ابتدائی زندگی ایک افسانہ ہے۔ اتنی بڑی تاریخی شخصیت کے متعلق اب تک صحیح طور پر معلوم نہیں ہوسکا کہ وہ کون تھا اور کہاں کا تھا؟ ایک گمنام لڑکے کا وزیر اور سپہ سالار ہونا اس دور کے عوام کے لئے ایک معجزہ تھا۔ سادات یا کسی ولی شخص کے علاوہ کوئی بھی اس درجہ تک نہیں پہنچ سکتا تھا، اس لئے اسے سید زادہ کہا گیا اور اس کی طرف کرامات منسوب کی گئیں۔ ''دُولہہ دریا خان اور ہموں'' کی داستان کے ذریعے یہ راز آشکار کیا گیا کہ وہ سید کبیر شاہ کا بیٹا اور شاہ جلالی کا پوتا تھا۔ یہ داستان اس قدر مشہور ہوئی کہ 'تاریخ طاہری' کے مصنف کو بھی گمان ہوا کہ دریا خان سید زادہ تھا۔ قصہ اور افسانوی دائرہ سے ہٹ کر دیگر زیادہ وقیع روایات کے مطابق وہ لاشاری قبیلہ کا ایک نہایت ذہین لڑکا تھا جس نے لاشاری قبائل کی طرف سے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ٹھٹہ آکر پہلے پہل وزیر کے ہاں نوکری کرلی تاکہ آگے چل کر وہ اپنی ترقی و کامیابی کے ذریعے وزیر اور جام آف سندھ کو لاشاریوں کا طرفدار بنا سکے اور ان کی مدد سے لاشاریوں کے مخالف فریق رند بلوچوں (جو اپنے نوجوان میبرگ کے ذریعے ارغونوں کو اپنا حمایتی اور طرفدار بنا رہا تھا) کو شکست دے سکے۔

(۲) اس قصے کی روایت اور دریا خان کی تاریخی حیثیت پر ہم نے لوک ادب سلسلہ کی انتیسویں کتاب ''مشہور سندھی قصا: سندھ جا عشقیہ داستان-۱'' (مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ ۱۹۶۴ء) کے مقدمہ ص۲۱-۲۶ اور متن ص۲۲۹-۲۷۲ پر مزید روشنی ڈالی ہے۔

(۳) اس داستان اور معموں کے متعلق دیکھیے لوک ادب سلسلہ کی انتیسویں کتاب ''مشہور سندھی قصا: سندھ جا عشقیہ داستان-۱'' (مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ ۱۹۶۴ء) مقدمہ ۲-۴ متن ص۳-۲۰

پیر مغاں اور ساقی، صراحی اور پیالہ، مئے نوشی اور مدہوشی کے موضوعات کچھ زیادہ ہی نمایاں رہے۔ اس موضوع کی روز افزوں مقبولیت کے پیش نظر "سندھی اعلیٰ شاعری" میں بھی یہ موضوع معنوی صورت میں رائج ہوا۔ اس کی پہلی شہادت اس دور کے کامل درویش اور بڑے شاعر میاں شاہ کریم (وفات ۱۰۳۲ھ/۱۶۲۳ء) کے بیان کردہ درج ذیل شعر سے ملتی ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ داستان اس دور میں مشہور ہوئی:

متارڪا گپيرو، گَرَٽُ نہ ٻڌن گوڏ
آيا اڱڻ هوڏ، سِرڏئو سَرُو پِيَنِ

[باہمت جوان تہمد میں کمر کے ساتھ رقم باندھ کر نہیں چلتے لیکن صحنِ میخانہ میں سر کی بازی لگا کر شراب پیتے ہیں۔]

بوبنا اور جراڑ:

اس قصے کے کرداروں کے ناموں مثلاً نظام اور جام شہزادہ، صالح یا سالم وزیر، نادر پہلوان اور ترک بادشاہ سے ظاہر ہے کہ یہ قصہ اس پچھلے دور کا ہے۔ نظام کا بیٹا جراڑ تھا اور بوبنا ڈاہری سردار مارکھ کی بیٹی تھی۔ ان کی شادی کی علامت، یعنی ترکوں اور سمّوں کی رشتہ داری کی علامت، ارغون-ترخان مغلیہ دور کی ہے اور اس لحاظ سے یہ داستان اسی آخری دور میں مشہور ہوئی(۱) اور اسے معتوں کے ذریعے گایا گیا۔ مثلاً

مارک ۽ جلال، کڏون ڪين کوٽيون
يا واڳون تيڪ لڳيون، يا ڳوري ڳل ٻانهون

[مارکھ اور جلال نے کبھی گڑھے نہیں کھودے تھے (کدال نہیں چلائی تھی)
وہ یا تو گھوڑوں پر باگیں ٹیکے رہتے، یا گوریوں کے بازوؤں پر لیٹے رہتے۔]

☆☆☆

اکيون تنهنجون ڪام کهيون، آهن بنا ڪات
سچ چوُ ڙي جلاليا، ڪنهن سَرِ هئين رات؟

[تیرے جادوگر نین شب بیداری کی وجہ سے خون کی طرح سرخ ہیں
جلال! سچی بات بتا، رات کہاں پر تھا۔]

---

(۱) ایضاً مقدمہ ص ۲۱-۲۰ اور متن ص ۱۸۵-۲۲۷

بڈامانی پنرو:

بڈامانی پنرو(۲) سندھ کے کاچھے (سندھ اور کچھ کی سرحد کے پاس) کا ایک سورما سردار تھا۔ اس کے قلعہ پر کسی 'مغل' نے چڑھائی کی۔ اس نام سے گمان ہوتا ہے کہ یہ چڑھائی ارغون-ترخانوں یا مغلوں کے دور میں ہوسکتی ہے۔ اس اعتبار سے یہ داستان اسی دور میں پروان چڑھی اور اسے معماؤں یک ذریعے گایا گیا(۳)۔ مثلاً

بڊاماڻي پنرا، اڄ گهرجين آءُ
ماٽيجي ۽ ماء، ٻيئي وڃن ٻان ۾

[بڈام کے دولھا! آیئے آج تیری ضرورت ہے
سوتیلی اور حقیقی ماں دونوں زندان میں جا رہی ہیں۔]

پنرو نے جواب دیا:(۳)

نڪي پنرو تو ڄائو، نڪي تو وٽ هوءِ
پوءِ ماٽيجي ميهڻو، ڇي لاءِ ڏنوءِ(۴)

[پنرہ نے تجھ سے جنم لیا نہ ہی تیرے پاس تھا
پھر تو نے سوتیلی ماں کا طعنہ کیوں دیا۔]

سندھی شاعری کے مستند تحریری ذخیرہ میں اضافہ:

اس دور میں سندھی شاعری کے تحریری ذخیرہ یعنی اس دور کے معلوم اور مشہور شعراء کے زبانی اور تحریری اشعار کے ذخیرے میں بڑا اضافہ ہوا۔ میاں شاہ کریم نہ صرف اس دور کے ایک بڑے ولی اور شاعر تھے بلکہ اس دور یا اس سے قبل کے سندھی اشعار کے بڑے راوی بھی تھے۔ ان کے ملفوظات میں ابیات کا محفوظ ذخیرہ، اس دور کی سندھی زبان کی ایک مستند دستاویز ہے۔ جس پر ہم آئندہ تفصیلی روشنی ڈالیں گے۔ سندھ سے باہر بھی اس دور میں دادو دیال اور پران ناتھ

---

(۱) 'پُنر ڈ' اس کا نام تھا اور کاچھے کی جس سرزمین (جگہ) پر وہ رہتا تھا اس کا نام 'بڈام' تھا، بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ 'بڈام' اس کی ذات تھی، جسکی وجہ سے اُسے 'بڈامانی' کہا جاتا ہے۔
دیکھیئے: ''ڳاهن سان ڳالهيون''، ص:۹۰ (مترجم)

(۲) تفصیل کے لئے دیکھیے لوک ادب سلسلہ کی ستائیسویں کتاب ''لوڪ ڪهاڻيون۔ ڳاهن سان ڳالهيون'' مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ ۱۹۶۴ مقدمہ ص ۹-۸ اور متن ص ۱۲۲-۱۲۱

(۳) ''ڳاهن سان ڳالهيون'' مقدمہ، ص:(ط) پر یہ جوابی شعر 'پُنر ڈ' کی سگی والدہ کے زبانی بتایا گیا ہے۔ (مترجم)

(۴) ڇي لاءِ ۔ ڇالاءِ (کس لئے)

دو ایسے فقیر اور سادھو تھے جنھوں نے دوسری زبانوں کے ساتھ سندھی میں بھی اپنا منظوم کلام چھوڑا، ان کا ذکر پہلے ہوچکا ہے۔ سندھ سے باہر کی روایات کے ذریعہ دستیاب ہونے والے سندھی ابیات کے ذخیرہ کو ہم بعد میں زیرِ بحث لائیں گے۔ یہاں ہم اس دور میں سندھ کے ان باقی شعراء کا ذکر کریں گے جن کے نام یا ابیات مستند روایت کے ذریعہ ہم تک پہنچے ہیں۔ اگرچہ وہ تمام ابیات بالکل معاصرانہ تحریرات میں محفوظ نہیں ہیں کہ ان کی زبان کی ترتیب و ساخت کو صحیح طرح سے پرکھا جاسکے تاہم مجموعی طور پر وہ سندھ کی مستند روایات کے ذریعے ہم تک پہنچے ہیں اور اسی لئے موجودہ متن کے اعتبار سے بھی اس دور کی زبان، شاعری اور فکر کے آئینہ دار ہیں۔

☆ راجو ستیہ دَل:

درویش راجو ستیہ دَل کے متعلق میر علی شیر قانع تحفۃ الکرام میں لکھتے ہیں کہ جب بھی انہیں کوئی بات یا معاملہ درپیش آتا تو وہ: ''کھڑے ہوکر سُر اور الحان میں کوئی سندھی شعر کہتے اور جو کچھ کہتے وہ وقوع پذیر ہوجاتا تھا''۔ اس درویش نے ۹۷۷ھ میں وفات پائی(۱)۔

اگر وہ عمر رسیدہ تھے تو ان کی ولادت اور بلوغت غالباً سمہ دور میں ہوئی ہوگی؛ اور ممکن ہے کہ وہ جو شعر پڑھتے تھے ان میں سے کچھ ان کے لڑکپن کے یاد کردہ اور سمہ دور ہی کے ہوں۔ البتہ ان کے وہ اشعار تحفۃ الکرام میں بھی نہیں دیے گئے اور نہ آج تک کسی دوسرے ماخذ کے ذریعے معلوم ہوسکے ہیں۔ البتہ اس دور کے دوسرے شعراء کے اشعار تحریر میں موجود ہیں۔

☆ مخدوم نوح:

مخدوم صاحب اپنی ولایت کے اوائلی دور میں مشاہدۂ الٰہی کے متعلق یوں سمجھنے لگے تھے کہ گویا وہ 'ذاتِ حق' کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں۔ ان کی یہ بات سن کر مخدوم جعفر بوبکانی ان کے یہاں تشریف لے آئے اور انہیں یہ ذہن نشین کرایا کہ مشاہداتِ الٰہی کا تعلق ظاہری آنکھ سے نہیں بلکہ اندر کی بینائی سے ہے۔ مخدوم جعفر نے اس بات کو مزید وضاحت سے سمجھانے کی غرض سے مخدوم موصوف سے کہا کہ: آنکھیں بند کرکے پھر توجہ کریں۔ مخدوم نوح نے یوں ہی کیا تو انہیں اندرونی توجہ کی بدولت مزید مشاہدہ نصیب ہوا اور انہوں نے مخدوم جعفر کی بیان کردہ تمام حقیقت کو محسوس کرلیا، بعد میں مخدوم نوح دوسرے لوگوں کی ہدایت کی خاطر بطور مثال کہا کرتے تھے کہ:

''نہ آیو جعفر، تہ نوح تیو ڪافر''
(نہ آتے جعفر، تو نوح ہوتے کافر)

---

(۱) تحفۃ الکرام، سندھی ترجمہ (سندھی ادبی بورڈ) ص ۴۴۹-۴۵۰

مخدوم نوح نے اسی حقیقت کو اپنے اس شعر میں یوں بیان فرمایا کہ:

اپتيان تہ انڌيون، پوريون پرين پسن

آهي اکڙين، عجب پرِ پسڻ جي

[آنکھیں وا کرتا ہوں تو اندھی ہوجاتی ہیں، بند کرتا ہوں تو محبوب کو دیکھتی ہیں
محبوب دیکھنے کے لئے آنکھوں کی بھی عجیب ریت ہے۔]

مخدوم نوح نے غالباً اپنی زندگی آخری دنوں میں مریدین و معتقدین کی ہدایت کے لئے کچھ اشعار بھی کہے، مثلاً:

ماڪَ نہ ڀانيو ماڙهئا، پيئي جا پرڀات

روئي چڙهي رات، ڏسي ڏکوين کي(۱)

[اے لوگو! صبح صادق کے وقت پڑنے والی اوس کو تم شبنم مت سمجھو
وہ تو دکھی انسانوں پر رات کے آنسو ہیں جنہیں بہا کر وہ چلی گئی۔](۲)

مخدوم صاحب نے اپنے آخری ایامِ علالت میں بھی کچھ اشعار کہے، جو زیادہ مشہور ہیں۔ اپنی علالت کو مہلک مرض سمجھتے ہوئے اور بعض اپنے رفیقوں اور پیاروں کی جدائی کو محسوس کرتے ہوئے درج ذیل اشعار کہے:

نہ سي جوڳي جوءِ ۾، نہ سا سڳهي چانئ

ڪاپڙين ڪنوات، وڏيَ ويل پلاڻيا(۳)

[اب تو وہ جوگی بھی نہیں رہے اور نہ ہی چوکھٹ، جو کہ مضبوط تھی
سنیاسیوں نے اپنے اونٹ سویرے (رات کے پچھلے پہر) ہی تیار کر لیے۔]

اپنے ایک چہیتے معتقد 'ابا بکر لکیاری' کے نام پیغام کے طور پر شعر کہا کہ:

---

(۱) یہ شعر حضرت پیر سید محمد راشد روضے دھنی کے خلیفہ محمود نظامانی کڑیو والا نے نقل کیا ہے۔

(۲) حضرت سید محمد راشد روضے دھنی سے اس شعر کی تشریح یوں منقول ہے: جس وقت رات اختتام پذیر ہوتی ہے تب وہ طالبانِ خدا کے فراق میں روتے ہوئی چڑھ جاتی ہے۔ لوگ اسے شبنم کہتے ہیں مگر وہ شبنم حقیقت میں رات کے وہ آنسو ہوتے ہیں جنہیں طالبانِ خدا کی جدائی میں وہ بہاتے ہوئے جاتی ہے۔ دیکھیئے: ملفوظات حضرت روضے دھنی، جلد اول، ص ۲۴۳، باب چہارم، فصل ۷ (مترجم)

(۳) یہ شعر ۱۹۶۵ء میں منعقدہ ایک محفل میں ہمیں فقیر محمد ہاشم سنجرانی نے سنایا اور بتایا کہ انہیں یہ شعر فقیر حاجی محمد صوفی کے ہم مجلس صوبھل فقیر بنگلانی نے سنایا تھا۔

اابابکر آءُ ، سامي سفر هليا
تهان پوءِ متا، سِڪين سناسين ڪي(۱)

ترجمہ: اے ابا بکر! آجائیے، درویش سفر پر جانے والے ہیں
مبادا سنیاسیوں (درویشوں) کو بعد میں ترستا رہے۔

یہ شعر جب ابا بکر نے سُنا تو اپنی طرف سے پیغام کے طور پر کہلوا بھیجا کہ:

اچان ٿو اچان، ڪجائو ڪاجري جي جتا
تهان پوءِ متا، سڪان سنياسين ڪي(۱)

[آتا ہوں آتا، کچھ دیر انتظار کرلینا
مبادا سنیاسیوں (درویشوں) کو بعد میں ترستا رہ جاؤں۔]

مخدوم نوح صاحب نے بروز جمعرات بتاریخ ۷/ ذی القعد ۹۹۸ھ (۱۵۹۰ء) کو وصال فرمایا۔ اس لحاظ سے آخری تینوں اشعار آپ کے ماہِ وصال ہی کے ہوسکتے ہیں۔ البتہ آپ کا پہلا شعر اس سے پہلے اور تقریباً ۹۵۰-۹۹۸ھ کے درمیانہ عرصہ کا ہوسکتا ہے۔

☆ میاں سید علی ثانی شیرازی کا شعر:

اس سے قبل پیر مراد شیرازی کے تذکرہ میں (ص۱۷۸ پر) بیان ہوچکا ہے کہ جام ندہ کے عہد میں سید علی ثانی (بن سید جلال بن سید علی شیرازی اول) سنہ ۸۹۱ھ/۱۴۸۶ء میں پیدا ہوئے تو ان کے نانا پیر مراد شیرازی نے انہیں منظوم فقرہ میں یوں دعا دی:

"اللّٰہ، او ياتي ڏيئي وڏي جمارا"

[اے فرد خانہ! اللہ تجھے بڑی عمر عطا فرمائے۔]

میاں سید علی ثانی کی نہ صرف ولادت بلکہ ان کی تمام تربیت سمہ دور میں ہوئی، کیونکہ سمہ حکومت کے اختتام کے سال (۹۲۷ھ) ان کی عمر تقریباً چھتیس برس تھی۔ میر معصوم لکھتے ہیں کہ سید علی ٹھٹہ کے بڑے برگزیدہ بزرگوں میں سے تھے علم، زہد اور سخاوت میں اپنی مثال آپ تھے؛ اور مکلی کی خانقاہوں پر محافلِ سماع کراتے تھے، انہوں نے سنہ ۹۸۱ھ (۱۵۷۳ء) میں وفات پائی(۲)۔

---

(۱) یہ دونوں اشعار عام طور پر مشہور ہیں۔

(۲) تاریخ معصومی (فارسی متن ۲۱۶) میں تاریخ وفات کا مادہ "فات الحاتم بجودہ" لکھا ہوا ہے جس سے سنہ ۹۸۱ھ برآمد ہوتا ہے۔ ڈاکٹر داؤد پوتہ مرحوم نے ایک قلمی نسخہ کے مطابق متن میں سنِ وفات ۹۷۱ھ درج کیا ہے جو کہ درست نہیں۔ تحفۃ الطاہرین (قلمی) کے مطابق بھی آپ نے ۹۸۱ھ میں وفات پائی۔
"معارف الانوار" کے مصنف نے سالِ وفات ۹۲۲ھ لکھا ہے اور یہ سن بھی غلط ہے کیونکہ تاریخ معصومی کا درج کردہ 'مادہ' صاف ظاہر ہے۔

'معارف الانوار' کے مصنف محمد صالح ولد مُلا زکریا ٹھٹوی نے لکھا ہے کہ: میاں علی ثانی نے جب دوسری بار حج پر جانے کا قصد فرمایا تو علماء کرام اور دیگر حضرات آپ کے ہاں حاضر ہوئے اور گزارش کی کہ آپ امسال ارادۂ حج ملتوی فرمادیں۔ آپ نے ان کی یہ درخواست قبول فرمائی مگر اس موقعہ پر حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے اپنا ہی ایک سندھی شعر پڑھا کہ:

سرتين سانگ سکن جو، مون کي رويو رهائين
آء تي هلان هوت ڏي، تان هو واريو وهارين
وريتيون ورن سين، ويٺيون گهر گهارين
کُهَنّدا ٿيون ڪارين، ڪانه هلائي ڪيچ ڏي(۱)

[سکھیوں کو اپنے سُکھ کا خیال ہے، روتے ہوئے مجھے روک لیتی ہیں
مَیں ساجن کی طرف چلنے کی کرتی ہوں تو وہ لوٹا کر بٹھا دیتی ہیں
سہاگن عورتیں اپنے سہاگوں کے ساتھ گھروں میں بیٹھے زندگی بسر کر رہی ہیں
تھکے ماندے لوگوں کو خراب کرتی ہیں، محبوب کے دیس کی طرف کوئی بھی نہیں بھجواتی۔]

تاریخ معصومی میں ہے کہ میاں سید علی ثانی ایک عالم و بزرگ ہونے کے ساتھ سماع کے بھی شائق تھے۔

آپ مکلی کی خانقاہوں پر سماع کراتے تھے۔ 'معارف الانوار' کے مصنف نے صاف طور پر لکھا ہے کہ جن علماء وغیرہ نے آکر ان سے گزارش کی تھی، آپ نے انہیں اس شعر کے ذریعے جواب دیا اور وہ شعر آپ نے ہی کہا تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ میاں سید علی ثانی ایک عالم و برگزیدہ اور سندھی کے قادر الکلام شاعر تھے۔ آپ کا یہ شعر تقریباً ۹۳۰-۹۶۵ھ کے عرصے کا ہوسکتا ہے، کیونکہ اسی عرصہ کے دوران ہی ان کا حج کے لئے جانا قرینِ قیاس نظر آتا ہے۔ ان کے ایک ہمعصر اللہ ڈنو درس ان سے بیت بازی کرتے تھے لیکن اللہ ڈنو درس کے ان اشعار کے متعلق آج تک کچھ بھی معلوم نہیں ہوسکا ہے۔(۲)۔

---

(۱) معارف الانوار کے قلمی نسخہ سے اخذ کردہ۔ اصل عبارت یوں ہے: ''تپندا ٿيون کهَارين'' جسے یوں پڑھا جائے گا: 'تہ پنڈان ٿيون ڪارين' (یعنی چلنے سے انہیں خفا کرتی اور تھکاتی ہیں) لیکن اسے غالباً اصل میں اسی طرح پڑھا جاتا تھا جس طرح اوپر لکھا گیا ہے۔

(۲) دیکھیے ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتہ کا مضمون ''سندھی قدیم شاعری'' رسالہ 'نئی زندگی' ماہ ستمبر ۱۹۵۸ء

☆ مخدوم میاں وُنہیو چانیہو:(۱)

تحفتہ الکرام میں میر علی شیر قانع نے انہیں اپنے دور کے مشائخ و اولیاء کبار میں "صاحب حال و قال" بتایا ہے۔ ۱۰۰۱ھ میں آپ نے وفات فرمائی آپ کا سالِ وفات 'مات فی عشق' (عربی میں) اور 'در عشق جاں سپرد' (فارسی میں) کے تاریخی مادوں سے نکلتا ہے۔ آپ ٹنڈو اللہ یار سے ٹنڈو آدم کی طرف جانے والی پختہ سڑک کے متصل مغرب کی طرف مدفون ہیں، جہاں پر بعد میں بیگلار خاندان کے سربراہان بھی مدفون ہوئے۔ آپ کا درج ذیل شعر ہمیں ولھاری بزرگوں کے کتب خانہ کے باقی ماندہ کاغذات میں سے ایک ورق پر لکھا ہوا ملا، جس کے پیچھے بطور تصدیق لکھا ہوا تھا کہ:

"کلام مخدوم وَنھیہ":

ڏکن سين (مر) گهار، نيباهو نه سُکڙا

جهڙي تهڙي حال، لنگهي ويندا ڏينهڙا

[دکھوں کے ساتھ (کاش) زندگی گزار دے، سکھ نبھاؤ کرنے والے نہیں جیسے تیسے حال میں دن بیت ہی جائیں گے۔]

☆ مخدوم قاضی عثمان دربیلائی:

میر معصوم نے "تاریخ سندھ" میں ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سب سے بڑے عالم تھے اور انہیں تمام علوم پر دسترس تھی۔ ازاں سواءِ بڑے پرہیزگار، متقی، نہایت متواضع اور معصوم صورت تھے، کسی سے کبھی نذر و نیاز قبول نہیں کیا، آپ کی بڑی درسگاہ تھی، اپنی زندگی اساتذہ اور شاگردوں کے ساتھ بسر کی اور ان کی خاطر تواضع اور خدمت میں گزار دی۔ سنہ ۱۰۰۲ھ میں آپ نے وصال فرمایا۔

مخدوم عثمان کا شعر بھی ہمیں ولھاری بزرگوں کے کتب خانہ کے باقی ماندہ کاغذات میں سے ایک ورق پر لکھا ہوا ملا جسے موجودہ رسم الخط میں یوں لکھا پڑھا جاسکتا ہے:

جيکين لهيو سو پس، اٹ - لهيو ڪونه مري

ڳالهيون ان جلّ و عليٰ وهيٹيون، هن گوليءَ ڪونهي وس(۲)

---

(۱) نام: وَنھیو، اور ذات: چانیہو ہے۔ (مترجم)

(۲) یہ دونوں شعر خطی ورق کی فوٹو اسٹیٹ کے ساتھ ماہنامہ "نئی زندگی" اگست - ستمبر ۱۹۸۱ء میں پہلی مرتبہ راقم کے مضمون میں شائع ہوئے۔

مخدوم ونيهو اور مخدوم عثمان کے ابیات کے ایک صفحے کا عکس

[جو لکھا ہوا ہے اس کا مشاہدہ کر، بن لکھے کوئی نہیں مرتا
اس جل وعلیٰ ذات کے اختیار کی باتیں اِس کنیز کے اختیار میں نہیں۔]

☆ شاہ خیرالدین اور ان کے ہمعصر درویش کے اشعار:

شاہ خیرالدین قادری طریقت کے ولی سکھر میں مدفون ہیں۔ ۹۱۱ھ میں بغداد میں پیدا ہوئے، لیکن آخر الامر سکھر میں سکونت پذیر ہوئے جہاں پر سنہ ۱۰۲۷ھ میں وصال فرمایا۔ عام روایت ہے کہ ایک درویش آپ کے ہاں آتا جاتا تھا، جو ایک سال حاضر نہیں ہوا۔ شاہ خیرالدین نے اس کے متعلق استفسار فرمایا تو معلوم ہوا کہ دریا خوردی کی وجہ سے درویش کی خانقاہ ریت میں دب گئی ہے۔ یہ سن کر شاہ خیرالدین گھوڑے پر سوار ہو کر اس جگہ پہنچے اور جب اوپر سے ریت اور مٹی ہٹائی گئی تو اس درویش کی کوٹھڑی نظر آئی۔ دروازہ کھول کر دیکھا تو درویش صحیح سلامت سجدہ میں پڑا ہوا نظر آیا یہ دیکھ کر شاہ خیرالدین اس سے مخاطب ہوئے:

نہ تو ڪعبو، نہ تو قبلو، رهين ٿو منجهہ سجود
ويساري پاڻ کي، ملين سان دريا

[تو کعبہ ہے نہ قبلہ، (پھر بھی) تو سجدہ میں رہتا ہے
خود کو بھلا کر دریا سے ہم آغوش ہوگیا ہے۔]

یہ سن کر درویش نے جواب دیا کہ:

ڪوہ ڪندو تن قبلو، جن سڃاتو سلطان
پرين اسين پاڻ، سجود ڪرهون ڪن کي

[قبلہ ان لوگوں کو کیا کرے گا جنھوں نے 'سلطان' کو پہچان لیا
ہم خود ہی محبوب ہیں، سجدہ کسے کریں۔]

وصال کے وقت شاہ خیرالدین کی عمر ۱۱۵ سال تھی۔ مذکورہ بالا روایت کے مطابق انہوں نے تقریباً اَسی (۸۰) برس کی عمر تک گھوڑے پر سواری کی ہوگی، اس اعتبار سے یہ اشعار اندازاً ۹۹۰ھ/۱۵۸۲ء کے ہوسکتے ہیں(۱)۔

---

(۱) ''لب تاریخ سند'' میں خدا داد خان نے یہ شعر اسی طرح دیے ہیں۔ (دیکھیے ''لب تاریخ سند'' راقم کی تصحیح سے فارسی متن ص ۱۵۰، مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ ۱۳۷۸ھ/۱۹۵۹ء) لیکن یہ شعر مقامی طور پر مشہور رہے ہیں اور بعض دیگر روایات کی رو سے ان کے پڑھنے میں اختلاف ہے۔ تذکرہ لطفی (حصہ اول، ص ۴۷) میں بتایا گیا ہے کہ ''رسالہ غنچۂ امید'' اگست ۱۹۲۳ء میں ان کی یہ گفتگو اس طرح درج ہے:

سوال: نہ تون ڪعبو، نہ تون قبلو، رهين منجهہ سجود
جواب: ڪوہ ڪندا قبلا، جن سڃاتو سلطان
پرين اسين پاڻ، ڪريون سجدو ڪنهن کي.

☆ مخدوم عثمان اگھم کوٹی:

میاں شاہ کریم نے بیان فرمایا ہے کہ: مخدوم محمد اسماعیل سومرہ، فقیر بھی تھے اور غنی بھی، آپ کے ہاں بھینسیں کثرت سے ہوتی تھیں۔ ایک مرتبہ مخدوم اسماعیل کی بیٹی نے مخدوم عثمان سے، جو اس دور کے زیرک شخص تھے، پوچھا کہ ہماری لونڈیاں دودھ بلوتے وقت پاؤں کو اکڑا کر متھانی/بلونی چلاتی ہیں تو اس وقت دہی کے کچھ قطرے پاؤں کو لگ کر دوبارہ اسی برتن میں گرتے ہیں، کیا وہ قطرے پاک ہیں؟ مخدوم عثمان نے اس کے جواب میں یہ شعر پڑھا:

چارِيْ پَلَ ۽ چِڪَ ۾، پُڇي پاريرَ وِٺ
ان اهڙي احتياط سين، ڦِٽ پچاٽا ڦِٽ(١)

[چاروں پلو کیچڑ میں لت پت ہیں اور پوچھتا ہے کبوتر کی بیٹ
کے بارے میں ایسی احتیاط پر بار بار لعنت ہو۔]

مخدوم محمد اسماعیل سومرہ اگھم کوٹ (موجودہ اگھامانہ) کے رہنے والے تھے اور وہاں ہی سنہ ۹۹۶ھ (۱۵۸۸ء) میں وصال فرمایا۔ مذکورہ بالا قصہ ان کی زندگی کے درمیانی دور ۹۵۰-۹۷۰ھ) کا ہوسکتا ہے، جس زمانے میں ان کے گھر میں کثرت سے دودھ بلویا جاتا تھا اور خود ان کی بیٹی بھی دودھ بلوتی تھی۔ مخدوم عثمان شاید ان کے کوئی عزیز رشتہ دار تھے جن سے ان کی بیٹی نے یہ سوال پوچھا اور انہوں نے اس کے جواب میں یہ شعر پڑھا۔ اس قصہ کی علامت سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ شعر مخدوم عثمان کا اپنا کہا ہوا ہے۔

☆ میاں شاہ کریم کے ایک ہمعصر درویش کا شعر:

ایک دن شاہ کریم سوار ہوکر اپنے مریدین کے ساتھ کہیں جا رہے تھے کہ راستے میں ایک ایسے شخص سے ان کا آمنا سامنا ہوگیا جو درویشی، مجاہدۂ نفس اور ترکِ لباس کی وجہ سے مشہور تھا۔ لیکن اس وقت اس کے بدن پر سفید لباس اور سر پر بڑی دستار تھی۔ شاہ کریم نے اس کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ: تو وہی ہے جو پہلے تھا؟ وہ شخص شاہ کریم کا مطلب سمجھ گیا اور اس نے یہ شعر پڑھا:

ڦِتيون ڪَرِ ڦڙڪيون، ورَ وِنگائي پاءِ
جا تَنَ اندر ڪاءِ، سا معلوم محبوب ڪي(٢)

[چھوٹی پگڑی باندھنا ترک کر، ٹیڑھے ہی پیچ باندھ
تن من میں جو (روگ) عشق ہے، وہ محبوب کو معلوم ہے۔]

(۱) 'شاہ کریم بلڑی وارے جو کلام' ۱۹۳۷ء، ص ۱۱۰-۱۱۱

(۲) ایضاً ص ۳۰

ظاہر ہے کہ یہ شعر میاں شاہ کریم کی وفات (۱۰۳۲ھ) سے کم از کم تیس برس پہلے کا ہے، جس زمانے میں شاہ کریم گھڑسواری کرتے تھے۔

☆ میاں شاہ کریم کے ایک اور ہمعصر کا شعر:

میاں شاہ کریم سے ان کے مریدین نے پوچھا کہ: فلاں شخص یہ شعر پڑھتا ہے، ہمیں حیرت ہے اور اس کے معنی نہیں سمجھ پا رہے:

وائي وڃيم چالَ ءِ ڪَنينْ سين ڪِينَ سُڻيانْ
ڀلو ڪري ڀالَ ته اکيين سين انڌو ٿِيانْ(۱)

[کاش گونگا بن جاؤں اور زبان سے بہرا ہو جاؤں
خدا پاک مہربانی فرمائے تو آنکھوں سے اندھا ہو جاؤں۔]

یہ شعر میاں شاہ کریم کے وصال (۱۰۳۲ھ) سے پہلے کا کہا ہوا ہے۔

شاہ کریم کے زبانی بیان شدہ اشعار اور ان کی زبان:

شاہ عبدالکریم (۹۴۴-۱۰۳۲ھ/۱۵۳۸-۱۶۲۳ء) اپنے دور کے صاحب الفت صاف دل صوفی اور ولی شخص تھے، ان کا اخلاق و کردار اسلامی تصوف و طریقت کا روشن آئینہ تھا۔ وہ اپنے مریدین و معتقدین اور دوسروں کی رہنمائی و ہدایت کے لئے وقتاً فوقتاً عمدہ نصیحتیں کرتے اور موقعہ اور موضوع کی مناسبت سے بہترین سندھی مثالیں بطور شعر سناتے تھے۔ آپ کے وہ ''ملفوظات'' (نصائح، ہدایات اور مثالی اشعار) آپ کی وفات کے چھ سال بعد سن ۱۰۳۸ھ میں آپ کے ایک دانا، دیندار اور مرید صادق محمد رضا ٹھٹوی نے ''بیان العارفین و تنبیہ الغافلین'' کے نام سے کتابی صورت میں قلمبند کیے۔ دیگر ہدایات اور نصائح کے ساتھ ان میں جو اشعار تھے وہ محمد رضا اور دوسرے مریدین نے خود شاہ کریم سے ان کے زبانی سنے تھے۔

محمد رضا نے 'بیان العارفین' فارسی میں لکھی، اس کے بعد اس کے سندھی میں بھی تراجم طبع ہوئے۔ خوش قسمتی سے ڈاکٹر داؤد پوتہ مرحوم کو خود محمد رضا کے ہاتھ کی لکھی ہوئی اصل 'بیان العارفین' (فارسی) دستیاب ہوگئی، جس سے انہوں نے تقابل کر کے سندھی اشعار کو اپنی مرتب کردہ کتاب ''شاہ کریم بلڑی وارے جو کلام'' میں شامل کیا، جس کے حوالہ جات اس سے قبل باب پنجم میں آچکے ہیں۔ اس کتاب میں ایک سو سے زائد اشعار شامل ہیں، جن میں سے ۹۴ اشعار (کسی اور ثبوت نہ ہونے کی بناء پر) ڈاکٹر صاحب نے مرحوم شاہ کریم کی طرف منسوب کر کے لکھے

(۱) 'شاہ کریم بلڑی وارے جو کلام' ۱۹۳۷ء، ص ۶۹

ہیں مگر ان کے ساتھ انہوں نے یہ بھی واضح طور پر لکھا ہے کہ:

''یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ ان ۹۴ اشعار میں سے کتنے شعر شاہ کریم کے ہیں؛ کیونکہ بیان العارفین کے مصنف نے سواء چند ایک مقامات کے کہیں پر بھی وضاحت سے نہیں بتایا کہ یہ اشعار خود شاہ کریم کے ہیں۔''(۱)

داؤد پوتہ صاحب کی یہ رائے بالکل درست ہے کہ، یقین سے نہیں کہا جاسکتا، کہ بیان العارفین میں کون سے شعر خود شاہ کریم کے ہیں؟ کتاب میں ایک سو تین مکمل اشعار(۲) اور دو مصرع درج ہیں۔ ان میں سے موجودہ معلومات کی بنیاد پر خواہ ہماری اپنی سوچ بچار کے مطابق کم از کم ۱۵ اشعار یقینی طور پر دوسروں کے ہیں(۳) اور باقی ماندہ ۸۸ اشعار اور دو مصرعوں میں سے بھی سب کے متعلق یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ شاہ کریم ہی کے ہیں(۴)۔ البتہ ان میں سے اکثر اشعار میاں شاہ کریم کے ہوسکتے ہیں، خاص طور پر وہ اشعار جو میاں شاہ کریم نے دوسروں کے اشعار کے جواب میں کہے، وہ یقیناً انہی کے ہیں۔ بہرحال یہ تمام اشعار

---

(۱) 'شاہ کریم بلڑی وارے جو کلام' دیکھیے مقدمہ کے طور پر ڈاکٹر داؤد پوتہ کا نوشتہ 'شاہ کریم جے زندگی جو احوال' ص۲۶-۲۷

(۲) ڈاکٹر داؤد پوتہ نے جن مکمل اشعار اور مصرعوں کو نمبر شمار دیا ہے وہ کل ۹۴ ہیں، لیکن انہوں نے ان میں سے ایک شعر کو دو مرتبہ شمار کیا ہے۔ درحقیقت شمار نمبر ۱۵ اور ۸۱ ایک ہی شعر ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ نمبر شمار دیے ہوئے اشعار ۹۱ اور دو مصرعے، کل ۹۳ عدد ہیں۔ اس کے علاوہ ۱۲ عدد دوسرے سندھی اشعار بھی ہیں جو درج ذیل صفحات پر موجود ہیں۔ (صفحات: ۲۰، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۳۶، ۶۱، ۶۹، ۸۳، ۸۸، ۹۴، ۱۱۱ اور ۱۱۳)

(۳) ان میں سے سات اشعار قاضی قادن کے نام سے ہیں (دیکھیے: 'شاہ کریم بلڑی وارے جو کلام' ص۲۶، ۲۷، ۲۸، ۳۶، ۸۸، ۹۴ اور ۱۱۳) نیز ایک شعر (شعر نمبر ۳۰) دہلی سے مطبوعہ قاضی قادن کے اشعار کے ذخیرہ میں (نمبر ۳۳) موجود ہے؛ اور ایک شعر (نمبر ۷۸) محمد غوثی گوالیاری نے اپنی کتاب 'گلزار ابرار' میں بصورت ترجمہ قاضی قادن کے نام سے درج کیا ہے؛ ایک اور (شعر نمبر ۴۸) شعر پراڑ ذات/قوم کے شاعر کا ہے جس میں اس کا نام بھی موجود ہے؛ ایک اور (ایضاً ص۱۱۱) شعر مخدوم عثمان اکھمی کا ہے؛ باقی چار دوسرے شعر (ایضاً ص۲۰، ۶۱، ۶۹ اور ۸۳) ایسے ہیں جن میں سے ایک شعر تو راہ چلتے ہوئے شاہ کریم کے ایک شناسا شخص نے ان کے سامنے پڑھا اور تین اشعار دوسرے شعراء کے ہیں جن کے معنی کے متعلق آپ کے مریدین نے آپ سے سوال کیا تھا۔

(۴) بیان العارفین میں درج وہ اشعار جن کے متعلق بتایا گیا ہے کہ: ''پھر آپ نے یہ (ایک یا دو) شعر پڑھے'' وہ اکثر شاہ کریم ہی کے ہیں؛ دوسرے وہ اشعار جو کسی بات کے اختتام پر صرف 'شعر' کے عنوان سے درج ہیں ان میں سے کچھ اشعار دوسروں کے بھی ہوسکتے ہیں۔ ہماری سوچ کے مطابق ان اشعار میں سے دو چار شعر ایسے ہیں جو شاید کسی اور کے ہیں۔ ابتدائی شعر نمبر ۱ پہلے کا ہوسکتا ہے، کیونکہ قاضی قادن کا ایک شعر گویا اس شعر کے معنوی جواب کے طور پر کہا ہوا ہے۔ شعر نمبر ۱۷ غالباً قاضی قادن ہی کا ہے، کیونکہ قاضی قادن ہی نے 'کھاہوڑیوں' (فقیروں کے ایک گروہ) کے معنوی مضمون کا آغاز کیا، جس پر ان کا اپنا ایک شعر (دہلی سے مطبوعہ کلام، شعر نمبر ۳۶) بھی گواہ ہے۔ دوسرا یہ کہ اس شعر میں 'کھاہوڑیاں' لفظ جمع کی صورت میں شاہ کریم کی لاڑی زبان کے مطابق نہیں بلکہ شمالی سندھ کی قاضی قادن کی زبان (یعنی لہجہ اور انداز) کے مطابق ہے۔ شعر نمبر ۷۷ قاضی قادن کا ہوسکتا ہے کیونکہ اس کے بعد والا شعر نمبر ۷۸ بھی قاضی قادن کا ہے جس کی غوثی نے بھی تصدیق کی ہے۔ شعر نمبر ۲۸ بھی غالباً کسی اور کا ہے، کیونکہ اس میں موجود لفظ 'سیک' کے معنی شاہ کریم نے سمجھائے ہیں۔

(اور مصرعے) مریدین نے میاں شاہ کریم کے روبرو ان کی وفات (۱۰۳۲ھ/۱۶۲۳ء) سے قبل ان کی زبانی سنے، جنہیں بعد میں محمد رضا نے رجب ۱۰۳۸ھ (۱۶۲۹ء) میں لکھا۔

میاں شاہ کریم ٹھٹہ علاقہ کے رہنے والے تھے اور محمد رضا بھی ٹھٹہ میں رہتے تھے اور جن دیگر افراد سے محمد رضا نے وہ اشعار سنے اور لکھے وہ بھی اکثر اسی علاقہ کے باشندہ تھے۔ شاہ کریم نے اپنی زندگی کے آخری تیس بتیس سالوں ہی میں یہ اشعار بطور نصیحت و ہدایت اپنے مریدین کے روبرو پڑھے ہوں گے اور ان کے مریدین کو بھی اتنے ہی عرصہ میں پڑھے ہوئے اشعار یاد رہ سکے ہوں گے۔ اس لئے کافی وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ ان اشعار کی زبان (لہجہ اور انداز) اور پڑھنے کا طریقہ جو ہم تک تحریرًا پہنچا ہے وہ تقریباً (۱۰۰۰-۱۰۳۸ھ (۱۵۹۱-۱۶۲۹ء) کے دور کی سندھی زبان ہے، جو لاڑ (جنوبی نشیبی سندھ) خصوصاً ٹھٹہ پرگنہ میں رائج تھی۔ 'بیان العارفین' میں درج قاضی قادن اور بعض دیگر شعراء کے اشعار بھی اسی زبان کے تلفظ کے مطابق ہی بیان ہوئے اور لکھے گئے ہیں۔ اس لئے کہہ سکتے ہیں کہ 'بیان العارفین' میں درج شدہ تمام اشعار سولہویں صدی کے اواخر اور سترہویں صدی کے نصف اول کی 'لاڑی سندھی' کی پختہ دستاویز اور مستند مثالیں ہیں۔ سندھی زبان اور شاعری کا یہ قدیم ترین اور بڑے میں بڑا ذخیرہ ہے، جو اس دور کی 'معاصرانہ' تحریر و کتابت میں ہم تک پہنچا ہے۔

ان اشعار کے مطالعہ سے اس دور کی لاڑی سندھی زبان کے بارے میں بالعموم اور ٹھٹہ علاقہ کی زبان کے متعلق بالخصوص درج ذیل نتائج قائم کیے جاسکتے ہیں:

(الف) باوجود اس کے کہ سندھ میں عربی و فارسی تعلیمی سلسلہ رائج تھا اور ان زبانوں میں اولیاء اللہ اور علماء کا علم و آگہی بھی عمدہ تھی (۱) سندھی زبان خالص صورت میں لکھی اور بولی جاتی تھی۔ 'بیان العارفین میں درج ایک سو تین اشعار اور دو مصرعوں کے بڑے ذخیرہ میں، جن میں علم و فکر کے بڑے گہرے خیالات پوشیدہ ہیں، صرف تقریباً ۲۷ عربی الفاظ (۲) اور تقریباً چار فارسی الفاظ (۳) استعمال ہوئے ہیں۔

---

(۱) شاہ کریم کو فارسی کی اچھی خاصی تعلیم حاصل تھی، انہیں مولانا روم کی 'مثنوی' اور 'دیوان کبیر' کے اشعار برزبان یاد تھے۔ وہ مریدین کے ساتھ اپنی مجالس میں قرآن پاک کی آیات اور فارسی اشعار پڑھتے تھے۔ ان کا سنایا ہوا ایک فارسی شعر غالبًا ان کا اپنا ہی تھا جسے محمد رضا نے صحیح طرح سے نہیں لکھا اور وہ اصل میں شاید یوں تھا:

گر دستِ من تہیست، ولی چشم من پُر است
دریای دل من است کہ آں پُر از گوہر است

(۲) ان کے علاوہ چار پانچ الفاظ عربی ہی سے نکلے ہوئے مگر سندھی (رسم الخط) صورت میں ہیں، جاب (جواب)، ھو (ھُوَ)، مجازي حقيقتن، سلامی۔ اس کے علاوہ تین عربی کتابوں کے نام بھی ہیں مثلاً: کنز، قدوری اور کافیہ۔

(۳) دم، داغ، نابودی اور نادیدی۔ ایک اور لفظ 'مُلو' (مُلّا) سندھی صورت (رسم الخط) میں استعمال کیا گیا ہے۔

(ب) زبان جس طرح بولی جاتی تھی اسی طرح لکھی اور پڑھی جاتی تھی: یعنی عوام اور پڑھے لکھے لوگوں کی زبان میں فرق نہیں تھا۔ اسی فرق نہ رکھنے ہی کی وجہ سے علماء اور خواندہ لوگوں نے زیادہ تر الفاظ ویسے ہی لکھے جیسے تمام عوام میں وہ بولے جاتے تھے۔ عربی اور فارسی الفاظ کے ساتھ بھی 'غلط العام' کا اصول لاگو رہا، جس پر درج ذیل مثالیں گواہ ہیں:

جابُ مَ ڏي = جواب مَ ڏي (جواب مت دے)

سڄڻ ساٺ هيڪڙي = سڄڻ ساعت هيڪڙي (ساجن ساعت ایک)

وائي وڃيم چال = وائي وڃيم شال (خدا کرے کہ میں گونگا بن جاؤں)

(ج) ہم اوپر 'دوسرے باب' کے تحت بعض قدیم سندھی فقروں اور جاٹوں کی زبان کے مطالعہ کی بنیاد پر کہہ آئے ہیں کہ اس دور کی سندھی زبان میں طویل حروفِ علت (آ، او، ای) اور 'اضافت' یا 'جر' کے جداگانہ حروف (جے، کھے، میں وغیرہ) کا سلسلہ موجود نہیں تھا۔ اس دور میں بھی طویل حروفِ علت کے تلفظات کے بجائے چھوٹے حروفِ علت زیر، زبر، پیش ہی کے تلفظات (زیادہ نہ سہی مگر کچھ نہ کچھ) باقی رہے، جداگانہ حروفِ اضافت (جو، جی، جے وغیرہ) اور حروفِ جر (کھے، میں وغیرہ) کے بجائے مشترکہ ترتیب کی اضافی اور جری تراکیب بھی اس دور کی زبان میں زیادہ رائج اور نمایاں رہیں۔

☆ طویل تلفظات کے بجائے چھوٹے تلفظات کی مثالیں:

لُهُه = لوهُ (لوہا)

هُنُد = هُونُدَ (مؤنث صفت ہے، ہونے کی حالت، موجودات، ملکیت، دولت، طاقت، نیز حرف تمنا ہے، کاش، کیا ہی اچھا ہو)

تُهَان = توهان = تورئ (=آپ = تیرے بغیر)

سُهون = سونهون (صفت مذکر ہے اس کے معنی ہیں راستے کا واقف، راستہ دکھانے والا، رہنما، پیشوا، واقف، جاننے والا)

سَرَءِ = سريوءِ، سَرِئي (حاصل ہو، ملے، بسر ہو، تجھے حاصل ہو، تجھے بسر ہو)

ڏِهُ = ڏيهُ (دیس، ملک سنسکرت زبان کا لفظ ہے)

☆ جداگانہ حروف جر کے بجائے مخفی مشترکہ ترتیبیں:

جداگانہ حروف جر 'کھے'، 'کھان'، 'مان'، 'وٹ' کے بجائے اس کی مخفی مشترکہ ترتیب (جری

تراکیب) زیادہ رائج تھی(۱)، جیسا کہ تمام ذخیرہ میں جداگانہ حرف جر 'کي' (کھے) کی ترتیب کی تقریباً دس مثالیں اور مشترکہ ترتیب کی تقریباً پچیس درج ذیل تراکیب موجود ہیں:

جٿان = جتان کان (جِتاں کھاں = جہاں سے)

پاڳن = پڳن کي (پگن کھے = پاگوں کو)

لوڪان = لوڪ کان (لوک کھاں = دنیا سے، جہاں والوں سے)

ڇڳيرن = ڇڳيرن کي (چھگیرن کھے = بہادروں کو)

ٿان = تنهن جاءِ کان (تُھن جاءِ کھاں = اس جگہ سے)

اويساهن = اويساهن کي (اویساہن کھے = لنگر کی زنجیر باندھنے کے کھونٹوں کو)

ڀنيورا = ڀنيور کان، مان (بھنبھور کھاں، ماں = بھنبھور سے)

آکينٿون = آکين کانِ (اَکھین کھاں = آنکھوں سے)

تهان = تنهن کان (تُہن کھاں = اس سے)

ڏوهنٿون = ٻنهي کان (بنہی کھاں = دونوں سے)

لوڪَ (ٿيي) = لوڪ کي ٿئي (لوک کھے تھیئے = دنیا کو ہو، جہاں والوں کو ہو)

ورٺام = مون کي ورٺا، مون تي ورٺا (مُوں کھے ورنا، مُوں تے ورنا = میری طرف واپس ہوئے، مجھ پر لوٹے)

ڪَنڌيَ (پڄڻ) = ڪنڌي کي، ڪنڌي وٽ پڄڻ (کندھی کھے، کندھی وٹ پجنڑ = کنارے پر پہنچنا)

جاڳايوس = مون کي جاڳايو (موں کھے جاگایو = مجھے بیدار کیا)

سُنبوينين = سُنبوين کي (سُنبوین کھے = لوہے کے بڑے سُوؤں والوں کو)

سوهٽيَ = سونهٽي (سهٽي) کي (سونہٹی (سُہٹی) کھے = سوہنی کو)

چُونِيِ = توکي چون (توکھے چَوَن = تجھے کہیں، بولیں)

ڳوريَ = ڳوري کي (گوری کھے = گوری، حسین کو)

وسرئوس = هن کي وسرئو (ہُنَ کھے وسروَ = اُسے بھولا)

جيڏيين = جيڏين کي (جیڈُینِ کھے = سہیلیوں کو، ہم عمروں کو)

---

(۱) یعنی جملہ میں 'کي' (کھے = کو، طرف)، 'کان' (کھاں = سے، از) وغیرہ کے جداگانہ حرف جر بہت کم استعمال ہوتے تھے، اس کے بجائے مخفی حرف جر کی مشترکہ ترکیب زیادہ رائج تھی مثلاً 'ڏيهه کان' (دیس سے) کہنے کے بجائے 'ڏيهان' (دیس سے) اور 'ڳوري کي' (گوری کو) کہنے کے بجائے 'ڳوريَ' (گوری کو) استعمال ہوتا تھا۔ (مترجم)

ڪُنَا ـ ڪُن (پاڻي جي) ڪان، مان (کُنَ (پانی ہے) کھاں، مَاں = بھنور، گرداب (پانی کا) سے)

سيگڙيين = سيگڙين (ڪمانن) ڪي (سینگڑین (کمانن) کھے = چھوٹی کمانوں کو)

آرا = آر (پاڻي جي) ڪان، مان (آر (پانی ہے) کھاں، ماں = (گرداب،بھنور (پانی کا) سے، دریا کے بہاؤ سے)

گھاتوئين = گھاتوئن ڪي (گھاتوئن کھے = شکاریوں، مچھیروں،غوطہ خوروں کو)

ماروئين = مارئن ڪي، وٽ (مارُئن کھے، وٹ = دیہاتیوں، سادہ لوحوں، مسکینوں کو، کے پاس)

☆ 'ساں' اور 'سین' حرف جر کی مخفی مشترکہ تراکیب:

حرف جر 'ساں' اور 'سین' (بمعنی سے، ساتھ، مع، پاس، قریب) کی جتنی جداگانہ (تقریباً آٹھ) صورتیں ہیں اس سے کچھ زیادہ ہی (تقریباً دس) مخفی مشترکہ حرف جر 'ساں' کی تراکیب استعمال ہوئی ہیں۔ مثلاً

(لگ گڏجن) لوڪَ = لوڪ سان (لوک سَاں = دنیا کے ساتھ، جہان والوں کے ساتھ)

ڪارين ڪَنين = ڪارن ڪنن سان (کارن کَنّن سَاں = کالے کانوں کے ساتھ)

نياپيَ = نياپي سان (نیاپے ساں = پیغام کے ساتھ)

هيجا = هيج سان، مان (ہیج ساں، مَاں = چاہت سے)

سَڌين = سڌن سان (سَدھن ساں = خواہشات کے ساتھ)

ڏوهِ = ڏوه سان، ۾ (ڈوہ ساں، میں = جرم کے ساتھ، میں)

ڪَريندي = ڪرڻ سان (کرنڑں ساں = کرنے سے)

ماڻڪين = ماڻڪن سان (مانکن ساں = سفیدی مائل سیاہ آنکھوں سے)

ڪَرهيندي = ڪَرهڻ (ڪاوڙجڻ) سان (کرھنڑں ساں = ناراض ہونے سے)

پارين ـ پارن سان، پارن وارا (پارَن ساں، پارَن وارا = نشانات اور اوصاف کے ساتھ، نشانات والے)

☆ حروف اضافت کی مشترکہ اضافی تراکیب:

حروفِ اضافت (جو، جی وغیرہ) کی جداگانہ (تقریباً گیارہ) صورتوں کے مقابلے میں

درج ذیل (تقریباً ۲۷) مشترکہ اضافی تراکیب استعمال کی گئی ہیں:

اَڱڻ هوڏ = اَڱڻ جي هوڏ (آنگن کی شرط رکھنا/ضد کرنا)

پکٹان = پکين جو (پرندوں کا)

پاٹياريَ سِر = پاٹيهاري جي سر تي (پانی والی کے سر پر)

پرينِ پَر = پرين جي پَرِ (پریتم کا دستور، رواج، رسم)

ماگرڙيا ريَ مڇڙا = مانگرياڻي جا مڇڙا (مچھیروں کی ذات 'مانگریانی' کے مگر مچھ، گھڑیال)

ساتيين سڏ = ملاحن جو سڏ (ملاحوں کا بلاوا)

گهاتوئن وياء = گهاتوئن جو اولاد (شکاریوں/مچھیروں/غوطہ خوروں کی اولاد)

ڪوڙ ڪُماڙئين = خراب ماڻهن جي ڪوڙ (گهڻائي) (خراب لوگوں کی کثرت)

ڏيئي وٽ = ڏيئي جي وٽ (چراغ کی بتی/فتیلہ)

چوريَ پاهت = چوري جو پاهت (چوری کا نیگ)

گهوٽيين گهور = گهوٽن جي گهور (دولھاؤں/نوشاہوں/بہادروں/ غازیوں کی بخشش، نوشاہوں کے واری)

پاڳن ور = پڳن جا وَرَ (دستار/ پاگ (جمع) کا پھیرا دینا، آ گا لینا)

ڳال مُور = ڳالهه جو مُور (مُنيد، بُڻ) (بات کا آغاز، بُن بنیاد)

ڪُهاڙ مُهْ = ڪهاڙي جو مُنهن (کلھاڑی کا رخ)

چارٽين چِندا = چارڻن جي چندا (ڳڻتي) (گویّوں کی فکرمندی)

ڪاڪ وٽن = ڪاڪ جي وٽن (کاک دریا کے درختوں)

توبَه تاءُ = توبهه جو تاءُ (توبہ کی گرمی)

پاريَرَ وِٽ = پاريهر جي وِٽ (کبوتر کی بیٹھ)

ڪلاچيَ پار = ڪلاچيءَ جي پارڪان (کلاچی کے اُس طرف سے)

گهروءِ = تنهنجو گهر (تیرا گھر)

پکيانْ پيرُ = پکين جو پير (پرندوں کا پیر)

مُهانِ = انهن جا مُنهن (ان کے منہہ)

مِران (مروئان) = مروئن جا (خنزیروں کے)

ٿوڙائون = انهن جو ٿوڙائو (ان کا فراق)

مُوران = مورن (ماکوڑین) جو (چونٹیوں (مکوڑیوں) کا)
گھوتیین = گھوتن جا (دولھاؤں کے)
قڑکین = قڑکین (پٹکن) جو (چھوٹی پگڑیوں کا)

☆ 'جا' کے معنی میں 'کا' حرفِ اضافت کا استعمال:

بیان العارفین میں ایک شعر ملتا ہے جس میں 'جا' حرفِ اضافت کے معنی میں 'کا' حرف اضافت استعمال ہوا ہے اور یہ استعمال پہلی مرتبہ اسی شعر میں ملتا ہے:

متارکا ہیرو، گرتُ نہ ہڈن گوڈ
آئیا اگہٖ ھوڈ، سر ڈئو سُرو پیَن

[میخوار باہمت جوان تہہ میں، کمر کے ساتھ رقم باندھ کر نہیں چلتے
لیکن صحنِ میخانہ میں سر کی بازی لگا کر شراب پیتے ہیں۔]

'متارکا' یعنی میخواروں کے، سندھی کی قدیم اصطلاح میں موالیوں اور میخواروں کو 'متارا' کہا جاتا تھا۔ یہ حرفِ اضافت 'کا' وہی ہندی والا 'کا' ہے، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ میاں شاہ کریم یا کسی اور نے اسی دور میں ہی یہ لفظ استعمال کیا، کیونکہ 'کا' اور 'کی' (جا، جی اور جے) کے حروفِ اضافت قدیم دور سے ہی سندھی کی بعض مخصوص معنوی صورتوں، خاص طور پر 'اراضی' اور عام 'پیشہ' کی طرف نسبت (اضافت) میں زیادہ استعمال ہوتے تھے: اراضی کی مثالیں جیسا کہ 'سارکي' (دھان فصل کی اراضی)، اوٺکي (اوٹھکی = اونٹ والوں کے قبیلہ کی اراضی) اسی طرح ڈھرکی، رہڑکی، گھوٹکی وغیرہ۔ کی مثالیں ہیں۔ اور پیشہ کی طرف نسبت (اضافت) کی مثالیں، مثلاً سونارکو (سنار کے پیشہ والا)، واڍکو (واڈھکو = بڑھئی/ترخان کے پیشہ والا)، رازکو (راج، معمار کے پیشہ والا)، لوھارکو (لوہار کے پیشہ والا) وغیرہ۔

☆ حرفِ جر 'میں' کی مخفی مشترکہ تراکیب کا استعمال:

مخفی حرف جر 'میں' کی درج ذیل مشترکہ جری تراکیب (تقریباً ۱۶) کے مقابلہ میں جداگانہ حرف جر 'میں' کی صورتیں زیادہ (تقریباً ۲۰) ہیں، جس کا مطلب یہ ہوا کہ 'میں' استعمال کرنے کا رجحان اس دور میں کچھ زیادہ ہوا۔ مثلاً:

وِڏین ھور = ھور ۾ (بیقراری میں، شیخی، گھمنڈ میں)
مَنِ = من ۾ (مَن میں)
پنجین ڏمین = پنجن درھمن ۾، سان (پانچ درہموں میں، کے ساتھ)

پڏرِ = پڏر (ظاھر) ۾ (ظاہر میں)

ڪارين راتيِن = ڪارين راتين ۾ (سیاہ راتوں میں)

اڱڻِ = اڱڻ ۾ (آنگن میں)

مَنَهِہ = مَنَهن ۾ (چھپر یا جھونپڑے میں)

چاچرِ = چاچر ۾ (دور تک پانی ہی پانی میں، گہرے پانی کی جھیل میں)

سڏِ = سڏ ۾، تي، سان (بلاوے میں، پر، کے ساتھ)

وَهي = وهي (جلدي) ۾، سان (جلدی میں، تیزی کے ساتھ)

اکينِ = اکين ۾ (آنکھوں میں)

پٿرِ = پٿر (پاٿاري، هنڌ) ۾ (بچھے ہوئے بستر میں، بچھونے میں)

گھَرِ = گھر ۾ (گھر میں)

اُترِ = اتر ۾، ڏانھن (شمال میں، شمال کی جانب)

ڏوھِہ = ڏوھ ۾، سان (جرم میں، جرم کے ساتھ)

لاڙِ = لاڙ ۾، ڏانھن (لاڑ میں، لاڑ کی طرف، نشیب میں، نشیب کی طرف)

'ھ' سے مرکب تلفظ اور نون غنہ، نیز ہمزہ اور 'ی' کے تلفظات کا عدم استعمال:

باب دوم کے تحت ہم نتیجہ کے طور پر کہہ آئے ہیں کہ ابتدائی دور کی سندھی زبان میں 'ھ' سے 'مرکب تلفظ' نیز 'نون غنہ' 'ھمزہ (ء) اور 'ی' (طویل حرف علت) کے تلفظات نہیں تھے یا نسبتاً کم تھے۔ ان تلفظات کا استعمال گزشتہ قریبی دور میں زیادہ ہوا، اس کی تصدیق 'بیان العارفین' کے اشعار میں استعمال شدہ الفاظ کے تلفظ، یعنی کہ سولہویں صدی کے نصف اول میں عام رائج 'لاڑی زبان' سے ہوتی ہے۔ مثلاً

'ن' غنہ کا نہ ہونا، مثلاً:

تا = تانْ (جب، بعد میں، کی وجہ سے، اوپر سے)

متا = متانْ (اوپر، اوپر سے، ابتدا سے، اول سے)

ايَ = ايئنْ (اسی طرح، ایسے)

ياء = ياڻءِ (چاہو، سمجھو کہ؟ خیال میں لا، اچھا لگا؟)

جيَ = جيئنْ (جس طرح، جیسے)

هيجا = هيجانْ (شوق سے، چاہت سے، ناز غمزہ سے)

ڪِيَ = ڪيئن (کس طرح، کیسے)
مُڏَ = مُنڏَ (عورت، زن، نوجوان بیوی، کم عقل بیوی، سادہ صاف دل بیوی)
ڪهِ = ڪنهن (کس، کس نے)
پائيو = پانئيو (چاہا، سمجھا، خیال میں لایا)
مُهَ = مُنهن (رخ، مُنہہ)
هيَڙو = هنيَڙو (دل، قلب اسم تصغیر)
مُو = مُون (میں، میں نے)
داهُون = دانهُون (دہائیاں، فریادیں، شکایات)
مُونٽا = مُونٽان (مجھ سے)
سياري = سنياري (یادگیری کرکے، خبرگیری کرکے، کوشش کرے)
پِريَ = پِرين (محبوب، دلبر)
ڪندي = ڪندين (تو کرے گا)

'ھ' کے ملاپ والے تلفظات کا نہ ہونا: مثلاً

اي = اهي (یہ، وہی (جمع) ڪُلين = ڪُلهين (کاندھوں میں، پر)
موجي = منهنجي (میری، میرے) ماڙوئين = ماڙهوئين (لوگوں میں)
ڳال = ڳالهہ (بات، قصہ) هيڏان = هيڏهان، هيڏانهہ (اِدھر، اِس طرف، اِس پار)
ڪال = ڪالهہ (کل (آئندہ) هوڏان = هوڏهان، هوڏانهن (اُدھر، اُس طرف، اُس پار)
ڳِنُ = ڳنهہُ (لے، پکڑ) هاڙي = هاڙهي (پہاڑی سلسلہ 'ہاڑھے' کا)
ڏياڙي = ڏهاڙي (دہاڑی) ڪَڏِين = ڪڏهين (کب، کبھی، بعضے، گاہے)
پيرِين = پهرِين (اوّل، شروع میں، ابتدا میں)

'ء' (ہمزہ) کے علاوہ الفاظ کا تلفظ کرنا، مثلاً:

چو = چئو (کہہ، بول) چاري = چارئي (چاروں)
ڏي = ڏئي (دے) جِين = جِيئن (جیسے)
جيُ = جيءُ (جی، جواب ندا، مَن، دل، طبیعت) ڏوهنون = ڏوهئون (گناہ کی وجہ سے)

'ھ' اور 'ن' غنہ دونوں کے علاوہ تلفظ کرنا:

تي = تنهنْ (اُس) جي = جنهنْ (جس)

تي هينْ = تنهنْ ئي (اُس ہی) پاجي = پنهنجي (اپنے)

الفاظ کی یہ صورتیں کافی قدیم معلوم ہوتی ہیں، مگر سولہویں صدی کے نصف اول تک بھی موجود تھیں۔

☆ 'لاڑی زبان' کی خصوصیات۔ اس دور میں لاڑی زبان کی خصوصیات درج ذیل الفاظ کے ذریعے ظاہر ہوتی ہیں:

۱۔ فعل کے صیغوں میں 'اِینُ' کے بجائے 'ایِنُ' (الف کی زیر کے بغیر یعنی یائے مجہول کے ساتھ) کے

تلفظات، جیسا کہ: وِجهين، ڪَريين، وهين. (وجھیں، کریں، وِہیں= تو ڈالے، تو کرے، تو بیٹھے)

۲۔ کچھ خاص نحوی ساختیں، مثلاً: اهي (اِہے) (= اِسی)، پسجي (پسجے) (= دیکھے)

۳۔ کچھ خاص مقامی تلفظات، جیسا کہ هُونڙا (= هُنڙا) (ہُنڑا= تھے)، هيڪڙي (هڪڙي) (ہکڑی= ایک، مؤنث)، بَهارِ (باهر) (باہر)، اَهنجائو (اَهنجو) (اَہنجو= تکلیف دِہ)

سویں - گیارہویں صدی ہجری (۱۶-۱۷ویں صدی عیسوی) میں مجموعی طور پر شمال خواہ جنوب میں، یعنی تمام سندھ میں معمولی فرق کے علاوہ ایک جیسی زبان رائج تھی۔ میاں شاہ کریم کی 'لاڑی سندھی' خواہ قاضی قادن کی سِرے والی سندھی' کی اپنی اپنی چند ایک خصوصیات کے مقابلہ میں، دونوں میں اختلاف کم اور یکسانیت زیادہ ہے، مثلاً

۱۔ دونوں زبانوں میں ایک اہم مشترکہ خصوصیت یہ ہے کہ دونوں زبانوں میں جداگانہ 'حرفِ جر' یا 'حرفِ اضافت' کے بجائے مشترکہ ترتیب کی اضافی اور جری تراکیب کثرت سے ہیں۔

۲۔ دونوں زبانوں میں سرائیکی الفاظ موجود ہیں، جیسا کہ ایک ہی لفظ 'ڈونْ' (=دو) قاضی قادن اور میاں شاہ کریم دونوں کے اشعار میں موجود ہے:

ٹُنڈُ، مَ ٿاءِ ڪُتاءِ، ٻوڏُ چُونِي جِي چو

جي پائين پرِيَ مِڙاءِ تہ ڏوهڻِ ڳڻِ پاءِ

[ہر جگہ تیزی (غصہ) سے بات مت کر، اگر وہ تجھے 'تُف' یا 'لعنت' یعنی کلمۂ نفرین بھی

کہیں، پھر بھی تُو انہیں 'جی' کہہ، اگر محبوب سے ملنا چاہتا ہے تو دونوں ('تُف' اور 'جی') سے، یعنی دونوں کو، احسان تصور کر(۱)۔]

(شاہ کریم بلڑی وارے جو کلام: شعر نمبر ۴۲)

ڏوهنون =(ڏُوهَنُئون = دونوں (تُف اور جی) سے، دونوں کو۔

سيچاڻا تي سينهن، ڏُونئَنْ وسن جهنگ ۾
سي ڪڙ ڪاون ڪيئن، ماسُ جنهين ڪي لکيو

['شہباز' اور 'شیر' دونوں جنگل میں رہتے ہیں
جن کے لیے گوشت کھانا لکھا ہوا ہو وہ گھاس کیونکر کھائیں گے۔]

(قاضی قادن جو کلام: شعر نمبر ۱۱۰)

ڏونئن = دونوں (شہباز اور شیر)

۳- نہ صرف دونوں زبانوں کی عام لغات ایک جیسی ہے، بلکہ کچھ خاص الفاظ بھی دونوں میں ہوبہو اور اُسی ایک ہی معنی میں استعمال ہوئے ہیں، جیسا کہ:

قاضی قادن	شاہ کریم	
سيٽان	سيٽان = ساٿن	(ان کے ساتھ)
ڪيٽان	ڪيٽان = ڪين، سندن	(انہیں، ان کا)
جي	جي = توڙي، جيتوڻيڪ، جيڪڏهن	(خواہ، اگرچہ، اگر)
ڪرِيندو، ڪرِينِ، ڪيريندي (ڪندو، ڪن) (ڪندي)	= 'ڪرڻ' مان فعل جي ٻين صيغن ۾ پڻ 'ر' آئي	('کرنا' مصدر سے فعل کے دوسرے صیغوں میں بھی 'ر' کو لانا = کریگا، کریں، کرتے ہوئے)
جو (= جيڪڏهن)	= جو (جيئن ئي)	(= جو (جیسے ہی)
توءِ	توءِ = ته به	(تو بھی)

(۱) ڈاکٹر عبدالغفار سومرو نے اپنی تحقیق، ترجمہ اور تشریحی حوالہ جات کے ساتھ شائع کردہ ''بیان العارفین و تنبیہ الغافلین'' کے ص:۵۹ پر اس شعر میں 'ڏوهنون ڪن ها،' کا ترجمہ کیا ہے کہ 'اپنے گناہوں کو (گُن) سھاؤ' نیکی، بھلائی میں تبدیل کر۔ یہاں پر سومرو صاحب نے ''ڏوهنون'' کو 'دوُ' کے وزن پر (بغیر زبر یا پیش) ڏوھ = گناہ پڑھا ہے، جبکہ بلوچ صاحب نے اسے پیش کے ساتھ (ڏُونْ = دو عدد) پڑھا ہے جو کہ حقیقت کے قریب اور ظاہری قرائن کے موافق ہے۔ کیونکہ یہاں گناہ یا ثواب کا بیان مقصود نہیں بلکہ محبوب کی طرف سے خوشی اور ناخوشی کے اظہار کے لیے 'ہوڏ' (تُف اور لعنت) اور 'جی' کہنے کی بات ہو رہی ہے، اس لیے یہ لفظ 'ڏُوهَنون' = دونوں ہے۔ 'ڏوهنون' (دال منقوط پر زبر یا پیش سے، علاوہ درمیانی تلفظ = گناہوں) نہیں ہے۔ (مترجم)

جُو جُو ...... جانْ جانْ .... = جيستائين، تيستائين (جب تک، تب تک)

جانْ جانْ = تانْ تانْ (جب جب، جس جس وقت)

جان ئي (جتان) جائينْ (جتان) = جتان (جہاں سے)

تان ئي (تتان) تائين (تتان) = تتان، تڏهن کان (وہاں سے، اس وقت سے، تب سے)

معمولی فرق کے ساتھ کی چند مثالیں:

لاهُو لاء= لاڙ، ڏکڻ (نشیبی، جنوب)

ڪاٿي، ڪيٿي=ڪٿي (کہاں، کہاں پر)

زبان کے عمدہ استعمال اور تخلیقی فکر کے اضافہ کے لحاظ سے بطور نتیجہ ہم یوں کہیں گے کہ شاہ کریم کا مقام بھی بہت بلند ہے۔ قلب و نظر کی وسعت کے ساتھ ساتھ ان کا حافظہ بھی بہت تیز تھا۔ انہیں اپنے سے پہلے کے اولیاء اور درویشوں کی سوانح کا اچھی طرح علم تھا اور نثر خواہ نظم میں ان کے ناصحانہ اقوال اور کلام سے بھی وہ آگاہ تھے۔

ڈاکٹر داؤد پوتہ مرحوم نے نتیجہ اخذ کرتے ہوئے ان کے متعلق صحیح رائے قائم کی تھی کہ: ''انہیں اپنے سے پہلے کے شعراء کا اکثر کلام یاد تھا''(۱)۔ خاص طور پر عارف شعراء کا کلام انہیں ازبر تھا اور سب سے زیادہ انہیں قاضی قادن کے اشعار سے آگہی تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ شاہ کریم قاضی قادن کے عارفانہ فکر اور گہرے نکات سے زیادہ متاثر تھے، کیونکہ ان سے قبل قاضی قادن ہی نے پہلے پہل اپنے اشعار میں کئی نئے مضامین اور موضوعات پیش کیے اس کے بعد ان شعراء نے جو شاہ کریم سے پہلے ہو گزرے تھے، یا شاہ کریم سے بڑے تھے یا ان کے ہمعصر تھے، انہوں نے اپنے اشعار میں وہی اور بعض نئے موضوعات پیش کیے۔ مثلاً کلالوں (مے خواروں) کا موضوع قاضی قادن کے اشعار میں نہیں تھا، لیکن ان کے کسی دوسرے ہمعصر نے اس موضوع پر شعر کہا(۲)۔ شاہ کریم نے اپنے اشعار میں کم از کم چھ ایک جیسے انہی موضوعات (توحید، وحدت و کثرت، ساجن کی یاد اور عشق، سسئی، گھاتو (مچھیرے یا شکاری) اور ہنس پرندہ) کو بار بار دہرایا ہے، جن کی بنیاد پہلی مرتبہ قاضی قادن کے اشعار میں رکھی گئی تھی۔ اس کے علاوہ قاضی قادن کے معنوی نکات، خاص الفاظ اور فقروں کو شاہ کریم نے اپنے اشعار میں استعمال کیا، مگر اس کے ساتھ ساتھ زبان میں بڑھتی ہوئی بیان کی صلاحیت اور وسعت کی وجہ سے اور اپنی نظر و ذہانت

---

(۱) ''شاہ کریم بلڑی وارے جو کلام'' بطور مقدمہ احوال زندگی، ص ۲۵

(۲) ''سر ڏيئي سٽ جوڙ، ڪنهن پر ڪلاڙن سين''

کے ذریعے انہوں نے اپنے اشعار میں نئے آٹھ موضوعات (پانی بھرنے والی عورت، مارئی، میخوار، بھاگوان مالداروں کی خانہ بدوشی اور علاقہ کچھ میں مویشی چرانا، مومل، سخی اور داتا، لیلاں اور سوہنی) اور دو نئے معنوی نکات (صوفی اور صلح، مجازی اور حقیقی عشق) آشکار کیے۔ قاضی قادن کے بعد اشعار میں اس قدر نئے موضوعات کو پہلی مرتبہ شاہ کریم ہی نے بیان کیا، جو ایک طرف اس دور میں سندھی زبان کی وسعتِ بیان کی واضح مثال اور دوسری طرف شاہ کریم کے عارفانہ فکر کا کمال بھی تھا۔

سندھ سے باہر کی سندھی، سندھی-سرائیکی اور دیگر پڑوسی زبانوں کی آمیزش کی شاعری کا ایک اہم ذخیرہ:

سندھ سے باہر دادو دیال اور پران ناتھ اس دور میں دو بڑے درویش ہوگزرے ہیں، جنھوں نے دیگر زبانوں کے علاوہ سندھی ابیات اور سلوکوں کا بھی اپنے پیچھے ایک بڑا ذخیرہ چھوڑا۔ ان میں سے پران ناتھ کے ابیات اسی دور کی تحریر میں محفوظ ہیں، اس لیے وہ اصل متن کے اعتبار سے زیادہ مستند ہیں۔ دادو دیال بڑے اثر و رسوخ والا درویش تھا، جس کے پیروکار بھی بہت تھے اور اس کا مذہب وفرقہ راجستھان اور دیگر اکثر علاقوں میں پھیلا۔

دادو دیال اور اس کے مذہب وفرقہ کے دیگر سادھوؤں اور فقراء کا شعر زبانی روایات کے ذریعے زیادہ مشتہر ہوا اور جس وقت اسے لکھا گیا تو اس وقت بھی اسے زبانی روایات ہی کے رنگ میں لکھا گیا۔

اس طرح کا ایک خاص قلمی پُستک، داو-پنتھی بھگت ہریداس کی قائم کردہ ایک کٹیا میں محفوظ ہے، جس کے ایک مستقل جداگانہ باب کے تحت خاص طور پر ''قاضی قادن اور دیگر درویش'' شعراء کے سندھی ابیات لکھے گئے ہیں۔ اس باب میں درج اشعار ''قاضی قادن جو کلام'' کتاب کے ذریعے زیورِ طباعت سے آراستہ ہوکر شائع ہوچکے ہیں(۱)۔ اور وہ کُل ۱۱۸ اشعار ہیں جن میں سے تین شعر درویش قاضی محمود گجراتی کے ہندی میں ہیں۔ باقی ۱۱۵ ابیات سندھی اور سرائیکی میں ہیں جن میں سے مطبوعہ کتاب کی فہرست کے مطابق ایک شعر دادو دیال کا، ایک شعر فرید کا اور ایک شعر 'حلُو' یا 'ہلوُ' نامی شاعر کا ہے۔ اس کے علاوہ باقی ۱۱۲ اشعار اور ہیں۔ ہم اپنی موجودہ معلومات کی بناء پر فی الحال اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ان ایک سو بارہ (۱۱۲) اشعار میں سے زیادہ سے زیادہ ستہتر (۷۷) اشعار قاضی قادن کے ہوسکتے ہیں، باقی ماندہ پینتیس (۳۵) اشعار دوسرے فقراء اور سادھوؤں کے ہیں(۲)۔ اس انداز ے

---

(۱) ہیرو ٹھاکر: ''قاضی قادن جو کلام'' پوجا پبلیکیشن، دہلی، ۱۹۷۸ء

(۲) تفصیل کے لئے دیکھیے ہمارا مضمون: ''قاضی قادن جا بیت، نئین تحقیق جی روشنی میں'' رسالہ مہران، جلد۴، سندھی ادبی بورڈ ۱۹۷۸ء، ص۱۱۲-۱۴۸؛ جلد ۱، ۱۹۷۹ء، ص۱۱۶-۱۴۹

کے مطابق 'دادوٗ' اور 'حلو' کے دو اشعار سمیت کل سینتیس (۳۷) اشعار اس کتاب میں دوسرے فقراء کے ہیں جن پر ہم یہاں غور و فکر کریں گے۔ قاضی قادن کے اشعار اور زبان پر ہم باب پنجم کے تحت گفتگو کر آئے ہیں(۱)۔

یہ اشعار کن شعراء کے ہیں؟ اور کس دور کے ہیں؟ اس کے متعلق عارضی طور پر ہی کچھ کہا جاسکتا ہے۔ یقینی طور پر صرف تین اشعار ہی کے شاعر (دادو، فرید اور حلو) معلوم ہیں۔ کتاب ''قاضی قادن جو کلام'' کے مؤلف کی طرف سے پیش کردہ آثار کے مطابق البتہ ایک اور شعر بھی فرید کا ہوسکتا ہے۔ ایک اور شعر(۲) جس میں دادو کا نام ہے وہ اس نے قاضی قادن ہی کے شعر سے متاثر ہو کر کہا ہے۔

دادو کے اشعار کی زبان اور ترتیب منفرد ہے۔ ایسے اشعار جن پر قاضی قادن کے الفاظ و خیالات کا عکس ہے یا جن کی زبان و ترتیب خواہ اسلوبِ بیان 'دادوٗ' کے اس شعر سے ملتے ہیں، وہ 'دادوٗ' کے ہی ہو سکتے ہیں۔

سندھی اشعار کا یہ ذخیرہ کس دور کا ہے؟ قاضی قادن (وفات ۱۵۵۱ء) کے اشعار کا دور ہمیں یقینی طور پر معلوم ہے۔ شیخ فرید خورد (۱۴۵۰-۱۵۶۳ء) اور دادو دیال (۱۵۴۴-۱۶۰۴ء) کے ادوار بھی معلوم ہیں۔ اگر شیخ فرید(۳) کے اشعار اس کی زندگی کے درمیانی دور کے ہوں

---

(۱) یہ باب پہلے طبع ہو چکا ہے جس میں اس مرحلہ پر ترمیم نہیں کی جاسکتی۔ جون ۱۹۷۹ء کے آخری ہفتہ دہلی جانا ہوا، وہاں پوچھنے پر معلوم ہوا کہ دادو۔پنتھیوں کی مختلف کتیاؤں سے ''قاضی قادن سے متعلق باب'' کے مزید تین قلمی نسخے ملے ہیں، ایک قلمی نسخہ جو کہ جے پور کی مرکزی کتیا میں ہے وہ سمبت ۱۷۴۵ کا تحریر کردہ ہے، اس میں 'قاضی قادن' کے باب کے تحت ۲۴۳ اشعار ہیں۔ اس نئے ذخیرہ کے پیش نظر قاضی قادن کے تمام کلام (خواہ دیگر فقراء کے سندھی اشعار) کا صحیح اندازہ تب ہوسکے گا جب اس پورے ذخیرہ کی چھان بین کی جائے گی۔

(۲) یہ دونوں شعر درج ذیل ہیں:

۱- دادو آکیون پسڻ کي پرين، پري اُلٿيان منجهه
جتي بيٺو مان پرين، نهاريندو هنجهه

۲- گهڙيين گهڙيين گاريان، پهري لهان سجاء
مون هيڙو گهڙيال جيون ڏکني رڻ بهاء

دیکھیئے: قاضی قادن جو کلام، ص: ۴۲-۴۳ (مترجم)

(۳) شیخ ابراہیم فرید ثانی، حضرت بابا فرید گنج شکر اجودھنی کے سلسلہ کے گیارہویں فرد اور گدی نشین تھے۔ ان سے کچھ شلوک (دوہے) اور کافیاں منسوب ہیں جو ابھی تک متنازعہ فیہ بنی ہوئی ہیں۔ 'گورو گرنتھ' میں موجود 'فرید' کے ان دوہوں کے متعلق بعض لوگوں کا گمان ہے کہ وہ شیخ ابراہیم فرید ثانی کے ہیں۔ لیکن زیادہ قابل اعتماد بات یہ ہے کہ وہ دوہے حضرت بابا فرید گنج شکر ہی کے ہیں، البتہ انہیں گرنتھ میں شامل کرنے کے لیے گورو نانک کی درخواست پر شیخ ابراہیم فرید ثانی نے استخارہ کر کے بابا صاحب کی روح سے اجازت لے کر دی تھی۔ چونکہ گورو نانک فرید ثانی کے ہمعصر تھے اس لیے ان کی ملاقاتوں کا ذکر 'حدیقۃ الاسرار' میں ملتا ہے۔ جیشی رام مشتاق نے ارشاداتِ فریدی میں گورو نانک اور شیخ فرید کے منظوم مکالمات کو درج کیا ہے، جس کا ایک نمونہ درج ذیل ہے:

گورو نانک: صاحب دیاں دوحداں — کس نوں پکڑاں کس نوں چھڈاں
فرید ثانی: صاحب کی دوحد — سچ نوں پکڑ، کوڑ نوں چھڈ

دیکھیئے: پنجابی زبان و ادب، باب سوم، ص: ۴۹، باب پنجم، ص: ۱۰۱، ۱۰۵ (مترجم)

اور اشعار کا یہ تمام ذخیرہ خود دادو دیال کی زبانی یا اس دور کی تحریر کے ذریعے بھگت ہریداس تک پہنچے ہوں تو اس صورت میں کہا جاسکتا ہے کہ یہ اشعار اندازاً ۱۵۰۰-۱۶۰۴ء کے عرصے میں کہے گئے ہیں(۱) رانیلا کی پستک میں قاضی قادن کے خواہ دوسرے تمام اشعار جس طرح لکھے ہوئے ہیں، اسی طرح 'قاضی قادن جو کلام' کتاب میں بھی دیے گئے ہیں۔ اس مطبوعہ صورت سے ظاہر ہے کہ اشعار کی اصل صورت (جس میں شعراء نے وہ شعر کہے) پر راجستانی اور پنجابی زبانوں کا رنگ ہے۔ اگر ان شاعروں کی مادری زبان سندھی یا سرائیکی تھی اور انہوں نے انہی زبانوں میں اشعار کہے، تو پھر وہ اشعار دادو دیال کے دور سے لے کر ہریداس کے دور تک راجستانی یا پنجابی بولنے والے بھگتوں کے زبانی یا تحریر کے ذریعے اس پستک تک پہنچے، اور اس دوران اشعار کے ایک شخص سے دوسرے شخص تک منتقلی کی وجہ سے ان کی اصل زبان پر راجستانی اور پنجابی کا رنگ چڑھتا گیا۔

اگر وہ تمام یا ان میں سے کچھ اشعار ایسے شعراء کے تھے جن کی ادری زبان راجستانی تھی تو بھی ان میں استعمال شدہ سندھی یا سرائیکی پر راجستانی لہجہ کا اثر پڑنا ہی تھا۔ چونکہ اصل حقیقت اس وقت ہمارے سامنے واضح نہیں ہے اس لئے بہتر یہی ہوگا کہ جس قدر ممکن ہو سکے اس قدر ان اشعار سے راجستانی - پنجابی رنگ اتار کر انہیں سندھی یا سرائیکی کی ممکن شکل میں استوار کیا جائے تا کہ ان اشعار میں استعمال شدہ اس دور کی اصل زبان کے متعلق زیادہ درست نتائج قائم کیئے جا سکیں۔ اسی وجہ سے ہم نے ذیل میں ان اشعار کی مطبوعہ صورت کو درست کر کے لکھا ہے، نیز انہیں زبان کی ترتیب، اسلوبِ بیان اور معنی کی مناسبت کے پیش نظر آٹھ شقوں میں تقسیم کیا ہے تا کہ کسی حد تک مختلف شعراء یا مختلف علاقائی زبانوں کا احتمالی اندازہ ہو سکے۔

ہر شعر کے نیچے دیا ہوا ہندسہ 'قاضی قادن جو کلام' کتاب میں اس شعر کے نمبر یا صفحہ نمبر کو ظاہر کرتا ہے(۲)۔

---

(۱) رانیلا کی پستک میں دوسرے ابواب کے تحت شیخ بہاؤالدین اور شیخ فرید کے اشعار درج ہیں۔ شیخ بہاؤ الدین زکریا کلاں (وفات ۱۲۶۲ء) اور شیخ فرید مسعود شکر گنج کلاں (وفات ۱۲۶۵ء) پہلے ہو گزرے ہیں اور یہ اشعار غالباً ان کے ہم نام چھوٹے بزرگوں کے ہیں، جن میں سے شیخ فرید خورد (۱۴۵۰-۱۵۶۳ء) دادو دیال سے کچھ عرصہ پہلے ہو گزرا ہے۔ اگر اس کے یہ اشعار اس کی زندگی کے درمیانی دور یعنی ۱۵۰۰ء کے تسلیم کیے جائیں تو وہ اس دور کا سب سے قدیمی سال ہوگا۔ اگر اشعار کا یہ ذخیرہ سب سے پہلے دادو دیال کے زبانی یا تحریر کے ذریعے پچھلے دور تک پہنچا ہو تو پھر کہا جا سکے گا کہ یہ ذخیرہ اندازاً سنہ ۱۵۰۰-۱۶۰۴ء کے دور کا ہے اور اگر رانیلا کی پستک بھگت ہریداس نے ابتدا میں خود لکھی یا لکھوائی ہو تو پھر ممکن ہے کہ اس میں کچھ اشعار ایسے بھی ہوں جو دادو دیال سے لے کر بھگت ہریداس کی زندگی کے دور (۱۷-۱۸ ویں صدی عیسوی) تک کہے گئے ہوں۔

(۲) ان اشعار کے رسم الخط اور معنی کے متعلق ہم نے اپنے مضمون "قاضي قادن جا بيت، نئين تحقيق جي روشنيءَ ۾" تفصیل سے لکھا ہے۔

دیکھیے رسالہ سہ ماہی مہران جلد:۴، سندھی ادبی بورڈ ۱۹۷۸ء، ص۱۱۲-۱۴۸، نیز جلد:۱، ۱۹۷۹ء، ص۱۱۶-۱۴۹

(الف) قاضی قادن کے دور کے (؟) سندھی اشعار:

۱- وڃي آيو ڪير، ڪنهن ڏٺو منهن لاهوتيين
اڇي ڪندو ڪير، ڳالهيون رب پرتيانءُ

[جا کر کون واپس آیا، جوگیوں، سنیاسیوں کا رخ کس نے دیکھا
جو باتیں (معلومات و احوال) اللہ کی، یا اللہ تعالیٰ کے متعلق ہیں وہ کون آ کر سنائے گا۔]
[نمبر ۱۵]

یہ شعر قاضی قادن کے دور کا یا اس سے بھی پہلے کا ہے۔ اس کی اصل صورت (رسم الخط) کیا تھی؟ اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ موجودہ صورت میں باعتبار شعر کچھ خاص عمدہ نہیں ہے۔ قاضی قادن نے اس شعر کے جواب میں یہ شعر کہا:

هُن سَر سندا هَنجهڙا، اِتي ئي آهينِ
ڳالهِينْ رب پرتيان، جو منگي تِنه ڏين

[نمبر ۲۱]
[اس جھیل کے ہنس یہاں ہی ہیں
رب کی پسندیدہ باتیں جو بھی کوئی طلب کرے، اسے دیتے (بتاتے) ہیں۔]

۲- تون وِيرئون ئي وِيرُ، جوڳي سو جو جڳ ۾
تون اسان جو پيرُ، سُوڏي ڏئين سرير ۾

[نمبر ۳۴]
[تو محسنوں کا بھی محسن ہے، جوگی وہی ہے جو سنسار میں رہ کر جوگ لیتا ہے
تو ہمارا مرشد ہے اپنے من اور وجود میں اس مالک کی شناسائی دیتا ہے۔]

یہ صاف سندھی میں کہا ہوا شعر یوں لگتا ہے کہ قاضی قادن کے کسی معتقد نے خود قاضی قادن کے لئے کہا ہے۔

(ب) وسطی سندھ کے (؟) شاعر 'حلو' کا ایک عمدہ سندھی شعر:

سفر مٿي سُپرين، اُيا ساٿُ لڏن
هلڻ جون حلو چوي، ڳجهيون ڳالهيون ڪَنِ

[صفحہ نمبر ۴۵ اور ۶۰]
[ساجن سفر پر جانے کے لیے کھڑے ہو کر قافلہ تیار کر رہے ہیں

'حاؤ' کہتا ہے کہ وہ جانے کے لیے خفیہ مشورے کر رہے ہیں۔]

شعر کی خالص سندھی زبان اور عمدگی سے ظاہر ہے کہ شاعر سندھ ہی کا تھا۔ نام کا اصل رسم الخط 'ہلوٗ' ہے، لیکن ہمارے اندازے کے مطابق یہ نام 'حلُو' (=) مٹھو) ہے یا 'حَلو' جو کہ 'حلیم' یا 'عبدالحلیم' کا اسم تصغیر ہوسکتا ہے۔ شعر کی زبان اور اسلوب قاضی قادن کے دور سے بعد کے معلوم ہوتے ہیں۔

(ج) سندھ کے شمالی خطہ (؟) کے شعراء کے اشعار:

ذیل کے اشعار میں 'ڈائین' (ڈائڻ =ٽبڻ، وهنجڻ بمعنی غوطہ لگانا، نہانا، غسل کرنا) [دھائین (غوطہ لگانا، نہانا)]، راڈي (=پوکي) [راڈھی (=کھیتی باڑی)]، محبان (جمع کی حالت میں) الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ اشعار سندھ کے شمالی خطہ کے کسی شاعر (یا شعراء) کے ہیں۔ یہ شعر قاضی قادن کے نہیں۔ کیونکہ ان کا معیار قاضی قادن کے اشعار والا نہیں ہے۔

۱- پٽو ڦٽو پيٽ ۾، وَڍي مُلا ماھ
ڈائينْ ڈِنئين ڈوڙ ۾، الله اوري آه(۱)

[نمبر۵۹]

[پِتا (زہرہ) پیٹ میں پھٹا ہے (یعنی دل بدن کے اندر پھٹا ہے) اور ملاّ گوشت کی چیر پھاڑ کر رہا ہے اس نے مٹی میں غوطہ لگایا خدا تعالیٰ بہت قریب ہے۔]

۲- قاضي ڪَتِ مَ ايترو، مَتِ ڪِيرو ئي ڦير
پَلاڻيندونْ پوٽلي متي ڪيندو ڪيرُ(۲)

[نمبر۶۰]

[قاضی! اتنا مت کات، چرخہ کی میخ (یا کھونٹا) اس قدر مت پھیر، پالان رکھتے وقت (سفر پر جاتے وقت) پوٹلی کون رکھوائے گا۔]

---

(۱) 'ہیرو ٹھاکر' نے یہ شعر یوں لکھا ہے:

پتو ڦتو پيٽ ۾، وڍي مُلان ماھُ ڈوئين ڈتي ڈوڙِ ۾، الله اوري آہؐ

دیکھیے: قاضی قادن جو کلام، ص:۹۱، شعر نمبر ۵۹ (مترجم)

(۲) 'ہیرو ٹھاکر' نے یہ شعر یوں لکھا ہے:

قاضي ڪَتِ مَ ايترو، مت ڪيروئي ڦيرُ پلاڻيندو پوٽلي متي ڪيندو ڪيرُ

دیکھیے: قاضی قادن جو کلام، ص۹۱، مطبوعہ روشنی پبلیکیشن، کنڈیارو طبع اول ۱۹۹۶ء، شعر نمبر ۶۰ (مترجم)

۳- جِهَڙي پائين(۱) هتڙي، تهڙي پاٹ پرين
پائڻ محبان ڇڏيو، تون نه ڇڏ ڏٹي (۲)

[نمبر۷۳]

[جو لوگ ہاتھ پھیلا کر تجھ سے مانگتے ہیں، انہیں تو خود بھرتا ہے
دوستوں نے پیار کرنا چھوڑ دیا، اے مالک! تو نہ چھوڑنا۔]

۴- توبهہ ڪَرِينِ باهُڙي، باهڙي توبهہ ڪَرِينِ
ڪيهي سادي هَٹ ہر، راڏِي اُجاڙينِ

[۱۰۱]

[توبہ کرتے ہیں ٹھوکر کھا کر، ٹھوکر کھا کر توبہ کرتے ہیں
کس قسم کے سادہ ہَٹ (ضد اور اصرار) میں اپنی کھیتی اجاڑتے ہیں۔]

۵- توڙي وڃي روم، ناه نصيبئون اڳرو
ماني مٽي ٹوم، جٹن لکيا چٹن ہر(۳)

[نمبر۱۰۶]

[خواہ روم ہی چلا جائے، نصیب سے مقدم یا زیادہ نہیں ہے
(وہی) روٹی پر لہسن ملے گا، جس طرح قسمت میں لکھا گیا تھا۔]

(د) سندھی - سرائکی اور پنجابی - ہندی کی آمیزش والے اشعار:

یہ اشعار سندھ کے علاقہ سرے (بالائی سندھ) اور ملتان کی سندھی - سرائیکی اور مشرقی

---

(۱) 'پائنین' میں یائے مجہول ہے۔ (مترجم)

(۲) 'ہیرو ٹھاکر' نے یہ شعر یوں لکھا ہے:

جَهڙي ني هَتَڙي تهڙي پاٹ پرين
بَهڻَ محبا ڇڏيو، تون نه ڇَڏ ڏٹي

اور اس کے دوسرے مصرع میں لفظ 'بہڻ' کا ترجمہ انہوں نے 'بہن' کیا ہے، جو کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے، کیونکہ قاضی قادن کے کلام پر 'سرائیکی' زبان کے اثر کی وجہ سے 'بھڻ' یا 'بہڻ' = بیٹھنا واضح ہے، نیز محاورتاً بھی دوست احباب کی جدائی اور نظر پھیرنے کی شکایت کے ساتھ 'بہن' کی بے رخی کا تذکرہ کچھ اچھا نہیں لگتا۔

دیکھیے: قاضی قادن جو کلام، ص۹۵ (مترجم)

(۳) 'ہیرو ٹھاکر' نے یہ شعر یوں لکھا ہے:

توڙي وَڃَنِ روم، نانهِہ نصيبون اڳِرو
ماني وَٹَن ٹومَ، جي لِکيا ڇِپَنِ مَ

دیکھیے: قاضی قادن جو کلام، ص۱۰۳، شعر ۱۰۶ (مترجم)

پنجاب کی پنجابی - ہندی کی آمیزش والے ہیں۔ کچھ اشعار میں الفاظ اور جملوں کی ترتیب 'گرو گرنتھ' کے بعض اشعار والی ہے۔

☆ شیخ فرید خورد کے اشعار:

۱- گهَڙين گهَڙيس گهاريانْ، پهرين لهي سَنجهاءِ
مون هِيَڙو گهڙيالَ جيونْ، ڏکين رَيْنِ وهاءِ (۱)

[ص ۴۴، ۶۰]

[لمحہ بلحہ بسر کرتا ہوں، رات کے پہلے پہر گزرنے پر
میرا مَن گھڑیال کی طرح، دکھوں میں رات بسر ہوتی ہے۔]

۲- ڏيهُ لتا، سنْجهاپئي، اگُون آئي رات
کڙا پڪاري پاتِڻي، ٻيڙا ڪپر وات(۱)

[نمبر ۴۷]

[دن ڈوبا، شام ہوئی، اس کے بعد رات آئی، دریا کے اس پار پہنچانے والا کھڑا پکار رہا ہے کہ بیڑا کنارے کے گرداب میں جا پھنسا ہے۔]

☆ شیخ فرید کے علاوہ دوسروں (؟) کے اشعار:

۱- جي جي ٻول مئن ڪيئي،(۲) سو سو مجهه نه ٿيان
اُس چنگي ديوان مين، سيي مُڪَر گيانْ

[نمبر ۱۱۱]

[جو جو قول و قرار میں نے کیئے تھے وہ مجھ سے ایفا نہ ہوئے میں وہ بھلامانس ہوں جو ان تمام قول و قرار سے پھر گیا۔]

۲- جتي(۳) سچ سنسار سان، سُه جا سائين ساڻ هوءِ
تو پڌر هي ٻيڙا تري(۳)، جُه ٿاءِ نِير نه ڪوءِ

---

(۱) ''گرو گرنتھ'' میں شیخ فرید کے نام کے ساتھ یہ شعر ایک اور تلفظ میں موجود ہے۔

(۱) ''گرو گرنتھ'' میں شیخ فرید کے نام کے ساتھ دیا ہوا شعر یوں ہے:

فريدا، ڏکان سيتي ڏِيه گيا، سُولانْ سيتي رات — کڙا پڪاري پاتڻي، ٻيڙا ڪپر وات

فریدا! دکھوں کے ساتھ دن گیا، غموں کے ساتھ رات — پار پہنچانے والا کھڑا پکارے، بیڑا گرداب میں جا پھنسا

[ص ۴۵]

(۲) پہلے مصرعہ میں 'جي' 'جي' اور 'ڪيئي' یائے مجہول کے ساتھ ہیں۔ (مترجم)

(۳) اس جگہ پر یائے مجہول ہے۔ (مترجم)

[نمبر ٦٨]

[جہاں بھی سنسار میں سچ کا چلن ہوتا ہے وہاں مالک خود ٹھکانہ کرتا ہے، ظاہر ظہور تیرا بیابان میں بھی بیڑا تیریگا، خواہ پانی نہ بھی ہو۔]

٣- ڀُلي [ڀُلي] وِي ڀُلي، ڀُلي تڳائونْ آئي
بابا آدم اَتي(١) حوا ڀُلي، ڀُلي سڀ دنيا ئي

[نمبر ٩٥]

[بھول گئے، وہ بھول گئے، ان کی یہ بھول زمانے سے چلتی آئی ہے
بابا آدم اور حوّا بھول گئے، ساری دنیا ہی بھولی ہوئی ہے۔]

٤- ڀڳا ساڃانہ ٿئي، مَن مو تاهل ڪچ
ڪَنين سٽيا نہ مَنيئي(١)، اک ڏٺو سچ

اس کی زبان سندھی آمیز سرائیکی ہے، زیادہ درست اسے یوں پڑھا جاسکتا ہے:

ڀڳا سچا نہ ٿيوي، من مو تاهل ڪچ
ڪَنين سٽيا نہ مَنيئي، اکيين ڏٺا سچ

[ٹوٹا ہوانہیں جڑیگا، مَن کچے موتی کی طرح ہے
کانوں سُنی بات پر اعتبار نہیں کرنا چاہیئے، آنکھوں دیکھا سچ۔]

٥- سِچ پيارا سائينيان، سائين سچ سُهاءِ
سچي منگل نہ دهئي(١)، سَچي سَرپُ نہ کاءِ
سچ سمندان سر چڙهي، ڪوڙ ڪکائين باهہ
جڏهون ڪڏهون ڪوڙ کي ڏيندو سچ سزاءِ

[نمبر ٦٩]

[اللہ تعالیٰ کو سچ عزیز ہے، اسے سچ اچھا لگتا ہے۔ سچے کو منگل گرہن (جس کی آگ فنا کرنے والی ہوتی ہے) کی آگ بھی نہیں جلائیگی، سچے کو سانپ بھی نہیں کاٹ سکتا۔ سچ کا بیڑا سمندر کے سینے پر چڑھتا ہے، جھوٹ خس و خاشاک کی آگ کی طرح ہے (جو ہوتی تو بہت تیز ہے مگر دیرپا نہیں ہوتی) ہمیشہ سچ جھوٹ کو سزایاب کرے گا۔]

٦- جو سائين سون سچ، تو ڀو کهڙا سُتڙي(١)
اُيا ٿِي ڪر نچ، توڙي ٣گرڙا ٻلي(١)

(١) یہ تینوں لفظ یائے مجہول کے ساتھ ہیں۔ (مترجم)

[نمبر۱۰۲]
[اگر مالک کے ساتھ سچا ہے، تو تجھے سوئے رہنے میں کیا ڈر ہے
کھڑے ہو کر ناچتے رہو، خواہ جلتے ہوئے انگارے ہی کیوں نہ ہوں۔]

۷- سُجِي نَتِي جَبابُ چَئي، سي سجڻ ڪِت گَئي(ا)
جتي بال سرير ۾، تِتي چِڻ پَئي(ا)

[نمبر۷۶]
[ویران بستی جواب طلب کرتی ہے کہ وہ ساجن لوگ کہاں گئے، جسم پر جتنے بال تھے اتنے چھید ہو گئے/ پڑ گئے۔]

۸- ڪَوسين ڪُو پَل نيپجي(ا)، تاري بڻدا هي(ا)
عقل غيب الله دا، الله ئي الله هي(ا)

[نمبر۱۰۵]
[کونپلوں سے پھلیاں پروان چڑھ کر اناج کے ڈھیر بنتے ہیں، عقل اللہ کا غیب ہے، اللہ ہی اللہ ہے۔]

۹- پيڙان سيي ڏُهيلِيانْ، ايهِي پيڙ نہ ڪا
جڻن وَڃڻ واجو ٿئي، جاڻي هڪ خدا

[نمبر۷۷]
[درد سب ہی تکلیف دِہ ہیں، ایسا درد کوئی نہیں
جیسا کہ حواس باختہ اس نے کیا، ایک خدا ہی جانتا ہے۔]

۱۰- هَسِينْ ڪِت سَهجڙي، رووڻ ڪِيونْ ناهِينْ
پريان پسڻ جوڳيان، آکين تو ناهِينْ

[نمبر۴۶]
[خوشی و تفریح میں ہنستی کیوں (؟) ہیں، روتی کیوں نہیں
تیری آنکھیں محبوب کو دیکھنے کے لائق نہیں۔]

(ھ) دادو دیال کے اشعار:

ذیل میں پہلا شعر دادو کے نام سے ہے، باقی دوسرے اشعار زبان، مضمون اور معنی کے

(ا) یائے مجہول ہے۔ (مترجم)

لحاظ سے دادو کے معلوم ہوتے ہیں۔ اشعار کی زبان میں سندھی کے ساتھ ڈھاٹکی-راجستانی کی آمیزش ہے۔ سندھی عبارت کی ترتیب فطری نہیں، بلکہ ذاتی کوشش کا نتیجہ ہے، جس سے ظاہر ہے کہ شاعر کی اپنی 'مادری زبان' سندھی نہیں۔

۱- دادو! اکيون پسڻ کي پريَ اُلٽيان منجهه
جتي بيٺو مان پرين، نهاريندو هَنجهه

[صفحہ ۴۳ اور ۶۴]

[دادو! محبوب کو دیکھنے کیلیے آنکھیں 'اندر' (مَن) میں جھکیں
جہاں میرا محبوب کھڑا ہوگا اس طرح ہنس بھی دیکھے گا۔]

۲- دَر پُورا گُر سي گهران، حقيقتان هَنجهه
ڪوڙين هنڌان ڪَڻ ٻِڳن، سَر پاٽي جي منجهه

[نمبر ۱۴]

[اپنے دروازے پر ایسے گروؤں کا آنا چاہتا ہوں، جو حقیقی ہنس کی طرح ہوں اور تالاب میں رہ کر کروڑوں جگہوں سے موتی چُنتے ہیں۔]

۳- اک اندر سَريو، جاڳي پَس جُواڻ
منجهيٽي مڪو ٿيو، منجهيٽي ملتان(۱)

[نمبر ۲۰]

[تیرے اندر ہی میں آنکھ ہے، بیدار ہو کر اے جواں نظارہ کر
تیرے اندر میں ہی مکّہ ہے، اندر ہی میں ملتان۔]

۴- شهباز باز ٿيو، پَنکي نه ماري
اک ڪوڙي عَرسِ ۾ لُڏي مناري

[نمبر ۲۲]

[باز (معمولی انسان) شہباز (عارف کامل) بنا، اب وہ پرندے نہیں مارتا
آنکھ ڈال کر عرش میں دیکھتا ہے اور مَنارہ پر جھولتا ہے۔]

---

(۱) پہلی سطر میں 'اک' (=آنکھ) کے بجائے 'انگ' (=جسم) مناسب ہوتا: یعنی اپنی جان یا اپنے آپ ہی میں سب کچھ ہے۔ لیکن یہاں پر 'اک' (اَکھِ = آنکھ) لفظ غالباً اس لئے استعمال کیا گیا کہ قاضی قادن کا مصرع ''ایک قصر در لکھّ'' سندھ سے باہر دادو دیال کے پاس ''عین قصر در لکھّ'' کی صورت میں پہنچا۔ یہی وجہ ہے کہ رانیلا کی پستک میں بھی اسی طرح لکھا ہوا ہے۔ 'عین' بمعنی آنکھ ہے۔ بعد میں دادو دیال نے آنکھ کو ہی اپنے اشعار میں معنوی تصور کے طور پر استعمال کیا، جیسا کہ اس کے بعد والے دوسرے شعر میں بھی آنکھ کا تصور لایا گیا ہے۔ 'مَنجهيٽي' کا لفظ راجستانی لہجہ کا ہے۔ سندھی میں 'مَنجهيني' ہوگا۔

۵- جِنهين جانِ جُدا ڪِئي، تُون مُهُه تِنهين پَسُ
لتاڙينِ لَتُن سين، اَٺي پَهَرَ عَرِسُ

[نمبر۲۳]

[جنہوں نے وجود گنوا دیا، تو ان ہی کا رخ دیکھ
لتاڑتے ہیں لاتوں (پاؤں) سے آٹھوں پہر عرش۔]

۶- [پاٺا] پڙهندو پئي(۱) ويو، ڪوڙين لک قرآڻ(۲)
لَکِي لوڪ نه سگهيو، پاڻي(۱) اندر پاڻ

[نمبر۴]

[دنیا کے لوگ پڑھتے رہتے تھے، کروڑوں لاکھوں مرتبہ قرآن
لیکن انہیں معلوم ہی نہیں ہو رہا تھا کہ محبوب خود اندر ہیں موجود ہے۔]

۷- تَئن پُڇي اَساڻ، تُون آسين نهين پڇيو
پڙهڻهار قرآڻ، نهين رتو رحمان سان

[نمبر۶۳]

[تو نے ہم سے پوچھا، تجھ سے ہم نے نہیں پوچھا
اے قرآن پڑھنے والا! تُو رحمٰن کے ساتھ نہیں رَچا۔]

۸- سچي سائين ساڻ، تون مَ ڪر ڪوڙي ڪُوڙيان
جي(۱) توءِ منجهه هِيانئَو، وو سيوڪي پرکٽو

[نمبر۶۶]

[سچے مالک کے ساتھ، تو جھوٹی! جھوٹ، فریب مت کر
جو تیرے اندر میں موجود ہے وہ سب کی پرکھ رکھتا ہے۔]

۹- سُتو هَتو جاڳ، راتڙين سَيڻه وِهَائيانْ
مَتئن تِيوءِ اَياڳ، پِرين وِسارڻ مَ ڪر

[نمبر۸۹]

[تُو بہت سویا ہے، اب تو بیدار ہو (کیونکہ) رات بیتنے والی ہے
تیرے سر پہ بدبختی آ گئی، محبوب کو بھلانے کی مت کر۔]

---

(۱) یائے مجہول ہے۔ (مترجم)
(۲) مطبوعہ کتاب میں آغاز کا لفظ 'پاٹا' موجود نہیں ہے۔

۱۰- پرين وساري(۱) رت روئن، ڪَنُڌي ري(۲) ڪارڻ (۳)
ڪَنچَن راس وِڃاءِ ڪي، ہُڪَنْ ڈوڑ پَوَن
[نمبر۹۰]
[محبوب کو بھلا کر خون کے آنسو روتے رہیں، اَن سُنی کی وجہ سے
سونے کی پونجی ضائع کرکے، مُٹھی بھر مٹی کے اوپر جا گرتے ہیں۔]

(و) مشرق اور جنوب - مشرقی سندھ اور قریبی راجستھانی علاقوں کی زبانوں کی آمیزش والے اشعار (؟):

یہ اشعار دادو دیال کے اشعار کے زیادہ قریب ہیں اور ممکن ہے کہ وہ دادو یا اس کے چیلوں کے ہوں۔ سندھی کے ساتھ ساتھ ان میں مغربی راجستھان زبانوں کی آمیزش کا شائبہ ہوتا ہے۔

۱- هَٽ ويا جهڻ لُوڻ، ڪستوري جهنگئن گهري
سچان دي صابوڻ، اندر اڇا نہ ڪري
[نمبر۹۸]
[تو دکان سے نمک خرید کر اُلار میں کستوری طلب کرتا ہے
سچے لوگوں کے صابن سے اپنا اندر اجلا نہیں کرتا۔]
اسے اگر درج ذیل طور پڑھا جائے تو معنی زیادہ واضح ہوں گے:
هٽ وِهائينْ لوڻ، ڪتوري جهنگين گهُرين
سچان دي صابوڻ، اندر اڇا نہ ڪرين!
[نمک دکان سے خریدتا ہے لیکن کستوری جنگل میں سے طلب کرتا ہے
سچے لوگوں کے صابن (محبت) سے اپنا مَن اجلا نہیں کرتا۔]
بہرحال اس کا جو اصل تلفظ ہے وہ سرائیکی - راجستھانی آمیز ہے۔

۲- مُباڻْ مَحلاڻْ مُندياڻْ اَڇَياڻْ چَلن
هَٿون گِنَن ہڪري، جهنگين اُٺ منگن

---

(۱) یائے مجہول ہے۔ (مترجم)
(۲) یائے معروف ہے۔ (مترجم)
(۳) ''ڪَنُڌي ري ڪارڻ'' میں 'ري' بمعنی 'کے' ہے۔ یعنی 'ڪَنُڌي کے سبب' (یعنی نہ سننے کی وجہ سے)

[نمبر ۹۹]

[کار پرداز لوگ مجلوں اور بازاروں میں معصوم لوگوں کو دھوکہ دیتے ہیں
دکان سے بکری خرید کر اُلار میں اونٹ مانگتے ہیں۔]

۳- مَنجھين مائو ناهِ ڪي، پسڻ ڪي گهاتي
ڏِني ڪسُونڀي(ا) رنگ جيون، ويندو ٿي واتي

[نمبر ۳]

[سرخ رنگ کا کپڑا دیکھنے میں تو گہرا ہوتا ہے، لیکن اسکے اندر میں کوئی مادہ نہیں ہوتا۔ دنیا بھی سرخ رنگ کے کپڑے کی طرح ہے، جو رنگ راہ چلتے پھیکا پڑ جاتا ہے۔]

۴- مٿن پاڻيي(ا) سونُ، هي جَر پوس جَرڪِٽون
ويو وَرائي(اَ) وَنءُ، ڪَهُ لڳي ڪارو ٿيو

[نمبر ۹۴]

[سورج کی کرنوں کی وجہ سے چمکتے پانی کو میں نے سونا سمجھ لیا۔
(ہاتھ لگانے سے) اس کا اصل رنگ اثر انداز ہوا اور اس نے مجھے سیاہ بنادیا۔]

(ز) بالائی سندھ - اور متصل راجستھانی علاقوں کی زبانوں کی آمیزش والے اشعار(؟):

۱- جي لوڙيندي نه لهان، اَلوڙيندي(ا) ڍير
توڙي (ا) ڏسڻ سهڻي (ا) انبانڻ تُل نه ٻير

[نمبر ۲۹]

[جن کی ضرورت ہے وہ ملتے نہیں اور جن کی ضرورت نہیں وہ ڈھیروں موجود ہیں
بیر دیکھنے میں خوبصورت کیوں نہ ہوں لیکن وہ آموں کی برابری نہیں کر سکتے۔]

۲- سُوني(ا) سرپ نه لوڙِيان، جي لوڙيان تان لک
مون نِنهان سندي ٻک، جنهين مستڪ مَڻي ٻَلي(ا)

[مَن کے بغیر والا سانپ طلب (تلاش) نہیں کرتا، اگر ایسے سانپوں کی ضرورت ہوتی تو وہ لاکھوں موجود ہیں۔ مجھے ایسے سانپ کی طلب ہے جس کی پیشانی میں مَن کی چمک ہو۔]

(ا) یائے مجہول ہے۔ (مترجم)

۳- کاگد ڪالي(۱) آکرين، مٿن واچَيندا اَلڏو
سڄڻ اڇي آکرين، مٿن لوڙِيندو لَڌو(۲)

[نمبر۴۳]

[سیاہ حروف والے کاغذ پڑھ کر، تلاش کرتے ہوئے میں نے محبوب کو نہیں پایا (کیونکہ میں ظاہری حروف تک ہی محدود رہا) محبوب کورے کاغذ کی طرح (ظاہری علامت کے بغیر ہی صاف شفاف) میں نے (ظاہری حروف کو ترک کر کے اندر میں) تلاش کرتے ہوئے حاصل کرلیا۔]

رانیلا کے قلمی پستک میں قاضی قادن کے اشعار کے ساتھ لکھے ہوئے ان سینتیس اشعار کو ہم نے ترتیب و تفصیل کے ساتھ سات گروپوں میں تقسیم کیا ہے۔ شروع کے تین گروپوں کے اشعار کی ترتیب زیادہ صاف سندھی میں ہے اور غالباً وہ سندھ ہی کے شعراء کے ہیں۔ چوتھے گروپ کے اشعار شیخ فرید (خورد) اور اس سمت کے دیگر درویشوں کے ہیں اور ان پر بھی سندھی - سرائیکی زبانوں کا رنگ غالب ہے۔ پانچویں گروپ کے تحت درج اشعار غالباً دادو دیال کے ہیں۔ چھٹے اور ساتویں گروپ کے اشعار بھی دادو کے ہی سلسلہ سے ملتے ہیں اور ان پر سندھی - راجستھانی رنگ کچھ زیادہ ہی ہے۔ ان اشعار سے اس دور میں سندھ سے مشرق اور شمال کی طرف، سندھی نیز سندھی - سرائیکی زبانوں کی پہنچ -وسعت اور سندھی کے صوفیانہ فکر کے بڑھتے ہوئے اثر کا ثبوت ملتا ہے۔

نتائج:

۱- یہ دور فارسی زبان کے عروج کا دور تھا۔ سندھ اور ہند میں فارسی سرکاری دفاتر، انتظامی امور، خط و کتابت، تعلیم و تصنیف اور ادب و شاعری کی زبان تھی۔ چونکہ سندھی پہلے ہی سے اپنے تاریخی و ارتقائی اعتبار سے ایک اعلیٰ سطح پر پہنچ چکی تھی، اس لئے باوجود فارسی کے عمل اور اثر کے سندھی کی انفرادیت و افادیت قائم رہی۔ سندھ میں فارسی اور سندھی کے عمل اور ردعمل کا جو سلسلہ شروع ہوا اس میں سندھی کی اہمیت میں مزید اضافہ ہوا۔

۲- اس دور میں سندھ میں مقامی طور پر بعض اہم سماجی، اخلاقی اور علمی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے سندھی ز.ن کے کچھ خاص نثری اصطلاحات، فقروں اور جملوں کے معنی و مفہوم کے بارے میں تحقیق شروع ہوئی۔

(۱) یائے مجہول ہے۔ (مترجم)
(۲) ہیرے ٹھاکر نے یہ شعر یوں لکھا ہے:

کاگد ڪالي آکرين، مَٿن واچيندا، اِڻِ - وڏو
سَڄَڻَ اڇي آکرين، مَٿن لوڙيندو لَڌو

دیکھیئے: قاضی قادن جو کلام، ص ۸۷ (مترجم)

۳- سندھ سے باہر سندھی زبان اور اس کی ثقافت کا دائرہ وسیع ہوا۔ شمال کی طرف ملتان سے اوپر پنجاب تک، جنوب میں کچھ، کاٹھیاواڑ اور گجرات تک، اور مشرق کی طرف راجستھانی علاقہ جات تک سندھی زبان کی ادبی ثقافت اثر انداز ہوئی اور وہاں کے کچھ مشہور درویشوں نے سندھی میں اشعار کہے اور اپنے کلام میں سندھی آمیز فقرے استعمال کیے۔

۴- سندھ کے روایتی ادبی ذخیرہ میں اضافہ ہوا اور خاص طور پر سندھی شعر کے تحریری سرمائے میں بڑا اضافہ ہوا۔ اس کے علاوہ سندھ سے باہر بھی سندھی، سندھی - سرائیکی اور ہندی - پنجابی - راجستھانی زبانوں کی آمیزش سے سندھی شعر کا اہم ذخیرہ وجود میں آیا۔

۵- اس دور میں سندھ میں عربی و فارسی سلسلۂ تعلیم نیز اساتذہ اور علماء کی عربی اور فارسی میں مہارت کے باوجود سندھی زبان خالص صورت میں لکھی اور پڑھی جانے لگی: یعنی علماء نے خالص سندھی بولنا اور لکھنا شروع کی جس کی وجہ سے عوام کی زبان اور علماء کی زبان میں کوئی خاص فرق نہیں رہا۔ علماء اور پڑھے لکھے لوگ زیادہ تر الفاظ اور فقرے اسی طرح لکھنے لگے جس طرح وہ عام طور پر بولے جاتے تھے۔ کچھ عربی اور فارسی الفاظ بھی جس شکل وصورت میں زبان زد عام و خاص ہوگئے تھے، اسی شکل وصورت میں علماء اور شعراء نے انہیں استعمال کیا مثلاً جاب = جواب؛ ساڌ ساٿَ=ساعت؛ چال (چھال) = شال وغیرہ۔

شاہ کریم کے ملفوظات (بیان العارفین) میں ایک سو تین اشعار اور دو مصرعوں کے بڑے سارے ذخیرہ میں، جو کہ علم و فکر کے گہرے خیالات پر مشتمل ہے، صرف تقریباً ستائیس عربی اور چار پانچ فارسی الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔

۶- ترتیب کے لحاظ سے اس دور میں سندھی زبان کی پرانی اصل اہم خصوصیات قائم رہیں: یعنی

(الف) جداگانہ حروف جر یا حروفِ اضافت کے بجائے مشترکہ ترتیب والی اضافی اور جری تراکیب زیادہ رائج ہوئیں۔

(ب) طویل حروفِ علت (ا، و، ی) کے تلفظات اور 'ھ' 'نون غنہ' اور ء (ہمزہ) سے مرکب تلفظات کم رہے اور خاص طور پر لاڑی زبان میں بہت ہی کم رہے۔

۷- اس دور میں سندھ کے مختلف حصوں کے مقامی 'لغات' اور 'محاورات' میں زیادہ یکسانیت پیدا ہوئی اور مجموعی طور پر شمال خواہ لاڑ میں، یعنی تمام سندھ میں، معمولی فرق کے علاوہ ایک جیسی زبان رائج ہوئی: مثلاً شاہ کریم کی 'لاڑی سندھی' اور قاضی قادن کی 'سرے والی سندھی' (یعنی بالائی علاقہ سندھ کی زبان) کی بعض جداگانہ خصوصیات کے باوجود دونوں میں نسبتاً زیادہ ہی مشترک ترتیبیں اور اصطلاحی یکسانیات ظاہر ہوئیں۔

باب ہفتم

مادری زبان سندھی کے ذریعے تعلیم دینے اور سندھی میں درسی، علمی او رمعلوماتی مواد کے منظوم ہونے کا ابتدائی دور

(مغلیہ دور ۱۵۹۰ء۔۱۶۸۰ء)

سندھ میں ایک باقاعدہ تعلیمی نظام کا سلسلہ، ہند کے دیگر تمام صوبوں سے پہلے عرب۔اسلامی دور میں شروع ہوا۔ منصورہ، دیبل او ردیگر شہروں کی درسگاہوں کے علماء واساتذہ کی تربیت سے بڑے بڑے محقق و مصنّف پیدا ہوئے، جن کا ذکر مشہور عربی کتابوں میں موجود ہے۔ اس قدیم تاریخی تعلیمی پس منظر ہی کا نتیجہ تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ، سندھ کی درسگاہوں کے بیدار مغز اساتذہ نے تعلیمی نظام، طریقۂ تعلیم او ر اساتذہ کی تربیت کے بارے میں سوچنا شروع کیا او ربالآخر دسویں صدی ہجری میں سندھ کے بہت بڑے محقق، عالم اور استاد مخدوم جعفر بوبکائی نے عربی میں ایک تفصیلی کتاب ''نہج التعلم'' (پڑھنے پڑھانے کا طریقہ) لکھی، جس میں انہوں نے نصابی تنظیم، طریقۂ تدریس، شاگردوں او راساتذہ کی ذہنی نفسیاتی صلاحیتوں او رذمہ داریوں، او راستاد۔شاگرد کے تعلیمی تدریسی تعلقات کو تفصیل سے سمجھایا۔ تعلیم اور تعلیمی طریقوں کے بارے میں ہندوستان میں یہ پہلی کتاب ہے جو اس قدر پرانے دور میں لکھی گئی (۱)۔

(۱) موجودہ تحقیق کی رو سے، تمام وسط ایشیا یعنی اُس وقت کے ایران، ترکستان اور ہندوستان میں فن تعلیم پر تصنیف ہونے والی یہ دوسری کتاب تھی۔ پہلی کتاب ''تعلیم المتعلم طریقة التعلم'' کے عنوان سے برہان الدین زرنوجی نے بارھویں صدی عیسوی کے اختتام پر تصنیف کی۔

[حدائق الحنفیہ کے محشی نے معجم المؤلفین کے حوالے سے لکھا ہے کہ برہان الدین زرنوجی ۵۹۳ھ تک زندہ تھے۔ اس کے علاوہ حدائق الحنفیہ کے مصنف نے ان کی کتاب کا نام تعلیم المتعلم اور ان کا لقب برہان الاسلام لکھا، جبکہ عبدالقادر قریشی نے ان کا لقب 'برہان الاسلام' اور ان کی کتاب کا نام 'تعلیم المتعلم طریق التعلم' لکھا ہے۔ برہان الدین ابوالحسن علی بن ابی بکر بن عبدالجلیل مرغینانی صاحب ہدایہ متوفی ۵۹۳ھ کے شاگرد تھے، اپنی اس کتاب تعلیم المتعلم کی فصل ثانی میں ان سے دو شعر بھی نقل کیے ہیں:

فساد کبیر عالم متهمک
و اکبر منه جاهل متنسک

....

هما فتنة فی العلمین عظیمة
لمن بها فی دینه متمسک

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مخدوم جعفر کے والد مخدوم یعقوب عرف مخدوم میراں خود بھی ایک بڑے قابل عالم اور دانشور تھے، جنہوں نے مرزا شاہ حسن ارغون، اپنے بیٹے مخدوم جعفر اور دوسروں کو ٹھٹہ میں پڑھایا اور ٹھٹہ ہی پر سن ۹۴۹ھ (۱۵۴۲ء) میں وفات پائی۔ اسی سال کی مناسبت سے اور اس حوالہ کے تناظر سے کہ مخدوم جعفر نے سن ۹۵۸ھ میں حج کیا، کہا جا سکتا ہے کہ مخدوم جعفر سن ۹۳۰ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔ انہوں نے اپنے والد کی رہنمائی میں تعلیم مکمل کی اور غالباً بعد میں مکہ میں (۹۶۶ھ - محرم ۱۵۵۹ء) مزید تعلیم حاصل کی۔ وہ جب سندھ واپس آئے تو اپنے والد کی طرح ایک بڑے ماہر استاد کی حیثیت سے ٹھٹہ میں تعلیم دینے لگے۔ مرزا عیسیٰ ترخان (وفات ۹۷۴ھ) کے ہاں ان کی بڑی قدر و منزلت تھی، اور وہ ان کے ساتھ گزشتہ تاریخی حالات کا ذکر کرتے رہتے تھے۔ غالباً مرزا عیسیٰ نے بھی مخدوم جعفر کے لیکچرز سنے، اس کا بیٹا اور دیگر مخدوم جعفر کے مدرسہ میں پڑھتے رہے۔ اپنی علمی قابلیت اور تجربہ کی روشنی میں مخدوم جعفر نے تعلیم و تعلم کے طور طریقوں کی اہمیت محسوس کی، اور سن ۹۷۳ھ (۱۵۶۵ء) کے لگ بھگ اس موضوع پر کتاب ''نهج التعلم'' لکھی۔ یہ کتاب عربی زبان میں تھی اور بہت زیادہ تفصیلی تھی، اور خاص تعلیمی ماہرین کے لیے لکھی گئی تھی۔ اس لیے بعد میں مخدوم جعفر نے عام اساتذہ کی رہنمائی کے لیے اسے فارسی میں مختصر کرنے کی ضرورت محسوس کی، اور ماہ صفر سن ۹۷۶ھ (اگست ۱۵۶۸ء) کو حاصل النہج کے عنوان سے اس کا خلاصہ یا اختصار لکھ کر مکمل کیا(۱)۔

ابتدائی عرب - اسلامی دور نیز سومرہ دور میں عربی ذریعۂ تعلیم تھی لیکن سمہ دور سے ذریعۂ تعلیم فارسی زبان بنی۔ اس لیے مخدوم جعفر نے بھی عام اساتذہ کی رہنمائی کے لیے ''حاصل النہج'' کو فارسی زبان میں لکھا۔ آپ کی اس آسان کتاب نے سندھ کے علماء اور اساتذہ کی تربیت پر بڑا اثر ڈالا کہ انہوں نے تدریس کے طریقوں پر غور کرنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ آئندہ

[گزشتہ سے پیوستہ]

نیز آپ نے ابو المحامد قوام الدین حماد بن ابراہیم بن اسماعیل بن احمد صفار بخاری (۴۹۳-۵۷۶ھ) سے علم حاصل کیا اور ان سے بھی علم کے متعلق ایک شعر امام ابو حنیفہ کا نقل کیا ہے:

من طلب العلم للمعاد
فاز بفضل من الرشاد
فيالخسران طالبيه
لنيل فضل من العباد

نیز محمد بن ابی بکر ابن ابراہیم جرغی المعروف امام زادہ (۴۹۱-۵۷۳ھ) سے علم حاصل کیا۔

دیکھیے: حدائق الحنفیہ: ۲۵۴، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۵، ۲۹۵

الجواہر المضیہ، جزء اول: ۲۲۴-۲۲۵، ۳۸۳، جزء دوم، ص: ۳۶۴ (مترجم)]

(۱) کتاب ''ابو الحسن جی سندھی'' کے لئے دیکھئے آٹھواں باب

[illegible] سالوں میں سندھ [illegible] کے تجربہ کار اور ماہر اساتذہ بالآخر اس نتیجے پر پہنچے کہ [illegible] تعلیم کا آغاز فارسی زبان [illegible] کے بجائے ان کی اپنی مادری زبان سندھی سے کیا جائے [illegible] مکتب کی تعلیم بآسانی [illegible] اور ان میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی مزید استعداد و [illegible] پیدا ہو۔

[illegible] کے ذریعے ابتدائی تعلیم دینے کا نظریہ:

[illegible] اس نئے تعلیمی نظریہ اور تجربہ بلکہ انقلابی تعلیمی تحریک کا سن او رسال تو تحریری [illegible]، لیکن اندازہ [illegible] یہ مخدوم جعفر کی تعلیمی کتاب ''حاصل النہج'' کے تقریباً تین چالیس برس بعد گیارہویں صدی ہجری (سولہویں صدی عیسوی) سے شروع ہوئی۔ مکتب کی تعلیم مادری زبان سندھی [illegible] کے اس نظریہ کی پذیرائی کا ایک اہم سبب یہ بھی تھا کہ سندھی زبان میں اعلیٰ فہم اور [illegible] کی مواد قاضی قادن او رمیاں شاہ کریم کے بے بہا اشعار کے [illegible] پیدا ہو چکا تھا اور فکر [illegible] (۱) ''حاصل النہج'' (فارسی متن) انگریزی میں اس کا خلاصہ، مقدمہ اور مصنف کی سوانح اور تصنیفات سمیت، راقم کی تحقیق و تصحیح کے ساتھ سن ۱۹۶۹ء میں سندھ [illegible] شائع ہوئی، مقدمہ [illegible] کے لیے ''حاصل النہج'' کا مقدمہ دیکھیے۔

معیاری تھی کہ ۱۰۲۲ھ بمطابق ۱۶۱۳ء سے پہلے ہندوستان کے عالم محمد غوثی گوالیاری نے قاضی قادن کے بعض اشعار کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا۔ سندھ میں محمد رضا ٹھٹوی نے سن ۱۰۳۸ھ میں میاں شاہ کریم کے اشعار میں موجود فکر کو کتاب ''بیان العارفین'' میں فارسی کے ذریعے سمجھایا۔ سندھی میں ایسے اعلیٰ فہم و فکر کی موجودگی اور اس کی عام اشاعت نے افادیت کے لحاظ سے سندھی کو فارسی کے ہم پلہ بنا دیا۔ یہی سبب تھا کہ گیارہویں صدی ہجری (سترھویں صدی عیسوی) سے ہی مادری زبان سندھی میں ابتدائی مکتبی تعلیم دینے کے لیے حالات ساز گار ہوئے۔

آج تک عام طور پر یہی سمجھا گیا ہے کہ ٹھٹہ کے عالم میاں ابوالحسن ہی نے سندھی زبان میں پہلی درسی کتاب ''ابوالحسن جی سندھی'' لکھی، یہ خیال اس لیے پیدا ہوا کہ اس کتاب سے پہلے کی کوئی اور کتاب، سندھی میں لکھی ہوئی نظر نہیں آرہی تھی، لیکن اب ایک قدیم سندھی قلمی ذخیرہ کے دستیاب ہونے سے ثابت ہوا ہے، کہ مادری زبان سندھی کے ذریعے تعلیم دینے کی تحریک او رسندھی میں درسی و تعلیمی مواد تیار کرنے کی ابتداء ''ابوالحسن جی سندھی'' سے پہلے ہو چکی تھی۔ میاں ابوالحسن ایک بڑے عالم و استاد تھے او روہ بھی اس نئی تعلیمی تحریک کے دوسرے دور کے

---

(۱) کتاب ''ابوالحسن جی سندھی'' کے لئے دیکھئے آٹھواں باب

سربراہ تھے، لیکن اس تحریک اور اس تحریک کے زیر اثر سندھی درسی کتب لکھے جانے کی ابتداء غالباً ان کے اساتذہ کے دور (۱۰۰۰ھ ۔ ۱۰۵۰ھ) میں ہوئی ،جن کے تعلیمی نظریات او ردرسی کتب سے متاثر ہو کر خود انہوں نے بھی سندھی میں ایک بہترین درسی کتاب تصنیف کی ،جو بعد میں 'ابو الحسن جی سندھی' کے نام سے مشہور ہوئی (۱)۔

جن بیدار مغز سندھی علماء و اساتذہ نے فارسی کے بجائے مادری زبان سندھی کے ذریعے مکتبی تعلیم دینے کا نظریہ پیش کیا او رسندھی میں درسی کتابیں لکھ کر عملاً اس نظریہ کو مستحکم کیا ان کے ابتدائی منصوبوں اور کوششوں کے بارے میں اگرچہ اس دور کے تحریری حوالہ جات تو موجود نہیں ہیں ،تاہم اس طرح کی تبدیلی کی وجہ سے بعد میں مختلف موضوعات او رعنوانات پر سندھی میں پڑھنے پڑھانے کے لئے جو درسی کتابیں یا کتابچے لکھے گئے او ربعد میں ایک ضخیم قلمی ذخیرہ کی صورت میں دستیاب ہوئے ہیں ،وہ اس نئی تعلیمی تحریک کا واضح ثبوت ہیں۔

تعلیمی مقصد کے لئے سندھی میں درسی اور علمی کتابچوں کا تحریر ہونا :

مختلف عنوانات پر اس قسم کے انتالیس ،منظوم موضوعات ، کا ایک قیمتی ذخیرہ اب تک سلامت ہے جسے عزت بن سلیمان کاتب نے ۱۰۶۷ھ ۔ ۱۰۶۹ھ (۱۶۵۵ء ۔ ۱۶۵۷ء) کے تین سالہ عرصے میں نقل کر کے مکمل کیا ۔ اس ذخیرہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کے سندھی علماء و اساتذہ نے ان موضوعات کو محض تعلیمی مقصد کے لیے اس وقت کی عام رائج سندھی زبان میں منظوم کیا، تاکہ انہیں آسانی سے سکھایا اور پڑھایا جاسکے۔ ذیل میں ان انتالیس موضوعات کی فہرست دی جاتی ہے جنہیں مختلف علماء دفضلاء او ردیگر بیدار مغز لوگوں نے منظوم کیا ۔جن بنیادی موضوعات پر وہ منظومات تیار کیے گئے انہیں اوپر چورس بریکٹ میں ظاہر کیا گیا ہے اور نیچے ان موضوعات سے متعلق وہ منظومات، کاتب کے قائم کردہ اصل عنوانات کے ساتھ درج کیے گئے ہیں ۔ جہاں کہیں اصل 'عنوان' درج نہیں کیا گیا ہے وہاں پر مضمون کے مناسب عنوان چورس بریکٹ میں لکھا گیا ہے ۔

[ا]

[خالق کی وحدت ،کائنات کی تخلیق او رانسان کی پیدائش]

۱۔ جباری صفت خدائی

۲۔ آغاز تخلیق آدم علیہ السلام

(۱) کتاب "ابوالحسن جی سندھی" کے لئے دیکھئے آٹھواں باب

کاتب عزت بن سلیمان کے 1067-1068ھ کے قلمی ذخیرے

سے ایک صفحے کا عکس

۳۔صفت جوہر آفرینش عالم ومہتر آدم علیہ السلام

۴۔نور نامہ حضرت رسالت پناہ، تیار کردہ 'آزادین' کا

[۲]

[نبی پاک ﷺ کی سوانح، تعریف اور معجزات]

۵۔ [نبی پاکؐ کی سوانح □]

٦۔ مدح رسول اللہ ﷺ، تیار کردہ 'عثمان' کی

۷۔معراج نامہ، تیار کردہ 'جمعہ' کا

۸۔ وفات پیغمبر علیہ السلام

۹۔ فاختہ اور باز کا معجزہ

۱۰۔صفت ماہی ودریا

[۳]

[تعلیمی سلسلہ: درسی اور علمی کتابیں، موضوعاتی تشریحات اور وضاحتیں]

[(الف) توحید کا اقرار اور ایمان، اور کفر سے بچنا]

۱۱۔ [اللّٰھم اِنّی: توحید کا اقرار □] سندھی ترجمہ ''ملاّ'' کا کیا ہوا

۱۲۔ [ایمان مفصل ۔۱: آمنت باللہ □] سندھی ترجمہ ''آدم کنباؤ'' کا کیا ہوا

۱۳۔ [ایمان مفصل ۔۲ □] سندھی ترجمہ ''حاجی'' کا کیا ہوا

۱۴۔ [ایمان مفصل ۔۳ □] سندھی ترجمہ ''سگرونہ'' کا کیا ہوا

۱۵۔ [اللہ ربّی: عقیدہ کا اقرار]

۱٦۔کلمات کفر [اور حرام کام]

۱۷۔کلمات کفر در بانگ نماز

[(ب) اسلامی شریعت کی تربیت کے لئے کتابیں]

۱۸۔کتاب شریعت، 'صادق' کی تحریر کردہ

۱۹۔ چار علوم، 'عثمان' کی تحریر کردہ

۲۰۔ سادھیون چھہ ویھیون فرضن (ساڈھے ون چھہ ویھوں فرضن۔ یعنی ساڑھے چھ بیسیاں [۲۰ × ٦۱/۲] فرائض کی، مقصد ایک سو تیس فرائض نامی کتاب)، 'عثمان' کی تیار کر

۲۱۔ آب دہ در دہ (=دس گز چورس)

[(ج) فقہ کے بارے میں علمی تحقیقی کتابیں]

۲۲۔ کتاب اساس المصلی ، 'پسیو' کی ترجمہ کردہ

۲۳۔ کتاب نظامی از کیدانی ، سندھی میں 'موسیٰ' کی مختصر کردہ

[۴]

اخلاقی تعلیم

[(الف) اخلاقی تعلیم : نصیحت اور ہدایت]

۲۴۔ چند بیت پندیات سنڌي (چند ناصحانہ سندھی اشعار)

۲۵۔ سی حرفی ، 'موسیٰ' کی منظوم کردہ سہ حرفی

۲۶۔ سی حرفی

۲۷۔ جھوٹ گہنا۔ جھوٹ زیور (کھوٹے اور جھوٹے زیور)

۲۸۔ قصہ عتاب زنانِ بدکرداران، مصنف 'گھرئو بن عمر'

۲۹۔ [صنعتِ مستزاد کی نظم](ا)

[(ب) اخلاقی تعلیم : اچھے کاموں کی ترغیب کے لئے موت ،قبر اور قیامت کی سختی کا بیان]

(ا) مستزاد: زیادہ کیا ہوا، اصطلاح شاعری میں ہر مصرع کے آخر میں وزن سے زائد ایک کلمہ۔ (فرہنگ عامرہ ص ۵۷۷، مطبوعہ مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، طبع اول جون ۱۹۸۹ء)

مستزاد: بڑھا ہوا، ایک طرح کی نظم جس کے مصرع کے بعد وزن سے زیادہ ایک اور رکن ملادیں۔ (اظہر اللغات اردو، ص۶۹۲ ،مطبوعہ اظہر پبلشرز، اردو بازار لاہور)

مستزاد: زیادہ کیا گیا، بڑھایا گیا۔ وہ غزل جس کے ہر مصرع یا شعر کے بعد کچھ زائد ٹکڑا بڑھا دیا جائے۔ (جواہر اللغات، اردو، ناشر کتابستان پبلشنگ کمپنی اردو بازار لاہور، ص۶۷۵)

مستزاد: زیادہ کیا ہوا، بڑھایا ہوا۔ وہ شعر جس کے ہر مصرع یا شعر کے بعد ایسا رکن (یا سرگم کا پد) لگا ہوا ہو جو اس مصرع کے اول رکن اور آخر رکن کے برابر ہو۔ (جامع سندھی لغات، جلد پنجم، ص۲۶۵۲ ،مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ، حیدرآباد، ۱۹۸۸ء)

سُرور اکبرآبادی صاحب لکھتے ہیں کہ: مستزاد اس نظم کو کہتے ہیں جس میں ہر مصرع یا ایک مصرع چھوڑ کر دوسرے مصرع کے بعد اُسی وزن کا ایک جُز یا دو ایک کلمے وزن سے زیادہ ملا دیئے جائیں۔ دیکھیئے: تفہیم البلاغت، ص:۱۰۸، ناشر: مکتبۂ فریدی کراچی، ۱۹۷۶ء

اور علامہ عبدالستار ہمدانی ''مصروف'' برکاتی، نوری فیروز اللغات کے حوالے سے لکھتے ہیں: علم عروض کی اصطلاح میں وہ غزل جس کے ہر مصرعہ یا شعر کے بعد ایسا زائد ٹکڑا لگا ہو، جو اسی مصرعہ کے رکنِ اوّل اور رکنِ آخر کے برابر ہو۔ دیکھیے: 'فنِ شاعری اور حسان الہند' ص۱۷۴، ناشر مرکز اہل سنت برکات رضا، پوربندر، گجرات (انڈیا)

شاعری میں صنعت مستزاد کی بہترین مثال مولانا شاہ احمد رضا خان بریلوی کی درج ذیل نعت ہے:

وہی رب ہے جس نے تجھ کو، ہمہ تن کرم بنایا ہمیں بھیک مانگنے کو، ترا آستان بتایا - تجھے حمد ہے خدایا

۳۰۔ 'کندھر' کی مناجاتِ موت نامہ

۳۱۔ قصۂ گور (قبر کا) 'سیّدؔ' کا کہا ہوا

۳۲۔ حشر نامہ

۳۳۔ [قیامت نامہ]

[(ج) اخلاقی تعلیم : سزا و جزا کے بارے میں مثالی قصّے]

۳۴۔ قصہ جُمْجُمۂ بادشاہ (۱)

۳۵۔ قصہ ابو شحم

[۵]

[عام مطالعہ : انبیاء کی تاریخ و قصص]

۳۶۔ [تاریخیں آدم علیہ السلام سے حضرت محمد ﷺ تک]

۳۷۔ مصیبت نامۂ پیغمبراں ، 'نورے' کا کہا ہوا

۳۸۔ قصہ مہتر یوسف علیہ السلام

۳۹۔ قصہ پیغمبر اسماعیل علیہ السلام ، 'ہیر' (ہَیَر) کا کہا ہوا

اس تمام ذخیرہ کے تفصیلی مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سندھی میں اتنے بڑے پرانے ذخیرہ کی تصنیف و تالیف کے بنیادی مقاصد اور ان کی تکمیل کے لئے اختیار کردہ طریقے درج ذیل تھے۔

(الف) مادری زبان سندھی کے ذریعے ابتدائی تعلیم دینا

(ب) ایسی تعلیم کے لئے سندھی میں درسی مواد مہیا کرنا

(ج) سیکھنے والوں کے شوق کو بڑھانے اور ان کے لیے آسانی پیدا کرنے کی خاطر درسی اور مطالعاتی مواد کو آسان زبان میں منظوم کرنا۔

سندھ میں صدیوں سے اسلامی تعلیمی نظام رائج تھا جس میں ابتدائی مکتبی تعلیم کو بڑی اہمیت

[گزشتہ سے پیوستہ]

اس نعت کے پہلے مصرعہ میں ''وہی رب ہے جس نے تجھ کو'' رکن اول ہے اور ''ہمہ تن کرم بنایا'' رکن ثانی ہے اور دوسرے مصرع میں ''ہمیں بھیک مانگنے کو'' رکن اول ہے اور ''ترا آستان بنایا'' رکن ثانی ہے۔ دونوں مصرعوں کے دونوں رکن کے برابر زائد ٹکڑا ''تجھے حمد ہے خدایا'' ہے۔ یونہی یہ پندرہ اشعار پر مشتمل تمام کی تمام نعت ''صنعتِ مستزاد'' کا شاہکار ہے۔ (مترجم)

(۱) 'جمجمہ' دونوں 'جیم' کے پیش کے ساتھ، عربی زبان کا لفظ ہے، اس کے معنی ہیں سَر کی کھوپڑی، لکڑی کا پیالہ، زمین شور میں، کھُدا ہوا کنواں۔ اس کی جمع جَماجم ہے۔ دیکھیے : المنجد عربی اردو، ص ۱۶۴، قصہ جمجمۂ بادشاہ یعنی بادشاہ کی کھوپڑی کا قصہ۔ (مترجم)

حاصل تھی۔ مسلمان بچوں کے لئے 'مکتبی تعلیم' اصولی طور پر 'دینی تعلیم' تھی جس میں قرآن شریف پڑھانے کے ساتھ توحید و رسالت پر ایمان پختہ کرنا، اسلام کے بنیادی ارکان میں سے نماز، [illegible] اور روزہ کے فرائض سمجھانا، اور ادائیگی نماز کے لیے جسم، لباس اور نیت کی صفائی و طہارت رکھنا لازمی [illegible] یہ شامل تھے۔ ایمان اور ارکان شرع کے ساتھ تیسرا موضوع اخلاقی تعلیم تھا(۱)۔ مذکورہ بالا [illegible] پانچ حصوں میں شامل انتالیس عنوانات پر مشتمل موضوعات میں سے، شروع کے چار حصوں [illegible] ۳۵ موضوعات نصابی اور درسی مقاصد کے لیئے تصنیف کیے گئے۔ آخری پانچویں حصہ کے تین موضوع عام معلومات و مطالعہ کا شوق بڑھانے کے لئے تیار کیے گئے ہیں۔

تیسرے حصہ کے تحت جملہ ۱۳ موضوعات، خاص طور پر ابتدائی تعلیمی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے درسی کتب کے طور پر تیار کئے گئے۔ اس بات کی تصدیق اس سے بھی ہوتی ہے کہ آگے چل کر ان موضوعات کو درسی سلسلہ میں شامل کیا گیا اور بعض موضوعات کی ترمیم و اصلاح بھی کی گئی(۲)۔

اس دور کے بیدار مغز علماء و اساتذہ نے نہ صرف اس درسی مواد کو عربی زبان سے سندھی میں منتقل کیا بلکہ اسے منظوم بھی کیا، تاکہ شاگرد درسی مواد کو اپنی مادری زبان اور منظوم صورت میں آسانی اور دلچسپی سے پڑھ سکیں۔ درج ذیل مثالیں اس دور کے سندھی علماء اور اساتذہ کے اس نظریہ کو واضح کرتی ہیں، اور خاص طور پر حاجی نام کے عالم کی وضاحت سے [illegible] تصدیق ہوتی ہے کہ: "پانھجي واءِ پروڙي سگھائي سکن"
('اپنی زبان' میں بآسانی سمجھ کر وہ جلدی سیکھ سکیں)۔

☆ [عنوان ۔ ۲۰] "ساڈھیون چھہ ویہوں فرضن" بیان کرتے ہوئے متبحر عالم 'فاضل عثمان' نے بتایا کہ علم حاصل کرنا سب کے لئے ضروری ہے، مگر عام لوگوں کے لئے (عربی کے بجائے) سندھی میں پڑھنا زیادہ آسان ہے:

عثمان چوءِ علم رِءَ عقل مور نہ کوءِ
سنڌي ابوجھن کي گھٽو سُھلي ھوءِ

[عثمان کہتا ہے کہ علم کے بغیر عقل کی کوئی حیثیت نہیں کم عقل لوگوں کے لئے سندھی زبان زیادہ آسان ہے۔]

---

(۱) سندھ میں پرانے وقتوں سے مکتبوں میں ہندو شاگرد بھی پڑھتے تھے، جنہیں فارسی زبان، کتابت اور انشاء پردازی کے ساتھ ادب و اخلاق کی تعلیم دی جاتی تھی۔

(۲) دیکھیے: باب آٹھواں

☆ [عنوان ۔۱۳] کے تحت ''حاجی'' نے 'ایمان مفصل' کا سندھی میں منظوم ترجمہ کیا ہے۔ تاکہ پڑھنے والے مادری زبان میں ہونے کی وجہ سے اُسے بآسانی سیکھ اور سمجھ سکیں۔

عربياءِ سنڌي ڪئي ''حاجي'' بيت ڪري
تہ سکن سَهُکي ٿئي اپنجهن ڏَري
سنڌي آهي سَهُکي سکڻ ابوجهن
پانهجيَ واءِ پروڙي سگهائي سِکَن

[ایمان مفصل کی عبارت کو) حاجی نے عربی سے سندھی شاعری میں منتقل کیا تاکہ سادہ لوح لوگوں کے لیے بھی سیکھنے میں آسانی ہو۔ سادہ لوح لڑکوں کے لئے سندھی میں سیکھنا آسان ہے: کیونکہ وہ اپنی زبان میں جلد سیکھ سکتے ہیں]

☆ [عنوان ۔۱۴] ایک اور عالم 'سگر ڈنہ' نے بھی ''ایمان مفصل'' کا اسی مقصد پیشِ نظر سندھی شاعری میں لایا:

''سگر ڏني'' سنڌي ڪئي صفت هِيَ ايمانَ
تن سيئي پُنيُون، جي ني ڪلمي ساڻَ

[سگر ڈنہ نے اس ایمانِ مفصل کو سندھی کا جامہ پہنایا، وہ تمام لوگ بامراد ہوں گے جنہیں مرتے وقت کلمہ پڑھنا نصیب ہوگا۔]

مادری زبان کے ذریعہ ابتدائی تعلیم دینے کے نظریہ کو عملاً کامیاب بنانے کے لیے بیدار مغز علماء و اساتذہ نے نہ صرف خود اپنی طرف سے نصابی مواد مرتب اور منظوم کیا، بلکہ انہوں نے عربی اور فارسی کی درسی کتب سے بھی مواد منتخب کر کے سندھی زبان میں منتقل کیا۔ اس سلسلہ میں فقہی مسائل کو خاص طور پر مشہور عربی کتب سے نکال کر سندھی زبان میں سمجھایا۔

☆ [عنوان ۔۲۲] عربی کتاب اساس المصلی کا پہلے فارسی میں ترجمہ ہوا، بعد میں ایک سندھی عالم ''پُسیو'' نے اس کا سندھی زبان میں منظوم ترجمہ کیا:

'اساس المصلي' ڪتيب متقيا، مون سنڌي ڳالهاءُ
يا ربّ! ڏينُ سيکهين نماز سندو ساءُ
عربيَ ڦُرُ فارسيَ، فارسيَ سنڌي ڦر هوءِ
سائين سباجها مون ڏٽي سکي سيو ڪوءِ

['اساس المصلی' کتابچہ اصل عربی میں تھا، جس کا میں نے سندھی میں ترجمہ کیا، اس طرح عربی بعد میں فارسی اور پھر فارسی سے سندھی میں اس کا ترجمہ کیا گیا، تاکہ ہر ایک اسے

آسانی سے سیکھ کر سمجھ سکے۔]

☆ [عنوان ۔۲۳] موسیٰ نامی عالم نے کیدانی کی عربی کتاب 'نظامی' کا (جس میں ۱۵ باب تھے) سندھی میں اختصار کیا اور اسے آٹھ ابواب میں مرتب کیا۔ اختصار کے باوجود اس نے تمام مسائل کو سندھی میں آسان بنا کر پیش کیا:

باب بيو بيان 'واجبين' سندو منجهہ جهين
سنڌيءَ ۾ سهڪا ٿيا سڪڻ سيکهين

([دوسرا باب واجبات نماز کے بیان میں ہے، جنہیں سندھی میں سیکھنا ہر ایک کے لئے آسان ہے۔]

مفسد پنج نماز ۾ 'کيداني' ڏنام
عربياءُ عامن کي سنڌيءَ سهل ڪيام

['کیدانی' نے نماز کے مفسِد پانچ ذکر کئے ہیں، عربی میں لکھے ہوئے ان مسائل کو میں نے عام لوگوں کے واسطے سندھی میں سہل بنا کر پیش کیا ہے۔]

☆ [عنوان ۔۲۱] بعض فقہی مسائل، ایک سے زائد عربی کتابوں سے دیکھ کر، مکمل تحقیق کے ساتھ سندھی میں بیان کئے گئے۔ ''دس گز مربع پانی'' (دہ در دہ) کی طہارت یا پلیدی کا مسئلہ بیان کرتے ہوئے بیدار مغز علماء نے سمجھایا کہ:

'فتاوا سراجي' ۾ لکي هئي نہ پتِ
'مجموع ۔ خاني' آب باب مون هي ڏٺو تت

['فتاویٰ سراجی' میں یہ وضاحت موجود نہیں تھی، میں نے اسے کتاب 'مجموع خانی' کے باب ''آب'' (باب الماء) میں دیکھا ہے۔]

☆ [عنوان ۔۴] 'نور نامہ حضرت رسالت پناہؐ' کے مصنف 'آرادین' نے بتایا کہ:

نور نامي منجهاء سا لکي سنڌي کيو پاکا
سب پرياءُ پاٺهي پاتا بادشاهہ
عربيا ۽ فارسيا سنڌي وا کيام
اربعا 'آرادين' چوءِ لکي پڄئيام

[نور نامہ کے متعلق اصل مواد سے، میں نے یہ پاک صاف سندھی لکھی، اسے لکھنے اور مکمل کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے میرے قلب و ذہن کو روشن فرمایا۔ میں نے یہ بیانات عربی اور فارسی سے سندھی زبان میں منتقل کیے 'آرادین' کہتا ہے کہ انہیں میں نے بدھ کے دن لکھ کر مکمل کیا]

ہم نے اس سے پہلے سن ۱۹۶۸ء میں شاہ لطف اللہ قادری کے 'سندھی رسالہ' کی بنیاد پر مادری زبان سندھی کے ذریعے ابتدائی تعلیم کے بارے میں جو درج ذیل نظریہ قائم کیا تھا اُسے مندرجہ بالا حوالہ جات کی روشنی میں تبدیل کرنا پڑے گا:

''شاہ لطف اللہ سے پہلے جن سندھی علماء، یا شعراء کی نظم او رنثر میں تصنیفات دستیاب ہوئی ہیں وہ عربی یا فارسی میں ہیں اور شاہ لطف اللہ قادری غالباً پہلے عالم وعارف تھے جنہوں نے محسوس کیا کہ سندھ کے لوگ، جن کی مادری زبان سندھی ہے، او رجو صرف سندھی ہی میں آسانی سے کسی بات کو سمجھ سکیں گے ان کی سہولت کے لیے ضروری ہے کہ علمی مسائل کو ان کی اپنی مادری زبان میں بیان کیا جائے تا کہ وہ نہ صرف آسانی سے بلکہ ذوق وشوق سے انہیں پڑھیں اور سمجھیں ۔۔۔۔۔ اس تعلیمی مقصد کے پیشِ نظر اس نے عوام کی مادری زبان سندھی میں رسالہ تالیف کرنا ضروری سمجھا، کیونکہ اس کے نظریہ کے مطابق لوگ مادری زبان میں با آسانی اور ذوق وشوق سے سیکھ سکیں گے ۔ اسی طرح شاہ لطف اللہ قادری نے اپنے ''رسالہ'' کے مقدمہ میں سندھ کے باشندوں کو ان کی مادری زبان سندھی میں تعلیم دینے کے نظریہ کی بنیاد ڈالی'' (۱)

مندرجہ بالا نتیجہ اس بناء پر اخذ کیا گیا تھا کہ شاہ لطف اللہ قادری کا 'سندھی رسالہ' اس وقت دستیاب ہونے والی وہ پہلی کتاب تھی جس میں اس نظریہ کی تائید کی گئی تھی۔ اُس وقت، شاہ لطف اللہ قادری کے 'سندھی رسالہ' سے بھی بہت پہلے کے یہ انتالیس منظوم موضوعات دستیاب نہیں ہوئے تھے ۔ اس ذخیرہ کے پانچ حصوں پر مشتمل منظومات میں سے دیئے گئے مندرجہ بالا حوالوں سے تصدیق ہوتی ہے کہ مادری زبان سندھی میں ابتدائی تعلیم دینے کا نظریہ شاہ لطف اللہ قادری سے پہلے ان علماء او راساتذہ (آرادین، عثمان، جعمہ، ملاّ، آدم کناد، حاجی، سگرڈنہ، صادق، پُسیو، موسیٰ، گھُرئـو بن عمر، کندھر، سیّد، نورو، پیر) نے قائم کیا، جنہوں نے اتنی بڑی تعداد میں تعلیمی او ردرسی موضوعات منظوم کیئے۔ ان میں سے حاجی نامی عالم نے یہ تعلیمی نظریہ واضح الفاظ میں ظاہر کیا کہ:

سنڌي آهي سَهُکي سکڻ ابوجهن

پانهجي واء پروڙي سگهائي سکن

[سادہ لوح لوگوں کے لیے سندھی میں سیکھنا آسان ہے کیونکہ وہ اپنی زبان میں جلد سیکھ سکتے ہیں]۔

(۱) ''سندھی رسالہ'' تصنیف شاہ لطف اللہ قادری، راقم کی تصحیح وتحقیق کے ساتھ شائع کردہ، انسٹیٹیوٹ آف سندھیالاجی، سندھ یونیورسٹی، سنہ ۱۳۸۸ھ/۱۹۶۸ء، مقدمہ ص ۲۵-۲۶۔

شاہ لطف اللہ قادری کے پیش نظر غالباً ان سے پہلے کا یہ تعلیمی نظریہ (۱) تھا، کیونکہ انہوں نے (اور دوسروں نے بھی) اس کی ضرورت بالکل عالم و فاضل حاجی ہی کے الفاظ میں کی کہ:

''پاڻهي ٻوليءَ تڪري سگهائي اي سکن''

[اپنی زبان میں ہونے کی وجہ سے یہ لوگ جلد سیکھ سکیں گے۔]

سندھی میں ایک بڑے علمی ادبی ذخیرہ کا تحریری صورت میں دستیاب ہونا:

سندھ کے بیدار مغز علماء کے اس ترقی پذیر تعلیمی نظریہ پر عمل نے سندھی میں درس و تدریس کے لئے وافر مقدار میں درسی مواد پیدا کیا جو بڑی علمی و ادبی اہمیت کا حامل تھا۔ سیکھنے اور پڑھنے والوں کی رغبت بڑھانے کے لیے تمام علماء و اساتذہ نے یہ مواد منظوم صورت میں مہیا کیا۔ اس طرح ترتیب کے لحاظ سے اس ذخیرہ میں شامل تمام انتالیس موضوعات 'منظوم' ہیں جنہیں بطور آسانی ''منظومات'' کہنا مناسب ہوگا۔ ان کے لکھنے اور بنانے والے، جن میں پندرہ کے نام معلوم ہیں، شاعر تو نہیں تھے البتہ ناظم گر (نظم جوڑنے والے) تھے اور انہیں 'منظوم کلام'، 'ابیات' اور 'قافیوں' کی پہچان تھی۔ ان میں سے بعض حضرات، کسی حد تک شاعرانہ شعور بھی رکھتے تھے اس لئے ان کی تیار کردہ 'منظومات' میں شعری اوصاف اور صنعتیں آگئی ہیں۔ اس لئے یہ ذخیرہ ایک طرف تعلیمی طریقوں اور تراجم کے لحاظ سے ایک 'علمی ذخیرہ' ہے، تو دوسری طرف 'منظومات' کے لحاظ سے بھی ایک اہم 'ادبی ذخیرہ' ہے۔

سندھی نظم کی دو اہم صنفیں:

اس ذخیرہ میں شامل انتالیس منظومیات میں سندھی نظم کی دو اہم اصناف شامل ہیں:

(الف) سندھی منظوم بند (ب) سندھی بیت رشعر

(الف) سندھی منظوم بند:

بہ لحاظ ترکیب 'سندھی منظوم بند' اس نظم کو کہتے ہیں جس میں دو سے زیادہ ہم۔ قافیہ سطریں ہوں، اور قافیہ ہر سطر کے آخر میں لایا گیا ہو۔ اس ذخیرہ میں کئی ایک منظوم بند ہیں، جن میں سے بعض تین سے دس سطروں والے چھوٹے بند، اور بعض چودہ، اٹھارہ، بائیس، اٹھائیس اور تیس سطروں پر مشتمل 'طویل بند' ہیں۔ [عنوان ۔ ٦] کے تحت 'مدح رسول ﷺ' کا منظومیہ ایک

(۱) شاہ لطف اللہ نے تقریباً ۱۰۷۸ھ-۱۰۸۳ھ کے عرصہ کے دوران اپنا 'سندھی رسالہ' ترتیب دیا۔ جب کہ اس سے بھی دس پندرہ برس پہلے کاتب عزت بن سلیمان گزشتہ علماء و اساتذہ کا ذخیرہ نقل کر چکے تھے۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ ان موضوعات کو کم از کم پچاس ساٹھ سال پہلے مختلف علماء و اساتذہ نے منظوم کیا ہوگا۔

یا ترہا بند ہے جس میں ('او' قافیہ پر) اڑسٹھ سطریں ہیں۔ اس ذخیرہ کے یہ اتنے سارے ترتیب خواہ طویل ہیں، نہ قدیم ترین بند ہیں، کیونکہ ان سے پہلے کے کوئی بھی ایسے 'سندھی منظوم بند' دستیاب نہیں ہوئے ہیں۔

(ب) سندھی بیت / شعر:

اس ذخیرہ میں 'سندھی ابیات / اشعار' بھی ایک بڑی تعداد میں موجود ہیں، جن میں بہ لحاظ ترتیب سندھی شعر کی وہ تمام صورتیں موجود ہیں جو ہمیں شروع میں قاضی قادن کے منظومہ میں ملتی ہیں۔ لیکن فنی ترتیب کے لحاظ سے، قاضی قادن کے اشعار صرف دو مصرعوں والے ہیں۔ اس دور کے ایک اور شاعر 'پرہیاڑ' کا تین سطری شعر ملتا ہے، اور میاں علی شیرازی کا ایک چار سطری شعر ملتا ہے۔ اس کے بعد میاں شاہ کریم کے کلام میں بھی صرف تین شعر تین سطری موجود ہیں۔ اس ذخیرہ کی منظومات میں پہلی مرتبہ پانچ اور چھ سطری شعر ملتے ہیں۔ ذیل میں ایسی منظومات کے 'عنوان اور نمبر' کے حوالہ سے 'شعر' کی جدا جدا ترتیبوں کی تفصیل دی جاتی ہے۔

۱- ایسے دو سطری اشعار جن کی دونوں سطر کی آخر میں قافیہ ہے:

0--------------

0--------------

اس ذخیرہ میں سب سے بڑی تعداد تقریباً چوبیس سو، دوسطری اشعار کی ہے، جن کی دونوں سطروں کے آخر میں ہم آواز قافیے آئے ہیں۔ اس طرح کے سب سے زیادہ اشعار (۸۳۹) ''قصہ مہتر یوسف علیہ السلام'' [عنوان ۔ ۳۸] کے تحت موجود ہیں۔ یہ 'سندھی شعر' کی قدیم ترین بنیادی ترتیب ہے۔ اور جیسا کہ اس طرح کے دوسطری اشعار قدیم قصے کہانیوں میں منظوم کیئے گئے، نیز کچھ خاص مواقع اور واقعات کے وقت مخفی اشارات و علامات اور پیغامات کی خاطر آلاپے گئے، اس لئے انہیں ''معما۔شعر'' (چلیپائی شعر) کہا جاسکتا ہے۔ مثلاً [عنوان۔۱۹] ''چار علم'' کے ابتدائی پانچ شعر:

ساراهجي سو ڌڻي جو خالقُ خلقَ

تَنه سندي فرمانَ ہر ماڑھو مِرُو مَلَڪَ

[اس مالک کی تعریف کرنی چاہیئے جو مخلوق کا خالق ہے۔ انسان، جانور، فرشتے اس کے زیر فرمان ہیں۔]

تَنهَ اوڙَڪِنِ ڪيترا ڪوڙِينْ پَدم لَڪَ

ات اُپايا پاتشاهَه عالَمَ گهٽا ۽ اَڪَ

[اس کے کئی لاکھوں، کروڑوں، اربوں بھید ہیں
اس بے مثل بادشاہ نے کئی عالم بنائے ہیں۔]

ڪي هَلَنِ، سُرَنِ ڪي، ڪَنِي ڏنائين پَکَ
ڪي عالمَ، عاقلَ ڪي، ڪي ڪيائين بَکَ

[بعض چلتے ہیں، بعض رینگتے ہیں اور بعض کو اس نے پر عطا کیئے ہیں۔ بعض عالم ہیں، بعض عاقل ہیں، بعض کو اس نے بھوجن (خوراک) بنایا۔]

ڪَنِي گُندَرِ گُذري، قوڙائو ۽ بُکَ
ڪي سَرَها سيٹن سين، ڪَنِي ڏنائين ڏُکَ

[بعض کی زندگی دکھ اور فکر و غم اور فراق اور بھوک میں گزرتی ہے بعض لوگ دوستوں عزیزوں کے ساتھ خوش و خُرم ہیں، اور کچھ کو دکھ دیئے ہیں۔]

ڪي ڪوجها، ڪي ڪُوَڙا، ڪَنِي مُنْهَ ۾ ڏِکَ
اِيَ پَرِ پَسِي ڪيترا وَهَ. چڙهيا ۽ تِکَ

[بعض بدصورت، بعض جھوٹے اور بعض کے چہروں پر رونق۔ یہ ریت اور نمونہ دیکھ کر کئی لوگ بڑائی میں پڑ گئے اور کئی لوگ غصہ اور تیزی طبع میں مبتلا ہوگئے۔]

۲- ایسے اشعار، جن کی پہلی سطر کے آخر، اور آخری سطر کے درمیان میں قافیہ ہے:

0--------------

--------0 ------

مثلاً [عنوان-۱۰] ''صفت ماہی و دریا'' میں درج ذیل شعر

اُهاريندا بيڙيون، پَکَہَ ڪٽي تڙاءُ
مَٽَندا درياءُ، پَسَندا ڪوڙَ ڪَنا

[بندرگاہ سے لنگر اٹھا کر کشتیاں چلائیں گے،
بڑے سمندر کا رخ کریں گے اور مسرتوں میں کنارہ دیکھیں گے (منزلِ مقصود پر پہنچیں گے۔]

'سُر ساموندی' کے سلسلہ کا یہ قدیم شعر ہے جو اس ذخیرہ میں موجود ہے۔
[عنوان-۲۳] ''کتاب نظامی از کیدانی'' میں درج ذیل شعر:

سَيي ساراهون جِنْ چگيون چاڳ ڪٽي
ڏيون آهنِ ڏٽي، ڪِي وڏي واڪائيون

[سب تعریفیں افضل اور جذبہ ذوق (ابھارنے والی)
اللہ نے ان کو بڑی تعریفوں کے ساتھ منتخب کیا ہے۔]
[عنوان ـ۳۰] ''مناجات موت نامہ'' میں ایسے دوسطری دوشعر:

اِلاھي ربَ سِباجھا، رَحمتَ مڱا تہ ڏِهلي ويرَ
جِينْ ٻانھُون ٻڌي پيرَ، هَلائجي قَبر مٿي(ا)

[الٰہی رب رحیم! اس مشکل وقت میں رحمت کا سوال کرتا ہوں، جب بازو اور پاؤں باندھ کر قبر کی طرف لے جایا جائے۔]

سَڙَئي(ا) هَڏَ ڳورَ ڊَرهي،(ا) پِريَ پَچارَ نہ ٿيءِ
ڪيتھِين ڪوءِ نہ چوءِ، تہ ڪي هُيَڙا ڪَڌھينْ

[ہڈیاں گل سڑ جانے اور قبر ویران ہوجانے کے بعد دوست کا تذکرہ نہیں ہوتا، کہیں بھی کوئی نہیں کہتا کہ 'کبھی کوئی تھا'۔]
[عنوان ـ۱۵] ''اللہ ربي '' (اقرارِ ایمان کی دعا ـ۱) میں اس طرح کا پانچ سطری ایک شعر:

قرآنُ مَهدارُ مُهُجو تَنهِ نالو فُرقانُ
نازُلُ ٿِيوءُ نَبِيَ ڪي خداءِ جو فرمانُ
ٻَسي جَنِي مَڃِيَوءُ پورو تَنِ ايمانُ
چڱايُون قِيامَ جُون تِٿاءُ لَهندا دانُ
جَنِيَ جو بيانُ، چِيانْ ڪيو نہ ٿئي.

[قرآن میرا پیشوا، اس کا نام فرقان ہے۔ نبی پر خدا کا فرمان نازل ہوا۔ دیکھ کر جنہوں نے مان لیا ان کا ایمان مکمل ہے۔ وہاں پر قیامت کی ایسی بھلائیاں دان حاصل کریں گے۔ جن کا بیان زبان سے ہو ہی نہیں سکتا۔]
۳- ایسے اشعار، جن کی پہلی سطر کے درمیان میں اور باقی سطروں کے آخر میں قافیہ ہے:

----------0----------

0----------------------

مثلاً [عنوان ـ۳۳] ''قیامت نامہ'' میں شش سطری ایک ایسا شعر:

(ا) یائے مجہول کے ساتھ۔ (مترجم)

اچي ڪِ آئي، ڪونيهِ شَڪُ قيامَ ۾
سجُ موٽندو، صُورَ لڳندي، مرندا مِڙيائي
پِيُ نه پُڇندو پُٽرَ کي، ڀائُرَ نه ڀائي
ما چُوندِي پُٽرَ کي آئون نه اُهائي
نَوسِي ٿيندِي نَفسِي اِهڙِي اُهڪائي
تَرسي تَهِينْ ڏِينه کي ڪره سَمُر سَانْباهِي

[آئی کہ آئی، قیامت میں کوئی شک نہیں سورج لَوٹ آئے گا، صُور پھونکی جائے گی، سبھی مرجائیں گے۔ باپ بیٹے کو اور بھائی بھائی کو نہیں پوچھے گا، ماں بیٹے سے کہے گی کہ میں وہ نہیں ہوں، آپا دھاپی اور ایسی مشکل بپا ہوگی، اس دن کا خوف کھا کر، زادِ راہ کی تیاری کر۔]

I ایسے اشعار، جن کی پہلی اور دوسری سطر کے درمیان میں قافیہ ہے:

------------0----------

------------0----------

مثلاً [عنوان ۔۸] ''وفات پیغمبر علیہ السلام'' میں درج ذیل دو شعر:

درسُ درازي پارِ، آئو مَلڪُ حبيب جو
ڪندو سائي ڪارِ، حڪم جوءِ حبيب جو

[صحیح دروازے پر، حبیب (اللہ) کا مَلک (عزرائیل) آیا
وہ وہی کچھ کرے گا، جس کا اسے حبیب نے حکم دیا۔]

پهرو پاڻ ڪِياءِ، پرت نبيَ جي پڌرو
ماڻڪ منجها مون ڏٺي عالَمَ اُپاياءِ
دُرود پاهِجي دوس اُتي پاڻهِي چياءِ
سجڻ سو سَنِياياءِ، جَهِ تاري ۾ تَڪِيو.

[اول خود ہی نبی کی محبت کا اظہار فرمایا۔ موتی و الماس سے میرے مالک نے عالم پیدا فرمائے۔ اپنے دوست پر خود ہی دُرورد بھیجا۔ ایسا ساجن مبعوث (پیدا) فرمایا جو مصیبت کی گھڑی (قیامت) میں سہارا ہے۔]

''قصہ اسماعیل پیغمبر علیہ السلام'' میں مندرجہ بالا تمام صورتوں والے اشعار موجود ہیں جنہیں منتخب کر کے ذیل میں دیا جا رہا ہے تا کہ اس قدیم ذخیرہ میں شامل اس طرح کے اشعار کی ترتیب، زبان اور بیان سے متعلق مزید تفصیلات ذہن نشین ہو سکیں۔

نہ دوستِني دُورِ ڪِئاءِ، نہ تو ڏُجَڻُ ڏُورِ
ڪي ڪوٺي(ا) تڙايينْ، ڪي ڪوٺِين حُضُور

[نہ تو نے دوست دور کیئے، نہ ہی دشمن تجھ سے دور ہیں۔ کسی کو بُلوا کر دھتکارتا ہے، اور کسی کو اپنے حضور میں بُلواتا ہے۔]

سونَ وَنِکا سُپِرين ڪوٺي(ا) ڪُسايا
پياسي بُجھايا، جي سائينءَ سين نہ سُونُا.

[سونا وَرَن/ سونا صورت محبوب بُلوا کر اس نے کٹوادیئے، اور دوسرے ایسوں کو اپنا آپ سُجھا دیا جن کی اُس مالک کے ساتھ جان پہچان بھی نہیں تھی۔]

اڳي ابراهيمَ ڪي آراڙِ وِجهاياءِ
پُڻ فرمانُ ڪياءِ، قهارُ ڪوٺائيءِ تي پاڻَ ڪي.

[پہلے ابراہیم کو آپ نے آگ میں ڈلوایا، مزید فرمان جاری کرکے اپنے آپ کو قہار کہلوایا۔]

آيوءُ ابراهيم ڪي ڏَڻِيَ سندو فرمانُ
ڪَر سِرِيَ ڪي قربانُ، تت بہ تاهيون قِبلي

[ابراہیم کے پاس مالک کا حکم آیا کہ سر قربان کر، اسی جگہ کو قبلہ بنائیں۔]

ٻِيءَ راتِ ٻبرُ چوءِ، پُڻِ ڪو سڏ سوٺاءِ
ماري ماهُ ڪياءِ، سُيا سڦس گهاوَ تَنهِ

[ٻبرُ کہتا ہے کہ دوسری رات بھی اس نے کوئی بُلاوا (آواز) سُنا۔ مار کر اس نے تہس نہس کر دیا، اسے ان گنت گھاؤ تھے۔]

تاڪيو ٽِريءَ راتِ، اڇي اِشارَتَ ۾
ٻهُون ماري ٻکرا، ڏيهَ ڏنائين ڏاتِ

[اس نے تیسری رات خواب میں دیکھا، بہت سارے بکرے ذبح کر کے علاقہ بھر میں خیرات کی۔]

چوٿِينْ راتِ چِياءِ، ڏيهُونْ سُونَهو سُڦرو
اِن سهٽي سَنگِئو اُٿي آهَ ڏناءِ

(ا) یائے مجہول ہے۔ (مترجم)

[چوتھی رات کو فرمایا کہ: صبح سویرے ہمیں مزید بہتر (چیز) دے! اس خواب نے ڈرادیا اور اک آہ نکالی (بڑا سانس لیا)۔]

اُتان اُتي هَلِئو، پُٺيَ پُٽر لڳوسِ
سُتي(۱) سَڏُ ٿئوسِ، پَسِي پارَٽُ هَلِئو.

[وہاں سے اُٹھ کر چل پڑا، بیٹا اس کے پیچھے ہولیا، سوتے میں اسے بلاوا ہوا تھا، اسے نبھانے کے لیے چل پڑا۔]

ٻيئو باپُ ٻِنو جَٽا وِيٺا ڪِٿهِينْ وَجهُه
"هـــو اللّٰه" رِءَ اَجُ، تاري طاقت ناهِ ڪاءِ.

[دونوں باپ بیٹا کسی جگہ/ مقام پر بیٹھ گئے اللہ کے بغیر آج مشکل سے نجات حاصل کرنے کی سبیل نہیں۔]

جَبرئيلَ جهتَ ۾ وڃِي ڪار قرارُ
اُسهُ، اسمائيلَ جو متان وِڍِي وارُ.

[جبریل! روانہ ہو جا، مبادا اسماعیل کا بال نہ کٹ جائے۔]

جهلِي ٻانُهَ پِيُ ڪاءُ اَچِي اُٿارِياءِ
گهِتو اُتِ ڪُناءِ، قائمُ اُپارِياءِ قبلو.

[بازو پکڑ کر، باپ کے پاس سے آکر اسے اٹھالیا وہاں دنبہ ذبح کروایا، قبلہ بھی قائم کروادیا۔]

جانْ ڪي زورَ منجهاءُ، ڪاتي پائي(۱) پُٽرِ ڪي
مُنهُ ميٺائي ڪُونٽرو، مُورِ نه وري داءُ.

[جب بھی بیٹے پر طاقت سے چھری چلاتا موم سے بھی نازک چہرے پر کوئی داؤ نہیں چلتا تھا۔]

سَجهُه ڪِيائينْ سُهٽو، تِينْ پُٽَر لَڌائينْ ڏانُ
مڃيائين جِينْ احسانُ، تہ سائينْ سَبِ سُهٽي ڪئي.

[اس نے عمدہ اقدام کیا تو بیٹے کو دان میں پالیا، جیسے ہی اس نے احسان مانا تو مالک نے سب سندر کردیا۔]

سَئين(۲) دَماما نَگرا، ڏيهينْ(۲) ڏَسَ وَڄَنِ
پيغامبَر جي ٻِيکَڙي جاڄِڪَ جُودَ نَڃَنِ.

---

(۱) یائے مجہول کے ساتھ ہے۔ (مترجم) (۲) یائے مجہول کے ساتھ ہے۔ (مترجم)

[صدہا نقارے، ڈھول باجے بستیوں میں مسلسل بجتے رہے، پیغمبر کی خیرات پر بھکاری تیزی سے ناچتے رہے]

تئينْ پچي سارَڙا، پوجَنَ يَتَ رَجھَنِ
فوجون فقيرَنِ، آيونْ کايُونْ اُسَھِي.

[تمام قسم کے، طعام، پُلاؤ پکتے رہے فقیروں کی ٹولیاں آتیں، کھاتیں اور روانہ ہوجاتیں۔]

کُنڊون ڪپَرَ آرَ، وَنگَ وَراکَا واديون
گِرَکِيُون ۽ غارَ، تارَ ڪٿهينْ ڪَنڊيُون.

[کونوں، کناروں پر پانی کا زبردست بہاؤ اور الٹے چکر،
وادیوں، گھاٹیوں، غاروں اور اونچے کناروں پر پانی بھر گیا۔]

ميينْ جي مُلڪَ ۾ عَجَبَ اَت اَپارَ
ڪَي ائيڏَ اَوارَ، ڪَنِ خَبَرَ پاڻِ لهي.

[مالک کے ملک میں عجیب وغریب بے انتہا راز اور بھید ہیں، کئی طاقتور ویران ہیں اور کتنوں کی خود ہی خبر گیری کرتا ہے۔]

شاعرانہ صنعتیں:

اگرچہ اصولی طور پر یہ 'منظوم' ذخیرہ ہے، 'شعروشاعری' کا بیاض نہیں، نیز 'نظم' کا ابتدائی نمونہ ہے اس لئے اس میں سادگی ہے۔ اس کے باوجود بھی بعض منظومات میں شاعرانہ شعور اور شعری صنعتوں کی جھلک نظر آتی ہے۔ ایک سے زائد اشعار میں ایک جیسے الفاظ کو بار بار لانا، یعنی 'جوابِ شعر' کی خوبی یا 'صنعتِ تکرار' پہلی مرتبہ اس ذخیرہ میں نظر آتی ہے۔ مثلاً [عنوان۔۳۰] کے تحت 'کندھر' کی منظوم کردہ ''مناجات موت نامہ'' کے بائیس اشعار ''الاهي رب سجاجها رحمت مڱا'' کے ایک ہی التجائی جملہ سے شروع ہوتے ہیں۔ [عنوان۔۱] ''جباری صفت خدائی'' کی نظم کے تیئس اشعار میں ''هئو ڏٺي سگهپ سين'' کا ایک ہی جملہ ہر شعر کی دوسری سطر میں دہرایا گیا ہے۔

سطر اول میں 'جواب شعر' یا صنعت تکرار کی مثال:

اِلٰهي ربَّ سڄاجها، رحمت مڱا محمّدَ اتي ۽ سِندِهسِ آلَ
فضلُ ڪَرِسين سين جملي مومنين جالَ

[الٰہی رب رحیم! رحمت کا سوال کرتا ہوں محمدؐ اوران کی آل کے لیے
فضل فرما سب پر، تمام مؤمنین پر بے انداز۔]

☆☆☆

الٰهي رب سہاجها، رحمتَ مڱا اوچتي(١) مَرِڻاءُ
رِءِ توبَهَ جو وڃي لَڏي دُنيَ مَنجهاءُ.

[الٰہی رب رحیم! رحمت کا سوال کرتا ہوں اچانک مرنے سے
جو بغیر توبہ کے دنیا سے کوچ کر جائے۔]

الٰهي رب سہاجها، رحمت مڱا سندي مرڻ وير،
جينءِ پڱهرُ نِراڙاءُ نڪري، اکينْ اُبتا پيرَ،
هڏڪي هٽي حلقَ ۾ جڏينْ ٺره پير.

[الٰہی رب رحیم! رحمت کا سوال کرتا ہوں اپنی موت کے وقت
جس وقت پیشانی سے پسینہ نکلے، آنکھیں پلٹ کر ٹیڑھی ہو جائیں
حلق میں ہچکی بندھ کر پاؤں ٹھنڈے ہو جائیں۔]

☆☆☆

الٰهي ربَ سہاجها، رحمت مڱا تِني اَهکاڻِ
جينْ ٻيڙَ روءِ ٻارَنِ سين، ماپيءُ دانهون ڪَنِ
پوٽرا ڏِسئو پاهجا هَي ڪيو هَٿَ هَڻَنِ.

[الٰہی رب رحیم! رحمت کا سوال کرتا ہوں اُن تکالیف سے
جب بیوی، بچوں سمیت روئے، ماں باپ چیخ و پکار کریں
پوتے بھی دیکھ کر، ہائے ہائے کر کے ہاتھ ملتے رہیں۔]

دوسری یا آخری سطر میں جواب شعر کی مثال:

جينْ پاڻِ هِي هوءُ ڏٺي، اُپايائين ڪي نه(١)
تَڏِهِ مُلڪُ سَندو تَهِينْ ڏٺو بي ڪَهِينْ نه.

[جب مالک خود ہی تھا، (ابھی) اس نے کچھ بھی پیدا نہیں کیا تھا، تب اس کا ملک کسی نے بھی نہیں دیکھا تھا۔]

---

(١) یائے مجہول کے ساتھ ہے۔ (مترجم)　　(٢) هوءُ ـ هئو (تھا)

☆☆☆

سو هاڻي، سو تڏهين، سندو ملڪ جبارَ
اَوٽو آگِرِ نه ٿئي، گهٽ نه ڪيِني وارَ(۱)

[وہی اب ہے، وہی تب تھا، اسی جبار کا ملک ہے، کم، زیادہ نہیں ہوتا۔]

☆☆☆

نه هوءُ جياڏڪو، نه ڪو هوءُ راڳُ(۲)
هوءُ ڏٿي سَگهِپَ سين، نه ڪو وري وٽاڳُ

[کوئی جاندار تھا، نہ ہی کوئی چرچا، مالک از خود طاقت وقوت کا صاحب تھا، سراغ اور وہم وگمان بھی نہیں تھا۔]

☆☆☆

حِرصُ نه هوءُ تَڏهينْ، نه هُئي حَرفاتِ
هوءُ ڏٿي سَگهپَ سين، نه وِهاڳُ نه راتِ

[اس وقت حرص تھی نہ ہی حرفت (چالاکی، پیشہ، فن)، مالک از خود صاحبِ قوت تھا صبح تھی نہ رات۔]

☆☆☆

سُجهَه نه هُئي تڏهينْ، نه تقدير نه روحُ
هوءُ ڏٿي سَگهپَ سين، رازقُ رب صبوحُ

[اس وقت نہ موجودات تھے، نہ تقدیر نہ روح، مالک از خود صاحبِ قوت تھا جو رازق ہے، صبح کا رب ہے۔]

[عنوان ۔۲۹] کی درج ذیل نظم ایک تو عمدہ مترنم 'چھوٹی تیز بحر' میں کہی گئی ہے ،اوردوسرا یہ کہ پوری نظم 'صنعتِ مستزاد' سے مزیّن ہے : یعنی اس کے ہر بند کے آخر میں مزید خوبصورتی کے لئے انہی قافیوں والا ایک اضافی چھوٹا جملہ لایا گیا ہے۔

جَنه جِيونْ ڪَنِ وِمَاسُون وِيرَ	جس کی فکرمندی دانا اور سورما لوگ کریں
سو پَنڌُ مٿي مون حقيرَ	وہی سفر مجھ حقیر کو بھی درپیش ہے
صُباحَ سَنجهه ٿيندو سيرَ ۔	صبح یا شام خدا کی طرف جانا ہوگا ۔ مولا! تیرا ہی
الله تو آهارَ	سہارا ہے

(۱) اوٽو آگِر ۔ گهٽ وڌ (کم زیادہ)

(۲) جياڏ ۔ جيئڏ، ساهوارو (جاندار)

نہ تنہ سمرُ، نہ سانڊارو
پار پريانءُ جي هَليو بارو
اڳيانءُ ڏِسي ڏيهُ ڀوارو –
نَڪا تتِ توارَ

تُهجو ٻانهو تو دَرِ آيو
پَسي پاهِنجا ڏوهَ لڄايو
رحمتَ مڱي پَلئُ پايو –
سٻاجها ستارَ

☆ نہ سو نَڪُ جو آميءَ قارِ
نہ سي نيڻَ ڪتوري ڪارِ
نہ سا ڀِڙنِ ڪارِي بارِ –
نہ سي پِرينءُ لَهنون سارَ

☆ نہ سي اهُرَ آرَتي وَنِ(۱)
نہ سي پاتا ڳِلَ پِريَنِ
نہ سي ڏندَ جها مُکڙِيَنِ –
نہ سي سڄڻ ڪَنِ سنيارَ

هِهو حالُ جهينءُ جو جِينَ
ڪِيئن ڪَرئينءُ مَنجها تو ڪِينَ
يا ارحم الراحِمينَ –
ٻاجهان ٻانهي ڪي اُکار (۳۵۹)

پرورَسيا تو اُپايو
دوسُ تنهجو سچو آيو
محمد رسول اسان ڪي شفيع پسايو –
ميڙهو محمد ڪي مختارَ

اس کے پاس زادِ راہ ہے نہ ہی پکھال
محبوب کی طرف وہ بوجھل ہو کر چلا
سامنے خوفناک دیس نظر آرہا ہے- جہاں کوئی
آواز نہیں

تیرا بندہ تیرے دروازہ پر آیا
اپنے گناہ دیکھ کر وہ شرمایا
دامن پھیلا کر رحمت مانگ رہا ہے- اے مہربان
پردہ پوش!

کیری کی قاش کی مانند ناک بھی نہیں
کٹوروں کی مانند نین بھی نہیں
سیاہ بھنویں بھی نہیں -خبر گیری کرنے والے
احباب بھی نہیں

نہ ہی دلہن والے لب لال ہیں
نہ ہی محبوبوں والے گال میں نے پائے ہیں
کلیوں کی مانند دانت بھی نہیں - دوست بھی
خبر گیری نہیں کرتے

جو ایسے حال میں جی رہے ہوں
ان کے لیے نہ ہونے (عدم) سے کچھ تو کرنا
اَے ارحم الراحمین! - مہربانی سے
بندہ کو پار لگا

پروردگار! سب تو نے پیدا کیا
تیرا سچا دوست تشریف لے آیا
ہمیں شفاعت کرنے والا محمد
رسول عطا فرمایا- محمدِ مختار کا وصل عطا فرما

---

(۱) اَهَرَ - چپ، یعنی ہونٹ

ويندا سي ايمانَ سين جَنِ ڪلمي سارَ	وہی لوگ با ایمان جائیں گے جنہیں کلمہ یاد ہوگا
لا اله الا الله محمد رسول الله	لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اس منظومہ کے 'ستارہ' نشان والے دونوں بندوں میں خوبصورت تشبیہات استعمال ہوئی ہیں ،جس کی دوسری مؤثر مثال [عنوان ۔۵] ''حضرت محمد ﷺ کی سوانح'' کے درج ذیل اشعار میں موجود ہے، جن میں نبی پاکؐ کے حسن و جمال کے وصف کے لئے ''سینگار'' (سنگھار، آراستگی) کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ 'سندھی سینگار شاعری' کی روایت جس میں نبی پاکؐ کے حُسن و جمال کا خوبصورت تشبیہات پر مشتمل بیان ایک خاص الخاص موضوع رہا ہے ، اس سے متعلق یہ اشعار او ران میں لائی گئی اصطلاح 'سینگار' (۱) ادبی تاریخ کے لحاظ سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں:

پُڇِ پُڇاءِ وَرُ تيو، سَلُ سندَسِ سينگارَ
سندي(۱) ختم انبياء رسولَ ڪهَا پارَ

[اُن کی آراستگی کے نشانات اور اوصاف ذکر کر خاتم الانبیاء رسول کے کیا نشانات تھے۔]

اکيون هئسِ اُجريون پُوڇَڙَ پارا پاند
ڪيا اوجاڳي سڄڻين ڪڪوريا تو ڪاند

[ان کی آنکھیں اجلی اور گوشۂ چشم نہایت باریک تھے
ساجن کی شب بیداری نے انہیں سرخی مائل بنادیا تھا۔]

رِءَ سُوئيري(۲) سوهِڻا ڪارائي نيڻن
گهڻو اَچائي اُجَري ڏارِي جا تارن

[کاجل، سرمہ کے بغیر ہی نین سیاہی کی وجہ سے حسین تھے آنکھوں نے بہت زیادہ اجلی سفیدی اختیار کی ہوئی تھی۔]

(۱) سینگار (سنگار، سنگھار): کے معنی ہیں: آراستگی، آرائش، سجاوٹ، زیب و زینت، لباس، زیور، کنگھی چوٹی، مانگ پٹی- زیور، لباس اور کنگھی چوٹی سے کی جانے والی آرائش۔ (دیکھیے: جامع فیروز اللغات اردو، ص:۸۱۴، سندھی اردو لغت، ص:۵۷۷)
یہ شاعری کی ایک صنف ہے، جسے ہندی میں ''شرنگار رس' کہا جاتا ہے اور سندھی میں ''سینگار''۔ اس صنفِ شاعری میں بنیادی طور پر عورت کے ''سولہ سنگھار'' اور ''بارہ اُبھرن'' کا تصور نمایاں ہوتا ہے جس کے ذریعے ایک حرافہ اور سرتا پا تکلف عورت کا سراپا سامنے آتا ہے اور اسی کے فطری حسن اور ظاہری آرائش کو اپنا موضوع سخن بنایا جاتا ہے۔ بالفاظِ دیگر اس صنفِ شاعری کا خاص موضوع 'مجاز' یعنی محبوب کے ظاہری حسن و سنگھار کی تعریف ہوتا ہے، جس میں محبوب کے ناز و انداز اور ظاہری حسن کو نہایت خوبصورت انداز میں بیان کیا جاتا ہے۔
لیکن سندھ میں رفتہ رفتہ تصوف کے زیرِ اثر اس صنف کو 'مجاز' سے نکال کر حقیقت کی طرف پھیر دیا گیا اور اسے نبی پاک ﷺ کے حقیقی اور معیاری حسن کے بیان کے لیے مخصوص کردیا گیا۔ اب ''سینگار'' کہتے ہیں نبی پاک ﷺ کے حسن و جمال کو مجازی رنگ میں گانا۔
خلاصہ مطالعہ: ''سنڌھی سینگار شاعری''، ص:۱-۴۰ (مترجم)

(۲) یائے مجہول ہے۔ (مترجم)

تِينِيْ سونهِن مُنه ۾ تارا ڪاريَ ڪورَ
ڪِي پُڻِ پوءِ آڪين ۾ ڳاڙهائيَ جي مورَ
[سیاہ قاش کی مانند آنکھیں ان کے رخ پر سجتی تھیں
آنکھوں میں سرخی مائل ڈورے بھی تھے۔]

سونهِن سپرين ڪي سِر رُخسارين خالَ
پِنبٽيون پُوجَ تِهِين، ڇپرَ جوڙَ جمالَ
[محبوب کے رخساروں پر تل سجتے تھے
ان کی پلکیں گھنی اور پپوٹے شاہکارِ جمال تھے۔]

مذکورہ بالا وضاحت کی روشنی میں، سندھی 'منظوم بندوں' اور اشعار کی فنی ترتیب کے متعلق جو بعض نظریات ہم اس سے پہلے شاہ لطف اللہ قادری کے ''سندھی رسالہ'' کے مطالعہ کی بنیاد پر قائم کر چکے ہیں ان میں ترمیم کی ضرورت ہے شاہ لطف اللہ قادری کے ''سندھی رسالہ'' کے مقدمہ میں (جس کے صفحات نمبر ذیل میں دیئے گئے ہیں) ہم نے یہ بتایا تھا کہ:

١- شاہ لطف اللہ قادری نے سندھی 'شعر' کی ہم قافیہ سطروں کی تعداد میں اضافہ کر کے 'طویل بند' کہے، جس کی مثال پہلی مرتبہ انہی کے کلام میں ملتی ہے، جس کے ایک بند میں گیارہ سطریں ہیں ------ سندھی نظم کی تاریخ میں یہ قدیم ترمنظوم 'طویل بند' ہیں۔ (ص ٢٥)

٢- شاہ لطف اللہ قادری سے پہلے سندھی شعر دو، تین یا چار سطروں پر مشتمل ہوتے تھے: ان کے کلام میں پہلی مرتبہ چھ اور سات سطروں پر مشتمل شعر ملتے ہیں۔ (ص ٢٣-٢٤)

٣- فن شاعری کے لحاظ سے اشعار میں 'تکرار' یا 'صنعتِ جواب' کے بانی مبانی شاہ لطف اللہ قادری ہیں۔ (ص ٢٩)

اب اس قدیم ذخیرہ کے دستیاب ہونے سے معلوم ہوا کہ 'طویل بند' اور 'طویل اشعار' شاہ لطف اللہ قادری سے بھی پہلے منظوم ہو چکے تھے، نیز اشعار میں اندرونی 'جواب' یا 'تکرار' کی صنعت شاہ لطف اللہ قادری سے قبل کے سیانے اور بیدار مغز لوگ استعمال کر چکے تھے۔ اس ذخیرہ میں 'سندھی شاعری' کی ترتیب کی بھی تمام صورتیں موجود ہیں۔ اس طرح سندھی شاعری کی تاریخ میں یہ رجحانات بہت پرانے نظر آتے ہیں جس کی تصدیق اس ذخیرہ میں شامل اکثر منظومات سے ہوتی ہے۔

زبان کی ترتیب و قدامت:

اس ذخیرہ میں شامل اکثر منظومات میں استعمال کردہ زبان کافی قدیم ہے، اور بعض الفاظ اور تراکیب تو قاضی قادن (وفات ۹۵۸ھ) اور میاں شاہ کریم (وفات ۱۰۳۲ھ) کے اشعار میں استعمال شدہ الفاظ اور تراکیب کی طرح ہی ہیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ مختلف اور قدیم محسوس ہوتی ہیں ۔ مثلاً منظومات میں درج قدیم الفاظ اور تراکیب موجودہ سندھی میں ان کا تلفظ اردو ترجمہ۔

منظومات میں درج قدیم الفاظ اور تراکیب	موجودہ سندھی میں ان کا تلفظ	اردو ترجمہ
هاڻي ڪَرِيهُ ڪِيَ	هاڻي ڪريون ڪيئن	(اب کیا کریں ر کیسے کریں)
تاپڇيرو	تنهن کان پوءِ جو	(اس سے بعد کا)
وڏِين ڏاتينْ	وڏيون ڏاتيون	(بڑی بخششیں ر بڑے انعامات ر بڑے تحائف)
آڳهُ اِجهو جنْ ہر اَهان پُواءِ آهه	مدد جو آسرو ۽ بچاءُ جن ہر اوهان کان پوءِ آهي. (اوهان کان پوءِ جن ہر اسان لاءِ مدد جو آسرو ۽ بچاء آهي.)	(آپ کے بعد جن میں ہمارے لئے مدد کا آسرا اور بچاؤ ہے)
تو ڳاليان	توکي چوان، توکي واکاڻيان	(تجھے کہوں، تیری مدح سرائی کروں)
سَلئانْ	سليان، سچ ڪري ٻڌايان	(راز بتاؤں، سچی بات بتاؤں)
مُيَداهِ	مُنجداءِ، موڪليندا ءِ	(میری طرف بھیج دینا، روانہ کر دینا)
سُڻِجاهُ	سڻجانُ، تون ٻُڌ	(تُو سُننا، تُو سُن)
ڏيجاهُ	ڏجانُ، ڏجئو	(تو دینا)
نہ ڪو جِينْدس	نہ ڪو جنم ڏيندس	(نہ کوئی اُسے جنم دے گا)
ڪجاڙي رُوءِ	ڪهڙي حال ہر؟	(کس حال میں؟)
پاڻو آڻو	خود بخود	(خود بخود، از خود)
پُونْدا	پَوَنْدا	(پڑیں گے)
چُونْدا	چَوَنْدا	(کہیں گے)

اِيهُ	هيُ، اهو	(یہ، وہ)
اَوڻو اَڳرو	گهٽ وڌ	(کم و بیش)
مالُ گَرَٿَ	مال ۽ ڳنڍ ۾ رکيل ناڻو،	(مال اور گرہ میں رکھی ہوئی دولت،
	مال ۽ موڙي	مال اور سرمایہ)
ڳالِينْ	ڳالهِينْ، ڳالهيون	(باتوں، باتیں)
لهرِينْ	لهريون	(لہریں)
پيرِين	پيريون (وڏا شاهي نقارا)	(دمامہ، بڑے شاہی نقارے)
مُندِينْ	مُندون	(موسمیں)
ڪوڙِينْ	ڪوڙيون	(کڑوی) جھوٹی؟
سَتراٺو	سخت، ڏکيو، زوراٺو	(سخت، مشکل، زور آور)
اَهان پُواءِ	اوهان کان پوءِ	(آپ کے بعد)
اَساهجو	اسان جو	(ہمارا)
اسين رسئا ايتري	اسين ايتري تائين پهتا	(ہم یہاں تک پہنچے ہیں، ہمیں اس
	آهيون، اسان کي ايتري	قدر معلوم ہوا ہے)
	قدر معلوم ٿيو آهي	
وِيا وَهي	لنگهي ويا	(گزر گئے)
اُلهندوسينء	الهندي تائين	(مغربی سمت تک، پچھم تک)
اَگهه بازار	بازار جي اگهه سان	(بازار کی قیمت سے)
هتوئي	اتوئي، توکي اٿئي	(تجھے ہے)
هتس	اٿس	(اُسے ہے)
ڌارو آر	ڌارو ڌار	(جدا جدا)
ويري تار	ويرُ وَتار	(بار بار، ہمیشہ، ہر وقت، دم بدم، کسی
		بھی وقت)
امانگرا	گهڻا	(زیادہ (جمع)

فعل

چوءِ	چوي	(کہے)
آکڻ	چوڻ	(کہنا)

پوءِ	پوي	(پڑے)
اوڙڪَڻ	ڏسڻ	(دیکھنا)
پڙهِهُه	پڙهين	(تو پڑھے)
پَرَنڻُ	سپرد ڪرڻ	(سپرد کرنا)
سڻِهُه	سڻين	(تو سُنے)
اُٻهڻ، اُٻيڻ	سنئون ٿي بيهڻ، اٿي بيهڻ (اُبيٺا = اٿي بيٺا)	(سیدھا ہو کر کھڑا ہونا، اُٹھ کھڑا ہونا (اُبیٹھا = اٹھ کھڑے ہوئے)
جکِينْ	ڏسين	(جکھیں = تو دیکھے)
اپٽڻ	کولڻ	(کھولنا)
هَتَو	اٿوَ	(ہتھَو = تم کو ہے/تمہیں ہے)
اندو هجڻ	پريشان ٿيڻ (اندوهِهين=پریشان ہونا (اَندوہیں = تو غم و تون اندوهه ۾ پئين) پریشانی میں پڑا)	
اُلَهَڻُ	لهڻ (اُلَتا = لٿا)	(اوپر سے نیچے اترنا (اُلتھا = اترے)
لِڌو	لکيو	(لِدھو = لکھا)
تُرڻ	تور ۾ برابر ٿيڻ	(تُلنا = تول/وزن میں برابر ہونا)
ڄِڻيندسُ	هن کي ڄڻيندو	(اسے جنم دے گا)
چوئڻ	چوڻ	(کہنا)
مَڃَهُون	مڃيون	(ہم مانیں)
جُوهڻ	ڏسڻ	(دیکھنا)
سنيُوڙا	سنيريا	(سَنُھوڑا = سن شعور کی باتیں یاد آئیں، روانگی کے لیے تیار ہوئے)
ڪَرِهو	ڪريو	(کَرِہو = کیجئے)
سنيُرئين	حاصل ڪرين	(سَنُھریں = تو حاصل کرے)
آئو	آيو	(آیا)
نِهيرَڻ	دفنائڻ (ميت)	(میت کو دفنانا)

هوئڻ	ٿيڻ، هجڻ (هوءُ=هج، ٿيءُ)	(ہونا، ہو جانا، وجود میں آنا، موجود ہونا، حاضر ہونا، واقع ہونا، (ہوء = تو ہو جا، تو حاضر ہو جا)
ڳري لڳڻ	ڳلي لڳڻ، ڀاڪر پائڻ	(گلے لگنا، گلے ملنا)
مُڪڻُ، مُڪڻ	مُنجڻ، موڪلڻ	(بھیجنا، روانہ کرنا، ارسال کرنا، قاصد دوڑانا)
سهڻُ ٿيڻ	فرمان ٿيڻ، حڪم ملڻ	(فرمان ہونا، حکم ملنا)
ڦِڪائڻ	اُڇلائڻ	(اچھالنا، پھینکنا، گرانا)
وَه چڙهڻ	لڙهي وڃڻ	(بہہ جانا، بہنا، کمزور ہونا)
وِهَرڻ	وِڦلڻ	(بچھرنا، بڑبڑانا، نیند میں بولنا)
مَٽڻ	سڌو لنگهڻ، قصد ڪري سڌو اچڻ	(سیدھا گزرنا، قصد کرکے سیدھا آنا)

اسم، فاعل وغیرہ

ڏُجڻ	دشمن	(دشمن)
اِرڪ	ٺونٺ	(اِرک = کہنی)
ٿوب	ٿورو	(تھوب = احسان)
انجهُه	اهنج، ڏک	(تکلیف، دکھ)
آهيڙو	شڪار ٿيل جانور	(آہیڑو = شکار شدہ جانور)
اپاهتا	ٻاهريان، اجنبي	(باہر کے، اجنبی)
ڪيڻ	کاڌا، طعام	(کھانے، طعام)
آواج	آواز	(آواز)
سڳارَ	وات، راه	(راستہ، راہ)
ٻُجرو	مجرو، ادائگي	(حساب میں مجرا، کٹوتی، ادائیگی)
آهِرو	آرسي	(آہرو = آئینہ)
گوندر	ڏک	(دکھ، ملال)
چيڻۃ	باهه	(آگ)
مُنِيدي	منادي	(منادی، ڈھنڈورچی)

پَريا	اچا وار	(سفید بال)
ڪتيب	ڪتاب	(کتاب)
چوڻهار	چوڻ وارو	(کہنے والا)
ٻاپ	پيءُ	(باپ، والد)
لکڻهار	لکڻ وارو، لکندڙ	(لکھنے والا، لکھاری)
دوسُ	دوست	(دوست)
آجڪو	رزق	(رزق)
مَرهيات	رحمت ڪيل، بخشيل	(مرحوم ومغفور)
آڏت	سج	(سورج)
ڳيهون	ڪڻڪ	(گیہوں، گندم)
ويڻ	ڳالهه، گفتو، ٻول	(بات، گفتہ، بول)
ڳاهَرُو	ڳاهن ڏيڻ وارا، ڳائيندڙ	(مٹھے دینے والے، گانے والے)
سَمِرٿ	سگهه، طاقت	(سَمرتھ = قوت، طاقت)
مگر	باهه، مچ	(آگ، الاؤ)
ڳويُون	ڳائيون	(گائے، گاؤ)
چيتَ ڪِلاڙ	جانچوسي، خبر لهندڙ	(چیت رکلاڑ = جاسوسی، خبر رکھنے والا)
سهڻو	خواب	(سپنا)
دِکُ	نظر ڏيکاء	(دِکھ = نظر، دکھاوا)
ٻکريُون	توليون (فوجن جون)	(ٹولیاں، افواج کی)
وِياهُ	وهانءُ، شادي	(بیاہ، شادی، نکاح)
پرياڻ	دليل	(دلیل، حجت، ثبوت، گواہی، نشان)
ڀاء	تَرياءُ، پتو	(بھاء = خبر، راز، پتہ)
هورو	ٻورو، گرانهه	(نوالہ، لقمہ)
وا	وائي، ٻولي	(بول، بات، کلمہ، زبان، بولی)

مہینوں کے نام: (ا)

سرانڻ = ساوڻ = ساون	بڊرو	(بھادوں)
اسو (اسوج)	ڪَتي	(کاتِک)
ناهري يا نهاري (مگھر)	پوهہ	(پوس)
ماهہ (ماگھ)	ڦڳڻ	(پھاگن)
چيٽر (چیت)	وهاءُ	(ویساکھ)، بیساکھ)
چيٽ (جیٹھ)	آراڙ	(آکھاڑ، اساڑھ)

ضمیر، جری اور اضافی صورتیں، ظرف وغیرہ

اِيہُ	هيءَ	(یہ)
مَٽي	وٽ	(کے پاس، کے قریب)
اِهين	انهين	(اِسی)
ڳرِ	کي	(کو، طرف)
تا	تنهن کان	(اس سے)
لڳ	واسطي، لاءِ نفعي لڳ، نفعي لاءِ	(واسطے، لئے، وجہ سے، کے سبب)
پسا	پوءِ	(بعد میں، بعد، اس کے بعد)
سِينءَ	تائين	(کے پاس، پاس، پر، اوپر)
پڇيرو	بعد ۾	(پچھیرو = بعد میں)
ڳرا	کان	(سے، از)
ڦرُ	پوءِ	(پھرُ = بعد میں، بعد، اس کے بعد)
کاءُ	کانءُ، کان	(اس سے، سے، از)
کَرا	کان	(سے، از)
تِهان	تنهن کان	(اس سے)
تَتاءُ	تتان	(وہاں سے، اس جگہ سے)

(ا) واضح رہے کہ مہینوں کے ناموں میں متبادل نام ڈاکٹر صاحب نے صرف چار مہینوں، ساون، ماگھ، ویساکھ اور آکھاڑ کے تحریر کیے ہیں۔ باقی مہینوں کے متبادل نام میں نے لغت کی کتابوں سے درج کیے ہیں۔ (مترجم)

تاءُ	تانْ	(جب، جس وقت، کی وجہ سے، اس لیے، تو، کہ، بعد میں)
لوٺاءُ	لوءِ مان، ڳوٺ مان	(قصبہ سے، گاؤں سے)
تانھُہ	ان جاءِ کان، اتان	(اس جگہ سے، وہاں سے، اسی جگہ سے)
پاٹیاءُ	پاڻيءَ منجھان	(پانی میں سے)
مَنجھارا	اندر مان	(اندر سے)
ڏھياءُ	ڏھين مان	(دسویں میں سے)
پاراءُ	پاران، ان طرف کان	(اس طرف سے، اس پار سے، بدلے، عوض میں)
اِکارھياءُ	يارھين مان	(گیارھویں میں سے)
ڏوھاءُ	ڏوھ کان	(جرم کی وجہ سے)
ڌارو آر	ڌار ڌار	(الگ الگ، جدا جدا، مختلف)
سُھَاءُ	سنھن کان	(ابتداء سے، آغاز سے)
ويري تار	ويرُ وَتار	(ہمیشہ، ہردم، دم بدم)
تڙاءُ	تڙتان	(تڑاء = گھاٹ پر سے، گھاٹ سے)
امانگرا	گھڻا	(بہت سارے، زیادہ، وافر)
ايانْ	اين مان، آسمانن مان	(اُبھاں = آسمانوں سے، آسمانوں میں سے)
پانْجا	پاڻ جا، پنھنجا	(خود کے، اپنے)
مِھتِ پھٹاءُ	مسجد ۾ گھڙڻ کان	(مسجد میں داخل ہونے سے)
پنره	پندرھن	(پندرہ)
ويجھايا ويا	ويم کي ويجھو	(قریب الولادت؟)
اڃي پاڻي	اڃي کي پاڻي	(پیاسے کو پانی)
بُکئي کيڻ	بکئي کي کاڌو	(بھوکے کو کھانا، طعام)
جھوءِ	تو جھڙو	(تیرے جیسا)
وزيروءِ	تنھنجو وزير	(تیرا وزیر)

ڏيھون	اسان کي ڏئي	(ہمیں دے)
پڇڻ رنجورن	ڏکويلن کي پڇڻ	(دکھیوں کو پوچھنا)
اڳاچ	گھڻو	(زیادہ)
جِم	متان	(مت، نہیں، شاید، غالبًا، مَبادا)
اَتِ	گھڻو	(زیادہ)
اوڙڪ	هر جاءِ، جتي ڪتي	(اَوڑک = ہر جگہ پر، جہاں کہیں)
اَلکِ	بيشمار، ڳڻڻ کان ٻاهر	(اَلَکھ = بے شمار، شمار سے باہر)
تَتِ	تتِ	(وہاں، اُدھر، اُس جگہ)
جالا رئو	گھڻو (پاڻي)	(زیادہ، وافر (پانی)
جيڪي تائين	جيسيتائين	(جہاں تک، جب تک)
جَه، جُه	جڏهن، جڏهن جو	(جب، جیسے ہی)
وُرُ	پَلي، پَلو	(بیشک، ضرور، بالکل)
وَري	تُوڙي	(اگرچہ، حتیٰ کہ، خواہ)
جَنّهَر	جنهن وير، جنهن وقت	(جس گھڑی، جس وقت)

ضمیر استفہام

ڪِيَ	ڪيترو، ڪهڙو	(کتنا، کون سا)
ڪُر	ڇا، ڪهڙو	(کیا، کونسا)
ڪيھي	ڪهڙي	(کون سی)
ڪُجاڙو	ڪهڙو	(کیا، کیسا، چہ)

عدد

ڪاره، اِڪاره	يارهن	(گیارہ)
پنرَه	پندرهن	(پندرہ)
ڇهاستر	ڇاهتر	(چھتر)
اناره	ارڙهن	(اٹھارہ)

اضافی تراکیب اور اداخر

نبیان سلطان	نبين جو سلطان	(انبیاء کا سلطان)
نبیان راءِ	نبين جو راءُ	(انبیاء کا راجہ/سردار/پیشوا)
وارِيَ ڍُها	واريءَ جا ڍڙا	(ریت کے ٹیلے)
ڌڻيَ ناںءِ	ڌڻيءَ جي نالي تي	(مالک کے نام پر)
فرعونَ ڌيَ	فرعون جي ڌيءَ	(فرعون کی بیٹی)
واٽَ مُنْهِ	رستي جي منهن ۾	(راستے کے آغاز میں)
امیرَ گھر	امير جي گھر	(امیر کے گھر)
ڪڇُنِ وِچُ	بغلن جو وچ	(بغلوں کا درمیان)
ڪنَنِ وَرِ	ڪنن جا پاسا	(کانوں کے اطراف)
وارَنِ پاڙون	وارن جون پاڙون	(بالوں کی جڑیں)
ٻيرِ پَنَ	ٻير جا پن	(بیری کے پتے)
ساٿ وڏیرو	قافلي جو اڳواڻ	(قافلے کا پیشوا، رہبر)
اُس تڙڪو	اس جي تپت	(دھوپ کی تپش)
مون ڌڻي	منهنجا ڌڻي	(میرے مالک)
محمداءُ	محمد جو	(محمد کا)
سَنْدِهِس	سندس	(اس کا)
اُتائُسِ	هن جي مٿان	(اس کے اوپر)
ڳالهائوءِ	تنهنجو ڳالهاءِ	(تیرے بولنے کی آواز، گفتگو، بات چیت)
لَهِسِ	لهيس، ان کي لهي	(اسے ملے؟)

مذکورہ بالا حروف، اسماء، افعال، اضافی اور جری تراکیب اور جملوں پر غور کرنے سے دو نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان میں سے کچھ منظومات سندھ کے ٹھٹہ اور لاڑ (زیریں سندھ) خطے کے علماء اور بیدار مغز لوگوں نے تصنیف کیں، اور کچھ سندھ کے مشرقی خطے (تھرپارکر، سانگھڑ، خیرپور اضلاع کے مشرقی حصوں) کے علماء اور بیدار مغز لوگوں نے۔ کیونکہ ان کی

زبان اور لغات انہی اطراف کی معلوم ہوتی ہے۔

دوسرا یہ کہ اندرونی بیان کے لحاظ سے تمام منظومات میں الفاظ کی کثرت اور روانی کے بجائے الفاظ کی قلت اور عبارت میں ہچکچاہٹ ہے۔ مجموعی طور پر ان منظومات میں استعمال شدہ زبان 'قلیل الالفاظ' (تھورَ-لفظی) ہے، اور نظم بھی نثر جیسی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اکثر منظومات کی زبان بہت قدیم ہے، اور ان موضوعات کو پرانے دور میں منظوم کیا گیا۔ اگرچہ کاتب عزت بن سلیمان نے اس مواد کو ۱۰۶۷ھ-۱۰۶۹ھ (۱۶۵۵ء-۱۶۵۷ء) کے عرصہ میں نقل کیا، مگر یقینی طور پر یہ مواد بہت پہلے سے موجود تھا۔ یہ مواد کتنا عرصہ پہلے موجود تھا، اس کے متعلق کچھ کہا نہیں جا سکتا، البتہ اتنا سارا مواد کم از کم ایک سو برس کے عرصے میں تصنیف ہوا ہوگا۔ اس اندازہ کے مطابق، یہ عین ممکن ہے کہ ۱۰۶۷ھ سے تقریباً ایک صدی پہلے، یعنی دسویں صدی کے نصف سے سندھی میں اس قسم کے مواد مہیا کرنے کا آغاز ہوا ہوگا۔

کاتب کا نقل کردہ تمام مواد بھی محفوظ نہیں رہا، اس کا کچھ حصہ ضائع ہو چکا ہے۔ ایک تو یہ کہ یہ نقل کردہ مواد اور بھی زیادہ تھا، دوسرا یہ کہ اتنا سارا مواد ایک ہی کاتب نے اپنے شوق اور ضرورت کی خاطر ایک جلد میں منتقل کیا۔ اس کے علاوہ سندھ کے مختلف حصوں میں مزید ایسا مواد موجود ہوگا، کیونکہ کئی علماء و اساتذہ اس دور میں مختلف موضوعات پر سندھی میں مواد منظوم کر رہے تھے، اس کی تصدیق تیرہ مختلف علماء، اساتذہ اور دیگر بیدار مغز اصحاب کی تالیف کردہ منظومات سے ہوتی ہے، جو اس ذخیرہ میں شامل ہیں اور جنہیں اُس وقت صرف ایک ہی کاتب نے جمع کیا اور رکھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دسویں، گیارھویں صدی کے نصف اول میں (۹۰۰ھ-۱۰۵۰ھ) بڑی مقدار میں، سندھی تعلیمی، علمی اور ادبی مواد تحریر ہو چکا تھا۔

نتائج:

۱- اس دور میں سندھ کے بیدار مغز علماء و اساتذہ نے اس تعلیمی نظریہ اور تعلیمی تحریک کی بنیاد ڈالی کہ بچوں کو ابتدائی تعلیم ان کی اپنی مادری زبان سندھی میں دی جائے تاکہ وہ بآسانی ابتدائی تعلیم مکمل کر سکیں۔

۲- اس تحریک کے زیر اثر سندھی میں پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ شروع ہوا، اور اس کے لئے سندھی میں درسی مواد مہیا کرنے کا آغاز ہوا۔

۳- یہ درسی مواد منظوم صورت میں مہیا کیا گیا، تاکہ طلباء نیز دوسرے عام پڑھنے والے اسے ذوق وشوق سے سیکھیں اور پڑھیں۔

۴- اس منظوم مواد سے، جسے ایک کاتب، عزت بن سلیمان نے ۱۰۶۷ھ - ۱۰۶۹ھ کے عرصے میں نقل کیا اور جس میں سے انتالیس موضوعات پر مشتمل منظومات محفوظ رہ سکی ہیں، جن میں تیرہ مختلف علماء و اساتذہ کی تصنیف کردہ منظومات شامل ہیں، یہ تصدیق ہوتی ہے کہ مواد کا اتنا بڑا ذخیرہ نقل/ قلمبند ہونے کے وقت سے سو ڈیڑھ سو سال، یا کم از کم ساٹھ ستر برس قبل (۱۰۰۰ھ-۱۰۶۷ھ) میں تصنیف ہوا ہوگا۔

۵- کاتب عزت بن سلیمان کے قلمبند کردہ مواد کی اس کثرت سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ اس دور میں سندھی میں تحریری طور پر اس قدر زیادہ مواد تخلیق کر دیا گیا کہ اس سے قبل غالباً تخلیق نہیں ہوا تھا۔

۶- انتالیس مختلف موضوعات سے متعلق سندھی منظومات کا یہ ذخیرہ اگر چہ بنیادی طور پر تعلیمی و تدریسی ہے مگر اس کے ساتھ وہ ایک قیمتی علمی و ادبی ذخیرہ بھی ہے، جس کے مطالعہ سے پہلی مرتبہ کچھ اہم نتائج برآمد ہوتے ہیں جو درج ذیل ہیں:

(الف) قاضی قادن کے اشعار میں جو بھی سندھی شاعری کی ترتیبیں دستیاب ہوئی ہیں وہ اِن منظومات میں سب کی سب موجود ہیں۔

(ب) اشعار کے علاوہ اس ذخیرہ میں 'منظوم طویل بندوں' (ٹیپ کے مصرعوں یا اشعار) کی ایک بڑی تعداد شامل ہے، اور 'طویل سندھی منظوم بند' پہلی مرتبہ اس ذخیرہ میں ملے ہیں۔

(ج) اگر چہ 'شعر و شاعری' کے بجائے بنیادی طور پر یہ ایک 'منظوم ذخیرہ' ہے تاہم کچھ 'صنعتیں' ایسی بھی ہیں جو پہلی مرتبہ ان منظومات میں ملتی ہیں، مثلاً اشعار میں 'جوابِ شعر' یا 'تکرار' کی صنعت اور چھوٹی بحر میں صنعت 'مستزاد' اس کے علاوہ معنوی تمثیل کے اعتبار سے 'سُر ساموندی' کا ایک شعر بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

۷- اکثر منظومات کی زبان پرانی ہے اور ممکن ہے کہ وہ دسویں صدی ہجری (۹۵۰ھ کے قریب یا اس سے بھی قبل) میں تصنیف ہوئی ہوں۔ 'بیان' کی کچھ ترتیبیں، حرف اور ظرف، یا جری اور اضافی تراکیب، قاضی قادن (وفات ۹۵۰ھ) اور میاں شاہ کریم (وفات ۱۰۳۲ھ) کے اشعار میں آئے ہوئے الفاظ، حروف اور تراکیب سے بھی زیادہ انوکھی اور قدیم محسوس ہوتی ہیں۔

☆

باب ہشتم

سندھی کے ذریعے تعلیمی تحریک کی کامیابی، سندھی میں معیاری درسی و علمی کتب کی تصنیف، سندھی صرف و نحو اور لغات کے مطالعہ اور سندھی نثر کے آغاز اور اعلیٰ سندھی شاعری کے عروج کا دور۔

(آخری مغل، عباسی کلھوڑوں اور تالپوروں کا دور ۱۶۸۰ء - ۱۸۶۰ء)

یہ دور، جس میں سندھی کے ذریعے تعلیمی تحریک زیادہ مضبوط ہوئی اور سندھی درسی علمی کتب کی تصنیف اور اشاعت کا بڑے پیمانے پر سلسلہ شروع ہوا، تاریخی لحاظ سے (آخری مغلیہ دور میں) تقریباً ۱۰۹۰ھ (۱۶۸۰ء) میں شروع ہوا، لیکن کامیاب نتائج کے لحاظ سے یہ سندھ میں عباسی کلھوڑوں اور تالپور امیروں کی آزاد حکومتوں کا دور تھا، جس میں نئی نصابی تنظیم کے نتیجے کے طور پر سندھی میں معیاری درسی کتب اور علمی ادبی تصانیف کا سلسلہ وسیع اور مقبولِ عام ہوا۔ یہاں تک کہ تالپور حکومت کے خاتمے (۱۲۵۹ھ/۱۸۴۳ء) کے بعد بھی باوجود مخالف حالات کے یہ سلسلہ کافی وقت تک جاری رہا۔ کتاب "دائرہ والی سندھی" جو اس دور کی علمی اور تعلیمی تحریک کا نمایاں نشان تھی، وہ ۱۸۵۳ء - ۱۸۶۰ء کے عرصے میں تصنیف ہوئی۔

انگریزی دور میں سندھی زبان اور تعلیم کے بارے میں بعض بنیادی فیصلے ۵۵-۱۸۵۰ء کے عرصے میں ہونے کے باوجود بھی سندھ کے لئے جدا گانہ 'محکمۂ تعلیم' ۱۸۶۰ء کے لگ بھگ قائم ہوا جس کے بعد ہی انگریز دور میں کئے گئے فیصلے زیادہ مؤثر ہوئے۔ ان آثار کے پیش نظر سندھی زبان کے اس تاریخی دور کا عرصہ ۱۶۸۰ء سے ۱۸۶۰ء تک ہی شمار کیا جا سکتا ہے۔

اس دور میں سندھ میں سرکاری اور دفتری زبان فارسی ہی رہی، لیکن ابتدائی تعلیمی زبان فارسی کے بجائے سندھی زبان قرار پائی۔ ذریعہ تعلیم کے طور پر فارسی کے مقابلے میں مادری زبان سندھی کی اہمیت اس سے پہلے تسلیم ہونا شروع ہو چکی تھی: اِس دور میں نہ صرف ذریعۂ تعلیم کے طور پر مادری زبان سندھی کو فارسی پر فوقیت حاصل ہوئی بلکہ مکتبی سطح پر نصابی تنظیم کی بنیاد بھی مادری زبان پر رکھی گئی۔

شعر و ادب کے میدان میں فارسی کا تاریخی مقام قائم رہا ،مگر اس دور میں اعلیٰ سندھی شاعری بھی اپنے عروج کو پہنچی اور خاص طور پر حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی صاحب کا دلپذیر کلام عوام اور خواص کے قلوب پر چھا گیا ۔ ذیل میں ہم اسی دور کے اہم رجحانات ومیلانات پر روشنی ڈالیں گے ،جن کے ذریعے سندھی زبان میں تعلیم وتحریر،تحقیق وتصنیف کا سلسلہ بڑے پیمانے پر شروع ہوا۔

۱- مادری زبان کے ذریعے تعلیمی تحریک کی بنیادوں کا مستحکم ہونا اور اس کی کامیابی :

ساتویں باب کے تحت تفصیل سے بیان کردیا گیا ہے کہ ۱۱ ویں صدی ہجری (۱۶/۱۷ ویں عیسوی) سے ہی سندھ کے بیدار مغز علماء و اساتذہ نے اس تعلیمی نظریہ اور تعلیمی تحریک کی بنیاد ڈالی کہ بچوں کو ابتدائی تعلیم ان کی مادری زبان سندھی میں ہی دی جائے ۔

اس تحریک کے زیر اثر سندھی میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع ہوا اور اس کے لیئے منظوم صورت میں بہت مواد مہیا کیا گیا۔ اس دور میں ،نصابی تنظیم او رمعیاری درسی کتب کی تصنیف سے یہ نظریہ مزید مستحکم ہوا اور مادری زبان سندھی میں ابتدائی تعلیم دینے کی تحریک ہر اعتبار سے کامیاب ہوئی ۔ اس کامیابی کا سہرا ٹھٹہ کے عالم و استاد میاں ابوالحسن کے سَر بندھتا ہے جنھوں نے پہلی معیاری سندھی درسی کتاب تصنیف کی ، جسے 'سندھی میں تعلیم' کے حوالے سے اور ابوالحسن کے نام کی مناسبت سے ''ابوالحسن جی سندھی'' کہا گیا، اور جس کی عام مقبولیت سے سندھی میں ابتدائی تعلیم دینے کی تحریک کامیاب ہوئی ۔

(الف) معیاری درسی کتاب ''ابوالحسن جی سندھی'' :

میاں ابوالحسن ٹھٹہ کے آخوند اساتذہ میں سے تھے،لیکن اپنے دور کے اس بہت بڑے بیدار مغز استاد کی سوانح حیات کے متعلق تفصیلی حوالہ جات موجودنہیں ہیں۔ کتاب کے آخر میں انہوں نے اپنا پورا نام 'ابوالحسن' نیز اسم مصغر 'ابول' یعنی 'اَبُل' اور اپنے والد کا نام ''عبدالعزیز'' لکھا ہے ۔ ان کا بھانجا میاں عبداللہ واعظ عرف میاں موریو ۱۱۰۰ھ - ۱۱۵۰ھ کے عرصے میں زندہ تھا۔ مخدوم محمد قائم جس نے مکتبی تعلیم غالبًا میاں ابوالحسن سے حاصل کی اس نے سن ۱۱۵۷ھ میں وصال فرمایا،اس سے گمان ہوتا ہے کہ میاں ابوالحسن ۱۰۸۰ھ - ۱۱۰۰ھ کے عرصے میں زندہ تھے ۔ تحفۃ الکرام میں مذکور ہے کہ میاں ابوالحسن بڑھاپے میں کمر خمیدہ ہوگئے تھے ،جس کا مطلب ہے کہ وہ عمر رسیدہ تھے ۔ ان علامات وآثار کے پیش نظر میاں ابوالحسن تقریباً ۱۰۱۰ھ میں پیدا ہوئے،

اور اگر وفات کے وقت ان کی عمر پچاسی برس(۱) کے قریب تھی تو ان کا انتقال ۱۱۰۵ھ کے لگ بھگ ہوا(۲)۔

مندرجہ بالا شواہد کی رو سے میاں ابو الحسن گیارہویں صدی ہجری کے نصف آخر کے بڑے عالم اور استاد تھے۔ اس وقت وہ ٹھٹھ میں سندھی کے ذریعے ابتدائی تعلیمی تحریک کے رہنما تھے، جس کی ابتداء پہلے ہی ہو چکی تھی۔ اس سلسلہ میں انہوں نے نماز کے موضوعات پر سندھی میں ایک خاص کتاب تصنیف کی جبکہ اس سے قبل اسی موضوع پر عربی یا فارسی میں کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔ ۱۰۶۱ھ میں فتح محمد نامی ایک نامور سندھی عالم(۳) جو خود تو ہندستان کے شہر برہانپور کے باشندہ تھے، مگر ان کے آباء و اجداد سندھ کے شہر 'پاٹ' (موجودہ ضلع دادو) کے تھے- فارسی میں 'مفتاح الصّلوٰۃ' (نماز کی چابی) نامی کتاب لکھی، اس کتاب نے بہت شہرت پائی اور مدارس

---

(۱) مطبوعہ اصل سندھی کتاب میں ''پچاسی'' ہی لکھا ہوا ہے جو نیچے تحریر کردہ سنِ ولادت ۱۰۱۰ھ اور سنِ وفات ۱۱۰۵ھ کے حساب سے 'پچانوے' ہونا چاہیے تھا لیکن پروف کی غلطی کی وجہ سے ایسا نہیں ہو سکا۔ (مترجم)

(۲) جناب جمیل نقوی صاحب نے لکھا ہے: مولانا ابو الحسن ٹھٹوی (وفات ۱۱۶۴ھ) نے سندھی نثر کی پہلی کتاب مقدمۃ الصلواۃ ۱۱۱۲ھ میں لکھی۔ دیکھیئے: اردو تفاسیر (کتابیات) ص ۱۳۷

کاش کہ نقوی صاحب نے مولانا صاحب کے سالِ وفات اور مقدمۃ الصلواۃ (ابوالحسن جی سندھی) کے سالِ تحریر کے متعلق مأخذ کی نشاندہی کی ہوتی! (مترجم)

(۳) ابوالمجد فتح محمد بن عیسیٰ بن قاسم بن یوسف سندھی برہانپوری۔ آپ کا سلسلۂ نسب سیوہانی صدیقی خاندان کے جد امجد اور سلسلہ سہروردیہ کے مشہور صوفی اور نامور عالم حضرت شیخ شہاب الدین سندھی پاٹائی متوفی ۸۹۴ھ سے ملتا ہے۔ آپ کے والد شیخ عیسیٰ جند اللہ برہانپوری ۹۶۲-۱۰۳۱ھ ایک معروف شیخ طریقت، صوفی بزرگ اور عالم تھے۔ ہندوستان کے مشہور محدث شیخ طاہر بن یوسف برہانپوری آپ کے والد کے چچا تھے۔ شیخ فتح محمد نے ظاہری و باطنی علوم کی تحصیل والد صاحب سے کی، ان کے وصال کے بعد مسندِ درس، و تدریس پر متمکن ہوئے اور تقریباً ۶۳ برس بعد سنہ ۱۰۶۴ھ میں حرمین شریفین ہجرت کر گئے اور مدینہ شریف میں مکمل سکونت اختیار کر لی۔

آپ کی تصانیف میں مفتاح الصلواۃ کے علاوہ نماز و طہارت وغیرہ مسائل پر تفصیلی کتاب ۱۰۵۰ھ میں تصیف کردہ 'فتح المذاہب الاربعۃ' نیز برہانپور اور آس پاس کے علاقہ جات میں 'سایۂ اصلی' یعنی ظہر اور دیگر نمازوں کے اوقات بتانے کے لیے 'جبۃ الکعبۃ' (فارسی منظوم) اور وظائف و اوراد کی کتاب 'فتوح الاوراد' (فارسی)، ازانسواء 'رسالۂ مستحب وقت عشاء و ظہر' اور ایک صوفیانہ مثنوی بعنوان 'بیان تنزل حق جل دعلیٰ ‌ھقیدہ صوفیا' (منظوم فارسی) کے نام ملتے ہیں۔

سید عبدالحی حسنی نے مذکورہ بالا کتب کے علاوہ ایک رسالہ وحدۃ الوجود پر ایک رسالہ مراتب عوالم خمسہ پر اور ایک رسالہ شیخ علی بن شہاب حسینی کی کتاب 'احادیث سبعین' کی تخریج پر ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ تینوں رسائل میں نے دیکھے اور ان سے استفادہ کیا ہے۔ مزید لکھتے ہیں کہ اس کے علاوہ بھی آپ کی تصانیف ہیں، مثلاً: 'مفتاح فتوح العقائد' 'فتح الطریقۃ فی السلوک' اور سیدنا عبدالقادر جیلانی کے نسب کی تحقیق پر ایک رسالہ اور آپ کے فرمان (قدمی ھٰذہ علیٰ رقبۃ کل ولی اللہ) کی اثبات پر ایک رسالہ۔ آپ نے سنہ ۱۰۸۰ھ میں وصال فرمایا اور جنت البقیع میں دفن ہوئے۔ سید عبدالحی حسنی نے آپ کا وصال مکہ شریف میں لکھا ہے۔

دیکھیئے: 'برہانپور کے سندھی اولیاء' ص ۱۱۸-۱۶۴

نزہۃ الخواطر جلد پنجم ص: ۳۲۹-۳۳۰ (مترجم)

اور مکتبوں میں پڑھائی جاتی تھی(۱)۔ غالباً اس کے بعد میاں ابوالحسن نے سندھی زبان میں کتاب ''مقدمۃ الصّلوٰۃ سندھی'' تصنیف کی۔ اگر میاں ابوالحسن بڑی عمر پا کر سن ۱۱۰۵ھ میں فوت ہوئے

(۱) قدیم دور میں کسی سندھی بزرگ نے حرفی اشارات میں تین فارسی شعر کہے تھے جنہیں مذہبی گھرانوں کی عورتیں یاد کرتیں اور ابتدائی تعلیم کے طور پر اپنے بچوں کو بھی یاد کراتی تھیں۔ ان اشعار میں نماز کے فرائض، واجبات اور سنتوں کی طرف اشارہ کیا گیا تھا، وہ اشعار درج ذیل ہیں:

فرائض ندانی شوی در قلق — اجس نوق تقق رسق
چو واجب ندانی شوی در خطر — ففت تقت لقت جسر
چو سنت بدانی شوی مقتدیٰ — ردثت بتت ستد دا

دراصل تینوں اشعار کے دوسرے مصرعہ میں ابتدائی حروف کے ذریعے فرائض، واجبات اور نماز کی سنتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ مخدوم فتح محمد نے بھی گھریلو ماحول میں یہ اشعار بچپن ہی میں یاد کر لیئے تھے، بعد میں آپ نے اپنی اس کتاب میں مذکورہ بالا اشعار کی روشنی میں ان تمام فرائض، واجبات اور سنتوں کو تفصیل سے بیان کر دیا، یعنی ان حرفی اشارات کو کھول کر بیان کیا۔

حرفی اشارات کے اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ نماز میں کُل تیرہ فرائض ہیں، جن میں سے سات فرائض نماز سے باہر اور چھ نماز کے اندر ہیں، پہلے شعر کے دوسرے مصرعہ میں ابتدائی حروف کے ذریعے ان کی طرف اشارہ ہے۔

(ا- اندام، یعنی جسم پاک)، (ج- جاے، یعنی جگہ پاک)، (ج- جامہ، یعنی کپڑے پاک)، (س- ستر عورت)، (ن- نیتِ نماز)، (و- وقت شناختن، یعنی وقت کی پہچان)، (ق- قبلہ شناختن، یعنی سمتِ قبلہ کی پہچان)، (ت- تکبیرِ اولیٰ)، (ق- قیام)، (ق- قرأۃ)، (ر- رکوع)، (س- سجدہ)، (ق- قعدہ اخیرہ)۔

اسی طرح دوسرے شعر کے حروف واجبات نماز کی طرف رہنمائی کرتے ہیں، یعنی (ف- فاتحہ پڑھنا)، (ض- ضمِ سورۃ، یعنی فاتحہ کے ساتھ کسی اور سورۃِ قرآن کا ملانا)، (ت- تعینِ قرأۃ در دو رکعتِ اول فرض، یعنی فرض کی پہلی دو رکعتوں میں قرأۃ کا تعین، یعنی ضروری ہونا)، (ت- تعدیلِ ارکان، یعنی نماز کے تمام ارکان کو ٹھیک طرح سے سرانجام دینا)، (ق- قعدہ اولی)، (ت- تشہد، یعنی التحیات پڑھنا)، (ل- لفظ السلام علیکم و رحمۃ اللہ کہنا)، (ق- قنوت کی دعا وتر میں پڑھنا)، (ت- تکبیراتِ عیدَین)، (ج- جہری نمازوں میں جہر، یعنی بلند آواز سے قرأۃ کرنا)، (س- سری نمازوں میں سرّی قرأۃ)، (ر- رعایتِ ترتیب، یعنی افعالِ نماز میں ترتیب کی رعایت کرنا)۔

اور آخری شعر کے حروف نماز کی سنتوں کی طرف اشارہ ہیں:

(ر- رفع یدین، یعنی تکبیرِ تحریمہ کے وقت ہاتھوں کو کانوں تک بلند کرنا)، (و- وضع یدَین زیرِ ناف، ناف کے نیچے ہاتھ باندھنا)، (ث- ثناء پڑھنا)، (ت- تعوذ پڑھنا)، (ب- بسم اللہ پڑھنا ہر رکعت کی سورۂ فاتحہ میں)، (ت- تکبیراتِ انتقالات، یعنی ایک حال سے دوسرے حال کی طرف جاتے وقت اللہ اکبر کہنا)، (ت- تسبیحاتِ رکوع اور سجدہ)، (س- سمع اللہ لمن حمدہ کہنا)، (ت- توقف کرنا رکوع و سجود سے اٹھتے وقت)، (د- درود پڑھنا قعدہ اخیر میں تشہد کے بعد)، (د- دعا پڑھنا درود کے بعد)، (ا- آمین کہنا خفیہ طور پر فاتحہ کے بعد، ہر نماز کی ہر رکعت میں، ہر نمازی کو)۔

دراصل 'مفتاح الصلوٰۃ' مذکورہ بالا حرفی اشارات کا تفصیلی حل ہے، جس میں نہ صرف ان اشارات کو حل کیا گیا ہے بلکہ ہر رکن کے بارے میں فقہ حنفی کی مستند کتابوں سے حوالہ جات اور احکام ایسی وضاحت کے ساتھ لکھے گئے ہیں کہ ہر اجمال دلنشین طریقے سے مفصل مسئلہ کی صورت میں آ گیا ہے۔ یہ کتاب آخر ذی الحج ۱۰۶۱ھ میں مکمل ہوئی۔

دیکھیے: ''نورِ العین فی اثبات الاشارۃ فی التشہد ین کے عربی متن کی تحقیق اور کتاب کے موضوع سے متعلق فقہی حوالہ جات اور احادیث کا تحقیقی جائزہ''

تحقیقی مقالہ، حصہ دوم (سندھی) ص ۸۴، حاشیہ ا (مترجم)

ہوں تو پھر انہوں نے یہ کتاب تقریباً پچیس سال قبل ۱۰۸۰ھ کے لگ بھگ لکھی ہوگی اور اس کتاب کے لکھنے سے 'سندھی زبان' کے ذریعے تعلیم دینے کی تحریک کا ایک نیا دور شروع ہوا کیونکہ اس بیدار مغز عالم نے یہ کتاب خاص طور پر زیرِ تعلیم طلباء کی تعلیمی ضرورت پوری کرنے کے لئے ایک درسی اور نصابی کتاب کے طور پر لکھی (۱)۔

کتاب کے اختتام پر مصنف نے کتاب لکھنے کا مقصد یوں واضح کیا ہے:

عبدالعزیز کے بیٹے 'ابول' نے پڑھے لکھے لوگوں سے پوچھ کر نماز کے یہ مسائل سندھی زبان میں تفصیل سے لکھے ہیں تاکہ مؤمن انہیں رغبت سے سیکھیں اور اس ناکارہ کے حق میں اللہ تعالیٰ سے دعاء کریں: بارِ الٰہا! اے مہربان مولا! اے شفیق مالک! ابوالحسن تجھ سے دعاء کرتا ہے کہ مؤمنوں کو طلب کی توفیق عطا فرما تاکہ وہ ان تمام مسائل کو خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھائیں، میں نے یہ رسالہ طلباء کی طلب (ضرورت) کے پیشِ نظر لکھا، اور اس کا نام 'مقدمۃ الصلوٰۃ سندھی' رکھا ہے۔

اس سے مصنف کے مقصدِ تصنیف کو ہم اس طرح سمجھ سکتے ہیں: (الف) انہوں نے نماز کے مسائل عربی یا فارسی کے بجائے سندھی زبان (سنڌي واء) میں تفصیل سے لکھے؛ (ب) تاکہ تمام لوگ چاہت اور توفیق کے ساتھ کتاب کو پڑھیں اور دوسروں کو پڑھائیں؛ (ج) انہوں نے یہ رسالہ (کتاب) خاص طور پر شاگردوں کی احتیاج (طلبَ طالبن) پر لکھا ہے؛ اور (د) انہوں نے اس کا نام ''مقدمۃ الصلوٰۃ سندھی'' (نماز کا مقدمہ سندھی) رکھا ہے۔

---

(۱) مرحوم محمد صدیق میمن نے 'سندھ جی ادبی تاریخ' میں بتایا ہے کہ: ''ابوالحسن نے اپنی کتاب مقدمۃ الصلواۃ سال ۱۷۰۰ء میں لکھی۔

میمن صاحب کا تحریر کردہ یہ سال سن ۱۱۱۲ھ کے مطابق ہے۔ میمن صاحب نے یہ اندازہ غالباً اس وجہ سے قائم کیا کہ ان کی دانست کے مطابق اس قسم کی کتاب کی ضرورت ٹھٹہ کے نواب حفظ اللہ خان کے دور میں پیش آئی جو ۱۱۰۳ھ۔۱۱۱۴ھ کے عرصے میں ٹھٹہ کا حکمران تھا۔ میمن صاحب کے بقول اس وقت ٹھٹے میں ہزاروں لوگ بغدادی بزرگ کے وعظ و نصیحت سے مسلمان ہوئے اور ''اس قدر کثیر تعداد میں نومسلموں کو اسلامی قواعد و قوانین سے واقف کرنے کے لیے زبانی وعظ و نصیحت کافی نہیں تھی اس لیے اس وقت کے مشہور عالمِ فقہ مولوی ابوالحسن ۔۔۔۔۔ نے محسوس کیا کہ اتنے عمر رسیدہ لوگوں کو فارسی و عربی سکھا کر اسلامی واقفیت فراہم کرنا، خاص طور پر فقہی مسائل سے انہیں آگاہ کرنا ممکن نہیں اس لئے انہوں نے لوگوں کی مادری زبان یعنی سندھی میں لکھنا شروع کیا'' دیکھیئے: 'سنڌ جي ادبي تاريخ، دور برطانيه کان اڳ' مسلم ادبی سوسائٹی حیدرآباد ۱۹۳۶ء)

دراصل اس قسم کے اندازے اور شبہات غالباً انگریز مصنف ENTHOVEN نے اپنی کتاب ''بمبئی علاقہ کی قومیں اور ذاتیں'' میں قائم کیے جس کا حوالہ بھیرومل نے 'سندھی بولی جی تاریخ' (ص ۲۴۷) میں دیا ہے۔ ان کی یہ دلیل درست نہیں ہے کیونکہ خود مصنف نے واضح طور پر بتایا ہے کہ اس نے یہ کتاب ''کارڻ طلبَ طالبن ''طلباء کی طلب کے پیش نظر یعنی شاگردوں کی تعلیمی ضرورت پوری کرنے کے لئے لکھی ہے۔

کتاب کا نام:

اوپر آخری سطر سے صاف ظاہر ہے کہ مصنف نے کتاب کا نام ''مقدمۃ الصّلوٰۃ سندھی'' رکھا، یعنی سندھی میں لکھا ہوا نماز کا دیباچہ۔ بعد میں یہ کتاب 'ابو الحسن کی سندھی' کے آسان او رعام فہم نام سے مشہور ہوگئی۔ اس نام کا مقصد اور مطلب یہ تھا کہ: یہ مصنف ابو الحسن کی تیار کردہ نصابی یا درسی کتاب ہے جسے عربی یا فارسی کے بجائے 'سندھی' میں لکھا گیا ہے۔ کتاب کے اصل نام ''مقدمۃ الصّلوٰۃ سندھی'' کا معنی بھی یہی ہے کہ یہ 'مقدمۃ الصّلوٰۃ' یعنی نماز کا مقدمہ ہے، جو کہ 'سندھی' میں ہے: یعنی عربی یا فارسی کی بجائے یہ 'سندھی' میں ''مقدمۃ الصّلوٰۃ'' ہے(۱)۔

اس کتاب کو ''مقدمۃ الصّلوٰۃ سندھی'' کے بجائے ''ابو الحسن جی سندھی'' کب سے کہا گیا؟ وہ تو معلوم نہیں؛ مگر مصنف کے نام کے ساتھ کتاب کا یہ عام آسان نام اس دور کی اِسی چاہت اور ذوق کا نتیجہ تھا کہ علمی اور تعلیمی سلسلے میں جو کچھ بھی ہو، وہ 'آسان سندھی' میں ہی ہو۔ بہرحال وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ کتاب ''ابو الحسن جی سندھی'' کے عام فہم نام ہی سے مشہور ہوگئی۔

کتاب کی درسی حیثیت:

اس درسی کتاب تصنیف کرنے کے بعد سب سے پہلے خود مخدوم ابو الحسن نے اسے اپنی درسگاہ میں پڑھانا شروع کیا۔ اس وقت سے یہ کتاب اس قدر مقبول ہوئی، کہ نہ صرف بڑے بڑے علماء و اساتذہ کے درمیان اس کے موضوع اور مضمون کے متعلق تحقیقی مباحث شروع ہوئے، بلکہ مکاتب و مدارس میں آئندہ اڑھائی سو برس تک، یعنی اندازاً ۱۰۹۰ھ (۱۶۸۰ء) سے ۱۳۵۰ھ (۱۹۳۰ء) تک اسے مقبول درسی کتاب کے طور پر بڑی رغبت و چاہت سے پڑھایا جاتا رہا۔ ۱۹۲۰ء میں یہ کتاب حیدرآباد سے شائع ہوئی، اس کے دیباچہ سے ظاہر ہے کہ اس وقت بھی یہ ایک درسی کتاب کے طور پر پڑھائی جاتی تھی(۲)۔

ابو الحسن کی 'مقدمۃ الصّلوٰۃ' (نماز کا مقدمہ) بطور درسی کتاب اس قدر اہم ثابت ہوئی کہ مخدوم محمد ہاشم کے بقول یہ کتاب مسائل نماز کے متعلق ''دستور العمل'' بن چکی تھی۔ اِسی عام

(۱) کتاب کے نام میں لفظ 'سندھی' کی وجہ سے اِس آخری دور میں ایک عام غلط فہمی یہ موجود رہتی آئی ہے کہ اس کتاب میں کسی خاص قسم کی سندھی زبان کی لکھم استعمال ہوئی ہے جسے 'سندھی' کہا جاتا ہے۔ خواندہ طبقے میں یہ غلط فہمی خاص طور پر محمد صدیق میمن کی ''سندھ جی ادبی تاریخ'' (حصہ اول: مطبوعہ مسلم ادبی سوسائٹی حیدرآباد ۱۹۳۶ء) میں دی گئی رائے کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ مصنف کے خیال میں ابو الحسن کی 'سندھی' کوئی خاص قسم کی سندھی ہے، نیز وہ ''سندھی ایک خاص لکھم میں ہے، جسے ابو الحسن کی سندھی کہتے ہیں۔ ان کے بعد دیگر علماء نے بھی اسی 'سندھی' میں کتابیں لکھیں، نیز اسی 'ابو الحسن کی سندھی' میں لکھی ہوئی کتابیں لیتھو پر چھپیں'' (ص ۵۷-۵۶)

(۲) محمد صدیق میمن ''سند جي ادبي تاريخ دور برطانيا کان اڳ'' مسلم ادبی سوسائٹی، حیدرآباد، ۱۹۳۶ء

مقبولیت کے پیشِ نظر اس دور کے اس رائے کے مقابلہ میں بھیرومل کی رائے زیادہ درست تھی کہ ''مسلم علماء میں سے جس کسی نے بھی سندھی میں کتاب لکھی، ان کی اس کتاب کو، اس مصنف کی سندھی کہتے تھے۔

(سندھی بولي جی تاریخ، کراچی ۱۹۴۱ء ص ۲۴۸)

بہت بڑے علماء مخدوم محمد ہاشم اور مخدوم محمد قائم کے درمیان اس کتاب پر علمی بحث شروع ہوئی اور یوں اس درسی کتاب کی صحت و اہمیت کی مزید تصدیق ہوئی، اسے متفقہ طور پر درسگاہوں میں پڑھایا گیا، جس سے مادری زبان سندھی کے ذریعے ابتدائی تعلیم دینے کی تحریک مستحکم ہوئی۔

(ب) شاہ لطف اللہ قادری کا رسالہ:

تعلیمی اداروں سے باہر بھی اس دور کے علماء میں یہ احساس بیدار ہو چکا تھا کہ اعلیٰ فکری و معنوی علمی موضوعات کو فارسی کے بجائے کوشش کرکے سندھی میں بیان کیا جائے تاکہ انہیں بآسانی سمجھایا جا سکے۔ سب سے پہلے اس دور کے بڑے صوفی و سالک شیخ المشائخ شاہ لطف اللہ قادری نے ۱۰۸۴ھ - ۱۱۰۰ھ کے عرصے میں توحید و رسالت جیسے بڑے معنی کے حامل موضوع کو تصوف و طریقت کے ذریعے سندھی زبان میں سمجھانے کی کوشش کی اور اس کے لیے سندھی اشعار میں 'رسالہ' (دیوان) تصنیف کیا۔ یہ رسالہ اعلیٰ سندھی۔شاعری کی تاریخ کے لحاظ سے تو ایک شاہکار ہی تھا، مگر یہاں پر یہ بتانا بہت ضروری ہے کہ اس وقت اس کا تصنیف ہونا سندھی زبان میں تعلیمی تحریک کی عام مقبولیت اور کامیابی کی ایک روشن مثال تھا۔ شاہ لطف اللہ قادری نے یہ رسالہ ایک خاص ارادے اور لگن سے منظوم کیا، جس کا ذکر انہوں نے اس طرح کیا ہے کہ:

ڪوڏان ڪئو رسالو ايءُ فقير جوڙي بيتن — تہ هوءِ سنڌيءُ وائيءُ سَهڪو ٻُجهڻ ابوجهن

پاهنجيءُ ٻوليءُ ڪري سگهائي اي سِکن — لطف الله چئي لئي پيو ورسکن ۽ پڙهن

[اس نے یہ رسالہ خاص طور پر ''سندھی زبان'' میں لکھا تاکہ پڑھنے والے اپنی زبان (سندھی) میں بیان کردہ موضوع کو جلد اور بآسانی سمجھ سکیں۔]

واقعی یہ شاہ لطف اللہ کی عالمانہ قابلیت اور عارفانہ بصیرت ہی تھی جو انہوں نے ایسے علمی موضوع کو آسان بنا کر سمجھایا مگر اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس وقت سندھی زبان میں بھی بیان کی بڑی وسعت پیدا ہو چکی تھی جو انہوں نے وحدت و کثرت کی حقیقت کو تصوف کی روشنی میں عام فہم سندھی اشعار کے ذریعے عمدہ اصطلاحات و تمثیلات کے ساتھ دلچسپ بنا کر سمجھایا(۱)۔

(۱) تفصیل کے لیے دیکھیے راقم کی تصحیح و تحقیق کے ساتھ شائع کردہ ''شاہ لطف اللہ قادری جو کلام''، انسٹیٹیوٹ آف سندھیالوجی، سندھ یونیورسٹی، حیدرآباد سندھ، ۱۳۸۸ھ/۱۹۶۸ء

اعلیٰ درسی کتاب کے طور پر تحریر کردہ ''ابو الحسن جی سندھی'' اور سلوک و طریقت جیسے علمی موضوع پر شاہ لطف اللہ قادری کے 'رسالہ' سے ظاہر ہوتا ہے کہ اپنی مادری زبان میں تعلیم و تربیت دینے کے لیے پہلے سے جاری تحریک اس دور میں کامیابی کی اس منزل پر پہنچی کہ درسگاہوں کے بڑے اساتذہ اور باہر کے دیگر علماء و محققین نے ابتدائی تعلیم و تربیت کو سندھی زبان میں مقبول عام بنانے کی طرف بھرپور توجہ دی ،تاکہ طلباء خواہ دیگر افراد اپنی زبان کے ذریعے جلد ، بآسانی اور ذوق و شوق کے ساتھ سیکھ سکیں۔

(ج) ''سندھی'' کے خاص نام کی مزید درسی کتابوں کا شائع ہونا:

کتاب ''ابو الحسن جی سندھی'' کے بعد دیگر مشہور علماء و اساتذہ نے سندھی میں درسی کتابیں لکھنا شروع کیں جو ''ابو الحسن جی سندھی'' کے عام فہم نام کی طرح ان مصنفین کے نام سے منسوب 'سندھی' کہلائیں ۔ ان مصنفین کا اہم مقصد درسی اور تعلیمی تھا ،یعنی کہ نئے پڑھنے والے اپنی مادری زبان سندھی کے ذریعے زیادہ شوق سے تعلیم حاصل کریں اور مشکل مسائل و موضوعات کو جلد اور بآسانی سمجھ سکیں ۔ بعد میں کتاب '' ابو الحسن جی سندھی'' کے نام کی مناسبت سے، سندھی درسی کتابوں کا اصطلاحی نام ہی ''سندھی'' مشہور ہو گیا۔ مثلاً درج ذیل کتابیں جدا جدا درسگاہوں میں مختلف اوقات میں پڑھی پڑھائی گئیں اور وہ بھی ''سندھی'' ہی کے نام سے موسوم ہوئیں(۱)۔

۱-مخدوم ضیاء الدین کی سندھی:

مخدوم ضیاء الدین (۱۰۹۱ھ-۱۱۷۱ھ) مخدوم ابوالحسن کے چھوٹے ہمعصر تھے اور اسی ٹھٹہ شہر کے نامور عالم تھے(۲) ۔ انہوں نے یہ درسی کتاب لکھی ،اس کا موضوع بھی وہی ''ابو الحسن جی سندھی'' والا تھا ،البتہ اس میں طہارت و نماز کے ساتھ دوسرے مسائل بھی درج کئے گئے اور انہیں نئے طریقے سے بیان کیا گیا۔ مثلاً نماز جمعہ یا نماز ظہر کا وقت معلوم کرنے کے لئے سایہ ڈھلنے کو،

---

(۱) بعد میں دوسرے موضوعات پر 'سندھی' میں کتابیں تصنیف یا ترجمہ ہونے کی وجہ سے ان کتابوں کو بھی 'سندھی' کہا جانے لگا، جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا۔

(۲) مخدوم ضیاء الدین بن ابراہیم بن ہارون بن عجائب بن الیاس صدیقی ٹھٹہ شہر میں سنہ ۱۰۹۱ھ/ ۱۶۸۰ء کو پیدا ہوئے، ٹھٹہ کے مشہور عالم مخدوم عنایت اللہ متوفی ۱۱۱۴ھ/ ۱۷۰۲ء سے اکتسابِ فیض کیا۔ علمی فضیلت و کمال کے باوجود راہ فقر کے سالک اور نہایت نیازمندی والے تھے۔ آپ کے شاگردوں میں سندھ کے نامور فقیہ و محدث اور بہت بڑے محقق علامہ مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی متوفی ۱۱۷۴ھ بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔ آپ نے اسی برس کی عمر میں ۱۱۷۱ھ/ ۱۷۵۸ء کو وصال فرمایا۔

'تحفۃ الکرام' سندھی ترجمہ، ص ۴۳۸، ۴۴۰ (مترجم)

بارہ مہینوں میں سے ہر ماہ کے حساب سے سمجھایا گیا۔ کتاب کا خاص مقصد تعلیمی تھا: یعنی یہ کہ ہر شخص سندھی میں لگن کے ساتھ دینی مسائل پڑھے اور انہیں سمجھ سکے:

مسئلا جي دين جا، سي گهڻا ۽ گهاتا — سيني ڪتابن ۾ عالمن لکيا ۽ چيا

تنهن منجهان ڪيترا مون سنڌي ۾ لکيا — ته سنڌي سکهي سيکو سانَ پڙهي هرت منجهان

[دین کے مسائل بہت سارے اور گہرے ہیں جنہیں علماء نے تمام کتابوں میں لکھا ہے، ان میں سے میں نے کئی مسائل منتخب کر کے سندھی زبان میں لکھے ہیں تاکہ ہر شخص انہیں ذوق و شوق سے پڑھ کر سیکھ سکے۔]

یہ کتاب مطبع فتح الکریم بمبئی سے سنہ ۱۲۹۰ھ میں شائع ہوئی۔

۲۔ مطلوب المؤمنین سندھی:

مخدوم محمد ہاشم کے شاگرد مولانا عبدالخالق ٹھٹوی نے سنہ ۱۱۵۷ھ (۱۷۴۴ء) میں اسلامی احکامات سے متعلق خصوصاً طلباء کی ضرورت پوری کرنے کی غرض سے یہ کتاب تصنیف کی۔ مصنف نے اس کا مواد طبرانی کی تصنیف کردہ عربی کتاب 'الطریقة المحمّدیه' سے اخذ کیا اور اسے سندھی کا جامہ پہنایا تاکہ طلباء اسے آسان سندھی میں پڑھ کر سمجھ سکیں:

اڪثر هن سنڌي ۾ جيڪي درج ٿيو — سو طريقة المحمدی ڪنان ميڙي مون لکيو

ڪارڻ طلب طالبين هي رسالو لکيوم — 'مطلوب المؤمنين سنڌي' نالو تنهن رکيوم

سنڌي واني سهکي سيني پروڙين — عاصي عبدالخالق ڪي دعا مانَ ڪرين

[اس سندھی کتاب میں جو کچھ درج ہوا ہے وہ اکثر 'الطریقة المحمّدیه' سے انتخاب کیا گیا ہے۔ طلباء کی طلب کے پیشِ نظر میں نے یہ رسالہ لکھا اور اس کا نام 'مطلوب المؤمنین سندھی' رکھا ہے تاکہ تمام لوگ سندھی زبان بآسانی سمجھ سکیں اور کاش عاصی عبدالخالق کے لئے دعاء کریں۔]

جس طرح کتاب کے آغاز میں بتایا گیا ہے کہ: یہ کتاب خاص طور پر شاگردوں کی ضرورت پوری کرنے کے لئے (ڪارڻ طلب طالبين): یعنی علمی تربیت کے لئے بطور درسی کتاب لکھی گئی۔ اسی طرح اس کے آخر میں بھی یہی بتایا گیا ہے کہ اس سے مقصود علم سکھانا ہے:

ڪر قبول ڪريم تون هن گولي جي گفتار — مرهين مڙني مومنين جي علم ڪن پچار

[اے کریم تو اس بندہ کی التجا قبول فرما ان تمام مؤمنوں کی بخشش فرما جو علم کا ورد کریں۔]

یہ کتاب مطبع محمدی، بمبئی سے سن ۱۲۸۷ھ (۱۸۷۰ء) میں دوبارہ طبع ہوئی۔

۳- مخدوم محمد ابراہیم کی سندھی (۱):

مخدوم محمد ابراہیم، پرانا ہالہ کے بھٹی بزرگوں کے خاندان سے تھے۔ سنہ ۱۱۰۲ھ (۱۶۹۰ء) میں پیدا ہوئے، اس دور کے مشہور عالم مخدوم عبدالرؤف بھٹی آپ کے بھائی تھے۔ انہوں نے مخدوم ابوالحسن کی سندھی سے متاثر ہو کر خاص تعلیمی مقصد کے پیشِ نظر یہ سندھی کتاب تصنیف کی اور اس میں وضو اور نماز کے ساڑھے تین سو مختلف مسائل وضاحت سے بیان کیے۔ مخدوم محمد ابراہیم نے بعض مسائل بالکل ہی مخدوم ابوالحسن کے نظریہ کے مطابق بیان کیے، نیز کچھ الفاظ بلکہ بعض سطریں تک وہی مخدوم ابوالحسن کی درج کیں۔ انہوں نے یہ کتاب مخدوم محمد ہاشم کی کتاب ''اصلاح مقدمۃ الصّلوٰۃ'' سے قبل تصنیف کی تھی (۲)، کیونکہ اس میں مخدوم ابوالحسن کی تشریحات ہوبہو موجود ہیں۔ جن میں سے بعض تشریحات کی مخدوم محمد ہاشم نے بعد میں درستگی بھی کی۔ یہ کتاب ہالہ اور اس کے اطراف کی دوسری درسگاہوں میں پڑھائی جاتی تھی۔ پہلی مرتبہ اس کتاب کو غالباً جمنا داس بھگوان داس تاجر کتب نے، ۱۳۲۵ھ (۱۹۰۹ء) یا اس سے بھی قبل بمبئی کے علوی پریس سے طبع کروا کر شائع کیا۔

۴- عبدالرحیم کی سندھی:

بعض منتخب فقہی مسائل کے بارے میں یہ سندھی کتاب عبدالرحیم نامی عالم (۳) نے سنہ ۱۱۷۷ھ (۱۷۶۳ء) میں منظوم کی۔ اس کتاب کے آخر میں انہوں نے اپنی اس 'سندھی' کا نام **''ما ینبغی للحمائل مِن معدود المسائل''** بتایا ہے:

جيڪو ڪري ڪنه وير ۾ نظر 'سنڌيءَ' کا — تہ مَرُدعا خير جي پني ڏونه موليٰ

منجهه حق عبدالرحيم جي جامع هن 'سنڌيا' — ۽ منجهه حق اولاد تنهنجي تہ ٿين صالحن گها

جيڪو پڇي ڪنه وير ۾ نالي 'سنڌي' کا — "ما ينبغی للحمائل مِن معدود المسائل" آهي نالي سا

---

(۱) یہ کتاب اسی نام سے ملتی جلتی ایک اور کتاب ''سندھی مخدوم محمد ابراہیم کی'' سے قبل کی ہے، اور اس سے پہلے تصنیف ہوئی ہے۔

(۲) 'اصلاح مقدمۃ الصلواۃ' کب لکھی گئی؟ اس کے متعلق صحیح معلومات میسر نہیں۔ البتہ 'اصلاح مقدمۃ الصلواۃ' پر مخدوم محمد قائم متوفی ۱۱۵۷ھ نے سخت اعتراضات کیئے اور اس کے رد میں رسالہ لکھا۔ بعد میں مخدوم محمد ہاشم نے سنہ ۱۱۴۲ھ میں ان اٹھائے گئے اعتراضات کا 'الشفاء الدائم عن اعتراض القائم' کے نام سے جواب لکھا، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ 'اصلاح مقدمۃ الصلواۃ' سنہ ۱۱۴۰ھ کے لگ بھگ لکھی گئی ہوگی۔ (مترجم)

(۳) غالباً ٹھٹھہ کے عالم؛ 'مروح المتعلمین' کتاب کے مصنف بھی عبدالرحیم نامی عالم ہیں اور غالباً یہ وہی عالم ہیں جنھوں نے مندرجہ بالا 'سندھی' بھی منظوم کی۔

ء جيڪو پڇي تاريخ ڪان ته چئج تهين ڪا سنن اگري ستر هئي يارهن سوءَ ن متا

[اگر کوئی شخص کسی وقت اس ''سندھی'' کو دیکھے تو خدا سے دعاء مانگے، اس 'سندھی' کے جامع عبدالرحیم اور اس کی اولاد کے حق میں کہ، کاش! وہ صالح بنیں اگر کوئی اس ''سندھی'' کا نام معلوم کرے تو اس کا نام ''**ما ینبغی للحمائل من معدود المسائل**'' ہے اور اگر کوئی اس کی تاریخ کے متعلق پوچھے تو اسے بتاؤ کہ سن گیارہ سو ستہتر تھا۔]

۵-اساس الفرائض سندھی:

یہ کتاب مخدوم عبدالرحیم گرہوڑی نے فوت شدہ شخص کے ورثہ ترکہ کو اس کے ورثاء کے درمیان شرعی حکم کے مطابق تقسیم کی تربیّت او رتعلیم کے بارے میں سنہ ۱۱۹۲ھ (۱۷۷۸ء) سے قبل (۱) لکھی، اور عام طو رپر ''گرہوڑی صاحب کی سندھی'' کے نام سے مشہور ہوئی ۔ کتاب تصنیف کرنے کا مقصد تعلیمی تھا، جسے کتاب کے آخر میں مصنف نے یوں بیان کیا ہے:

پُنو بيان ترڪي جو ضروري قدرا
جي هي پڙهي پروڙئين، ته ٿئو پڻ پڌروناه
'اساس الفرائض' سنڌيَ جو نالو نهَرَ ڪجاه

[اس 'سندھی' کا نام 'اساس الفرائض' ہے، جو ورثہ کے حصص اور حساب کے متعلق ایک مختصر مگر بنیادی مقدمہ ہے، جسے پڑھنے اور سمجھنے سے باقی مزید ابواب خود بخود صاف او رنمایاں ہو کر سمجھ میں آجائیں گے۔]

گرہوڑی صاحب نے دیگر اہم موضوعات مثلاً ایمان ،توحید، رسالت وغیرہ کو بھی کی تفصیل بھی منظوم سندھی میں بیان کی اور ان کی وہ نظمیں بھی بعد میں 'اساس الفرائض' کے ساتھ ''گرہوڑی صاحب کی سندھی'' میں شامل ہو گئیں ۔ سن ۱۳۳۶ھ (۱۹۱۸ء) میں یہ رسالہ، مخدوم عبداللہ کے 'سگت نامو' (قرابت نامہ) (۲) اور دیگر چار کتابوں کے ساتھ مطبع کریمی بمبئی سے طبع ہوا۔

۶-؟ کی سندھی:

پرانے دور کی تحریر شدہ اس کتاب کا ایک ناقص مخطوطہ موجود ہے (۳) جس کا خاتمہ اس طرح ہوتا ہے:

جيڪو ڏسي هن سنڌيَ ۾ ڪا غلط ڪِ سهوا سا واري سنئين ڪَن موجب ڪتابا
موتي مَ ڪَن هنَ اَڪاج جي وري ڪا گلا ڪچن جون ڪچائيون ڪن سيُون صالحا

(۱) گرہوڑی صاحب سن ۱۱۹۲ھ (۱۷۷۸ء) میں شہید ہوئے ۔

(۲) یعنی رشتہ داری کی وجہ سے محرمات، حرمتِ رضاع اور طلاق وغیرہ کے مسائل کے بارے میں ۔ (مترجم)

(۳) راقم کے ذخیرۂ مخطوطات میں ۔

جي وڙ لائق جن جا، سي ٿين تن هٿا — مون کي ناه مجال قدرت ڪا پانهنجي پارا
آهيان عاجز نِڪٿين، (ا) منجهه گتو گناها — ساريان ڪونه سرير ۾ اَجُرُ ڪو عملا
ڻ نصيب ڪريين (ا) لقاء پنهنجو قادر ڪريما — ۽ پاڙو ڏئيم پيغمبر سين قيامت ڏينها
۽ ساڻ اهل بيت اصحاب ان جي ڏيين قرارا — هِتي هُتي سلامت رکين ساڻ ايمانا

احمد جهڙي اجاڻ تي ڪا مهر ڪر مولي

[جو بھی اس 'سندھی' میں کسی قسم کی غلطی یا سہو وغیرہ دیکھے تو اسے بموجب کتب درست کردے۔ اس ناکارہ کا گلہ شکوہ نہ کرے۔ ناقص لوگوں کے عیوب کو صالح انسان چُھپا لیتے ہیں، جو لوگ جس سلوک و احسان کے عادی ہوتے ہیں ویسا ہی سلوک واحسان ان کے ہاتھوں سرانجام پاتا ہے، مجھ میں کوئی طاقت وخوبی اپنی طرف سے نہیں ہے، سراسر گناہوں میں غرق عاجز سا بندہ ہوں، مجھے اپنا کوئی بھی اجر او رنیک عمل یاد نہیں۔ اے قادر کریم! اپنا لقاء (دیدار) نصیب فرما او رقیامت کے روز پیغمبر علیہ السلام کا پڑوس او راہل بیت اور اصحاب کے ساتھ سکونت نصیب فرما، اِس دنیا او رُاس جہان میں ایمان کی سلامتی عطا فرما، اے مولا ''احمد'' جیسے نادان شخص پر کرم فرما۔]

۷- عالم جمعہ گراٹي (گرانڑیں) کی سندھی:

عالم جمعہ گرانڑیں کی 'سندھی' کا قلمی نسخہ غالباً ۱۱۹۶ھ (۱۷۸۲ء) سے کافی پہلے کا ہے اور 'برٹش میوزیم' میں موجود ہے، جس کا موضوع نبی پاک ؐ کا معراج نامہ ہے۔

۸- عبدالحمید کی سندھی:

اس کتاب کا قلمی نسخہ 'مخدوم ابو الحسن کی سندھی' کے مخطوطہ کے آخر میں اسی جلد میں، سندھی ادبی بورڈ کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

۹- دائرہ والوں کی سندھی: (۲)

یہ کتاب سید علی محمد شاہ نے ۱۲۷۰ھ۔۱۲۷۷ھ (۱۸۵۳ء-۱۸۶۰ء) کے سات سالہ عرصہ میں سندھی میں تصنیف کی۔ کتاب کا علمی نام ''مصلح المفتاح'' ('المفتاح' کتاب کو سنوارنے والا)

(ا) یہ لفظ یائے مجہول کے ساتھ ہے۔ (مترجم)

(۲) کتاب کے مصنف سید علی محمد شاہ تھے، جو 'درسگاہ دائرہ' (موجودہ اڈیرو لال) کے عالم اور استاد تھے۔ 'دائرہ' کی نسبت اور ان کے اپنے نام کے احترام کی وجہ سے 'جمع' کے طور پر اس کتاب کو 'دائرہ والوں کی سندھی' کے عام نام کے ساتھ موسوم کیا گیا۔

تفصیل کے لئے دیکھیے 'مصلح المفتاح یعنی دائرہ والوں کی سندھی' راقم کی تصحیح اور مقدمہ کے ساتھ۔
مطبوعہ سندھ یونیورسٹی، حیدرآباد، ۱۳۹۰ھ/۱۹۷۰ء

ہے، مگر وہ ''دائرہ والوں کی سندھی'' کے نام سے مشہور ہو گئی۔ نماز کے متعلق یہ ایک تفصیلی او رجامع کتاب ہے۔ اگر چہ سید علی محمد شاہ نے اپنی کتاب کی بنیاد اصولی طور پر مخدوم فتح محمد سندھی کی فارسی کتاب ''مفتاح الصّلوٰۃ'' (سال تصنیف ۱۰۶۱ھ) پر رکھی، لیکن ان کی وسیع معلومات، فقہی بصیرت او رمنصفانہ علمی تنقید نے اس کتاب کو تحقیقی نقطہ نظر کے، اعتبار سے ایک مستقل علمی کارنامہ بنادیا اور یہ کتاب چوٹیاریوں کی اعلیٰ درسگاہ کے علاوہ دیگر درسگاہوں میں بطور 'درسی کتاب' پڑھائی جاتی رہی۔

مذکورہ بالا کتابوں کو مختلف اوقات میں 'درسی کتب' کی حیثیت حاصل رہی **اور ان کے** علاوہ کچھ اور کتابیں بھی عربی و **فارسی کے بجائے سندھی** میں **لکھی یا ترجمہ کی گئیں**۔ اس وجہ سے انھیں بھی 'سندھی' ہی کہا گیا۔ جیسا کہ 'بناء الاسلام سندھی'، 'فرائض الاسلام سندھی'، 'روضۃ الشہداء سندھی' وغیرہ۔ ''روضۃ الشہداء سندھی'' کو مترجم احمد نے ۱۱۷۲ھ میں شہادت ائمہ کے موضوع پر فارسی کتاب 'روضۃ الشہداء' سے سندھی میں ترجمہ کیا اور اسے 'سندھی' کہہ کر پکارا(۱)۔

جيڪو پَسي هن سنڌي ۾ غلط ڪِ سَهوَ ڪا
تہ سا واري سنئين ڪري موجب ڪتابنا

[جو شخص بھی اس 'سندھی' میں کوئی غلطی یا سہو وغیرہ دیکھے تو وہ اسے بموجب کتاب درست کردے۔]

۱۰- سید ہارون کی سندھی:

سید ہارون نے قرآن و حدیث سے اسلامی عقائد و اخلاقیات کے متعلق ''سی حرفی ترتیب'' میں نظم لکھی، جسے بعد میں ''سید ہارون کی سندھی'' نام دیا گیا (یہ قلمی نظم برٹش میوزیم میں موجود ہے)۔ نظم کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

الف اڳئين پنڌ جو ساٿي ڪر سماء
جيُ منجهارا جوڙ تون پرين ساڻ پساه

[الف، اگلے سفر کی، اے دوست سُدھ بُدھ رکھ

(۱) یہ کتاب دس ابواب اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے، جن میں حضرات امام حسن و حسین ؓ کی اولاد اور دیگر سادات کا تذکرہ ہے۔ یہ کتاب لاہور میں ۱۸۸۲ء، بمبئی میں ۱۳۳۱ھ اور طہران میں ۱۳۳۳ھ میں چھپ چکی ہے۔ مولانا محمد علی صاحب کے بقول اس کتاب میں اہلِ سنت کے اکابر اور ان کے مسلک پر گھناؤنے انداز میں اعتراض کیے گئے ہیں، یہ کتاب اہلِ تشیع کی تصانیف میں سے ہے۔

دیکھیے: میزان الکتب، ص:۲۱۴-۲۵۴، ناشر مکتبۂ نوریہ حُسینیہ، بلال گنج لاہور، طبع اول ۱۹۹۳ء

دوست کے ساتھ دل کی گہرائی سے تعلق قائم کر

آخر میں اپنی اس 'سندھی' تصنیف کے متعلق کہتا ہے:

مولا مرهين مومنن کي سين حرمت حضرتا،
خاصو ٿي سيد هارون کي جنهن سنڌي ڪي صفتا،
ڪيڍي معنيٰ قرآن ۽ حديث جي آڇيائين آڪرا،
آهين اُوءِ ايمان سين جي ڪلمو چون مُها

[اے مولا ! بطفیلِ حرمتِ رسول تمام مؤمنوں کو عطا فرما
خاص طور پر سید ہارون کو، جس نے یہ 'سندھی' منظوم کی
اور قرآن و حدیث کے معانی نکال کر پیش کیے،
وہی لوگ با ایمان ہیں جو اپنی زبان سے کلمہ پڑھتے ہیں۔]

(د) آسان سندھی میں کتابیں لکھنے کے نظریہ کا عام ہونا:

ابوالحسن کی "مقدمۃ الصّلوٰۃ سندھی" اور اس کے بعد اس نئی تحریک کے زیرِ اثر لکھی جانے والی درسی یا دیگر عام کتابوں کے مصنفین کا اہم مقصد یہی تھا کہ مادری زبان سندھی کے ذریعے تعلیم کو عام اور آسان بنایا جائے۔ درج ذیل کتابوں میں مصنفین کا اس قسم کا اظہار اسی علمی و تعلیمی جذبہ اور مقصد کی تصدیق کرتا ہے۔

۱- مخدوم محمد ہاشم نے سنہ ۱۱۲۵ھ (۱۷۱۳ء) میں اپنی کتاب 'زاد الفقیر' میں روزہ کے مسائل کو عربی کتب سے منتخب کر کے سندھی زبان کی آسان عبارت میں سمجھایا:

مسئلا روزن جا آهن گهڻا اپار
جي ڪجي هيڪاندو تن کي ته ٿين هوند هزار
تنين منجهان ڪي ڪيترا مسئلا ڪيام
ساري سنڌي وائي ۾ لکي لڳ ڪيام

[مسائل روزہ بہت سارے ہیں،
اگر انہیں جمع کیا جائے تو وہ ہزاروں بن جائیں گے
ان میں سے میں نے بہت سارے مسائل منتخب کیے اور
ان کی جانچ پڑتال کر کے سندھی زبان میں جمع کیا ہے۔]

عربي اَجاڻن کي گھڻي ڏُھلي ھوءِ
سنڌي ڪيم سھڪي، جاڻ سکي سيڪو

[انجان لوگوں کے لیے عربی بہت مشکل تھی
میں نے انہیں آسان سندھی میں لکھا تا کہ ہر ایک سیکھ سکے۔]

۲- اس کے بعد سن ۱۱۳۰ھ (۱۷۱۸ء) میں مخدوم محمد ہاشم نے اپنی کتاب ''راحۃ المؤمنین سندھی'' میں ذبح اور شکار کے مسائل کو عربی کتابوں سے منتخب کر کے، آسان سندھی زبان میں درج کیا، کیونکہ:

عربي آھي اَھڪي اہوجھن اپار
نڪا پروڙ پارسيَ جي ناموزون نبار
پوءِ نه اجاڻن کي ڪا سنڌي ڌارا سار
تَڏ سنڌي ڪِيَم سَھُڪي سُھَلي ڪيدي عربيا.

[سادہ لوح لوگوں کے لئے عربی بہت مشکل ہے،
انہیں فارسی کا علم ہے نہ ہی خالص زبان ان کے لیے موزون ہے
انجانوں کو سندھی کے بغیر اطمینان نہیں رہتا،
اسی لیے میں نے عربی سے نکال کر آسان سندھی بنائی۔]

۳- مخدوم محمد ہاشم نے 'تفسیرِ ہاشمی' یعنی عَمَّ پارہ کی تفسیر آسان سندھی میں لکھی (۱) تا کہ اسے سمجھنے میں آسانی ہو:

تڏھن سنڌي ڪِيَم سُھلي ڪيدي عربيا
ته مانَ پروڙين معنيٰ تنھن جي مومن مرھاتا

[تب میں نے عربی سے آسان سندھی بنائی،
کاش! معاف کیے گئے مومن اس کے معنی سمجھ سکیں۔]

مخدوم محمد ہاشم اپنی کتاب ''بناء الاسلام سندھی'' میں بھی یہی مقصد بیان کرتے ہیں:

''سنڌي ڪِيَم سُھلي ڪيدي ڪارڻ تن''

[ان کے لئے میں نے سندھی میں اسے آسان بنایا ہے۔]

(۱) مخدوم صاحب نے یہ تفسیر ۱۷ شعبان سنہ ۱۱۶۲ھ میں لکھی، جو ۱۳۳۰ھ میں مطبع کریمی، بمبئی سے پہلی مرتبہ شائع ہوئی۔ سندھی ادبی بورڈ کی طرف سے شائع شدہ تفسیر ہاشمی اُسی بمبئی والے نسخہ کا عکس ہے۔ جسے مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی نے مرتب کر کے شائع کرایا تھا۔ (مترجم)

۴- علی اکبر نامی ایک عالم نے سن ۱۱۶۲ھ/۱۷۴۹ء میں بڑی محنت سے مسائل زکوٰۃ پر سندھی کتاب ''حصص الاموال'' تصنیف کی

مگر قدر موجب پانهنجي ڪوشش ڪيم ڪا
ڪو قدر حديثن حبيب صلعم جو ڪيڍي ڪتابنئا
جوڙي اتم جمع ڪيو ڪارڻ نصيحتا
سنڌي ڪيم تنهن جي خالص لڳ خدا.

[اپنی بساط کے مطابق میں نے کوشش کر کے
نبی پاکؐ کی کچھ احادیث کتابوں سے نکال کر،
نصیحت کی غرض سے جمع کی ہیں
اور انہیں خالصتاً للہ فی اللہ سندھی بنایا (تصنیف کیا) ہے۔](۱)

۵- مولوی محمد حسین نے ۱۱۷۷ھ(۱۷۶۴ء) میں فارسی کتاب ''قصص الانبیاء'' کا 'سیر بستان' کے نام سے سندھی ترجمہ کیا: .

ته لکي ڪريان پڌرا قصا نبين جا
سنڌي وائي سهڪا سي ڪريان بيانا.

[تا کہ انبیاء کے قصے لکھ کر آشکار کروں
سندھی زبان میں سہل بنا کر بیان کروں۔]

۶- حامد بن حسن نے سن ۱۲۴۳ھ میں عشق اور اولیاء کی حکایات سے متعلق ''قوۃ العاشقین با عشقیہ'' کتاب سندھی میں تالیف کی۔ اصل کتاب شیخ عثمان انصاری(۲) کی لکھی ہوئی

---

(۱) پیر حسام الدین راشدی نے اس کتاب کا نام ''الاموال وبجل الاموال'' لکھا ہے۔ دیکھیئے: سندھی ادب، ص:۵۳ (مترجم)

(۲) مولوی شمس الدین صاحب تاجر کتب نادرہ مسلم مسجد لاہور نے مخطوطات کا ایک ذخیرہ نیشنل میوزم آف پاکستان کراچی کو فروخت کیا تھا، جس کی تفصیلی فہرست مولانا عبدالحلیم چشتی نے تیار کی تھی۔ اس فہرست میں شیخ عثمان انصاری کی فارسی کتاب 'عشقیہ' کا بھی اندراج ہے۔

یہ وہی کتاب ہے جس کا حامد بن حسن نے خلیفہ محمود کے ایماء اور ارشاد پر ''قوت العاشقین با عشقیہ'' کے نام سے سندھی منظوم ترجمہ کیا۔ چشتی صاحب ''عشقیہ'' اور اس کے مصنف کے متعلق لکھتے ہیں:

''اسرار و رموز معرفت اور عشق الٰہی کے مباحث پر ایک اہم کتاب ہے جس میں مصنف کا نام عثمان انصاری درج ہے اور جگہ جگہ اس نے اپنا تخلص 'عثمان' استعمال کیا ہے۔ یہ کتاب ۴ فصول اور ۴ ابواب پر مشتمل ہے۔ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے کتب خانہ میں اس کا ایک نسخہ ہے ''ایوناف'' نے فہرست میں اس کا تذکرہ کیا ہے، دیکھیئے فہرست کتب خانہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال مرتبہ ایوناف مطبوعہ سنہ ۱۹۲۴ء، ص ۱۲۶۴، ۶۰۵ انڈیا آفس لائبریری میں بھی اس کا ایک نسخہ موجود ہے، فہرست نگار نے اس کا ذکر کیا ہے (نمبر ۹۱۵) اس نے لکھا ہے کہ اس کے مصنف نقشبندی شیخ خواجہ عثمان متوفی سنہ ۱۰۰۵ھ ہوسکتے ہیں۔ اس کے بعد چشتی صاحب نے کتاب کی داخلی شہادت کے حوالے سے اسے خواجہ عثمان نقشبندی کی تصنیف ہونے کو نقل کیا ہے۔

دیکھیئے: سہ ماہی الزبیر بہاولپور، کتب خانہ نمبر ۱۹۶۷ء، ص ۴۱۳-۴۱۴ (مترجم)

تھی۔ مؤلف حامد بن حسن کے مرشد (خلیفہ محمود؟) نے اسے فرمایا کہ: اصل کتاب فارسی میں ہے

پر آهيس عبارت اَهُکي ۽ مُغْلَق مضمونا

جي ٿئي سنڌي تَنهن جي ته عام ٿئي نفعا

[اس کی عبارت ثقیل اور مضمون بھی بمشکل سمجھ میں آنے والا ہے

اگر اسے سندھی میں کر دیا جائے تو اس کا فائدہ عام ہو جائے گا۔]

اس ترغیب پر انہوں نے اس فارسی کتاب کا آسان سندھی میں ترجمہ کیا۔

۷- ربح الفقراء (= درویشوں کا فائدہ) کے نام سے مخدوم احمد نے عربی کتاب ''مقصود القاصدین'' کا سندھی میں ترجمہ کیا، تاکہ سندھی زبان میں ہونے کی وجہ سے اہلِ سندھ اس سے فائدہ اٹھا سکیں:

پئو هن عاصيءَ کي دل ۾ خيالا

ته ڪريان نسخو ڪو سنڌيءَ ۾ ڪارڻ مومنا

مانَ پَسن، پڙهن، ڪن 'عمل سي خالص لاءِ خدا.

[اس عاصی کے دل میں خیال آیا کہ مؤمنوں کے لیے کسی کتاب کو سندھی میں منتقل (یعنی اس کا ترجمہ) کرنا چاہیے تاکہ وہ اسے دیکھیں، پڑھیں اور خالص اللہ کے لئے عمل کریں۔]

یہ قلمی کتاب 'ادارۂ سندھیات' کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔

۸- محمد مقیم نے کسی فارسی کتاب کا 'تفسیر خواب' کے نام سے سندھی میں ترجمہ کیا تاکہ سمجھنے میں آسانی ہو:

هِنيَڙي ۾ محمد مقيم ۾ اجي اِيَ پيئي

ته تعبير جو خواب جو سو آهي پارسي

سو سنڌيَ وائيَ لکجي ته سين ٿيي سهکائي.

[محمد مقیم کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا

کہ خوابوں کی تعبیر کی کتاب فارسی میں ہے،

اسے سندھی زبان میں لکھنا چاہیے تاکہ سب کے لئے آسانی ہو۔]

سندھی علماء اور فضلاء کے اس صحیح علمی جذبہ اور تعلیمی خدمت کی بدولت اس دور میں نہ صرف سندھی زبان اور علم و ادب کی بنیادیں مستحکم ہوئیں بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنی مادری زبان میں لکھنے پڑھنے اور کتابیں تصنیف کرنے کی تحریک آگے بڑھی اور مزید کامیاب ہوئی۔

۲- ''سندھی درسی نصاب'' کی بنیاد مضبوط ہونا:

سندھی زبان میں مکتبی تعلیم کا آغاز دسویں صدی ہجری (۱۶ ویں صدی عیسوی) کے آخر میں ہوا اور گیارہویں صدی میں اس میں بڑی ترقی ہوئی اور اس کے ساتھ 'سندھی تعلیمی نصاب' کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس ابتدائی مرحلہ پر 'نصابی نظام' کی کیا صورت تھی؛ چونکہ 'دینی تعلیم و تربیت' کو مرکزی حیثیت حاصل تھی اس لئے اس سلسلہ کے مختلف موضوعات پر درسی کتابیں لکھی اور پڑھائی گئیں ۔ باب ہفتم کے تحت بیان ہو چکا ہے کہ اس دور میں انتالیس مختلف موضوعات پر جو منظومات دستیاب ہوئی ہیں ان میں سے پینتیس خاص تعلیمی سلسلہ کی اور باقی عام مطالعے میں اضافہ کرنے والے موضوعات پر ہیں ۔ اس سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ مادری زبان سندھی کے ذریعے تعلیمی نصاب کے اہم مقاصد تین تھے:

۱- اسلامی شریعت سے متعلق دینی تعلیم فراہم کرنا۔

۲- اخلاقی تعلیم دینا، اور

۳- عام مطالعہ میں اضافہ کرنا۔

گیارہویں صدی میں اس نصاب کی بنیادیں مزید مستحکم ہوئیں ۔

گیارہویں صدی میں پہلے نصابی مرحلہ پر ،اسلامی شریعت اور دینی تعلیم کے بارے میں ''چار علم'' اور ''ساڈھیوں چھ وِیہُوں فرضن جُوں'' (۱) کے زیر عنوان دو درسی منظومات مُلاّ عثمان نے تصنیف کیں ،مُلاّ عثمان اس دور کے بڑے عالم و استاد اور غالباً سندھی کے ذریعے تعلیم دینے کی تحریک کے قائد بھی تھے ۔ یہ دونوں کتابیں اس قدر مقبول ہوئیں کہ گیارہویں صدی کے آخر میں انہیں دوسرے نصابی دور میں شامل کرلیا گیا۔ اس دوسرے دَور کے سندھی نصاب میں ''ابو الحسن جی سندھی'' (مقدمۃ الصّلوٰۃ) کو مرکزی درسی کتاب کی حیثیت حاصل رہی ،مگر اس کے ساتھ مُلاّ عثمان کی کتابیں ''چار علم'' یا ''چہار علمی'' اور ''ساڈھیوں چھ وِیہُوں فرضن جُوں'' کو بھی اسی دوسرے دور میں شامل کیا گیا ۔ اس لئے آئندہ دور کے اکثر قلمی (خطی) خواہ مطبوعہ مجموعات میں ''ابو الحسن جی سندھی'' کتاب کے آخر میں ''چہار علمی'' اور ''ساڈھیوں چھ وِیہُوں فرضن

(۱) یعنی ($6\ 1/2 \times 20 = 130$) ساڑھے چھ ضرب بیس برابر ایک سو تیس فرائض ۔ (مترجم)

جُون'' کی منظومات بھی شامل ہیں (۱)۔ اپنی ان دونوں منظومات میں مصنف مُلّا عثمان نے انتہائی اہم معلومات کو نہایت مختصر اور عام فہم سندھی میں آسان بنا کر پیش کیا ہے ۔

سندھی میں بنیادی دینی تربیت کے لیے ''ابو الحسن جی سندھی'' (مقدمۃ الصّلوٰۃ) اور مُلّا عثمان کی ''چہار علمی'' دونوں معیاری کتابیں ہیں: 'ابو الحسن جی سندھی' فقہی اعتبار سے تمام اہم موضوعات کے بارے میں ایک عالمانہ اور جامع درسی کتاب ہے۔ دوسری طرف سندھی زبان کے ذریعے مختصر الفاظ میں کتنا زیادہ سے زیادہ سمجھایا جا سکتا ہے؟ اس کی معجزانہ مثال مُلّا عثمان کی یہ ''چہار علمی'' ہے(۲)۔

اسلامی ارکان او رشرعی احکامات کی تعلیم کے علاوہ علمی واقفیت بڑھانے ،اخلاقی تربیت کرنے ،اور معلومات میں اضافے کی خاطر سوانح ،حکایات اور قصص وغیرہ موضوعات کی کتابیں نصاب میں شامل کی گئیں ۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے اس دور میں بہت ساری کتابیں اور رسائل لکھے گئے جن کا ذکر آگے آئے گا ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سندھی زبان میں تعلیمی تحریک کے آغاز کے بعد ڈیڑھ سو سال کے عرصہ میں، بارہویں صدی ہجری (۱۸ ویں صدی عیسوی) کی ابتداء سے تعلیمی نظام میں ''سندھی تعلیمی نصاب'' کو خاص اہمیت حاصل ہوئی جس کی وجہ سے مادری زبان سندھی میں مطالعہ کا ذوق بڑھا۔

تالپور عہد کے تیسرے نصابی دور میں ''سندھی مکتب'' دینی اور دنیوی تعلیم کا مرکز قرار پایا او رمسلمان شاگردوں کے ساتھ ہندو شاگرد بھی مکتب میں داخل ہوتے اور ان کے لیے فارسی زبان اور خط وکتابت (انشاء) کے ساتھ ساتھ حکایات او رقصص کے ذریعے اخلاقی تعلیم 'سندھی نصاب' کا لازمی جز بنی۔ ۱۸۳۰ء کے لگ بھگ جس وقت رچرڈ برٹن انگریزوں کی طرف سے تالپور دربار میں سفیر تھے ،اس وقت ابوالحسن کی سندھی کے علاوہ درج ذیل دوسری کتابیں بھی

---

(۱) سن ۱۳۰۲ھ (۱۸۸۴ء) کے بعد سے یہ کتابیں ایک ہی جلد میں طبع کی جاتی رہیں تا کہ لازمی نصاب کے طور پر پڑھنے پڑھانے میں آسانی ہو۔

(۲) راقم کے کتب خانہ میں اس کا ایک قدیم مخطوطہ موجود ہے ،جسے مُلّا عثمان کے بیٹے ابو الحسن نے ۲۶/شعبان ۱۱۱۵ھ کو لکھ کر مکمل کیا۔ ایک نسخہ برٹش میوزیم میں No. OR 1238 موجود ہے جسے غلطی سے ''چہار علمی ابو الحسن'' کا عنوان دیا گیا ہے ۔ جیسا کہ ''چہار علمی'' کو درسی طور پر پڑھایا جاتا رہا اس لئے اسے بھی مقدمۃ الصّلوٰۃ (ابو الحسن جی سندھی) کے آخر میں شامل کر کے لکھا گیا۔ بعد میں جب کتابیں طبع ہونے لگیں تو ۱۸۶۹ء میں بمبئی سے اور ۱۸۷۰ء میں کراچی سے ،ابو الحسن جی سندھی کے آخر میں مُلّا عثمان کی 'چہار علمی' بھی ساتھ طبع ہوئی۔

سندھی نصاب میں شامل تھیں: مخدوم محمد ہاشم کی تفسیر ہاشمی عـمّ پـاره، عبدالرحمٰن کا نور نامہ،(۱) معراج نامہ، مخدوم عبداللہ کا تحریر کردہ رحلت نامہ (لاڑائو) ، اسماعیل کے تصنیف کردہ سو مسائل اور معلوماتِ عامہ نیز ادبی ذوق بڑھانے کی خاطر حکایات الصّالحین، سیفل (سیفل الملوک کا قصہ) اور لیلیٰ مجنوں پڑھائے جاتے، جن میں سے 'حکایات الصّالحین' زیادہ مقبول تھی (۲)۔

یہ سندھی نصاب سندھ کے ایک حصہ (حیدرآباد اور لاڑ) کی درسگاہوں میں رائج تھا جس سے برٹن کو آگاہ کیا گیا، کیونکہ اس زمانے میں جدا جدا درسگاہوں میں نصاب بھی جدا جدا رائج تھا ۔ برٹن نے ابوالحسن کی کتاب 'مقدمۃ الصّلوٰۃ' (ابوالحسن جی سندھی) کا نام درج نہیں کیا جو کہ غالباً اس سے بھول ہوگئی ہے، کتاب ''رحلت نامہ'' (حضور پاک کا سفرِ آخرت) کے بارے میں برٹن نے لکھا ہے کہ یہ مخدوم عبداللہ کی تصنیف ہے، اس کا اصل مواد کتاب ''حبیب السیر'' سے ماخوذ ہے(۳)۔

۳- مختلف موضوعات پر کثیر تعداد میں سندھی کتب کا تالیف ہونا:

سندھ کے بیدار مغز علماء نے جب سندھی میں کتابیں لکھنے کا اصول قبول کیا تو اس پر انہو ں نے پختہ طور پر عمل بھی کر دکھایا۔ ان کی اپنی تمام تعلیم کی تکمیل فارسی و عربی کے ذریعے ہوئی تھی، لیکن جب انہوں نے سندھی میں کتابیں لکھنا شروع کیں تو ایک تو انہوں نے خالص سندھی

---

(۱) مسٹر بھیرومل لکھتے ہیں: 'نورنامہ' کا شعر دوہری ترتیب پر ہے تاہم اس میں بات (بیان) مسلسل چلتی ہوئی آتی ہے۔ اس قسم کے شعر کو عام طور پر ''کبت'' (طویل قصہ، رام کتھا، کہانی) کہتے ہیں۔ اس نورنامہ کی ہر سطر کے آخر میں الف لگا کر قافیہ بنایا گیا ہے۔ مثلاً

''ساراهيان سچو ڌڻي، جو آگو عليما
جڳاء جه (جنهن) صاحب کي سيڪا ساراها
عالم عليم مون ڌڻي، مولو ملک خدا''

دیکھیے: 'سنڌي ٻوليءَ جي تاريخ' مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ، طبع ششم ۲۰۰۴ء، ص:۲۲۹-۲۳۰ (مترجم)

(۲) رچرڈ برٹن کی انگریزی کتاب ''سندھ میں آباد قومیں'' اشاعت اول ص ۱۳۶-۱۳۵۔

(۳) اس کتاب کا پورا نام ''حبیب السیر فی اخبار افراد البشر'' ہے، جو فارسی زبان میں تاریخ کی کتاب ہے۔ 'میزان الکتب' کے مصنف نے آقا بزرگ شیعی مصنف ''الذریعۃ الیٰ تصانیف الشیعۃ'' جلد ۶، ص:۲۴۴-۲۴۷، مطبوعہ بیروت کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس کا مصنف غیاث الدین محمد ابن ہمام الدین پکا شیعی مصنف ہے، جس نے اپنی دوسری تصنیف میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بیعت خلافت کو امام برحق سے روگردانی اور لوگوں کی بے اعتنائی سے تعبیر کیا ہے، اس نے لکھا ہے کہ: ''حضور پاک کے بعد خلافت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے تھی، ان کے سوا کوئی دوسرا لائقِ امامت نہ تھا، لیکن لوگوں نے بے اعتنائی برتی، کیونکہ مشرکین کے ساتھ جہاد میں ان کے بہت سے رشتہ دار کام آگئے تھے۔ امام برحق سے منہ موڑ کر لوگوں نے ابوبکر کی بیعت کر لی۔''

دیکھیے: ''میزان الکتب''، ص:۷۸-۸۳ (مترجم)

زبان استعمال کی ؛ دوسرا یہ کہ ہر موضوع کو آسان سندھی میں بیان کیا تاکہ عام پڑھے لکھے بلکہ سادہ لوح عوام کو بھی ان کتابوں کے سمجھنے میں آسانی ہو۔ یہ ان کی اعلیٰ علمی صلاحیت کا کارنامہ تھا کہ انہوں نے الٰہیات وعقائد کے باریک مفاہیم، فقہ وتفسیر کے دشوار موضوعات اور تصوف وسلوک کے مشکل مضامین کو سلیس اور عام فہم سندھی میں کامیابی سے سمجھایا۔

سندھی علماء کی اس کامیابی کا دارومدار ان کے اختیار کردہ تین اہم طریقوں پر تھا: اول یہ کہ انہیں ہر موضوع اور مضمون کی ماہیت مکمل طور پر معلوم تھی اور ہر موضوع اور مضمون کے مختلف مسائل کی انہیں اچھی طرح پہچان تھی۔ دوم یہ کہ انہیں عربی و فارسی زبانوں کے ساتھ سندھی زبان پر بھی پوری طرح مہارت حاصل تھی۔ سوم یہ کہ انہوں نے ہر موضوع کو درست طور پر اور آسان عبارت میں سمجھانے کی کوشش کی۔ انہوں نے جب بھی کسی موضوع یا مسئلہ پر لکھا تو پہلے سے کی گئی تحقیق کی روشنی میں اُسے جامع انداز سے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی۔ نیز انہوں نے معاشرے کے کچھ خاص مسائل کو سندھ کے طبعی اور سماجی ماحول کی مناسبت سے سمجھایا اور سندھی میں ایسے مسائل و موضوعات کو صحیح طرح سے بیان کرنے کی خاطر انہوں نے عربی فارسی او رسندھی الفاظ اور اصطلاحات کی چھان بین بھی کی۔

سندھی میں درسی کتابوں کے آغاز سے علمی ذوق میں بڑا اضافہ ہوا، اور اس دور میں مختلف علمی موضوعات پر کئی کتابیں تصنیف اور ترجمہ ہوئیں۔ کُل کتنی کتابیں لکھی گئیں؟ اس کا اب تک صحیح شمار نہیں ہوسکا ہے۔ البتہ یہ کہنا درست نہیں کہ: ''تقریباً پچاس کتابیں'' لکھی گئیں(۱)۔ اس کے بجائے یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ کئی موضوعات پر سندھی منظومات اور رسائل، خواہ چھوٹی بڑی سندھی کتابیں کئی سو کی تعداد میں لکھی گئیں، جن میں سے انگریزوں کے دور میں سرکاری طور پر بے قدری اور اپنوں کی بے رُخی کی وجہ سے اکثر کتابیں ضائع ہوگئیں۔ اس کے باوجود بھی ہم نے خود جو کتابیں دیکھی ہیں، یا جن کے نام ہمیں معلوم ہو سکے ہیں، وہ بھی پچاس کے بجائے ایک سو سے بھی زیادہ ہیں، جیسا کہ درج ذیل موضوعات پر لکھی گئی چھوٹی بڑی تصنیفات سے ظاہر ہے(۲)۔

---

(۱) یہ تعداد سب سے پہلے بھیرومل نے لکھی، بعد میں اسے محمد صدیق میمن نے بھی نقل کیا۔ بھیرومل کے بقول
''کُل تقریباً پچاس کتابیں ابوالحسن کی سندھی کے نمونہ پر پرانے رسم الخط میں لکھی ہوئی موجود ہیں''
(سندھی ٻولي جی تاریخ طبع کراچی ۱۹۴۱ء ص ۲۴۸)۔ (مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ، طبع ششم ۲۰۰۴ء، ص:۴۲۹ مترجم)
اس کے بعد محمد صدیق میمن نے بھی بغیر کسی مزید تفتیش و تحقیق کے وہی بھیرومل کی ذکر کردہ تعداد درج کردی اور لکھا کہ ''اس قسم کی کتابیں اندازاً پچاس ہونگی'' (ص ۵۷)

(۲) ''سندھی'' کے عنوان سے اوپر بیان ہونے والی کتابیں ان کے علاوہ ہیں۔ اس باب کے تحت کل تقریباً ۱۳۸ نام آئے ہیں۔

تفسیر:

۱-تفسیرِ ہاشمی(۱): قرآن پاک کے تیسویں پارہ (عَمَّ یَتَسَآءَلُون) کی ۱۱۶۲ھ (۱۷۴۹ء) میں تصنیف کردہ مخدوم محمد ہاشم کی ، سندھی تفسیر، جو سنہ ۱۲۹۰ھ(۱۸۷۳ء) میں یا اس سے بھی پہلے بمبئی میں طبع ہوئی(۱)۔

۲-تفسیرِ ہاشمی: یہ ایک بڑی کتاب ہے ،جس کے مطبوعہ صفحات ۵۰۳ ہیں۔ انتیسویں پارہ کی تفسیر ہے اور ندوۃ العلماء لکھنؤ کے کتب خانہ میں قلمی صورت میں محفوظ ہے۔

۳-تفسیرِ تبارک سندھی: یعنی سورۃ 'تبارک' (سورۃ المُلک) کی تفسیر ،مخدوم محمد ہاشم کی تصنیف کردہ، سن ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء یا اس سے قبل بمبئی سے طبع ہوئی ۔

۴-منظوم ترجمہ سُورۃ المُلک: مخدوم محمد ہاشم کے شاگرد ،عالم خلیفہ مخدوم عبد الخالق کے فرزند خلیفہ مخدوم محمد نے ماہ محرم سنہ ۱۱۹۳ھ میں مکمل کیا ،برٹش میوزیم لائبریری میں اس کا قلمی نسخہ موجود ہے، جس کا آغاز یوں ہے:

ساراهجي ته صاحب کي جنهن قادر مُکو قرآن
متي مير محمد کارڻي جو شافع سڀ جهان.

[اس صاحبِ قدرت کی تعریف کرنی چاہیے جس نے قرآن شریف کو تمام جہاں کے شافع محمد ﷺ پر نازل فرمایا۔]

۵-تفسیر سورۃ یوسف: تصنیف مخدوم عبداللہ نرِئے والا (۲)، ۱۱۹۷ھ (۱۷۸۳ء) سے قبل

---

(۱) بعض قلمی نسخوں میں اس کا عنوان ''تفسیرِ ہاشمی عم جو'' یا ''تفسیرِ ہاشمی سندھی جزءعم'' بھی لکھا ہوا ہے۔ اس تفسیر کے ،خود مصنف کے دور کے قلمی نسخے موجود ہیں۔ ایک نسخہ بتاریخ ۲۱رذی القعدہ ۱۱۶۵ھ کا لکھا ہوا سندھ صوبائی میوزیم میں محفوظ ہے ۔ دوسرا ایک نہایت خوشخط نسخہ جو بتاریخ ۱۴رجمادی الثانی بروز منگل سنہ ۱۱۶۹ھ کو حافظ محمد حسن نیرون کوٹی کے ہاتھوں مکمل ہوا، راقم کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

(۲) یہ کتاب اور ذیل میں درج وہ کتابیں جن کا سال طباعت ۱۲۹۰ھ یا اس سے بھی پہلے کا بتایا گیا ہے،ان کے نام کتابوں کی اس فہرست میں درج ہیں ،جو بمبئی سے مطبوعہ کتاب ''قمر المنیر'' کے آخر میں ہے۔قمر المنیر کی کتابت طباعت کی تاریخ ''۱۴ربیع الاوّل ۱۲۹۰ھ اور ۳۱/مئی ۱۸۵۴ء'' تحریر ہے۔ ان دونوں تاریخوں میں مطابقت نہیں ہے،تاریخ کے لکھنے میں یقیناً کوئی غلطی ہوئی ہے۔ اگر سنہ ۱۲۹۰ھ تسلیم کیا جائے تو پھر عیسوی سنہ ۱۸۷۳ بنے گا۔ (مترجم)

(۲) محمد صدیق میمن نے اسے مخدوم عبداللہ عرف میاں موریہ خواہر زادہ مخدوم ابوالحسن کی تصنیف ذکر کیا ہے، جو دراصل میمن صاحب کا مغالطہ ہے۔ کیونکہ میمن صاحب نے اپنی کتاب 'سندھ جی ادبی تاریخ' ص:۸۳ پر مخدوم میاں موریہ کی تصنیفات میں 'کنز العبرت' کتاب کو ۱۱۷۵ھ کی تصنیف بتایا ہے اور اس کے بعد دیگر کتابوں میں 'تفسیر یوسف' کا تذکرہ کیا ہے۔ حالانکہ مخدوم موریہ کا وصال ۱۱۶۷ھ ہے، جیسا کہ مولانا وفائی صاحب نے تذکرہ مشاہیرِ سندھ، جلد۲، ص:۲۲۷ پر لکھا ہے۔ نیز ڈاکٹر عبدالجبار جونیجو صاحب لکھتے ہیں: کلہوڑہ دور کا یہ لاثانی عالم کئی علمی و دینی کتابوں کا مصنف ہے۔ سندھ کے تذکرہ نگاروں نے غلطی سے ان کی تصنیفات کو ان کے ہم نام میاں عبداللہ واعظ عرف میاں موریہ کے نام سے منسوب کردیا۔ جس کی وجہ سے اصل مصنف گوشۂ گمنامی میں رہا۔ موجودہ تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ جو بھی کتابیں عبداللہ واعظ عرف میاں موریہ کے نام منسوب تھیں وہ مخدوم عبداللہ مندھرہ نرِئے والا کی تصنیف ہیں۔

دیکھیے: ''سندھی ادب جی مختصر تاریخ''، ص:۹۵-۹۶ (مترجم)

کی لکھی ہوئی ہے(۱)۔ یہ قلمی کتاب برٹش میوزیم لائبریری میں موجود ہے(۲)۔

۶- تفسیر سورۃ یوسف: تصنیف مخدوم محمد مقیم نورنگ پوتہ(۳)۔

۷- تفسیر سورۃ الفاتحہ: تصنیف مخدوم عبدالرحیم گرہوڑی ۔

۸- تفسیر سورۃ الاخلاص: تصنیف مخدوم عبدالرحیم گرہوڑی ۔

۹- تفسیر سورۃ الکوثر: تصنیف مخدوم عبدالرحیم گرہوڑی ۔

۱۰- تفسیر پارہ عم: مولوی مہر و ولد مرہیو ولد موٹیو، ساکن پُران نے سنہ ۱۲۰۶ھ (۱۷۹۱ء) میں لکھی اس کے

۱۱- تفسیر سورۃ یٰسین : مخدوم عبد الکریم سندھی نقشبندی نے ۱۴ر ربیع الآخر سنہ ۱۱۰۹ھ کو مکمل کی۔ اس کتاب کی ایک نقل کاتب محمد حسین سومرہ، ساکن چیہو پڈعیدن نے ۱۲۴۰ھ۔۱۲۴۲ھ کے عرصے میں لکھی جو سندھ یونیورسٹی کے ادارۂ سندھیات میں نمبر۲۲۷۰۲ پر محفوظ ہے۔

۱۲- سورۃ کوثر کی تفسیر: گرہوڑی صاحب کی متذکرہ بالا کتاب کے علاوہ ایک اور کتاب ہے، جس کا قلمی نسخہ راقم کے کتب خانہ میں موجود ہے ۔

۱۳- قواعد القرآن سندھی: تالیف وتصنیف حافظ عبد الرحمٰن قاری سندھی ۔ اس کی اختتامی سطریں اس طرح ہیں۔

خاتمو مون خسيس جو تون خاوند خير ڪريج

ڪلمون منهنجي قلب ۾ تون ڏٽي ڏرائيج

[اے مولا ! مجھ خسیس کا خاتمہ بالخیر کرنا اور میرے قلب میں کلمہ پختہ فرمانا۔]

اس کتاب کی مصنف نے دوسری مرتبہ اصلاح و درستگی کی (۴) ہے ۔

(۱) مخدوم عبداللہ قوم کے 'مندھرہ' تھے، تحصیل بدین کے 'ماندھر' خطہ میں سنہ ۱۱۵۰ھ/ ۱۷۳۷ء میں پیدا ہوئے۔ اکتسابِ علم مخدوم محمد ہاشم سے کیا۔ بعض ناگزیر حالات کے سبب سے 'ماندھر' سے ترک وطن کرکے ریاست کچھ (ہندوستان) میں 'بزئے' نامی گاؤں میں سکونت پذیر ہوگئے، کچھ عرصہ بعد وہاں سے بھی کچھ کی تحصیل 'ابڑاسو' کے 'سری' نامی گاؤں میں جا کر رہے۔ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ رچرڈ برٹن نے آپ کو مخدوم محمد ہاشم کے بعد 'مشہور سندھی نثر نگار' لکھا ہے۔ تقریباً ۱۲۳۸ھ/ ۱۸۲۱ء میں وصال فرمایا۔

دیکھیے: ''مخدوم محمد هاشم ٺٽوي: سوانح حيات ۽ علمي خدمتون'' ص۸۴-۸۵ (مترجم)

(۲) اس کا قلمی نسخہ محررہ حافظ سلام اللہ بتاریخ ۱۱ر ربیع الثانی بروز ہفتہ سنہ ۱۱۹۷ھ، راقم کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

(۳) یہ سندھی منظوم کتاب قلمی صورت میں راقم کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ مطبوعہ صفحات ۵۷۴ ہیں۔

(۴) راقم نے یہ اصلاح کردہ قلمی نسخہ شیخ محمد سومار مرحوم کے پاس بدین میں دیکھا۔

حدیث:

۱- کتاب چہل حدیث مترجم سندھی: (چالیس احادیث کا منظوم سندھی ترجمہ) یہ کتابچہ مولوی محمد صدیق
مالک مطبع حسنی نے ۱۰رشوال ۱۳۱۶ھ (۱۸۹۸ء) کو بمبئی سے شائع کیا۔
۲- شرح چہل احادیث : مخدوم فضل اللہ پاٹائی (وفات سنہ ۱۲۹۰ھ) نے یہ شرح منظوم سندھی میں لکھی۔
۳- احادیث کا ترجمہ: عبدالکریم نامی عالم نے ۱۲۵۸ھ (۱۸۴۲ء) میں لکھا:

نسخو هن ناقص جو جڏهن ٿئو ختما
تڏهن جان نهارئا ورهين ہر، ته ڪيترا هوا
تان ٻارهن سوُ اٺونجاهه ورهيه هوا گذرئا

[اس ناکارہ کا تحریر کردہ نسخہ جب مکمل ہوا تب میں نے جیسے ہی غور کیا کہ کتنے برس (سن) گذر چکے ہیں،تو (ہجرت کے) بارہ سو اٹھاون برس گزر چکے تھے۔
۴- احادیث کے حوالہ سے نظموں کا قلمی مجموعہ، برٹش میوزیم لائبریری میں موجود ہے۔ جس کا آغاز یوں ہوتا ہے:

ساراهيان سبحان کي جنهن ڪامل قدرتا
بخشي ڏوهه بندن جا ڪري عفو خطا

[سبحان کی تعریف کروں جس کی قدرت کامل ہے، جو بندوں کے گناہ معاف فرماتا ہے۔]

فقہ:

اس دور میں لکھی گئی اکثر کتابوں میں اسلامی تعلیمات کی خاطر فقہی مسائل سمجھائے گئے۔ ''مخدوم ابو الحسن جی سندھی'' بھی مسائل نماز کے متعلق ایک فقہی کتاب تھی جو سنہ ۱۲۸۷ھ / ۱۸۷۰ء سے پہلے مطبع محمدی بمبئی سے پہلی مرتبہ طبع ہوئی۔ اس طرح کچھ اور فقہی کتابیں بھی ''سندھی'' کے نام سے موجود ہیں۔ دیگر عنوانات کی سندھی کتابوں میں سے بھی تقریباً پچاس ساٹھ کتابیں فقہ ہی کی قسم میں شمار کی جاسکتی ہیں۔
۱- زاد الفقیر: مسائل روزہ سمجھانے کے لئے مخدوم محمد ہاشم نے رمضان سنہ ۱۱۲۵ھ (۱۷۱۳ء) میں تصنیف کی

یہ کتاب سنہ ۱۲۸۷ھ (۱۸۷۰ء) میں مطبع محمدی بمبئی سے دوسری مرتبہ طبع ہوئی۔

۲- راحت المؤمنین یعنی ذبح شکار سندھی: شکار کرنے اور شکار کردہ جانور کو ذبح کرنے کے مسائل کے بارے میں مخدوم محمد ہاشم نے ۱۱۳۰ھ/۱۷۱۷ء میں تصنیف کی او رسنہ ۱۲۸۷ھ/۱۸۷۰ء میں مطبع محمدی، بمبئی سے دوسری مرتبہ طبع ہوئی۔

۳- حصص الاموال: علی اکبر نامی عالم نے حصصِ زکوٰۃ، فطرہ، خراج اور عشر کے فقہی مسائل کے بارے میں ۹/ذی الحج ۱۱۶۲ھ/۱۷۴۹ء کو لکھ کر مکمل کی۔ یہ کتاب صفدری پریس بمبئی سے مخدوم عبدالصمد نورنگ پوتہ اور شیخ جیوا خان نے سن ۱۳۰۳ھ/۱۸۸۵ء میں طبع کروا کر شائع کی۔(۱)

۴- وجیز الفقہ سندھی: یعنی سندھی میں 'مختصر فقہ' سنہ ۱۳۰۲ھ سے قبل بمبئی سے طبع ہوئی۔

۵- مجموعہ خلاصۃ الفقہ: یعنی فقہ کا خلاصہ، سنہ ۱۳۰۲ھ سے قبل بمبئی سے طبع ہوا۔

۶- سندھی عبدالرحیم کی: ٹھٹہ کے عالم عبدالرحیم کی 'کچھ خاص قلیل مسائل' (**ما ینبغی للحمائل مِن معدود المسائل**) کے بارے میں سنہ ۱۱۷۷ھ/۱۷۶۳ء میں سندھی نظم میں تحریر کردہ کتاب ہے(۲)۔

۷- ایک سو مسائل (فقہ کے): اسماعیل کی تصنیف کردہ یہ کتاب تیرہویں صدی ہجری کے نصف اول میں نصاب میں داخل تھی۔ ۱۱/ ربیع الثانی بروز ہفتہ سنہ ۱۱۹۷ھ/۱۷۸۳ء میں حافظ سلام اللہ کا تحریر کردہ اس کتاب کا قلمی نسخہ راقم کے کتب خانہ میں موجود ہے(۳)۔

۸- کھڑے ہوئے پانی کی پلیدی و پاکی کے متعلق، مُلّا بھوڑے کا الف اشباع قافیہ پر تیار کردہ سندھی منظومہ، ادارۂ سندھیات میں ۲۲۷۰۲ نمبر پر اس کا قلمی نسخہ محفوظ ہے۔

۹- مخدوم محمد جعفر بوبکائی کی فقہی کتب سے انتخاب۔ مخدوم موصوف کی کتاب 'فتح الدارین' او ردیگر کتابوں سے ابراہیم ساکن شہر مرزا چنہ کا(۴) سندھی میں تیار کردہ انتخاب۔

---

(۱) ڈاکٹر عبدالرسول قادری نے اپنے تحقیقی مقالہ ''مخدوم محمد هاشم ٺٽوي: سوانح حيات ۽ علمي خدمتون'' (سندھی) مطبوعہ مفتی اعظم سندھ اکیڈمی، طبع اول ۲۰۰۲ء، ص: ۲۱۰ پر اس کتاب کا نام 'حصن الاموال' لکھا ہے اور بتایا ہے کہ اس رسالہ میں زکواۃ، خراج، عشر اور صدقۃ الفطر وغیرہ کے مسائل بیان شدہ ہیں۔ کتاب کے موضوع اور اس کے مضامین کی مناسبت سے قادری صاحب کا ذکر کردہ کتاب کا نام کچھ نامناسب سا لگ رہا ہے۔ درست نام ڈاکٹر بلوچ صاحب کے بقول 'حصص الاموال' ہی ہے۔ (مترجم)

(۲) راقم نے مرحوم حکیم معین الدین، کھڈیاروی کے کتب خانہ (نواب شاہ) میں دیکھی۔

(۳) رچرڈ برٹن نے اپنی انگریزی کتاب ''سندھ میں آباد قومیں'' میں اس کا ذکر کیا ہے۔

(۴) مرحوم حکیم معین الدین، کھڈیاروی کے کتب خانہ (نواب شاہ) میں راقم نے دیکھا، افسوس کہ اس کتب خانہ کی قیمتی کتب کی نقلیں حاصل کرنے کا وقت میسر نہیں آیا۔ بعد میں حکیم مرحوم کا کتب خانہ منتشر ہو گیا، اور کچھ کتابیں راقم کی بحیثیت وائس چانسلر کوشش سے سندھ یونیورسٹی کی لائبریری کے لیے خرید کر محفوظ کی گئیں۔

دین اسلام:

۱- کتاب ساڈھیوں چھ ویہُون فرضن جُوں: یہ کتاب حاجی محمود حُلیہ نے منظوم کی اس نے یہ منظومہ مُلّا عثمان کی کتاب 'ساڈھیوں چھ ویہُون فرضن' سے متاثر ہو کر تیار کیا۔ حاجی محمود حلیہ کا یہ منظومہ سنہ ۱۲۹۰ھ/۷۴-۱۸۷۳ء یا اس سے قبل پہلی مرتبہ بمبئی سے شائع ہوا۔

۲- 'عقائد' سندھی: مصنف محمد ہاشم کے نام کی نسبت سے اسے 'کتاب عقائد ہاشمی' بھی کہا گیا۔توحید وغیرہ عقائد کی تشریح سے متعلق ۱۱۴۳ھ/۳۱-۱۷۳۰ء میں مخدوم محمد ہاشم نے تصنیف کی۔

۳- فرائض الایمان: (''فرائض الاسلام خورد یعنی فرائض الایمان'') سنہ ۱۲۹۰ھ/۷۴-۱۸۷۳ء یا اس سے بھی قبل بمبئی سے طبع ہوئی۔

۴- فرائض الاسلام سندھی: مخدوم محمد ہاشم نے 'فرائض الاسلام' عربی میں دو جلدوں میں تصنیف کی ،ان میں سے پہلی جلد کا ترجمہ مخدوم عبداللہ نے کیا (جو ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۴ء میں بمبئی سے طبع ہوا)؛بعد میں مخدوم عبداللطیف بن مخدوم محمد ہاشم نے سن ۱۱۸۱ھ (۶۸-۱۷۶۷ء) میں پہلی جلد کو ترتیب دیا اور دوسری جلد کا سندھی میں ترجمہ کیا جو ۱۲۹۱ھ میں بمبئی سے پہلی مرتبہ طبع ہوا۔

۵- بناء الاسلام ،سندھی: دین اسلام کے بنیادی عقائد سے متعلق اس کتاب کو مخدوم محمد ہاشم نے ۵/ذی الحج ۱۱۴۳ھ (۳۱-۱۷۳۰ء) کو مکمل کیا۔ یہ کتاب ۱۲۸۷ھ (۱۸۷۰ء) سے قبل مطبع محمدی بمبئی سے طبع ہوئی۔

۶- تشریح کلمہ طیبہ: اس کتاب کو احمد نامی ایک عالم نے منظوم کیا (۱)۔

۷- فرائض ،حمد اور معجزات: یہ کتاب ۱۱۸۸ھ سے قبل تصنیف ہوئی۔ محمد ہاشم اور عبدالرحمٰن نامی کاتبوں کا سنہ ۱۱۸۸ھ (۱۷۷۴ء) میں لکھا ہوا قلمی نسخہ انڈیا آفس لندن کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

۸- سراج المؤمنین: (تصنیف مولوی حامد کچھی ؟) ۲۴/شعبان سن ۱۲۴۰ھ میں تصنیف ہوئی۔ اس کا قلمی نسخہ سندھ یونیورسٹی کے ''ادارۂ سندھیات'' میں محفوظ ہے ،جس کا درج ذیل سراج المؤمنین سے تقابل کر کے مصنف کے نام کی تصدیق کی جاسکتی ہے۔

۹- سراج المؤمنین سندھی: مخدوم نورنگ زادہ کی اولاد میں سے مخدوم میاں عبدالرسول بن یار محمد نے ضخیم چار جلدوں میں اسے منظوم کیا۔ کسی زمانے میں اس کا مکمل قلمی نسخہ پیر جھنڈا کے کتب خانہ میں موجود تھا۔

(۱) مختصر (خواہ ناقص) اس کا قلمی نسخہ محترم محمد سومار شیخ مرحوم کے پاس بدین میں دیکھا گیا۔

۱۰- مفتاح الصّلوٰۃ سندھی: سنہ ۱۳۰۵ھ(۱۸۸۶ء) سے قبل مطبع فتح الکریم بمبئی سے طبع ہوئی۔

۱۱- کتاب ترتیب الصّلوٰۃ: مخدوم فضل اللہ پاٹائی المتوفی ۱۲۹۰ھ کی تصنیف ہے۔

۱۲- ترتیب الصّلوٰۃ سندھی: (تصنیف میاں عثمان نورنگ پوتہ؟) پانچ خطبات کے ساتھ ۱۲۸۷ھ (۱۸۷۰ء) سے قبل مطبع محمدی بمبئی سے طبع ہوئی۔

۱۳- ترغیب الصّلوٰۃ: یعنی رسالہ ”آخر الظہر“ سن ۱۳۰۵ھ(۱۸۸۷ء) سے قبل مطبع فتح الکریم بمبئی سے طبع ہوا۔

۱۴- صلوٰۃ سندھی: سید ہارون کی مختصر منظوم ہے۔

۱۵- کنز العبرت: مخدوم عبداللہ نے سن ۱۱۷۵ھ بتاریخ ۳۰/رمضان بروز پیر تصنیف کی۔ یہ کتاب حدیث کی روشنی میں فقہ اور اسلامی تعلیمات، مثلاً ایمان، عبادات، معاملات، ممنوعات، سیرت اور اخلاق وغیرہ مسائل سے متعلق دو جلدوں میں لکھی گئی اور ۱۲۸۷ھ (۱۸۷۰ء) سے قبل مطبع محمدی بمبئی سے طبع ہوئی۔ محمد بن محمد اشرف کاتب کا تحریر کردہ اس کا قلمی نسخہ برٹش میوزیم لائبریری میں موجود ہے۔(۱)

۱۶- نور الابصار سندھی: اسے مخدوم عبداللہ نے اپنی کتاب ؟ ”خزانۃ الابرار“ (۲) کی شرح کے طور پر ۳/جمادی الثانی سنہ ۱۱۹۳ھ(۱۷۷۹ء) کو لکھا اور ۱۲۸۷ھ (۱۸۷۰ء) سے قبل

(۱) محمد صدیق میمن صاحب نے اپنی کتاب ”سندھ جی ادبی تاریخ“ ص ۸۳ پر ’کنز العبرت‘ کتاب کو مخدوم عبداللہ عرف میاں موریہ کی تصنیف شمار کیا ہے اور لکھا ہے کہ: ”مخدوم عبداللہ نے سنہ ۱۱۷۵ھ کے رمضان شریف میں کنز العبرت کتاب لکھ کر مکمل کی تھی“۔ اس کے علاوہ میمن صاحب نے ان کی فہرست کتب میں ’بدر المنیر‘، ’غزوات‘، ’نور الابصار‘، ’صفت بہشت‘، ’قمر المنیر‘، ’مکت نامو‘، ’تفسیر یوسف‘، ’شجاعت سید الانام‘، ’سیدنا امیر عمر کے اسلام لانے کا قصہ‘، ’خلفائے راشدین‘ اور ’شہادتِ امام حسین‘ کتابوں کے نام گنوائے ہیں۔ اسی طرح پیر حسام الدین راشدی نے بھی ’کنز العبرت‘، ’قصص الانبیاء‘، خزانۃ الابرار‘، خزانۃ الاعظم‘، ’خزانۃ الروایات‘ اور ’تنبیہ الغافلین‘ کو مخدوم عبداللہ ٹھٹوی کی تصنیفات شمار کیا ہے۔ دیکھیے: سندھی ادب، ص:۵۴ جبکہ یہ تمام کتابیں مخدوم عبداللہ مندھرو بڑے والا کی تصنیف ہیں اور خاص طور پر ’کنز العبرت‘ کتاب مولانا قاسمی صاحب نے ترتیب دی اور اسے مولانا محمد مدنی، کلاں کوٹ کراچی سندھ نے ۱۳۸۰ھ میں شائع کروایا ہے۔ دیکھیے اس کا مقدمہ، ص: ’ح‘ ’کنز العبرت‘ میں شرعی مسائل جمع کیے گئے ہیں، اپنے موضوع کے اعتبار سے یہ ایک جامع کتاب ہے جس میں ایک طرف مضمون کا تنوع ہے تو دوسری طرف مسائل کا اظہار اور ان کی علمی چھان بین اور تحقیق ہے، ہر مسئلے کو دلیل سے بیان کیا گیا ہے۔ فرائض واجبات اور سنن کے ساتھ ممنوع اعمال کا بھی اس میں ذکر کیا گیا ہے۔ کسی بھی مسئلہ کی تشریح کو موثر اور مزید واضح بنانے کے لیے کچھ قصے اور رسول اللہ کی حیاتِ طیبہ سے مثالیں بھی ذکر کی گئی ہیں۔ اوامر و نواہی کے متعلق ایک مکمل کتاب ہے جس میں زیارتِ قبور، مجازی عشق، شراب نوشی، نذر و نیاز، سرود و سماع اور دیگر کئی مسائل پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ مخدوم عبداللہ مندھرہ بڑے والا کی تصنیف کے متعلق دیکھیے مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی کا وضاحتی مضمون، رسالہ مہران (سندھی) ۳/۱۹۸۸ء (مترجم)

(۲) ڈاکٹر عبدالرسول قادری نے ’کنز العبرت‘ مرتبہ علامہ غلام مصطفیٰ قاسمی کے حوالہ سے اسے ”خزینۃ الابرار“ لکھا ہے۔ دیکھیے: ’مخدوم محمد هاشم ٺٽوي: سوانح حيات ۽ علمي خدمتون‘ ص ۸۴ (مترجم)

مطبع محمدی بمبئی سے طبع ہوئی ۔ بعد ازاں سنہ ۱۳۰۰ھ(۱۸۸۲ء) میں مخدوم عبد الصمد نورنگ پوتہ، قاضی فتح محمد اور نورالدین نے اسے حیدری پریس بمبئی سے چھپوا کر شائع کیا ۔

۱۷- خزانۃ الاعظم: مخدوم عبداللہ نے اسے اپنی کتاب کنز العبرت کی شرح کے طور پر سات بڑی جلدوں میں منظوم کیا (۱)، نیز اس کا ایک چھوٹی جلد میں اختصار بھی لکھا گیا۔

۱۸- نماز کی تاکید کے بارے میں سندھی منظومہ: تالیف کردہ تاجل فقیر کا۔

۱۹- مجموعۂ نت کتابی: بمبئی سے طبع ہوا۔

۲۰- تسھیل الفرائض: ورثہ اور ترکہ کے حصص اور ان کی تقسیم سے متعلق علی نامی عالم نے یکم شعبان ۱۱۶۲ھ (۱۷۴۹ء) کو سندھی میں منظوم کیا۔

۲۱- حیات العاشقین یعنی مناسک حج (احکامات حج کے بارے میں): مخدوم محمد ہاشم کے فرزند مخدوم عبدالرحمٰن نے سن ۱۱۶۸ھ (۱۷۵۵ء) میں اپنے والد (مخدوم محمد ہاشم) کی تحریر کردہ فارسی کتاب (۲) کو سندھی میں منتقل کیا اور ۲۰ ربیع الاول ۱۲۸۸ھ (۱۸۷۱ء) کو مطبع محمدی بمبئی میں طبع ہوئی۔ اس کے بعد ۱۳۰۷ھ (۱۸۹۰ء) کو مطبع فتح الکریم بمبئی سے بھی شائع ہوئی۔

۲۲- بدر المنیر فی احوال قیامت کبیر: (بڑی قیامت کے بارے میں) اسے مخدوم عبداللہ نے ۱۱۸۴ھ میں سندھی میں منظوم کیا اور سنہ ۱۲۹۰ھ میں یا اس سے قبل بمبئی سے طبع ہوئی۔

۲۳- مخدوم عبدالخالق ٹھٹوی کا روز محشر کے متعلق منظومہ، جس کا قلمی نسخہ برٹش میوزیم لائبریری لندن میں محفوظ ہے:

ء ڏاڍو ڏينه قيام جو ڪر سهڪو جن شفاعت شفيع جي، ڇٽو تاء تني ڪا سپاجها

جن چيو ڪلمو ڪريم اتي سهجا سچ منجها

ترجمہ: اے مہربان مولا! قیامت کا کٹھن دن سہل کر، جنہیں شفیع (المذنبین) کی شفاعت حاصل ہوگی وہ تپش سے چھوٹ جائیں گے، جنہوں نے نبی کریمؐ کا کلمہ پڑھا وہ اس سچے کلمہ کی بدولت وہاں سکھی ہونگے

(۱) کسی زمانے میں یہ مکمل کتاب پیر جھنڈا لائبریری میں موجود تھی، بعد میں بھی اس کی پہلی اور تیسری جلد راقم نے وہاں دیکھی تھی۔

(۲) جس کا نام 'حیات القلوب فی زیارۃ المحبوب' ہے۔ جناب ڈاکٹر صاحب نے صفحہ نمبر ۱۰۴ پر اسی کتاب کو مخدوم محمد ہاشم کی تصنیف شمار فرمایا ہے جو یقیناً پروف ریڈنگ کی سہو ہے ورنہ ایک ہی کتاب کو دو مختلف شخصیات کی طرف منسوب کرنا کم از کم ڈاکٹر صاحب سے بہت بعید ہے۔ (مترجم)

۲۴- دعاؤں کے بارے میں مخدوم محمد ہاشم کا رسالہ
۲۵- درود شریف کے بارے میں مخدوم محمد ہاشم کا رسالہ (۱)

ایمان، اعتقاد، رِیت اور رسم کے بارے میں وضاحت:

۱- رسالہ ایمان مجمل او رایمان مفصل (غالباً مخدوم عبداللہ کا عربی سے سندھی منظوم ترجمہ)، درج ذیل تصنیف ''سگی نامو'' (قرابت نامہ) کے ساتھ مجموعہ کی صورت میں طبع ہوا۔

۲- ''سگی نامو'' (قرابت نامہ) اسے مخدوم عبداللہ نے قریبی رشتہ داری (محرمات)،

---

(۱) ڈاکٹر صاحب نے دونوں رسالوں کا نام نہیں لکھا۔ دعاؤں کے بارے میں مخدوم صاحب کی فارسی کتاب 'فضائل نماز و دعاء عاشورہ' کا سنہ ۱۲۰۱ھ کا کتابت کردہ مخطوطہ ٹھٹہ کے قریب 'سونڈہ' شہر میں قاضی محمد موسیٰ کے پاس موجود ہے۔ جس میں خاص طور پر دسویں محرم کی رات اور دن میں نفل نمازیں اور دعائیں احادیث کی روشنی میں تحریر کی گئی ہیں۔ عبدالرسول قادری کے بقول اس رسالہ میں مختلف نمازیں پڑھنے کا طریقہ اور دعاؤں کے نمونے بیان کیئے گئے ہیں۔

ممکن ہے کہ ڈاکٹر بلوچ صاحب کا بتایا ہوا یہ رسالہ اِسی فارسی کتاب کا سندھی ترجمہ یا خلاصہ ہو، جیسا کہ مخدوم صاحب اکثر اپنی کتب و رسائل کا دوسری زبان میں ترجمہ یا خلاصہ لکھ لیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ سندھی زبان میں دعاؤں سے متعلق ایک اور رسالہ کا بھی نام ملتا ہے، جناب عبدالرسول قادری صاحب نے اس کا نام ''رسالہ سندیہ فی ترجمۃ الدعائینِ اللّٰھم انی – اللّٰھم ربی'' لکھا ہے۔ یعنی دو دعاؤں: 'اللّٰھم انی' اور 'اللّٰھم ربی' کے متعلق رسالہ۔

مخدوم امیر احمد عباسی مرحوم نے ''بذل القوۃ فی حوادث سنی النبوۃ'' کے مقدمہ ص ۲۹ پر لکھا ہے کہ وہ دو دعائیں یہ ہیں:

اللّٰھم انی اعوذبک من ان اشرک بک شیئا و انا اعلم بہ و استغفرک لما لا اعلم بہ و تبت و رجعت و تبرات عن الشرک والکفر والکذب والغیبۃ والبھتان والمعاصی کلھا و اسلمت بقول اشھد ان لا الہ الا اللّٰہ و اشھد ان محمدا عبدہ و رسولہ.

اور دوسری دعا ہے:

اللّٰہ ربی جل جلالہ و محمد رسولی والقرآن امامی و کعبۃ اللّٰہ قبلتی والمؤمنون اخوانی اشھد ان لا الہ الا اللّٰہ و اشھد ان محمدا رسول اللّٰہ.

اسی طرح درود شریف کے متعلق بھی مخدوم صاحب کے رسالہ کا نام ڈاکٹر صاحب نے تحریر نہیں فرمایا۔ ویسے تو اس موضوع پر، دلائل الخیرات کی طرز پر عبدالسلام بن بشیش کے ''درود حاضری'' کا، مخدوم صاحب کا عربی و فارسی میں حاشیہ موجود ہے، اس کے علاوہ درود شریف ہی پر ایک اور عربی کتاب ''وسیلۃ القبول الیٰ حضرۃ الرسول'' کا نام آپ کی فہرستِ کتب میں ملتا ہے، یہ کتاب دراصل فارسی میں اسی موضوع پر مخدوم صاحب کی تحریر کردہ کتاب ''ذریعۃ الوصول الی جناب الرسول'' کا اختصار ہے۔ ان میں احادیث نبوی اور صحابہ و تابعین کے آثار میں وارد درود کے الفاظ، نیز درود کے فضائل وغیرہ ذکر کیئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ اس موضوع پر سندھی میں ایک رسالہ بھی ہے جس کا نام ''رسالہ فی ذکر افضل کیفیات الصلواۃ علی النبی'' ہے۔ ممکن ہے کہ بلوچ صاحب کا ذکر کردہ یہی رسالہ ہو یا اس سے قبل مذکور دو رسالوں ''وسیلۃ القبول الی حضرۃ الرسول'' اور ''ذریعۃ الوصول الیٰ جناب الرسول'' میں سے کسی رسالہ کا سندھی ترجمہ یا خلاصہ ہو۔ واللہ اعلم بالصواب.

دیکھیئے: 'مخدوم محمد هاشم ٺٽوي: سوانح حيات ۽ علمي خدمتون' ص ۳۶۹، ۳۸۷، ۴۴۲، ۴۸۳ - ۴۸۵ (مترجم)

ایک ہی عورت کے دودھ پینے (حرمت رضاعت) اور طلاق وغیرہ کے مسائل کے بارے میں لکھا، پہلی مرتبہ یہ کتاب سنہ ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء مین یا اس سے قبل، اور اس کے بعد سنہ ۱۳۳۶ھ/۱۹۱۸ء میں دیگر پانچ کتابوں کے مجموعے میں شائع ہوئی۔

۳- تربیت نکاح کے بارے میں رسالہ، جو ''قرابت نامہ'' کتاب کے ساتھ شائع ہوا۔

۴- خطبۂ نکاح، 'قرابت نامہ' کے ساتھ شائع ہوا۔

۵- آداب النکاح سندھی: (نکاح کے متعلق) ایک قلمی نسخہ کے اوپر مخدوم محمد ہاشم کا نام لکھا ہوا ہے۔ لیکن کتاب کے مطالعہ کے دوران مخدوم صاحب کا نام نظر نہیں آیا۔

۶- میت دفنانے کے متعلق رسالہ: ۲۰/ذی القعد سنہ ۱۱۶۷ھ(۱۷۵۴ء) کو عبدالرزاق کا تصنیف کردہ، جو مندرجہ بالا رسالہ قرابت نامہ کے ساتھ چھپا ہوا ہے۔

۷- میت کی نجات کے لئے دعاء کا رسالہ: مرحوم خلیفہ عبدالخالق کا منظوم کردہ برٹش میوزیم میں موجود ہے۔ اس کا آغاز یوں ہوتا ہے:

سارا هجي سو ڏٺي جو جياري ۽ ماري

[اس مالک کی تعریف کرنی چاہیے جو جلاتا اور مارتا ہے۔]

۸- منتخب الفوائد: حافظ عبدالرحمٰن بن مخدوم عبداللہ کا تالیف کردہ۔

۹- مُوضح الشرک سندھی، (شرک کی وضاحت کے بارے میں): سنہ ۱۲۸۷ھ(۱۸۷۰ء) سے قبل مطبع محمدی بمبئی سے طبع ہوا۔

۱۰- رسالۂ محرمات: سنہ ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء میں یا اس سے قبل پہلی مرتبہ بمبئی میں مذکور پریس سے طبع ہوا۔

۱۱- رسالۂ عقد نکاح: سنہ ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء میں یا اس سے قبل بمبئی میں مذکور پریس سے طبع ہوا۔

۱۲- رسالہ دربیان طلاق: سنہ ۹۰ ھ/۱۸۷۳ء میں یا اس سے قبل بمبئی میں مذکور پریس سے طبع ہوا۔

۱۳- رسالہ دربیان قسم: سنہ ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء میں یا اس سے قبل بمبئی میں مذکور پریس سے طبع ہوا۔

۱۴- رسالۂ میراث: سنہ ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء میں یا اس سے قبل بمبئی میں مذکور پریس سے طبع ہوا۔

۱۵- عہد نامہ، اسناد نامہ یا سندھی اسنادِ عہد نامہ: سنہ ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء میں یا اس سے قبل بمبئی میں مذکور پریس سے طبع ہوا

۱۶- رسالۂ عقیقہ: تصنیف محمد اسماعیل۔ سنہ ۱۸۷۴ء میں مطبع حیدری بمبئی سے مخدوم محمد ابراہیم بھٹی کی ''سندھی'' کے ساتھ طبع ہوا۔

۱۷- رسالہ بابت عقیقہ: منظوم (غالباً کسی اور بزرگ کا ہے)۔

۱۸- نکاح نامہ: مخدوم فضل اللہ پاٹائی نے سنہ ۱۲۷۱ھ یا اس سے قبل تصنیف کیا۔ اس کا قلمی نسخہ محرّرہ سنہ ۱۲۷۱ھ موجود ہے۔

۱۹- اسلامی عقائد او رشب معراج کے متعلق منظومہ، سنہ ۱۲۰۱ھ (۱۷۸۰ء) سے قبل لکھا گیا۔ اس کا قلمی نسخہ محرّرہ ۲۱/رمضان ۱۲۰۱ھ برطانوی کتب خانہ میں موجود ہے۔

۲۰- رسالۂ ردِ وہابیہ: بسرائی عبدالرؤف نے سن ۱۲۷۸ھ میں منظوم کیا۔

سوانح اور تاریخ:

۱- نبی پاک ﷺ کی ولادت: سنہ ۱۱۹۶ھ (یا ۱۱۹۷ھ) سے قبل تصنیف شدہ منظومہ۔

۲- نبی پاک ﷺ کی بی بی خدیجہؓ کے ساتھ شادی: ۱۱۹۶ھ (یا ۱۱۹۷ھ) سے قبل کا تصنیف شدہ منظومہ۔

۳- شمائل نبویؐ سندھی: (ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورۃ) ترمذیؒ کی عربی کتاب 'شمائل نبویؐ'(۱) کا سنہ ۱۱۹۷ھ میں مخدوم عبدالسلام کا سندھی منظوم ترجمہ(۲)، مطبع فتح الکریم بمبئی سے ۱۲۹۰ھ (۱۸۷۳ء) یا اس سے قبل طبع ہوا۔ یہ ضخیم کتاب بڑی سائز کے ۲۹۶ صفحات پر، تمام کی تمام الف اشباع کے قافیہ پر منظوم شدہ ہے(۳)۔

---

(۱) امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سُورۃ بن موسیٰ بن الضحاک ابن السکن سلمی، بلخ کے شہر ترمذ میں سنہ ۲۰۹ھ میں پیدا ہوئے۔ حصولِ علم کے لیے خراسان، عراق اور حجاز کے کئی شہروں کا سفر کیا اور جید اساتذہ سے اکتسابِ علم کیا۔ فقہِ حدیث کا فن امام بخاری سے حاصل کیا، نیز امام بخاری نے آپ سے حدیث کا سماع کیا، جس کا ذکر امام ابوعیسیٰ نے اپنی ''الجامع الصحیح'' میں کیا ہے۔ بڑے جلیل القدر محدِّث تھے، خوفِ خدا سے روتے روتے اخیر عمر میں نابینا ہوگئے تھے۔ ۱۳ رجب سنہ ۲۷۹ھ کو ترمذ میں انتقال فرمایا اور وہیں دفن ہوئے۔ حدیث میں آپ کی جمع کردہ کتاب الجامع الصحیح یعنی جامع ترمذی کتب صحاح میں پانچویں درجہ کی کتاب ہے، اور آپ کی مندرجہ بالا کتاب کا پورا نام 'کتاب الشمائل النبویۃ' ہے۔
دیکھیے: تذکرۃ المحدثین، ص ۲۳۹-۲۴۳، ۲۶۸ (مترجم)

(۲) پیر حسام الدین راشدی نے اسے مولوی (مخدوم) عبدالسلام کی تصنیف قرار دیا ہے۔ دیکھیے: سندھی ادب، ص: ۵۴ (مترجم)

(۳) انگریز مصنف رچرڈ برٹن نے اپنی کتاب ''سندھ میں آباد قومیں'' میں اس کا ذکر کیا ہے۔

۴-سید ہارون کی سندھی : سید ہارون دانُہیرے والا (۱) شاہ عبداللطیف بھٹائی کے غالبًا بڑے معاصر تھے۔ عموماً اسے "سيدن واري سنڌي" (سیدوں کی سندھی) کہا جاتا تھا، اور علاقہ کَچھ کے مدارس میں پڑھائی جاتی تھی۔

۵-قمر المنیر : علاقہ کَچھ کے عالم مخدوم عبداللہ نرِیے والا نے نبی پاک ؐ کے معجزات سے متعلق بارہویں صدی میں تالیف کی۔ سنہ ۱۲۹۰ھ (۱۸۷۳ء) میں عبدالصمد نورنگ پوتہ کی کتاب کے ساتھ بمبئی سے طبع ہوئی۔

۶-بدر المنیر : مخدوم عبداللہ نے نبی پاک ؐ کی سیرت و سوانح پر یہ دوسری کتاب تصنیف کی۔

۷-معراج نامہ : مخدوم عبداللہ کا تصنیف کردہ۔ پہلی مرتبہ سنہ ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء میں یا اس سے قبل مطبع نامی کریمی بمبئی سے طبع ہوا۔

۸-معراج نامہ : محمد حسن سومرہ کا تالیف کردہ۔ اس کا قلمی نسخہ ادارۂ سندھیات میں موجود ہے۔

۹-معراج نامہ : الف اشباع کے قافیہ پر منظوم کردہ اور غیر معتبر روایتی رنگ میں احمد کا سنہ ۱۲۷۹ھ سے قبل کا کہا ہوا ہے۔ ۲۷ر جماذی الاوّل ۱۲۷۹ھ کا تحریر کردہ اس کا قلمی نسخہ ادارۂ سندھیات میں موجود ہے۔ نیز سنہ ۱۳۲۵ھ میں مطبع علوی بمبئی سے طبع شدہ۔

۱۰- نبی پاک ؐ سے التجا اور مناجات : جو اصل عربی میں تھی ؛ (یا قبر طیب ھل نبیتک یسمع) اسے کسی بزرگ نے سندھی نظم میں لکھا۔ اس کا قلمی نسخہ برٹش میوزیم لائبریری میں موجود ہے۔

۱۱- ایک اور موضوع پر سندھی منظومہ : مذکورہ بالا کتاب کے ساتھ ایک ہی جلد میں برٹش میوزیم لائبریری میں اس کا مخطوطہ موجود ہے۔ جس کا آغاز یوں ہے :

سارا هجي سو ڌڻي واحد سپ ويرا جو رب رحمان رحيم ڌڻي جليل جبارا

[اس مالک کی تعریف کرنی چاہیے جو ہر ساعت واحد ہے، ربّ ہے، رحمٰن ہے، رحیم ہے، مالک ہے، جلیل ہے، جبار ہے۔]

۱۲- رحلت : (رحلت نامہ) اسے مخدوم عبداللہ نے اصل کتاب "حبیب السیر" سے سندھی میں کیا، تیرہویں صدی کے نصف آخر میں یہ کتاب سندھی نصاب میں داخل تھی (۱)۔

۱۳-"بزغ الحبیب" یا "بزغل کے کلمات" : "بزغ الحبیب المجتبیٰ فی سُحمَةِ اللیل الدجیٰ" شاہ عبداللطیف بھٹائی کے ہمعصر مولوی محمد صلاح کا مشہور مدحیہ سندھی منظومہ۔

۱۴-منظومہ درشان نبی ﷺ : تاریخ کتابت ۱۲ر رمضان ۱۲۰۱ھ۔ برٹش میوزیم لائبریری میں موجود ہے

---

(۴) سید ہارون عرف میوں ہارون تو تکہ کے قبرستان (بمقام بنو تحصیل کھاہوڑی) میں مدفون ہے۔

(۲) انگریز مصنف رچرڈ برٹن نے اپنی کتاب "سندھ میں آباد قومیں" میں اس کا ذکر کیا ہے۔

۱۵- نبی پاکؐ ،حضرت علیؓ اور رامامین کریمین کے بارے میں عوامی رنگ کا حکایتی منظومہ:
اس کا آغاز یوں ہے:

هيُ حڪايت هيڪڙي سا پڻ سٽيجاهه
تہ قادر قدرت جو ڌڻي غالب غيورا

[یہ ایک حکایت سنو کہ قادر قدرت کے مالک غالب غیور نے
متذکرہ بالا منظومہ سے ملتی جلتی ثناء اور تعریف پر مشتمل نظم ہے-]

واڪائڻو واحد کي جو قدرت ڪمالا
مشهور ڪيائين محمد مير جو جلوو جمالا.

[کمال قدرت کے صاحب اس واحد کی تعریف کرو جس نے محمد، میرﷺ کا جلوہ جمال مشہور کیا-]

۱۶- بسم اللہ کی برکت کے بارے میں منظومہ (یہ اور اس سے پہلے مذکورہ دونوں نظم اور ''سید ہارون کی سندھی'' یعنی سی حرفی، چاروں مخطوطات، ایک ہی جلد میں برٹش میوزیم لائبریری میں موجود ہیں)۔

هائي برڪت بسم الله جي سٽهو مومناه
آهي جنهن جي 'بي' ۾ سڄي قرآن جي معنا

[اے مؤمنو! اب بسم اللہ کی برکت سماعت کریں، جس کی 'ب' میں پورے قرآن کے معنی ہیں-]

۱۷-☆ نبی پاکؐ کے معراج کے بارے میں منظومہ، سنہ ۱۲۵۱ھ سے قبل کا:

جڏهن رسئو رسول رب جو هاشمي حرما

[جب رب کا رسول ہاشمیؐ حرم شریف پہنچا-]

۱۸-☆ نبی پاکؐ کی شان میں منظومہ، سن ۱۲۵۱ھ سے قبل کا:

سارا هيان سو ڌڻي رهندو جو آهي

[اس مالک کی تعریف کرتا ہوں جو ہمیشہ ہے-]

۱۹-☆ نبی پاکؐ کی شان میں دوسرا منظومہ، سنہ ۱۲۵۱ھ سے قبل کا:

پاڪي سڀ الله جل جلاله آهي جيڪا ڪا
جو بزرگ بلند بارءُ سڙئو وڏو وڏيئا.

[جو کچھ پاکی ہے وہ سب اللہ جل جلالہٗ کی ہے، جو عظیم، بلند، بنانے والا، تمام بڑوں سے بڑا ہے-]

۲۰-☆ دو مزید منظومات، نبی پاکؐ، حضرت علیؓ اور امامین کریمین کی تعریف میں۔ سن ۱۲۵۱ھ سے قبل کے (☆)۔

۲۱-قوۃ العاشقین: مخدوم محمد ہاشم کی سنہ ۱۱۲۷ھ میں نبی پاکؐ کے ایک سو ساٹھ معجزات پر مشتمل تصنیف۔

(انڈیا آفس لندن کے کتب خانہ میں موجود مخطوطہ کی تاریخ کتابت ''۲رمضان ۱۱۶۷ھ'' (۱۷۵۳ء) درج ہے۔ یہ کتاب سنہ ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء میں یا اس سے قبل بمبئی میں طبع ہوئی) (۱)

۲۲-معجزات: سنہ ۱۲۲۸ھ (۱۸۱۳ء) سے قبل کے تصنیف شدہ، جو ایک قلمی نسخہ میں سید ہارون کی سی حرفی کے آخر میں لکھے ہوئے ہیں۔

۲۳-معجزات: الف اشباع کے قافیہ میں احمد کے منظوم کردہ ہیں، جو برطانوی کتب خانہ کے قلمی نسخہ (No add, 26335) میں موجود ہیں۔

۲۴-معجزہ: مخدوم فضل اللہ پاٹائی (متوفی ۱۲۹۰ھ) کا منظوم کردہ۔

۲۵-نور نامہ: نبی پاک ﷺ کے نور سے کائنات کی تخلیق کے بارے میں، عبدالرحمٰن کا تصنیف کردہ۔

سنہ ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء یا اس سے قبل پہلی مرتبہ بمبئی سے طبع ہوا۔

۲۶-مجموع وفات نامہ: سنہ ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء یا اس سے قبل بمبئی سے طبع ہوا۔

۲۷-حیات العاشقین: ۱۱۶۸ھ (۵۵-۱۷۵۴ء) میں مخدوم محمد ہاشم نے تصنیف کی (۲)،

(☆) مختلف فضلاء کے کہے ہوئے یہ پانچوں منظومات ۱۳۸ اوراق کے ذخیرہ میں شامل ہیں، جسے خلیفہ محمد بن مرحوم عبدالخالق نے بتاریخ ۲۱رمضان ۱۲۵۱ھ کو لکھ کر مکمل کیا اور اب برٹش لائبریری لندن میں محفوظ ہے۔

(۱) اس کے بعد سنہ ۱۳۶۹ھ/۱۹۵۰ء میں 'سندھ مسلم ادبی پرنٹنگ پریس حیدرآباد' سے طبع ہوئی، اس کے علاوہ اسے مفتی عبدالرحمٰن ٹھٹوی نے موجودہ سندھی سلیس نظم میں اور ڈاکٹر میمن عبدالمجید سندھی نے موجودہ سندھی نثر میں شائع کروایا۔ (مترجم)

(۲) 'حیات العاشقین' مخدوم محمد ہاشم کے فرزند اکبر مخدوم عبدالرحمٰن کی تصنیف ہے جسے انہوں نے اپنے والد کی کتاب 'حیات القلوب فی زیارۃ المحبوب' کے خلاصہ کے طور پر سنہ ۱۱۶۸ھ میں، سندھی میں منظوم کیا، جو پانچ ابواب اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے۔ مخدوم محمد ہاشم نے مناسک حج اور زیارتِ حرمین سے متعلق ۸ رجب ۱۱۳۵ھ کو فارسی کتاب 'حیات القلوب فی زیارۃ المحبوب' لکھنا شروع کی اور ۲۷ رمضان ۱۱۳۵ھ کو اسے مکمل کرلیا، اس میں مقدمہ کے علاوہ چودہ ابواب ہیں، حیات القلوب نومبر ۱۸۸۰ء میں بمبئی کے مطبع کریمی سے طبع ہوئی۔ تقریباً ایک سو سال بعد اسے مفتی محمد شفیع نے مشہور پریس کراچی سے دوبارہ طبع کروایا۔ بعد میں مخدوم صاحب نے 'حیات القلوب فی زیارۃ المحبوب' کا 'سفینۃ السالکین الیٰ بلد اللہ الامین' کے نام سے فارسی ہی میں خلاصہ لکھا، اس کا سنِ تحریر معلوم نہیں ہو سکا، نہ ہی اس کے کہیں قلمی نسخہ دستیاب ہونے کی اطلاع ہے۔ سنہ ۱۱۵۸ھ میں آپ نے 'سفینۃ السالکین' کا 'تحفۃ السالکین الیٰ جناب الامین' کے نام سے فارسی میں خلاصہ تیار کیا، جس کا کرم خوردہ قلمی نسخہ جناب ڈاکٹر بلوچ صاحب کے کتبخانہ میں موجود ہے اور اس کی فوٹو کاپی جناب قادری صاحب کے پاس موجود ہے۔ مخدوم امیر احمد عباسی مرحوم نے اِس خلاصۂ خلاصہ کا نام 'تحفۃ المساکین الیٰ جناب الامین' تحریر فرمایا ہے۔

دیکھیے: 'مخدوم محمد هاشم ٺٽوي: سوانح حيات ۽ علمي خدمتون' ص ۱۶۵-۱۶۶، ۴۰۹-۴۱۱، ۴۲۲ اور 'مقدمہ بذل القوۃ فی حوادث سنی النبوۃ' ص ۲۷ (مترجم)

جس کا بعد میں ان کے فرزند مخدوم عبد الرحمٰن نے منظوم ترجمہ کیا جو ۲۰/ ربیع الاوّل سن ۱۲۸۸ھ(۱۸۷۱ء) میں مطبع محمدی بمبئی سے طبع ہوا۔ (مخدوم عبدالرحمٰن کے ترجمہ کا صاف اور عمدہ قلمی نسخہ سنہ ۱۲۲۷ھ میں خواجہ منور علی ہروی کا سنہ ۱۲۲۷ھ میں تحریر کردہ، برٹش لائبریری میں Mss Sindh نمبر پر موجود ہے)۔

۲۸- بنی پاکؐ کا معجزہ: سنہ ۱۳۲۷ھ(۱۹۰۹ء) میں آٹھ کتابچوں کے مجموعہ کے ساتھ مطبع علوی بمبئی سے شائع ہوا۔

۲۹- غزوات نبیؐ یعنی نبی پاکؐ کی جنگیں: مخدوم عبداللہ کی تصنیف کردہ، سنہ ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء یا اس سے قبل بمبئی سے پہلی مرتبہ شائع ہوئی۔

۳۰- شجاعت سید الانامؐ: (نبی پاک کی بہادری کے متعلق) مخدوم عبداللہ کی تصنیف کردہ۔

۳۱- بی بی خدیجہؓ کا قصہ: مخدوم عبداللہ کا تصنیف کردہ۔ سنہ ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء یا اس سے قبل بمبئی سے پہلی مرتبہ طبع ہوا۔

۳۲- خدیجۃ الکبریٰؓ کا قصہ: (غالباً یہ وہی سابقہ "بی بی خدیجہؓ کا قصہ" ہے)، کتابوں کے مجموعہ کے ساتھ مطبع علوی بمبئی سے شائع ہوا۔

۳۳- خلفاء راشدینؓ: مخدوم عبداللہ کی تصنیف۔ سنہ ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء یا اس سے قبل بمبئی سے پہلی مرتبہ طبع ہوئی۔

۳۴- سیدنا امیر عمرؓ کا اسلام قبول کرنا: مخدوم عبداللہ کی تصنیف، سن ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء یا اس سے قبل بمبئی سے پہلی مرتبہ طبع ہوئی۔

۳۵- شہادتِ امام حسینؓ کا بیان: مخدوم عبداللہ کی تصنیف، سنہ ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء یا اس سے قبل بمبئی سے پہلی مرتبہ طبع ہوئی۔

۳۶- شہادت نامہ امام حسینؓ: محمد نامی عالم کا الف اشباع کے قافیہ پر منظوم کردہ (۱)۔

۳۷- قصۂ شہادت امام حسینؓ: محمد مقیم کا منظوم کردہ، اس کا قلمی نسخہ برٹش میوزیم لائبریری میں موجود ہے، جس کا آغاز یوں ہے:

سڀ ساراھ رب کي جل جلالہ وصف وڏايا

آھين جنھن جھان ۾ عجب کھا کمڙا

(۱) اچھی خاصی بڑی قلمی کتاب، شروع اور آخر سے ناقص، ہم نے (تحصیل گولاڑچی کے گاؤں جونا میں) جناب میر علی شاہ صاحب کے پاس دیکھی۔

[تمام تعریف ربّ کی، جس کی وصف بڑائی جل جلالہٗ ہے
جہاں میں جس کے عجیب وغریب کام ہیں۔]

۳۸- روضۃ الشہداء سندھی: اسے سندھ کے عالم احمد نے مُلّا حسین کاشفی(۱) کی کتاب 'روضۃ الشہداء' سے سنہ۱۱۷۲ھ(۵۹-۱۷۵۸ء) میں سندھی میں ترجمہ کیا۔ یہ کتاب سنہ ۱۲۸۷ھ(۱۸۷۰ء) سے قبل مطبع محمدی بمبئی سے طبع ہوئی۔

۳۹- مناقب مرتضوی: سی حرفی کی صنعت میں خلیفہ محمد کا منظوم کردہ، جس کا قلمی نسخہ برٹش میوزیم لائبریری میں موجود ہے۔ اس کا آغاز یوں ہے:

"ھيُ مناقب مرتضوي سٺھو سنڌي واء"

[یہ مرتضوی مناقب سندھی زبان میں سنو

۴۰- مناقب مرتضوی: (الف اشباع کے قافیہ پر) یہ کتاب بھی پرانے دور میں تصنیف ہوئی، اس کا قلمی نسخہ راقم کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

۴۱- افادۃ العینین: عربی سے ماخوذ اور خلیفہ محمد کی منظوم کردہ۔ اس کا قلمی نسخہ برٹش میوزیم لائبریری میں موجود ہے۔

۴۲- حضرت یوسفؑ کا قصہ: احمد نامی عالم نے 'سورۃ یوسف' میں مذکور علامات کی روشنی میں منظوم کیا۔ اپنا نام وہ اس طرح لائے ہیں:

"الا ھي احمد چئي آھيان عاصي اپارا"

[احمد کہتا ہے کہ بارِ الہٰا! میں بے انتہا گناہگار ہوں۔]

اس قصہ کا ایک قدیم قلمی نسخہ، سنہ ۱۱۸۰ھ میں محمد ملوک کاتب کا تحریر کردہ برٹش لائبریری میں موجود ہے۔

---

(۱) کمال الدین، حسین بن علی واعظ کاشفی، بیہقی۔ مشہور فارسی تفسیر حسینی کے مصنف، تمام ظاہری و باطنی علوم اور نطقی و رسمی فنون میں معرفتِ تامہ رکھتے تھے، خاص طور پر علم نجوم اور انشاء میں اپنی مثال آپ تھے۔ ابتداء میں تشیّع کی طرف مائل تھے مگر بعد میں مضبوط اہل سنت ہو کر حنفی المذہب ہوئے۔ نہایت خوش آواز اور بہت بڑے واعظ تھے۔ آپ نے کئی کتابیں تصنیف کیں جن میں سے کچھ کے نام یہ ہیں:
'جواہر التفسیر لتحفۃ الامیر' اس کے آغاز میں، چار فصلوں کے اندر تفسیر سے تعلق رکھنے والے، بائیس فنون پر مشتمل، علوم کا بیان ہے۔
'مواہب علیہ' (تفسیر حسینی جو ۸۹۹ھ میں لکھی گئی)
'روضۃ الشہداء'، 'انوار سہیلی'، 'اخلاق محسنی'، 'مخزن الانشاء'، 'رشحات عین الحیوۃ' یہ کتاب مشائخ نقشبند کے مناقب پر مشتمل ہے۔
'الرسالۃ العلیۃ فی الاحادیث النبویۃ'، 'لوائح القمر' اور سنہ ۸۷۵ھ میں تصنیف کردہ 'لبِ لباب مثنوی' فارسی۔
آپ نے سنہ ۹۱۰ھ میں ہرات میں وفات پائی، 'سالار حقیقت' سے آپ کا سال وفات برآمد ہوتا ہے۔
ماخوذ از: حدائق الحنفیہ، ص۳۸۳-۳۸۴
نیز دیکھیے: فہرست مخطوطات دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری، لاہور، جلد اول، ص۱۶
نیز دیکھیے: سہ ماہی 'الزبیر' بہاولپور، کتب خانہ نمبر ۱۹۶۷ء ص ۲۲۵، ۲۱۵ (مترجم)

۴۳- قصص الانبیاء : مولوی محمد حسین نے ماہ شعبان سنہ ۱۱۷۷ھ (۱۷۶۳ء) میں سندھی ترجمہ کیا(۱) اور سنہ ۱۲۸۷ھ/۱۸۷۰ء سے قبل مطبع محمدی بمبئی سے طبع ہوا۔

تصوّف ، اخلاقیات :

۱- نصیحت نامہ: (بعد از موت حالت کے بارے میں) مخدوم محمد ہاشم کا۔

۲- تحفۃ التائبین : (گناہوں سے توبہ کے بارے میں) مخدوم محمد ہاشم کا۔

۳- ہدایۃ المریدین: مخدوم محمد ابراہیم بن مخدوم عبداللطیف نے سنہ۱۲۰۶ھ (۱۷۹۱ء) میں لکھی اور سنہ ۱۲۹۰ھ(۱۸۷۳ء) یا اس سے قبل بمبئی سے پہلی مرتبہ شائع ہوئی۔

۴- ابراہیم کی سندھی(۲): تصوف او رنقشبندی طریقہ کے متعلق، جس کا ''۲۹رذی الحجہ سنہ ۱۳۱۷ھ'' میں لکھا ہوا قلمی نسخہ ہم نے مرحوم حکیم معین الدین کے کتب خانہ (نوابشاہ) میں دیکھا۔ اس کے آخر میں یوں لکھا ہوا تھا:

آگاھن عاجز کي تون پنھنجي رنگ رنگيج
طرف طاعت تائب ڪري، ڏونه عبادت آڻيج

[خدایا! اس عاجز کو اپنے رنگ میں رنگ دے، طاعت کی طرف تائب بنا کر، اسے عبادت کر طرف لے آ۔]

۵- تذکرۃ الطالبین سندھی: مخدوم محمد ہاشم کے ایک مقتدی مخدوم مولوی عبداللہ کا۔

۶- سراج المشتاقین : علاقہ کچھ کے شہر پانڈھ کے اسماعیل شاہ نے ۲۳ر ربیع الآخر ۱۷۶۰ھ(۳) میں تصنیف کی۔

۷- مجمع الفیوضات: پیر صاحب محمد راشد روضہ دھنی(۴) کے ملفوظات جسے خلیفہ محمود نظامانی نے سنہ ۱۲۴۸ھ (۱۸۳۲ء) میں تالیف کیا۔

---

(۱) سندھی ترجمہ کا نام 'سیرِ بستان' (باغ کی سیر) ہے۔ سندھ جے ادبی تاریخ،ص:۱۴۱ (مترجم)

(۲) غالباً یہ کتاب یعنی (ابراہیم کی سندھی) اس سے قبل ذکر کردہ اسی مخدوم ابراہیم کی کتاب (ہدایۃ المریدین) ہی ہے (؟) کیونکہ اس قلمی نسخہ پر مؤلف کا نام بڑے احترام سے درج ہے: ''تاليف تصنيف مولانا هادينا مهدينا سيدنا و مرشدنا دام فيوضاته' مخزن الشمس مع شجرة العارفين ''

(۳) مطبوعہ اصل کتاب میں یہ سن یوں ہی لکھا ہوا ہے۔ جو یقیناً پروف کی غلطی ہے، غالباً ۱۱۶۰ھ یا ۱۲۶۰ھ ہے۔(مترجم)

(۴) سید محمد راشد المعروف روضہ والا بن سید محمد بقا شاہ شہید کی ۶ رمضان ۱۱۷۱ھ (۱۷۵۸ء) میں ولادت ہوئی۔ آپ کا سلسلہ نسب اکیسویں پشت میں سید علی مکی لکیاری سے اور چھتیسویں پشت میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے جا ملتا ہے۔ اپنے والد صاحب اور دیگر نامور اساتذہ سے علم حاصل کیا۔ ۱۰ محرم سنہ ۱۱۹۸ھ میں والد صاحب کے وصال کے بعد مسند آرائے رشد و ہدایت ہوئے۔ حد درجہ متوکل علی اللہ اور متبع سنت تھے۔ سندھ میں احیاء سنت کے لیے آپ کی خدمات، ہندوستان میں حضرت امام ربانی ۔کے، بدعت و شرک کے خلاف جہاد کی مانند تھیں۔ یکم شعبان سنہ ۱۲۳۴ھ کو وصال فرمایا، آپ کی اولاد آپ کے نام سے 'راشدی' کہلائی۔ مشہور خانوادے پیران پاگارہ اور پیر جھنڈا آپ کی نسل سے ہیں۔ آپ کا خاندان اپنی وجاہت، شرافت، علمی عظمت اور ملکی و ملی خدمت کے لحاظ سے ممتاز ترین خاندان شمار ہوتا ہے۔

خلاصۂ مطالعہ: 'مکتوبات شريف ۽ سوانح حيات سيد محمد راشد روضي ڌڻي' ص ۲۶-۱۲۲ (مترجم)

۸- سید ہارون کا سی حرفی منظومہ: اخلاقی نصیحت و ہدایت کے بارے میں ہے۔ اس کا قلمی نسخہ برٹش لائبریری لندن میں محفوظ ہے۔ غالباً یہ سی حرفی "مجموعہ سی حرفی سید ہارون و میاں عبداللہ" کے نام سے ۱۲۸۷ھ (۱۸۷۰ء) میں یا اس سے قبل مطبع محمدی بمبئی سے طبع شدہ ہے۔

۹- سید ہارون کا ایک اور سی حرفی منظومہ: جو اخلاقی نصیحت و ہدایت کے بارے میں ہے اور اس کا قلمی نسخہ برٹش لائبریری لندن میں محفوظ ہے۔

۱۰- تصوف میں رسالہ: خلیفہ محمود نظامانی متوفی ۱۲۶۷ھ نے تصنیف کیا(۱)۔

۱۱- مفید الانام: سنہ ۱۲۹۰ھ (۱۸۷۳ء) یا اس سے قبل پہلی مرتبہ بمبئی سے طبع ہوا۔

۱۲- وحدت نامہ: یا توحید نامہ، مخدوم فضل اللہ پاٹائی نے ۱۲۶۴ھ (۱۸۴۸ء) میں تصنیف کیا۔

۱۳ تصوف نامہ: جس میں مخدوم فضل اللہ متوفی ۱۲۹۰ھ نے توحید نامہ کی پہلی دو سطروں کی شرح بیان کی ہے۔

۱۴- انیس العابدین: (یا منہاج الزاہدین یعنی انیس العابدین)، سنہ ۱۲۹۰ھ

---

(۱) محمود بن گہنور خان نظامانی تقریباً سنہ ۱۱۸۰ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے اسلاف کلہوڑا اور تالپور دورِ حکومت میں بڑے عہدوں پر فائز رہتے ہوئے آرہے تھے اور جاگیردار نواب تھے۔ آپ کے اساتذہ میں میاں عبدالکریم لکڑی والے، میاں حافظ محمد عثمان درویش اور میاں ابوالقاسم کاتیاری کے نام ملتے ہیں۔ آپ حضرت سید محمد راشد روضہ والا کے بڑے خلیفہ، عالم، عارف اور صاحب فیض تھے، آپ کے مریدین کی بہت بڑی تعداد کچھ، کاٹھیاواڑ، گجرات، بمبئی، بنگال، مارواڑ اور کراچی میں موجود ہے۔ سنہ ۱۲۴۸ھ میں آپ نے حضرت محمد راشد روضہ والا کے ملفوظات کو فارسی میں 'مجمع الفیوضات' کے نام سے جمع فرمایا، جس میں 'جامع' کے مقدمہ کے علاوہ سولہ ابواب تھے۔ 'مجمع الفیوضات' کے چار ابواب کا سندھی ترجمہ حضرت علامہ پیر محمد قاسم مشوری رحمۃ اللہ علیہ نے 'نفحاتُ الکرامات' کے نام سے، پینتالیس پچاس سال پہلے شائع کروایا تھا۔ اس کے باقی ابواب کا ترجمہ جامعہ راشدیہ (پیر جو گوٹھ پیر صاحب پاگارہ) کے فاضل علامہ مفتی در محمد (مرحوم) نے کیا، بعد میں معروف محقق و مصنف اور مؤرخ علامہ حکیم رمضان علی قادری نے سنہ ۱۴۰۱ھ/ ۱۹۸۱ء میں، اردو میں 'مخزن فیضان'، کے نام سے اس کی تلخیص لکھی، یہ دونوں کتابیں جمعیت علماء سکندریہ کی جانب سے چھپ چکی ہیں۔ اس کے علاوہ خلیفہ محمود رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کے مختلف خطوط کو یکجا کیا جنکی تعداد ۴۶ ہے جو گیارہ مختلف لوگوں کو لکھے گئے ہیں۔ ان خطوط پر محترم جناب نذر حسین صاحب سکندری سنہ ۱۹۹۴ء میں سندھ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کر چکے ہیں اور وہ مدرسہ صبغۃ الھدیٰ شاہپور چاکر کی طرف سے ۱۹۹۶ء میں طبع ہو چکے ہیں۔ نیز آپ نے حضرت پیر صاحب علی گوہر شاہ اصغر کے ایماء اور ارشاد پر تقریباً ۱۲۵۲ھ کے بعد حضرت محمد راشد روضہ والا کے قادری اور نقشبندی طریقہ کی تشریح و توضیح کے لیے فارسی میں 'المحبوبیۃ المحمودیۃ' تصنیف کی، جس کا سندھی منظوم ترجمہ مخدوم حامد نے لکھا اور سنہ ۱۳۱۲ھ میں حافظ رکن الدین کے مطبع فیض سبحانی کوٹری سے طبع ہوا۔

سنہ ۱۲۵۸ھ میں خلیفہ صاحب نے فارسی میں "گلشن اولیاء" لکھی جو حدیقۃ الاولیاء (سال تصنیف ۱۰۱۶ھ) کے بعد کے دور کے مقامی اولیاء کے تذکرے پر مشتمل تھی۔ آپ نے حضرت روضہ دھنی کے علاوہ تین صاحبان مسند و ارشاد کا دور دیکھا اور پیر پاگارا ثالث سید حزب اللہ شاہ راشدی مسکین الملقب بہ 'تخت دھنی' (۱۸/شوال ۱۲۵۸ - ۵/محرم ۱۳۰۸ھ) کے دور میں ۹/ ربیع الاول سنہ ۱۲۶۷ھ کو وصال فرمایا۔ آپ کا مزار پر انوار 'کڑیو گہنور' تحصیل گولاڑچی (فاضل راہو) ضلع بدین میں ہے۔

خلاصۂ مطالعہ: 'مکتوبات شریف ۽ سوانح حیات سید محمد راشد روضي ڌڻي' ص۱۲۵- ۱۴۵

مقدمہ اصغر سائیں جو کلام' ص ۱۲-۱۳، ۱۸ (مترجم)

(۱۸۷۳ء) یا اس سے قبل پہلی مرتبہ بمبئی سے طبع ہوئی۔

۱۵- زیور نامہ: مخدوم فضل اللہ پاٹائی نے سنہ ۱۲۷۸ھ میں تصنیف کیا۔

۱۶- موت نامہ: ہشت کتابی مجموعہ میں مطبع علوی بمبئی سے ۱۳۲۷ھ (۱۹۰۹ء) میں طبع ہوا۔

۱۷- کتاب انیس المتقین: سندھی منظوم، ۱۲۸۵ھ سے قبل تالیف ہوئی۔

۱۸- حکایۃ الصالحین: اخلاقی تعلیم و تربیت کے لیے مولوی ولی محمد نے سنہ ۱۲۲۰ھ (۱۸۰۵ء) میں سندھی ترجمہ کیا، اور ۱۲۸۷ھ (۱۸۷۰ء) سے قبل مطبع محمدی بمبئی سے طبع ہوا، ۵۷۸صفحات پر مشتمل بڑی کتاب ہے۔

۱۹- معراج المؤمنین: شیخ عبدالرسول حجازی نے سندھی میں رسالہ تصنیف کیا (محمد صدیق نصرپوری نے اس رسالہ کی عبارت نقل کی ہے، جس کا ذکر سید علی محمد شاہ دائرائی نے اپنی بیاض میں کیا ہے)

۲۰- منہاج الزاہدین و سراج العابدین سندھی: محمد نامی عالم کا تالیف کردہ۔ (نور نامہ کے ساتھ شائع شدہ)

سماجی اصلاح:

۱- مُلِکی (مُلّاؤں کی) سندھی: (کم علم انجان مُلّاؤں کی طرف سے فضول خیالات اور رباتوں کی ہمت افزائی کرنے پر تنقید) سنہ ۱۱۶۰ھ / ۱۷۴۷ء میں محمد شریف رانی پوری(۱) کی تصنیف کردہ۔

---

(۱) مولانا دین محمد وفائی صاحب نے لکھا ہے کہ محمد شریف رانی پوری شاعر، عالم، محدث، صوفی اور بارھویں صدی ہجری کے درویشوں میں سے تھے۔ ان کی یہ نظم چھوٹے رسالہ کی صورت میں مخدوم عبدالرحیم گرہوڑی کے مجموعہ رسائل میں شامل ہے جس کی وجہ سے عام لوگ اسے محمد شریف کے بجائے 'گرہوڑی کی سندھی' سمجھتے ہیں۔ وفائی صاحب نے اس نظم سے بطور نمونہ کچھ اشعار درج کرکے اس کے متعلق لکھا ہے کہ: ''اس رسالہ میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ 'مُلّاؤں' نے قرآن و حدیث کو چھوڑ کر فقہ پر زور دیا ہے اور جعلی و مصنوعی مسائل بنا کر مخلوق کو گمراہ کیا ہے وغیرہ''۔

مزید لکھا ہے:

''تمام رسالہ میں بڑی حد تک علماء سُوء کی مذمت کی گئی ہے اور صوفیاء کرام کی تابعداری پر زور دیا گیا ہے اور کہیں کہیں حد سے گزر کر غیر صحیح باتیں بھی کی گئی ہیں''

اس نظم کے آخری دو شعر یوں ہیں:

مرھي محمد شريف کي ڏسي ڏوهہ فضلن — مانٽ جنهن جا اصلي رانٽي پور رهن

رسالو راس ٿيو منجهہ اٺويهہ ڏينهن — يارهن سو گزريا سائيڪو ورهن

یعنی اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے محمد شریف کے گناہ معاف فرمائے، جس کے عزیز و اقارب اصل رانی پور کے رہائشی ہیں۔ یہ رسالہ انیس دنوں میں مکمل ہوا اور گیارہ سو ساٹھ برس گزر چکے تھے۔

وفائی صاحب نے لکھا ہے کہ ان کی یہ نظم 'مُلّن جي سنڌي' کے نام سے مشہور ہے۔

تذکرۂ مشاہیر سندھ، جلد اول، ص ۱۶۵-۱۶۸ (مترجم)

کارَھ سوٗ گذرئا، ٻيو سائيکو ورھن
[گیارہ سو گزرے، دیگر ساٹھ برس ۔]

بتاریخ ۶ رصفر ۱۳۱۰ھ مطابق ۲۹ر اگست ۱۸۹۲ء کو قاضی میاں نور محمد صاحب سانونی نے اپنے پریس سے لیتھو پر طبع کی۔

۲- نصیحت نامہ: مُضر سماجی رسومات او ران کے نتائج کے بارے میں ، مخدوم عبداللہ کا تصنیف کردہ، ۱۲۹۰ھ (۱۸۷۳ء) یا اس سے قبل بمبئ سے طبع ہوا، او ردوسری مرتبہ ۱۳۲۷ھ (۱۹۰۹ء) کو ہشت کتابی مجموعہ میں مطبع علوی بمبئ سے طبع ہوا۔

۳- تنبیہ الجاھلین: مخدوم عبداللہ کی منظوم سندھی میں تصنیف ، جو سنہ ۱۲۹۰ھ ر۱۸۷۳ء یا س سے قبل بمبئ سے طبع ہوئی ، اس کے بعد سنہ ۱۳۳۶ھ ر ۱۹۱۷ء میں مطبع نامی کریمی بمبئ سے نیز مفید عام پریس لاہور سے طبع ہوئی۔ ۔

۴- تنبیہ الغافلین: مصنف محمد اسماعیل (؟)، سنہ ۱۲۹۱ھ (۱۸۷۴ء) میں مطبع حیدری بمبئ سے طبع ہوئی ۔

۵- جاہلوں کو تنبیہ: تصنیف مخدوم غلام محمد بُگائی ، جسے قاضی نور محمد قریشی ہالائی نے طبع روایا۔

۶- حقوق الزوجین: (خانگی زندگی عمدہ نمونہ سے بسر کرنے کے لئے میاں او ربیوی کو بحت) ہشت کتابی مجموعہ میں مطبع علوی بمبئ سے سن ۱۳۲۷ھ (۱۹۰۹ء) میں طبع ہوئی۔

بّ:

۱- حکیم محمد جعفر نے رمضان ۱۲۶۴ھ (۱۸۴۸ء) میں طب پر ''مفید الخلق'' نامی کتاب ڌھی میں منظوم کی، جو'' طب جعفری'' کے نام سے ۱۲۹۴ھ اور ۱۳۰۳ھ میں ، نیز اس کے بعد ئ سے شائع ہوئی۔

۲- طب جعفری، منظوم، غالبًا مندرجہ بالا کتاب یا اس کے انتخاب کو (الف اشباع کے بہ پر) منظوم کیا گیا۔

۳- تحفۃ المجربات سندھی، طبع مرغوب ہردیار بمبئ سے ۱۸۷۷ء (۱۲۹۴ھ) میں طبع ہوئی ۔

یذات:

۱- مجمع الفوائد: تعویذات او رفالنامہ ، ۱۲۸۷ھ (۱۸۷۰ء) سے قبل دونوں کتابیں مطبع ا بمبئ سے ایک ساتھ طبع ہوئیں۔

۴- کتابوں کے تراجم کا سلسلہ شروع ہونا:

اس دور میں سندھی زبان میں تعلیمی تحریک کی کامیابی نے سندھی زبان کی ترقی اور توسیع کے لئے راہ ہموار کی اور سندھی میں پڑھنے پڑھانے کے ذوق کو تقویت بخشی۔ نتیجے کے طور پر نہ صرف سندھی میں درسی، علمی اور عام مطالعہ کی کتابیں تصنیف ہوئیں بلکہ کتابوں کے تراجم کا سلسلہ بھی شروع ہوا: نہ صرف عربی اور فارسی سے سندھی میں کتابیں ترجمہ ہوئیں بلکہ سندھی کے اعلیٰ فکری مواد کا بھی عربی اور فارسی میں ترجمہ ہوا۔

(الف) سندھی تحریری مواد کا عربی و فارسی میں ترجمہ ہونا:

بلندی فکر اور اعلیٰ معیار کے لحاظ سے اس دور میں سندھی زبان میں ایسا اہم مواد ظہور پذیر ہوا، جسے وسیع علمی حلقوں میں روشناس کرانے کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے اس کا فارسی و عربی میں ترجمہ کیا گیا۔

۱- محمد رضا ٹھٹوی نے اپنے مرشد میاں شاہ کریم کے سندھی اشعار، اقوال اور ہدایات کو سنہ ۱۰۳۸ھ (۱۶۲۸ء) میں ''بیان العارفین'' کے نام سے فارسی میں لکھ کر محفوظ کیا۔

۲- مخدوم عبدالرحیم گرہوڑی (شہادت ۱۱۹۲ھ/۱۷۷۸ء) نے اپنے مرشد حضرت خواجہ محمد زمان کے سندھی
اشعار کا عربی میں ترجمہ کیا اور ان کی تفسیر لکھی۔

۳- مخدوم فضل اللہ پاٹائی نے سید علی محمد شاہ کی سندھی کتاب ''مصلح المفتاح'' کی علمی اہمیت کے پیش نظر سنہ ۱۲۸۴ھ/ ۱۸۶۷ء میں اس کا ''اصلاح المصلح والمفتاح'' کے نام سے فارسی میں ترجمہ کیا۔

(ب) عربی و فارسی کتابوں کے سندھی میں تراجم ہونا:

اس دور میں نہ صرف سندھی میں کتابیں تصنیف ہوئیں، بلکہ دوسری زبانوں کی کتابوں کے بھی سندھی تراجم کئے گئے۔ ان تراجم کا اہم مقصد یہ تھا کہ کتابوں کے تحت اللفظ ترجمہ کے بجائے شروع سے آخر تک ان کا واضح مطلب اور مفہوم آسان سندھی زبان میں سمجھایا جائے۔ اس سلسلے میں درج ذیل تراجم مشہور و معلوم ہیں۔

۱- آخوند عزیز اللہ متعلوی (۱۱۶۰-۱۲۴۰ھ/ ۱۷۴۶-۱۸۲۴ء) نے ''قرآن مجید مترجم سندھی'' کے عنوان سے قرآن شریف کا تحت اللفظ ترجمہ کیا، جو ۱۲۹۳ھ (۱۸۷۷ء) میں پہلی مرتبہ (؟) بمبئی سے طبع ہوا۔

۲- مخدوم عبداللہ نے عربی کتاب ''شرح سراج المنیر'' کا '' قمر المنیر'' کے نام سے سندھی میں ترجمہ کیا(۱)۔

۳- مولوی احمد نے مُلّا حسین کاشفی کی فارسی کتاب ''روضۃ الشہداء'' سے سنہ ۱۱۷۲ھ(۵۹-۱۷۵۸ء) میں ''روضۃ الشہداء سندھی'' تیار کی۔ (جو مطبع کریمی بمبئی سے ۱۳۲۱ھ میں طبع ہوئی، ۴۶۳ صفحات کی بڑی کتاب ہے)

۴- قصص الانبیاء، جو اصل فارسی میں تھی، مولوی محمد حسین نے شعبان سنہ ۱۱۷۷ھ (۱۷۶۳ء) میں اس کا ''سیر بستان'' کے نام سے سندھی میں ترجمہ کیا۔

۵- فالنامہ، فارسی سے سندھی منظومہ کی صورت میں ترجمہ۔ (ادارۂ سندھیات میں اس کا قلمی نسخہ 22702 نمبر پر موجود ہے)۔

۶- مخدوم عبد السلام نے ترمذی کی کتاب ''شمائل نبویؐ'' کا جمادی الثانی سنہ ۱۱۹۷ھ(۱۷۸۳ء) میں سندھی منظوم ترجمہ مکمل کیا۔ حضور پاک ﷺ کی صورت و سیرت کا تفصیلی احوال ہے، کتاب بڑی تختی کے ۲۹۶ صفحات پر لیتھو پر طبع ہوئی۔

۷- فرائض الاسلام سندھی: مخدوم محمد ہاشم کی عربی کتاب فرائض الاسلام کا علی بن حافظ (ذات بیجورو، جس کے متعلق مشہور ہے کہ وہ سَن کے قریب قریہ چھچھر کے ساکن تھے) نے سنہ ۱۱۷۷ھ (۱۷۶۳ء) میں ۱۲۶۲ صفحات پر مشتمل سندھی ترجمہ کیا۔ اس کا قلمی نسخہ برٹش لائبریری لندن میں موجود ہے۔

۸- فرائض الاسلام سندھی: مخدوم محمد ہاشم کی عربی کتاب فرائض الاسلام کا مکمل سندھی ترجمہ۔ اس کے پہلے حصے کا ترجمہ مخدوم عبداللہ اور دوسرے حصے کا ترجمہ مخدوم عبداللطیف نے سنہ ۱۱۸۱ھ/۶۸-۱۷۶۷ء میں کیا۔

۹- سراجی سندھی: علم میراث یعنی ورثہ، ترکہ کے بارے میں عربی کتاب 'سراجی' کا سندھی

---

(۱) محمد صدیق میمن صاحب نے قمر المنیر کے متعلق ایک جگہ پر لکھا ہے کہ: ''قمر المنیر کے ابتدائی اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب جب بعض عزیزوں اور دل خواہ دوستوں کی وفات اور قریبی رشتہ داروں کی رنجش اور عداوت کی وجہ سے بہت غمگین اور ملول رہنے لگے۔ اس وقت آپ نے اپنے دلی سکون اور ڈھارس کے لیے قمر المنیر کتاب لکھی''۔ اس کے بعد کچھ آگے چل کر میمن صاحب لکھتے ہیں کہ: ''اصل عربی زبان میں شرح سراج المنیر کتاب حضرت پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پاکیزہ زندگی کی معتبر تاریخ اور سیرت کی کتاب ہے، اسے میاں عبداللہ نے سندھی میں منتقل کر کے اس کا نام ''قمر المنیر'' رکھا ہے۔''

دیکھیے: ''سندھ جی ادبی تاریخ''، ص: ۸۷-۸۸ (مترجم)

ترجمہ مذکورہ بالا عالم علی بن حافظ نے سنہ ۱۱۶۲ھ (۱۷۴۹ء) میں کیا(۱)۔

۱۰- مخدوم عبدالخالق نے اسلامی مسائل کے بارے میں ابوالدرداء طبرانی کی عربی کتاب 'الطریقۃ المحمدیہ' کا سنہ ۱۱۵۷ھ (۱۷۴۴ء) میں 'مطلوب المؤمنین' کے نام سے آسان سندھی میں ترجمہ کیا، جس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔

۱۱- عبدالرحمٰن بن محمد ملوک ڪاٽ ہانيڻ (کاٹھ = بانبھن = برہمن)(۲) نے، میاں شاہ کریم کے فارسی ملفوظات 'بیان العارفین' کا ۱۲۱۰-۱۲۱۳ھ (۱۷۹۵ء۔۱۷۹۸ء) کے تین سالوں میں سندھی ترجمہ کیا،(۳) جسے ۱۲۹۱ھ میں مخدوم عبدالصمد نورنگ پوتہ نے مختصر کیا او راس کی اصلاح کی اور ۲۷رجب سنہ ۱۲۹۳ھ میں اسے مطبع مرغوب ہردیار بمبئی سے طبع کروایا۔

۱۲- مخدوم فتح محمد سندھی کی فارسی کتاب 'مفتاح الصلوٰۃ' کا مخدوم محمد انور لاڑائی نے سندھی میں ترجمہ کیا، جس کا ذکر علی محمد شاہ نے کیا ہے: علی محمد شاہ کی طرف سے اس ترجمہ کے حوالہ دینے سے ظاہر ہے کہ یہ ترجمہ 'مصلح المفتاح' کی تصنیف ۱۲۷۰۔۱۲۷۷ھ سے پہلے ہوا۔ نیز اس کا ذکر مخدوم فضل اللہ پاٹائی نے بھی کیا ہے ۔ لاڑائی صاحب کا یہ ترجمہ ۱۳۰۲ھ (۱۸۸۴-۱۸۸۵ء) سے قبل مطبع فتح الکریم بمبئی نے طبع ہوا۔

۱۳- شیخ عثمان انصاری کی اصل فارسی کتاب کا حامد بن حسن نے شعبان سنہ ۱۲۴۳ھ (۱۸۲۷ء) میں ''قوۃ العاشقین با عشقیہ'' کے نام سے ترجمہ کیا۔ جو سنہ ۱۹۱۵ء میں شکار پور کے کتب فروش شولداس کی طرف سے طبع ہوا۔

۱۴- محمد عارف 'صنعت' شکار پوری متوفی ۱۲۶۶ھ نے(۴) شیخ مصری کی فارسی کتاب 'کریما' کا منظوم ترجمہ کیا۔

---

(۱) غالباً یہ وہی کتاب ہے جو اس سے قبل ذیلی عنوان ''دین اسلام'' کے تحت بیسویں نمبر پر 'تسہیل الفرائض' کے نام سے ذکر ہو چکی ہے۔ (مترجم)

(۲) ذات کا نام ہے۔ (مترجم)

(۳) ڈاکٹر عبدالغفار سومرو صاحب نے لکھا ہے کہ ڪاٽ ہانيڻ کا یہ ترجمہ منظوم تھا۔

دیکھیے: بیان العارفین وتنبیہ الغافلین، دیباچہ ص:۰۱ (مترجم)

(۴) محمد عارف 'صنعت' بن محمد امین، ذات اعوان، انیسویں صدی کے اوائل میں تالپور امراء اور افغانیوں کی جنگ و جدل کے دور میں تقریباً ۱۸۰۰ء میں شکار پور میں پیدا ہوا، ان کے آباء شکار پور میں داؤد پوتوں کے عہدِ حکومت میں پنجاب سے نقل مکانی کرکے آئے تھے۔

'صنعت' نے شکار پور کے معروف عالم، صاحب دیوان اور خوشگو شاعر علامہ اویس محمد سے دینی علوم کی تکمیل کی اور اس کے بعد استاد ہی کے مدرسہ میں پڑھاتے رہے چونکہ آپ کا آبائی پیشہ خیاطی (درزی) تھا اس لیے استاد کے وصال کے بعد درس و تدریس ترک کرکے آبائی پیشہ اختیار کیا اور خیاطی میں کمال حاصل کرنے کے بعد مستقل طور پر خیمہ دوزی کے ہنر سے وابستہ ہوگئے، اس میں بھی آپ نے بڑا کمال حاصل کرلیا کہ حاکمانِ وقت آپ کی طرف رجوع کرنے لگے، جس وجہ سے آپ کی گزر اوقات بہت عمدہ طریقے سے ہونے لگی۔

۱۵- شیخ عبدالصمد کی عربی کتاب 'انیس المتقین' کا سنہ ۱۲۸۵ھ (۱۸۶۸ء) سے قبل 'انیس المتقین' ہی کے نام سے سندھی منظوم ترجمہ ہوا۔ جس کا قلمی نسخہ ''فقیر سومار ابن اسحٰق ساکن شہر ونجان مُلک کچھ ۱۲۸۵ھ'' کا تحریر کردہ موجود ہے۔

۱۶- محمد مقیم نامی عالم نے 'تفسیر خواب' فارسی کا سندھی میں ترجمہ کیا۔

۱۷- عبدالصمد ولد حاجی محمد مقیم نورنگ پوتہ نے، مخدوم فتح محمد سندھی کی فارسی کتاب 'مفتاح الصّلوٰۃ' کا سندھی ترجمہ بنام 'مفتاح الصّلوٰۃ سندھی' ۱۵ر محرم ۱۲۸۸ھ (۱۸۷۱ء) کو مکمل کیا، بعد میں قاضی عبدالرحیم ساکن کوٹ عالمی نے مزید اصلاح کر کے اسے ۱۷ر ذی الحج ۱۲۹۳ھ کو مکمل کیا۔

۱۸- قاضی عبدالحکیم (ہالہ کنڈی والے) نے سنہ ۱۲۸۰ھ سے قبل ہندوستان کے عالم محمد ہادی کی ''کتاب ردِّ نصاریٰ'' کا اردو سے سندھی میں ترجمہ کیا۔

۱۹- عیسیٰ بن موسیٰ نے، میر امن دہلوی کی فارسی سے اردو ترجمہ 'قصہ چہار درویش' کا ذی الحج ۱۲۶۲۔ ربیع الاول ۱۲۶۳ھ (۱۸۴۶ء) کے عرصے میں 'قصو چار درویش' کے نام سے سندھی میں ترجمہ کیا۔(۱)

۵۔ تجرباتی تحقیقی نتائج کو سندھی میں شائع کرنا:

موضوع کی علمی معرفت اور اس کے ساتھ عربی و فارسی نیز سندھی زبان میں مہارت کے لحاظ سے اس دور کے سندھی علماء کا علمی معیار بہت بلند تھا۔ ان کی اس اعلیٰ قابلیت نے نہ صرف ان کے تحقیقی معیار کو بلند کیا بلکہ اس کے ساتھ سندھی لغت کے استعمال خواہ عبارت و بیان میں صحت اور وسعت بھی پیدا کردی۔ مثلاً ابوالحسن کی کتاب 'مقدمۃ الصلوۃ' (ابوالحسن جی سندھی)، مخدوم محمد ہاشم کی کتاب 'بناء الاسلام' اور 'ذبح و شکار' اور علی نامی عالم کی تصنیف 'تسہیل الفرائض'

(گزشتہ سے پیوستہ) علامہ اویس محمد کے انتقال کے بعد آپ کا شعر و شاعری سے شغف کم ہوگیا، اس دوران حضرت حاجی شاہ فقیر اللہ علوی ۱۱۰۰ - ۱۱۹۵ھ (۱۶۸۹ - ۱۷۸۱ء) کے فیض یافتہ اور فارسی کے بہت قابل شاعر آخوند صاحبڈنہ متخلص 'صاحب' کی صحبت میں پھر سے شعر و سخن کی طرف متوجہ ہوئے۔ ابتداء میں تخلص 'عارف' تھا لیکن بعد میں اپنے پیشہ خیمہ دوزی کی مناسبت سے 'صنعت' تخلص اختیار کیا۔

آپ نے ۲/ صفر ۱۲۶۶ھ (۱۸۴۹ء) کو وفات پائی اور شکارپور میں امین شاہ چشتی کے قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے۔ آپ نے فارسی زبان میں ایک مثنوی بنام 'ناگہاں' اور ایک عدد دیوان یادگار چھوڑے ہیں، جس میں ۲۱۶ غزل، ۱۲ قصائد اور کچھ رباعیاں، مخمس اور قطعات وغیرہ ہیں۔ آپ کا کلام بہت پختہ بڑا رنگین اور ایرانی شعراء کے ہم پلہ ہے۔

دیکھیے: 'تذکرہ مشاہیر سندھ' جلد اول، ص ۲۱۴ - ۲۱۵

'دیوان صنعت' مقدمۂ مرتب، ص 'ہ' - 'لب' (مترجم)

(۱) غالباً یہ اردو کتابوں کا سب سے قدیم سندھی ترجمہ ہے۔ (مترجم)

میں موضوعات اور مسائل کے بارے میں کی گئی علمی تحقیق صحت اور جامعیت کے اعتبار سے مثالی اور معیاری ہے۔

اس کی ایک خاص مثال مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی کی اس تجرباتی تحقیق میں ملتی ہے جو انہوں نے 'عین نصف النہار' (خاص دوپہر) کے سایہ ڈھلنے اور بڑھنے کے متعلق کی، اور جسے بیان کرنے میں پرانی سندھی زبان یا خود مصنف کے دور میں ٹھٹہ میں رائج سندھی زبان کے لغات کی انوکھی مثالیں موجود ہیں۔

سایہ ڈھلنے کے لحاظ سے نماز ظہر کا وقت مقرر کرنے پر تحقیق :

ہر نماز مقرر وقت ہی پر پڑھی جاتی ہے، ظہر نماز کا وقت نصف النہار ہوتے ہی سورج ڈھلنے (''زوال'') کے ساتھ شروع ہوتا ہے اور بڑھتے ہوئے ''سائے کے مقرر طول رلمبائی'' پر مکمل (ختم) ہوتا ہے۔ نصف النہارؔ کے بعد سائے کے معمولی جھکاؤ سے ہی سورج ڈھلنے کو ہر ایک بآسانی معلوم کرسکتا تھا، لیکن اس دور میں یہ سوال پیدا ہوا کہ ظہر نماز کے آخری وقت کی مقرر حد کو ڈھلے ہوئے سائے کے لحاظ سے کس طرح پہچانا جائے؟ ایک ہزار برس قبل جب 'گھڑیاں' اور 'گھنٹے' ایجاد نہیں ہوئے تھے اور وقت کو محض سایہ ڈھلنے سے ہی پہچانا جاتا تھا اس وقت ائمہ فقہ نے نماز ظہر کے وقت کی آخری حد کے لئے یہ ضابطہ مقرر فرمایا:

آخر وقت ظہر تا آنکہ رسد سایہ ہر چیز بدو برابر او
سوائے فیٔ الزوال نزد ابی حنیفہ۔ و بہ یک برابر او سوائے
فیٔ الزوال نزد صاحبیہ و شافعی و احمد۔

[نماز ظہر کے آخری وقت کی حد ابو حنیفہ کے نزدیک یہ ہے کہ کسی بھی چیز کا سایہ اس چیز کے نصف النہار کے سائے کے بعد بڑھ کر اس کے قد سے دگنا (دہرا) ہوجائے جبکہ صاحبین (امام ابو یوسف اور امام محمد)، امام شافعی اور امام احمد کے بقول وہ سایہ بڑھ کر اس چیز کے قد کے برابر ہوجائے]

اس ضابطہ کی رو سے کسی بھی چیز کے طول کو اور نصف النہار کے بعد اس چیز کے ڈھلے ہوئے سایہ کے طول کو سمجھنا ضروری تھا۔ اس کے لئے فقہاء نے ڈھلتے سائے کے متعلق تحقیق کر کے اس ضابطہ کو آسان بنایا: انہوں نے ہر شخص کے اپنے قد کے لحاظ سے ڈھلتے سائے کی ماہانہ اوسط (AVERAGE) لمبائی کی پیمائش خود اس شخص کے اپنے قدم یا پَیر، (پاؤں) کی لمبائی کے حساب سے مقرر کی؛ تاکہ ہر شخص اپنا ڈھلتا ہوا سایہ خود ہی قدم قدم اٹھا کر ناپ سکے او

رمندرجہ بالا ضابطے کی رو سے ظہر نماز کا آخری وقت معلوم کر سکے ۔ یہ ماہانہ اوسط لمبائی شمسی مہینوں کے حساب سے بیان کی گئی، کیونکہ ہر شمسی سال کے اسی مہینے میں اسی جگہ پر سورج کا سایہ اندازاً اسی ناپ کا رہتا ہے۔ سندھ کے کسی عالم نے پرانے زمانے میں اس ماہانہ اوسط لمبائی کی جدول (زائچہ) کو سندھی مہینوں کے ناموں اور حساب سے درج ذیل طور پر منظوم کیا:

اٺ ڏنائين 'پوھ' کي، اٺ ڏنائين 'ماھ'
ڇھہ ڏنائين 'ڦڳڻ' کي، چار ڏنائين 'چيٽ'
ٽي ڏنائين 'وهاڱ' کي، ٻہ ڏنائين 'جيٺ'
هڪ ڏنائين 'آکاڙ' کي، 'ساوڻ' ڏنائين هيڪ
ٻہ ڏنائين 'بدري' کي، ٽي 'اَسُوءَ' کي
چار ڏنائين 'ڪَتي' کي، ۽ ٻہ 'نهاري' کي
پڻ وري وڌائين مٿان ٽي 'ساڍ' سين کي

[یعنی 'پوہ' اور 'ماگھ' کے مہینوں میں آدمی کا اپنا سایہ دوپہر کے بعد ڈھل کر لمبائی میں خود اس کے آٹھ پاؤں کے برابر ہو اس وقت تک ظہر کا وقت موجود ہے ۔ اور 'پھاگن' میں چھ پاؤں اور 'چیت' میں چار پاؤں کے برابر۔ 'ویساکھ' مہینے میں تین پاؤں کے برابر اور 'جیٹھ' مہینے میں دو پاؤں کے برابر، 'اساڑھ' اور 'ساون' کے مہینے میں ایک ایک پاؤں کے برابر۔ 'بھادوں' کے مہینے میں دو پاؤں اور 'اسو' میں تین پاؤں کے برابر۔ 'کتی' کے مہینے میں چار پاؤں اور 'مگھر' میں دو پاؤں کے برابر۔ نیز تمام مہینوں میں پاؤں کا نصف یعنی 'ساڑھے' کی پیائش بڑھائی جا سکتی ہے]

ایک اور سندھی بزرگ نے کسی دوسری ماہانہ اوسط جدول (زائچہ) کو یوں منظوم کیا:

اٺين پيرين پوھ ڦڳڻ، ڇهين نهاري چيٽ
چئين ڪتي وهاڱ، ٽئين اسو جيٺ
ٻين بدرو آراڙ، ڏيڍ ماھ، ساوڻ هيڪ
ساڍ سيني اگري ڏيئي ڪجي ڇيٽ

[پوہ اور پھاگن دونوں مہینوں میں آدمی کا اپنا سایہ دوپہر کے بعد ڈھل کر جب تک لمبائی میں اس کیا پنے آٹھ پاؤں کی ناپ کے برابر لمبا ہو اس وقت تک ظہر نماز کا وقت ہے، اور جب وہ لمبائی ختم ہو گئی (یعنی آٹھ پاؤں کی پیائش سے بڑھ گئی) تو ظہر نماز کا وقت ختم ہو گیا۔ اسی طرح مزید دوسرے مہینوں کے لئے یہ لمبائی اس طرح دی گئی ہے کہ: 'مگھر' اور 'چیت' دونوں مہینوں کے لئے چھ پاؤں، 'کتی'، اور 'ویساکھ' دونوں مہینوں کے لئے چار پاؤں، 'اسو' او ر 'جیٹھ' دونوں

مہینوں کے لئے تین پاؤں ۔'اساڑھ' اور'بھادوں' دونوں مہینوں کے لئے دو پاؤں۔'ماگھ' مہینے کے لئے ڈیڑھ پاؤں او'ساون' کے لئے ایک پاؤں کے برابر سایہ رہے تو ظہر کا وقت ہے۔ لیکن مذکورہ بالا تمام اندازوں میں'ساڑھے' (نصف پاؤں) کے برابر ناپ بڑھائی جاسکتی ہے۔

پیمائش کے اعتبار سے دونوں جدولوں (زائچوں) میں فرق ہے۔ یہ زائچے شاید سندھ سے باہر کسی دوسرے ملک کے لئے وہاں کے علماء نے عربی و فارسی عبارت میں لکھے تھے جنہیں سندھی زبان میں منظوم کیا گیا۔

تاریخی اعتبار سے یہ منظومات پرانے دور کے ہیں، اس لحاظ سے سندھی تحریر کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں ۔ممکن ہے کہ یہ منظومات دسویں یا گیارہویں صدی ہجری (۱۶۔۱۷ ویں صدی عیسوی) کے ہوں، کیونکہ ۱۲ ویں صدی ہجری کے اوائل یعنی سن ۱۱۳۳ھ (۱۷۲۱ء) میں ظہر نماز کا وقت معلوم کرنے کی خاطر سائے کے حساب کے متعلق تصنیف کردہ(۱) اپنی کتاب میں مخدوم محمد ہاشم نے ان منظومات کونقل کیا ہے۔مخدوم صاحب نے ان دونوں منظومات میں مذکورہ جدولوں (زائچوں) کو غلط قرار دیا ہے کیونکہ بقول آپ کے یہ جدولیں (زائچے) سندھ سے مطابقت نہیں رکھتیں ۔ غالبًا یہ کسی دوسرے ملک کے لئے عربی یا فارسی میں لکھی گئیں تھیں، جن کا بعد میں سندھ کے بزرگوں نے سندھی زبان میں ترجمہ کردیا، لیکن آپ نے ان سندھی مترجمین کا نام نہیں بتایا، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بزرگ کافی زمانہ پہلے ہوگزرے ہیں، البتہ ان کے یہ منظومات لوگوں کو یاد تھے اور عام مشہور تھے اسی وجہ سے مخدوم صاحب نے انہیں نقل کیا ۔ ان منظومات میں بعض سندھی مہینوں کے نام جس صورت میں لائے گئے ہیں اس سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ نام بہت پہلے رائج تھے۔'نہاری'(ناہری) 'ماہُ'(ماگھ) وہاءُ (ویساکھ) اورآراڑ(آکھاڑ) کافی پرانے نام ہیں جو ٹھٹہ کے علاقے میں رائج رہے ہیں ۔سندھی زبان کی قدیم لغت کی رُو سے، یہ دونوں منظومات ایک دستاویزی حیثیت رکھتے ہیں ۔ مخدوم محمد ہاشم نے ان دونوں نظموں کو ''ابیات سندیہ'' (سندھی بیت رشعر) کہا ہے۔

ان دونوں جدولوں (زائچوں) میں اغلاط کومحسوس کرتے ہوئے مخدوم محمد ہاشم نے بعد میں خود تحقیقی تجربہ کیا، وہ اس طرح کہ آپ نے ایک لکڑی گاڑ کر پورے ایک سال تک اس کے

---

(۱) مخدوم صاحب کی کتاب کا نام "رشف الزلال فِي فَيِ الزوال" ہے جو قلمی صورت میں موجود ہے۔ قاضی فتح الرسول نظامانی نے ازراہ مہربانی پیر جھنڈو لائبریری کے قلمی نسخہ سے راقم کے لئے ایک نقل تیار کی تھی جس میں یہ جدولیں اسی طرح درج ہیں۔ مخدوم صاحب کا خود اپنے ہاتھوں لکھا ہوا نسخہ موجود نہیں تاکہ اصلی متن کا صحیح اندازہ لگایا جاسکے۔

[واضح رہے کہ علامہ ڈاکٹر عبدالرسول قادری نے اس کتاب کا سندھی میں ترجمہ کیا ہے، جو جناب بلوچ صاحب کے پیش لفظ کے ساتھ سندھی لینگویج اتھارٹی حیدرآباد کی جانب سے ۱۴۱۵ھ/۱۹۹۴ء میں شائع ہوچکا ہے۔ (مترجم)]

نصف النہار (دوپہر) کے سائے کی لمبائی کو ناپتے رہے؛ دوسرے سال بھی وقفہ وقفہ سے ناپ لے کر پہلے سال کی پیائش کی تصدیق کرتے رہے۔ اس کے بعد آپ نے ان دونوں پیائشوں کی بنیاد پر ہر 'نصف ماہ' کی 'اوسط ناپ' نکالی اور جدول (زائچہ) تیار کی۔ اسی طرح ٹھٹہ اور نصر پور دونوں علاقوں کے لئے اس جدول کی تصدیق کر کے(۱)، پہلے اسے فارسی اور بعد میں سندھی میں یوں منظوم کیا(۲):

سايو اصلي ملڪ سنڌ جو سڻهو مؤمنا(۳)
لکي ڪريان پڌرو ڪارڻ ربَ رضا
ڪَيم محنت تِنه تي چوئيه ماه سچا(۴)
اڌ اڌ مهيني جا سَيَڪهين لکان پيرَ جدا(۵)

[اے مؤمنو! سندھ ملک کے سایۂ اصلی کا بیان سنو
جسے میں خدا کی رضا کی خاطر لکھ کر ظاہر کرتا ہوں
اس پر میں نے مکمل چوبیس ماہ تک محنت کی ہے
ہر نصف، نصف ماہ کے لئے پاؤں کا فاصلہ الگ الگ لکھتا ہوں۔]

ورهُ وِهي(۶) وهاڱ ڪنا، ڪريان شروع تِءا(۷)
پهرين اڌ ہر وهاڱ جي اڍائي پيرَ ٿين
پوئين اڌ ہر بہ ٽٽا، سٽي ياد ڪجن

[سال شروع ہوتے ہی 'ویساکھ' کے مہینے سے اس کا آغاز کرتا ہوں
'ویساکھ' مہینے کے نصف اول میں اڑھائی پاؤں فاصلہ ہوتا ہے

---

(۱) محسوس ہوتا ہے کہ اگرچہ مخدوم صاحب نے اپنا یہ تجربہ ٹھٹہ کے علاقہ میں کیا تاہم اس کے ساتھ ہی آپ نے نصر پور علاقہ میں بھی سائے کی پیائش لینے کے لئے کسی شخص کو مقرر کیا، اور بعد میں ان پیائشوں کو سامنے رکھ کر نتائج اخذ کیے۔

(۲) مخدوم صاحب نے کتاب کی فصل دوم میں فارسی نظم درج کی ہے، اور کتاب کے 'خاتمہ' میں مکمل جدول سندھی نظم میں لکھی ہے۔ اس نظم سے قبل 'خاتمہ' کی عبارت درج ذیل ہے:

"خاتمہ رسالہ در بیان تقدیر اقدام سایہ اصلی ملک سند بزبان سندیہ: باید دانستہ کہ آنچہ بعد از تحقیق و امتحان از سایہ اصلی ملک سند معلوم شد پیشتر آن را درابیات فارسیہ درج کردہ شد بود۔ کما تقدم فی الفصل الثانی ۔ والحال باز آں را درابیات سندیہ درج نمودہ می شود تسهيلا على المبتدين و تعميما للفائده بدیں طریقہ کہ:

(۳) سايو اصلي = نصف النہار (دوپہر) کا سایہ۔ سڻهو = سنو

(۴) چوئيه = چوبیس

(۵) پیر (پاؤں/قدم) = جوان آدمی کے پاؤں (قدم) کے عدد، اس کے پاؤں کی پیائش کے مطابق۔

(۶) یہ لفظ یائے مجہول کے ساتھ ہے۔ (مترجم)

(۷) ورہ وهي = سال شروع ہوتے ہی۔ وهاڱ ڪنا = ویساکھ کے مہینے سے تنا ۔ تنان، یعنی ویساکھ سے

اور 'ویساکھ' کے نصف آخر میں دو پاؤں کے برابر، اُسے سن کر یاد رکھنا چاہیئے ۔]

پھري اڏ کي جيٺ جي ڏيڍ پير ڏبو
پوپين اڏ کي تنه جي قدم هيڪڙو(۱)
اڏ ۾ پھري(۲) آراڙ جي اڏ پير پسجي(۳)
تھا پوءِ اچي سج برابر ٿيي، پاڇو ڪين رهي(۴)

[جیٹھ مہینے کے نصف اول کو ڈیڑھ پاؤں دیا جائے گا اور اس کے نصف آخر کو ایک پاؤں کا فاصلہ۔ اساڑھ مہینے کے نصف اول میں نصف پاؤں کا فاصلہ، اس کے بعد سورج بالکل اوپر ،سر کے برابر ہو جاتا ہے اور سایہ پڑتا ہی نہیں ۔]

نڪين پوپين اڏ ۾ آراڙ جي، نه ساوڻ سپ سُجي
جو ساوڻ لنگھي هليو تو وري سو وَڌي
اڏ پَسجي پير جو پنره(۵) ڏينه بڍري(۶)
پويان پنره تَنه جا سجو پير ٿئي

[اسی طرح اساڑھ مہینے کے نصف آخر اور پورے ساون مہینے میں ،سورج کا سایہ نہیں پڑتا ،ساون مہینے کے اختتام کے بعد ،سورج کا سایہ پھر بڑھنا شروع ہوتا ہے ۔ بھادوں مہینے کے نصف اول میں نصف پاؤں کا فاصلہ ہوتا ہے اور اس کے نصف آخر میں ایک پاؤں کا فاصلہ ہوتا ہے۔

اَسُو پھري(۷) اڏ 'ڏيڊ' ٿيي، پوپين ۾ پورا(۷)
ڪتي پنره پھرا پير ٽري، پويان چار هٿا

['اسو' کے نصف اول میں ڈیڑھ پاؤں کے برابر سایہ ہوتا ہے اور اس کے نصف آخر میں دو پاؤں۔ 'کتی' کے پہلے پندرہ دنوں مین سایہ تین پاؤں کے برابر اور آخری پندرہ دنوں میں چار پاؤں کی پیمائش کے برابر ہوتا ہے۔

(۱) قدم هيڪڙو= ایک پاؤں ،یعنی ایک پاؤں کی ناپ
(۲) یہ لفظ یائے مجہول کے ساتھ ہے۔(مترجم)
(۳) اساڑھ مہینے کے نصف اول میں اوسطاً سایہ 'نصف پاؤں' کے برابر نظر آتا ہے
(۴) اساڑھ مہینے کے نصف آخر میں سورج بالکل اوپر ،سر کے برابر (مقابل) (یعنی سر کے سامنے) ہوتا ہے، اس لئے نیچے سایہ پڑتا ہی نہیں ۔
(۵) پنره = پندرہ
(۶) 'اسو پھري اڏ' = اسُو مہینے کے نصف اول میں
(۷) یائے مجہول کے ساتھ ہے۔(مترجم)

پنج پھري(۱) اڌ نھاري جي، ساڍا پنج پُٺا(۲)
ڇھه پير پھري(۳) اڌ پوه جي، پوئين ڇه ساڍا
پھري اڌ ھہ ماهَ جي پورا ست ٽٺا(۴)
مور نه وڌي سنڌ ھہ سايو ستنِٺا(۵)
وري موٽي واڌ ڪَنا اچي ان ماگھا
ڦري ساڍا ڇه ٽٺا پوين اڌ ماھا(۶)

['نہاری' مہینہ کے نصف اول میں سایہ پانچ پاؤں اور نصف آخر میں ساڑھے پانچ پاؤں کے برابر ہوتا ہے۔'پوہ' مہینہ کے نصف اول میں چھ پاؤں اور نصف آخر میں ساڑھے چھ پاؤں کے برابر ہوتا ہے۔'ماگھ' مہینہ کے نصف اول میں پورے سات پاؤں کے برابر سایہ ہوتا ہے۔ سندھ میں سات پاؤں کی پیائش سے زیادہ سایہ نہیں بڑھتا، اور اس کے بعد اس میں کمی واقع ہونا شروع ہوتی ہے، اور 'ماگھ' کے نصف آخر میں سایہ ساڑھے چھ پاؤں کے برابر ہوجاتا ہے۔]

ڇه پير پھري(۶) اڌ ڦڳڻ جي، پوءِ ساڍا پنج ٽئي
ساڍا چار پھري(۶) پنرھين چيٽ جي، پوئين ساڍا ٽي
پاڇا ٻارھن ماھن جا اچي پُنا اي(۶)
پر پَوَنِ مڙئي اتر پار ڏانه، ڏکڻ ڪونه پوي(۷)
سڪي سي ياد ڪَرِھو ته آنْ ڪي رب تسي

[پھاگن مہینے کے نصف اول میں چھ پاؤں کے برابر سایہ ہوتا ہے،اس کے بعد ساڑھے پانچ پاؤں، چیت مہینے کے نصف اول میں ساڑھے چار پاؤں کے برابر سایہ ہوتا ہے اور اس کے نصف آخر میں ساڑھے تین پاؤں ۔ بارہ مہینوں (سال بھر) کے سائے (یعنی ان کا بیان) مکمل ہوئے ۔]

---

(۱) یائے مجہول کے ساتھ ہے۔(مترجم)
(۲) پُنا = آخری (پندرہ دن)
(۳) یائے مجہول کے ساتھ ہے۔(مترجم)
(۴) ماہ = ماگھ کا مہینہ
(۵) سایو = سایہ، پرچھائیں، چھاؤں، سات پاؤں کی پیائش سے زیادہ نہیں بڑھتا۔
(۶) ماگھ مہینے کے نصف آخر میں ۔
(۷) جس بھی چیز کا ،جن مہینوں میں زمین پر سایہ پڑتا ہے ، وہ اس چیز کی شمالی سمت پڑتا ہے، اس چیز کی جنوبی سمت نہیں پڑتا۔

البتہ یہ بات ذہن نشین رہے کہ بارہ ہی مہینوں میں سایہ تمام چیزوں کی شمالی جانب پڑتا ہے، جنوب کی طرف نہیں پڑتا۔ انہیں (یعنی ان کے اس تفصیلی بیان کو) سیکھ سمجھ کر یاد کریں تاکہ تمہیں رب پاک خوش رکھے۔

پرآنْ توکي چانْ ڳال جا، سٹيج سا ساري(۱)
تہ جني سادا اَٺ پير لکئا 'پوھ' کِينْ 'ماھ' مي(۲)
اُو کم نہ ايندي ڳالڙي مُوران سنڌين کي
سنڌ ۾ ستن پيرنُٿونْ پاڇو کِين وڌي
مگر کَھين ٻئي ملک سين جيکر هوند جُڙي(۳)

[لیکن میں آپ سے ایک بات کہتا ہوں اسے توجہ سے سنو! کہ جن لوگوں نے 'پوہ' یا 'ماگھ' مہینوں میں سائے کی مقدار ساڑھے آٹھ پاؤں لکھی ہے، ان کی یہ بات اہل سندھ کے لئے قطعاً کارگر نہیں۔ سندھ میں کبھی بھی سات پاؤں کی مقدار سے زیادہ سایہ نہیں ہوتا البتہ ان کی یہ بات کسی دوسرے ملک کے لئے ممکن ہوسکتی ہے کہ وہاں پر اس مقدار میں سایہ پڑتا ہو۔]

سايو سيني ملکن ۾ تفاوت کري(۴)
پڻ جَني ڏنو ساوڻ کي ڏيڍ پير سڄو
اِو نہ جڙندو سنڌ سين، چوکاري ڏسو(۵)
سنڌ منجھہ ساوڻ ماھ ۾ پاڇو مور نہ پوءِ
مگر قدر ٻن ٽِن آڱرين، جنھ اعتبار نہ کو(۶)

[ہر ملک کے نصف النہار (دوپہر) یا کسی بھی وقت کے سایہ کی لمبائی میں فرق ہوتا ہے، اس لئے جن لوگوں نے ساون مہینے میں سایہ کی مقدار ڈیڑھ پاؤں کے برابر لکھی ہے، ان کی یہ بات (کم از کم) سندھ میں درست ثابت نہیں ہوتی، آپ خود ہی اس کا تجربہ کر کے دیکھ لیں، سندھ میں ساون کے مہینے میں کسی بھی چیز کا سایہ بالکل نہیں پڑتا (نہیں ڈھلتا) بجز دو تین انگل کی مقدار کے، کہ جس کا کوئی اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ (یعنی اس معمولی فرق کو شمار نہیں کریں گے)]۔

---

(۱) آنْ = میں۔ چانْ = کہوں یا کہتا ہوں
(۲) 'پوہ' یا 'ماگھ' کے مہینوں میں
(۳) یعنی ممکن ہے کہ اس مقدار (سات پاؤں سے زیادہ) میں سایہ کسی دوسرے ملک میں پڑتا ہو۔
(۴) یعنی ہر ملک کے نصف النہار (دوپہر) کے سائے یا دوسرے کسی بھی وقت کے سائے کی لمبائی میں فرق ہوتا ہے۔
(۵) چوکاري ڏسو (چوکھارے ڈسو) = پرکھ کر تجربہ کر کے دیکھو۔
(۶) جنھ اعتبار نہ کو = جسے شمار نہیں کیا جائے گا، (یعنی اس معمولی مقدار کا اعتبار نہیں کیا جائے گا)۔

سٽي دين شريعت کي سکي ياد ڪرهو

ويندا سي(١) ايمان سين ڪلمو جن چيو

[دین شریعت کی باتیں سن کر انہیں یاد رکھو، وہی لوگ دنیا سے بحالتِ ایمان جائیں گے جو کلمہ پڑھیں گے۔]

اگرچہ مخدوم محمد ہاشم نے اپنے تجرباتی نتائج کو شروع میں فارسی زبان میں تحریر کیا، مگر اس کے ساتھ انہیں سندھی زبان میں بھی منظوم کیا۔ ان کی مندرجہ بالا نظم سن ۱۱۳۳ھ (۱۷۲۱ء) کی ہے، اس زمانے میں شاہ عبداللطیف بھٹائی کی عمر تقریباً اکتیس (۳۱) برس تھی۔ اس لئے یہ نظم بھی سندھی لغت و بیان کے اعتبار سے خاص اہمیت کی حامل ہے۔

۶- سندھی نثر میں عبارات اور کتابیں تحریر ہونے کا آغاز:

باب ہفتم میں بیان ہو چکا ہے کہ سندھ کے علماء و فقہاء نے دسویں صدی ہجری (۱۶۔ویں صدی عیسوی) ہی سے سندھی زبان کی بعض مخصوص اصطلاحات، فقروں اور جملوں پر بحث شروع کردی تھی، جو اس دور میں بھی جاری رہی۔ اس طرح یہ سندھی نثر کی وہ اصطلاحات، فقرے اور جملے تھے جو سب سے پہلے حیطۂ تحریر میں آئے۔ اس دور میں مخدوم ابوالحسن کی 'مقدمۃ الصلوۃ سندھی' (ابوالحسن جی سندھی) سے لے کر ایک نئی قسم کی ''نظم نما نثر'' رواج میں آئی، جس نے سادہ سندھی نثر کے لئے میدان تیار کیا۔ ان کتابوں میں سادہ سلیس نثری نمونہ کے 'منظوم بند' استعمال ہوئے (جن پر مزید روشنی ہم ذیل میں ڈالیں گے)، جن کی وجہ سے آگے چل کر سندھی نثر میں کتابیں لکھنے میں آسانی ہوئی۔ ''سندھ جی ادبی تاریخ'' (سندھ کی ادبی تاریخ) کے مصنف نے صحیح کہا ہے کہ مخدوم محمد ہاشم کی عربی کتاب ''فرائض الاسلام'' کے سندھی ترجمہ کی نظم بہت سادہ ہے: گویا محض نثر نما نظم ہے'' (۲)۔

'فرائض الاسلام' کے سندھی تراجم مخدوم محمد ہاشم کی وفات (۱۱۷۴ھ) کے بعد ہوئے لیکن اس سے بہت پہلے 'ابوالحسن جی سندھی' اور اس کے بعد بطور خاص مخدوم محمد ہاشم کی یکے بعد دیگرے تصنیف کردہ سندھی کتابوں۔ مثلاً زاد الفقیر (۱۱۳۰ھ)، راحۃ المؤمنین (۱۱۳۰ھ)، بناء الاسلام (۱۱۴۳ھ)، اور عقائد سندھی (۱۱۴۳ھ)۔ کے ذریعے نثری نمونہ کی نظم عام مقبول ہوئی، اور ۱۲ویں صدی ہجری (۱۸ویں صدی عیسوی) کے اولین پچاس سالوں میں سندھی نثر میں عبارات لکھنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ سنہ ۱۱۵۲ھ میں تحریر کردہ اسی سلسلہ کی ایک عبارت بطور مثال

(۱) یائے مجہول کے ساتھ ہے۔ (مترجم)

(۲) محمد صدیق میمن: 'سندھ جی ادبی تاریخ' حصہ اول، ص ۷۵

ذیل میں دی جاتی ہے(۱)۔

سن ۱۱۵۲ھ(۱۷۳۹ء) کی سندھی نثر میں تحریر کردہ عبارت:

وِيهَ كوريٌ سيد صاحِبَ ڏني(۲) واريٌ
ايڪيهٌ ئي جا پئيسا سُورهْ كوريٌ ساهوءَ
جي(۲) هَٿا اني(۲) ڏنيٌ اُهينْ ڪِڪا كي
ڇه كوريٌ صالحَ ڪَنا حسن كني وَهيُوْ اُه
ڇه كُوريٌ بازارِ ۾ ڇُوريْ(۲) كَٿِ مَنْجَا مُنْ ڏنيٌ
اي(۲) سَيَئي بابَ ٽئا كُوريٌ اُونَوَنجاهُ
سي(۲) سَپْ ڏِنِيٌ اُهينِ ڪِڪا كي مَنجْ وَرَ ڏِيَ
جي اَڏَ پا ١ جي(۲) ڪنْ كَنايُو تي(۲) ڪڪا ڪَنا اَڏِئي(۲) ديويرا

یہ عبارت ٹاٹ کی بوریوں کی تفصیل سے متعلق درج ذیل طور پر ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں بعض ہندو یا مسلمان دکان کا حساب کتاب بھی بنیوں کے حروف (ہندوانہ رسم الخط) کے بجائے سندھی رسم الخط میں لکھنے لگے تھے۔

[مندرجہ بالا نظم نما نثری عبارت کو موجودہ سندھی رسم الخط میں یوں تحریر کیا جا سکتا ہے]

ويهہ ڳوٽيون سيد صاحبڏني ۏاريون
ايڪيهن جا پئسا (ڏنا ويا) سورهن ڳوٽيون ساهُوءَ
جي هٽ تان آٽي ڏنيون آهين ڪڪا (ڪڪي) کي
ڇهہ ڳوٽيون صالح ڪَنا حسن ڪٽي ويو آه
ڇهہ ڳوٽيون بازار ۾ چوڙي ڳٺِ منجها سون ڏنيون
اي (اهي) سيئي باب (پاڳا) ٽئا ڳوٽيون اوٹونجاه
سي سپ ڏنيون آهينِ ڪڪا کي منجهہ وَرَ ڏِيَ جي اڏِپا
جيڪِينْ ڪٺايون تي ڪِڪا ڪَنا اَڏئي
ڏيوٹا (يا ڏيوي راءِ)

[بیس بوریاں سید صاحبڈنہ کی، اکیس کے پیسے (دیئے گئے) سولہ بوریاں ساہُو کے ہاٹ (دکان) سے لا کر دی ہیں ککّا (ٹھّے) کو، چھ بوریاں صالح کے ہاں سے حُسن لے گیا ہے،

(۱) یہ عبارت مخدوم محمد ہاشم کی سندھی کتاب "بناء الاسلام سندھی" کے برطانوی کتب خانہ میں رکھے ہوئے قلمی نسخہ کے بالکل آخر میں اُسی کاتب کی تحریر کردہ ہے، جس نے سن ۱۱۵۲ھ میں 'بناء الاسلام' کو نقل کیا۔

(۲) یائے مجہول کے ساتھ ہے۔ (مترجم)

چھ بوریاں بازار میں کھول کر گٹھڑی سے مَیں نے دیں
یہ سب باب (حصے) ہوئے بوریاں انچاس
وہ سب کِگا (تھے) کو دی ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔]
جو کِگّا (تھے) کے ہاں سے اٹھوائی تھیں اڈئے دیونیا (یا دیوے راء) نے یائے مجہول کے ساتھ ہے۔(مترجم)

سندھی بیان العارفین:

رجب ۱۰۳۸ھ میں محمد رضا ٹھٹوی نے میاں شاہ کریم کے ملفوظات کو ''بیان العارفین'' کے نام سے فارسی میں تالیف کیا۔ عبد الرحمٰن بن محمد ملوک کاٹھ۔ بانبھن (برہمن) نے یکم ربیع الاول ۱۲۱۰ھ سے ۲۰ / ربیع الاول ۱۲۱۳ھ تک اس کے گیارہ ابواب سندھی میں ترجمہ کئے اور باقی پانچ ابواب اس کے بعد مکمل کیے گئے، اس طرح اس نے ''سندھی بیان العارفین'' کے نام سے دو جلدوں میں کتاب تیار کرڈالی۔ اس اعتبار سے نثر میں یہ پہلی سندھی کتاب ہے (اس میں اشعار بھی شامل ہیں)، جو اب تک معلوم ہوسکی ہے(۱)۔

قرآن شریف کا ترجمہ:

سندھی نثر کے سلسلہ میں اس دور کا سب سے بڑا کارنامہ قرآن شریف کا سندھی ترجمہ ہے، جو تالپور دور کے ایک بڑے عالم استاد آخوند عزیز اللہ (بن قاضی محمد ذاکر بن حافظ محمد صدیق) نے کیا۔ انہوں نے سنہ ۱۱۶۰ھ(۱۷۴۷ء) میں مٹیاری میں جنم لیا اور سنہ ۱۲۴۰ھ (۲۵/۱۸۲۴ء) میں لواری میں وفات پائی(۲)۔ وہ مٹیاری کی بڑی درسگاہ کے استاد مخدوم محمد عثمان

(۱) یہ کتاب دو جلدوں میں تھی بعد میں اسے مخدوم عبد الصمد نے سنہ ۱۲۹۳ھ میں اور اس کے بعد مخدوم نورنگ زادہ نے اس کی اصلاح او راختصار کر کے ''مطبع مرغوب ہردنار'' بمبئی سے طبع کرایا۔ اس کے بعد مرزا قلیچ بیگ نے پرانے مخطوطے اور بمبئی سے طبع شدہ نسخہ سامنے رکھ کر''رسالہ کریمی'' مرتب کیا جو سنہ ۱۹۰۴ء میں طبع ہوا۔ اس کے بعد مرحوم ڈاکٹر داؤد پوتہ نے ''شاہ کریم بلڑی وارے جو کلام'' مرتب کیا جو سنہ ۱۳۵۶ھ/۱۹۳۶ء میں شائع ہوا۔

(۲) آخوند عزیز اللہ کے بارے میں بعض معلومات ہمیں نصر پور کے حکیم مولوی احمد صاحب (آخوند صاحب کے بھائی قاضی لطف اللہ کے پڑپوتہ) سے دستیاب ہوئیں۔ انہی سے ''سندھ جی ادبی تاریخ'' کے مصنف مرحوم محمد صدیق میمن کو بھی حالات دستیاب ہوئے تھے۔ بعد میں مٹیاری کے محترم اسرار احمد قاضی (جو آخوند عزیز اللہ کے پوتے قاضی ابو الحسن کے نواسہ ہیں) سے آخوند صاحب کی سوانح کے متعلق ایک تفصیلی مضمون ملا، جس میں بتایا گیا ہے کہ قاضی عزیز اللہ نے انگریز دور کے آغاز میں بزرگانِ لواری کی حمایت میں وکالت کی انگریزوں نے سنہ ۱۲۵۹ھ میں سندھ پر قبضہ کیا، جس کا مطلب یہ ہوا کہ قاضی عزیز اللہ ۱۲۵۹ھ کے بعد بھی زندہ تھے اور انہوں نے ایک سو برس کی عمر میں وکالت کی جو کہ ناممکن ہے۔

[قبلہ ڈاکٹر صاحب قاضی عزیز اللہ کی سؤ سالہ عمر تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں، جبکہ مولانا وفائی صاحب ان کی تاریخ وفات ۷ شعبان سنہ ۱۲۷۳ھ کو قرار دے رہے ہیں، جس کی رُو سے قاضی صاحب کی عمر ایک سؤ تیرہ سال بن رہی ہے۔
دیکھیے: 'تذکرہ مشاہیر سندھ' ۳/ ۲۲۸-۲۲۷ (مترجم)]

کے پاس تعلیم حاصل کرکے فارغ التحصیل ہوئے۔ اندازے سے کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے یہ ترجمہ اپنی تعلیم کی تکمیل اور مزید مطالعہ کے بعد چالیس برس کی عمر کے بعد ۱۲۰۰-۱۲۴۰ھ کے عرصہ میں کیا ہوگا۔ ان کا یہ ترجمہ مخدوم عبد الصمد ولد حاجی محمد مقیم نورنگ پوتہ ساکن میر پور بھٹورو نے سنہ ۱۲۹۳ھ میں 'مرغوب ہر دیار مطبع' بمبئی سے طبع کروا کر شائع کیا۔ اسی مطبوعہ قرآن شریف سے ذیل میں سورۃ فاتحہ کے معنی درج کیے جاتے ہیں:

''سورۃ الفاتحہ نازل ہوئی مکہ میں بعض نے کہا مدینے میں، اس میں سات آیتیں ہیں شروع کرتا ہوں ساتھ نام خدا کے جو رزق دینے والا اور بخشنے والا ہے،

ہرایک تعریف مناسب ہے اللہ کے جو مالک ہے تمام عالموں کا جو صاحب ہے رحمت کا، دنیا اور آخرت کا، جو آشکار بادشاہ ہوگا درمیان روز قیامت کے،

تجھے خاص عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہمراہی مانگتے ہیں دوران عبادت، دکھلا ہمیں آقا راہ سیدھی اپنی جو ہے راہ ان نبیوں کی، نعمت کی تو نے جن پر، نہ راہ ان کی، غصہ کیا گیا جن یہودیوں پر، اور نہ راہ گمراہوں کی جو ہیں نصاریٰ''۔

یہ تحت اللفظ ترجمہ ہے، مگر جب اس کا اس دور کے، یا اس سے بعد کے فارسی یا اردو تحت اللفظ تراجم سے تقابل کیا جاتا ہے تو یہ ترجمہ نثری ترتیب و معنی کے اعتبار سے کافی سلیس نظر آتا ہے۔

آخری سطر میں ''ضالین'' کا ترجمہ 'یہودی' کیا گیا ہے، جس سے گمان ہوتا ہے کہ مترجم موصوف شاید مخدوم نوح علیہ الرحمہ کے فارسی ترجمۂ قرآن سے واقف تھے کیونکہ اس میں بھی ضالین کا یہی ترجمہ کیا گیا ہے۔ قاضی صاحب نے ترجمہ کے علاوہ کئی مقامات پر سندھی نثر میں حواشی بھی دیئے ہیں۔ مترجم موصوف بزرگان لواری کے مرید تھے اور اس اعتبار سے سلوک وطریقت میں باطنی و روحانی رموز کی طرف مائل تھے، جیسا کہ ان کیکتابوں سے معلوم ہوتا ہے۔ ان کے بعض حواشی کا بیان پیچیدہ ہے لیکن بعض حواشی میں عمدہ سندھی نثر کی جھلک بھی نظر آتی ہے مثلاً:

''چاہیے کہ خدا کی محبت سب سے چھپائی جائے، بلکہ اپنے جسم اور نفس سے بھی چھپائی جائے، مگر روح کے ساتھ چھپ کر بیان کی جائے''

۱۸ویں صدی کے اختتام اور ۱۹۔ویں صدی کے آغاز میں انگریز حکومت کی ہمت افزائی سے عیسائی پیشوایانِ مذہب نے مقامی لوگوں کو عیسائی بنانے کے لئے اپنی مذہبی کتابوں کے علاقائی زبانوں میں تراجم کرنا شروع کر دیئے تھے۔ اس سلسلہ میں ہندوستان میں 'سیرامپور' کے

پادریوں نے سنہ ۱۸۲۵ء میں بائبل کے باب 'متی' کا سندھی ترجمہ کیا، جس کا کپٹن جارج سٹک نے دیوناگری رسم الخط میں نیا سندھی ترجمہ کیا جو سنہ ۱۸۵۰ء میں شائع ہوا۔ دو سال بعد برنس نے ۱۸۵۲ء میں عربی سندھی رسم الخط میں بائبل کے باب 'یوحنا' کا ترجمہ کیا(۱)۔

ان تراجم کے بعد پادریوں نے ایک قدم اور آگے بڑھاتے ہوئے علاقائی لوگوں کے مذاہب پر حملے شروع کردیئے، جن کے جوابات انہیں مقامی علماء نے دیئے۔ ہندوستان کے عالم محمد ہادی نے سنہ ۱۲۲۲ھ (۱۸۰۷ء) میں کرستان پادریوں کی طرف سے اسلام پر کیے گئے حملوں کے جواب میں 'کتاب ردنصاریٰ' لکھی، جس کا ہالا کنڈی (پرانا ہالا) کے عالم قاضی عبدالحکیم نے سندھی نثر میں ترجمہ کیا۔ جس کے ابتدائی الفاظ یوں ہیں: ''یہ رسالہ در بیان سوالاتِ عیسوی جوابات محمدی کے'' ۔سندھی نثر میں یہ کتاب سنہ ۱۲۸۰ھ (شروع ۱۸/ جون ۱۸۶۳ء) سے قبل لکھی گئی (۲)۔

تالپور امیروں کے دور میں سندھی نثر میں اور بھی بعض کتابیں لکھی گئیں، لیکن انگریز دورِ حکومت میں ان کی طرف عدم توجہ کی وجہ سے وہ کتابیں ضائع ہوگئیں (۳)۔

۷- سندھی الفاظ او رصرف ۔نحو (گرامر) کا زیر مطالعہ آنا:

تعلیمی نقطۂ نگاہ سے مادری زبان کی اوّلیت و اہمیت کا اصول قبول کرلینے کے بعد، ایک تو سندھی میں ابتدائی تعلیم دینے کے لئے درسی کتابیں لکھی گئیں؛ او ردوسرا ثانوی سطح پر فارسی پڑھانے کے لئے سندھی کو 'تعلیمی ذریعہ' بنایا گیا۔ طلباء کو سندھی زبان سکھانے کی خاطر کم از کم دو خاص اقدامات کیے گئے:

(الف) سندھی الفاظ کے صحیح معنی کو سمجھنا او رسمجھانا

(ب) سندھی زبان کی ساخت یعنی صرف -نحو کو زیر مطالعہ لانا۔

اس سلسلہ میں ماہر اساتذہ کی طرف سے تیار کردہ تمام کا تمام مواد تو سلامت نہیں رہا کہ اس کا صحیح طور پر اندازہ لگایا جا سکتا؛ البتہ جو کچھ مواد قلمی صورت میں سلامت رہ گیا ہے، اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ پرانے زمانے دسویں او رگیارہویں صدی میں فارسی لغات او رفارسی صرف-نحو (گرامر) سکھانے کے لئے بھی درسی مواد سندھی میں تیار کیا گیا تھا۔

---

(۱) بھیرومل: سندھی بولی جی تاریخ، مطبوعہ کراچی ۱۹۴۱ء ص: ۲۷۸ (مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ، طبع ششم ۲۰۰۴ء، ص: ۲۵۷)

(۲) عزت اللہ کاتب نے اس کتاب کو خلیفہ عبداللطیف کے لئے سنہ ۱۲۸۰ھ میں نقل کیا، یہ قلمی نسخہ ہم نے ڈیپر میں منصورہ کی درگاہ کے کتب خانہ میں ۲/اپریل ۱۹۷۰ء کو دیکھا تھا۔

(۳) ''میروں کے دورِ اقتدار میں نثر میں تیار کردہ دو تین کتابیں سننے میں آرہی ہیں، لیکن وہ آج تک طبع نہیں ہوسکی ہیں'' بھیرومل: سندھی بولی جی تاریخ، ص ۲۹۱-۲۹۲ (مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ، طبع ششم ۲۰۰۴ء، ص: ۲۶۹)

(الف) زبان کی ابتدائی تربیت کے لئے 'دو۔وایا' اور 'سہ۔وایا':

طلباء کو ابتدائی طور پر فارسی الفاظ سمجھانے کے لئے ہم معنی فارسی او رسندھی الفاظ کے 'دو۔وایا' مرتب کیے گئے اور آگے چل کر اسی اصول کے تحت فارسی او رعربی الفاظ کے سمجھانے کے لئے ہم معنی سندھی، فارسی او رعربی الفاظ کے 'سہ۔وایا' مرتب کیے گئے۔ یہ دونوں نصابی نام سندھی۔آمیز ہیں، جن میں 'وائی' (زبان) کا مفہوم سمایا ہوا ہے: 'دو۔وایا' یعنی دو زبانوں (فارسی او رسندھی) کے ہم معنی الفاظ، اور 'سہ۔وایا' یعنی تین زبانوں (سندھی، فارسی او رعربی) کے ہم معنی الفاظ۔ طلباء کا شوق و ذوق بڑھانے کی خاطر بعض 'دو۔وایوں' میں کچھ الفاظ تک بندی سے لائے گئے نیز ایک جنس کے الفاظ کو یکجا کردیا گیا۔

'دو۔وایوں' میں تک بندی کی مثالیں، جیسا کہ

'غودان' ٻٻا (پستان)۔ 'گنبذ' قبا (قبے)

'جغرات' ڏونرو (دہی) 'کوزہ' ڪوُنرو (لوٹا)

ایک ہی جنس کے الفاظ کو یکجا کرنا، مثلاً کھانا پکانے کی اشیاء وغیرہ:

فلفل (ا) = مرچ (سیاہ مرچ) اجمود = ولجاٹ (اجوائن، نانخواہ)

زیرہ = جیرو (زیرہ) کِشنیز = ڏاڻا (دھنیا)

جوزبو = جعفر (جائفل) قرنفل = لونگ (لونگ)

اجوان = جاڻ (اجوائن) خرما = کارڪ (کھجور، چھوارا)

ایک ہی پیشہ سے متعلق الفاظ، مثلاً پیشۂ آہنگری:

آہن = لوھ (لوہا) تبر = ڪھاڙي (کلہاڑی)

آہن گر = لوھار (لوہار، حداد) کلند = ڪوڏر (کدال، پھاوڑا)

آتش = باھ (آگ) داس = ڏانتو (درانتی)

اخگر = ٽانڊو (انگارا) خدنگ = تکو (تکّا، بغیر بھالے کا تیر، پیکان، ناوک)

(ا) متن میں یہ لفظ ''فوفل'' لکھا ہوا ہے جس کے معنی مرچ لکھے گئے ہیں۔ معنی کی مناسبت سے ہم نے اسے 'فلفل' تحریر کیا ہے۔ کیونکہ مرچ کو فلفل کہا جاتا ہے اور اگر متن میں درج اصل لفظ 'فوفل' درست تسلیم کیا جائے تو پھر اس کے معنی ہوں گے ''سپاری'' یعنی چھالیہ

دیکھیے: 'کریم اللغات' ص ۱۶۵-۱۶۶

'غیاث اللغات' ص ۳۲۹-۳۳۰ (مترجم)

اِنگشت = انگار (جلتا ہوا کوئلہ)   سندان = سنڈاڻ، ساندان (نِہائی، اَہرَن)

سندھ کے بعض پرانے علماء اور درسگاہوں کے بچے کھچے کہنہ اوراق میں راقم کو مختلف قسم کے 'دو۔وایا' اور بعض 'سہ۔وایا' نظر آئے، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ سندھ کی تمام بڑی درسگاہوں کے اساتذہ اپنے شاگردوں کے لئے خود ہی اس قسم کا درسی مواد تیار کرتے تھے: اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مکتبی سطح پر ہر جگہ 'سندھی' ہی ذریعۂ تعلیم تھی۔

(ب) سندھی کے ذریعے فارسی اور سندھی گرامر کا مطالعہ:

بعض اساتذہ کے تحریر کردہ مواد کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے نہ صرف فارسی اسماء سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے 'دو۔وایا' مرتب کیے بلکہ سندھی کے ذریعے 'فارسی صرف۔نحو' پڑھانے کے لئے بھی مواد مرتب کیا۔

درسگاہ وِلھار کے کتب خانہ کے ویران ذخیرہ سے دو مختلف کتابوں کے کچھ ورق دستیاب ہوئے، جن میں سے ایک میں سندھی کے ذریعے 'فارسی صرف۔نحو' اور دوسرے میں سندھی کے ذریعے 'عربی صرف۔نحو' کی تشریحاتی عبارات تحریر تھیں۔ مثلاً فارسی لفظ 'چہ' (کیا) حرفِ استفہام کی سندھی کے استفہامیہ الفاظ کے ذریعے وضاحت کی گئی تھی؛ درج ذیل عبارات جو کہ زیادہ صاف اور قابل فہم تھیں، وہ بعینہٖ نقل کی جاتی ہیں:

☆ "چہ	:	ڪهاڙو	(کیا، کونسا، کیوں، کہاں)
چہ گفتی	:	ڪهاڙو تو چيو	(تو نے کیا کہا)
چیست	:	ڪهاڙو آهه، ڪهڙو آهي	(کیا ہے، کون سا ہے)
چیستی	:	ڪهاڙو اَيهين تون	(تو کیا ہے/تو کون ہے)
☆ "چہ	:	ڪهاڙو	(کیا)

یہ لفظ ایسے اسماء پر دو مرتبہ آتا ہے جو معنی میں ایک ہوتے ہیں، مثلاً:

"چہ مردان لشکر چہ زنان"   جیسا (مردوں کا) لشکر ویسی جماعت عورتوں کی

چہ باشد مُیَسَّر بزودی فرست،   جو کچھ میسر ہو جلدی بھیج"

1 'سو'، 'ڪوه' ..... 'تهڙو'، 'گهڻو'، 'ڪو' یہ پانچوں استفہامی معنی ہیں:

'سو'، 'ڪتهين'،

نامعلوم بات کی خبر معلوم کرنا مراد ہوتی ہے مثلاً: چہ گفتی؟ کیا کہا تو نے؟

چ سے صاد (ص) تبدیل ہو، مثلاً

باالحسن عليا الفاظ التاكيد نفس و عين وكلا
وكلتا وكل واجمع وكتع وابصع وابتع نحو جاءني
القوم كلهم اكتع ابصع ابتع واو فاء و
ثم لكن لا وبل او واما و ام وحتى ست ليس همه معارف
پنجن ني نروني لم مضاف مضمر ذواللام مبهم علم
علامت خبر لفظ اهي بدل كيني سو كهروٽ عطف بيان
سوسي صفت ازوهي وهم كري علامت تميز ستهي سنهني
جو حال ٿي منجه حال هوئنا هي جو مفعول دارد نشان كي كري
لو و سي هم ٻين منجه معرسان جوجا اضافت بنجه
المعرفة ما وضع لشيئ معين والنكرة ما بخلافه
اثنان واثنتان وثنتان واسم واست و
ايم وابن وابنة وامرء وامرءة والالا والما من الا
فعال المنشعبة غير اكرم ومصادرها والالف التي مع

سندھی زبان کی توسط سے ''عربی صرف ونحو'' سکھانے والے قلمی مخطوطے کے
ایک صفحے کا عکس

چِین سے صین

چندن سے صندل (= ہر کھن لکڑی) (۱)

☆ ایک اور کتاب کے ورق میں عربی صرف۔نحو کی عبارت کے ساتھ درمیان میں ذیل کے پانچ فارسی اشعار درج ہیں جن میں 'سندھی صرف۔نحو' سمجھائی گئی ہے۔محسوس ہوتا ہے کہ سندھی صرف۔نحو کے بارے میں فارسی میں کوئی الگ منظوم کتابچہ لکھا گیا تھا جس سے یہ شعر نقل کیے گئے ہیں۔

''پنجند نَي فزون نَي کم	مضاف مضمر ذو اللام مبهم ست عَلم
علامت خبر لفظ آهي بدان	ڪيني سو ڪهرو ست عطف بيان
سو، سا، سي از روي او هم ڪري	علامتِ تميز است بي شبهتي
چو حال است منجهه حال هوئڻ ان جي	چو مفعول دارد نشان ڪي ڪري
له واسطي هم سبب فيه منجهه	معه سان، جو، جا اضافت پنج''

یہ منظوم سطریں جس طرح اصل قلمی صورت میں تحریر شدہ تھیں بعینہٖ نقل کی گئی ہیں۔
دوسری سطر کے نصف اول سے صاف ظاہر ہے کہ مصنف سندھی لفظ ''آہے'' کی وضاحت کر رہا ہے، اور بتا رہا ہے کہ: ''لفظ 'آہے' کو خبر کی علامت شمار کر''۔ان منظوم سطروں میں سندھی کی نحوی ساخت 'عربی نحو' کے حوالے سے ذیل کے طور پر سمجھائی گئی ہی:

❀ 'سندھی نحو' کی (ساخت، وضع) اوضاع پانچ ہیں، کم نہ زیادہ (عربی نحو کی مناسبت سے) وہ یہ ہیں:

۱-مضاف ۲-مضمر ۳-ذو اللام ۴-مبہم ۵-عَلَم

لفظ 'آہے' کو خبر کی نشانی یقین کر ۱- ڪيئن (کیسا، کیسے، کس طرح) ۲- سو (وہ، وہی) ۳- ڪهڙو (کیسا، کون سا، کس قسم کا) یہ الفاظ بیان میں 'بدل' اور 'عطف' کے لئے آتے ہیں۔

❀ ۱- سو (وہ، وہی مذکر کے لئے) ۲- سا (وہ، وہی مؤنث کے لئے) ۳- سي (وہ، وہی جمع کے لئے) اور ۴- ڪري (کے لئے، لئے، برائے) سندھی نحو میں یقیناً تمیز کی نشانی ہیں۔

❀ 'حال' سے مراد ہے ''اس حال میں ہونا''

(۱) یہ ایک خوشبو دار درخت ہے جس کے چھلکے کو دار چینی، جڑ کو چوب چینی، پتوں کو گرم پتہ، اس کے پھل کو جائفل اور لکڑی کو ہر کھن (سرکھنڈ)، رکت چندن کہتے ہیں۔ جامع سندھی لغات، جلد۴، ص:۱۶۱۲، مخزن المفردات، ص:۲۹۰ (مترجم)

کي (کھے =کو، طرف) اور ڳري (=پاس، نزدیک، طرف، جانب) دونوں 'مفعول' کی پہچان ہیں۔

❁ سندھی نحو میں لفظ 'واسطے' (عربی نحو میں) 'لہٗ' کے مساوی ہے اور 'منجھہ' (=اندر، میں، درمیان دوران، ظرف ہے) 'فیہٖ' کے مساوی ہے۔

❁ سندھی لفظ سانءُ (= سے، ساتھ، مع، پاس، قریب، حرف جر ہے) مساوی ہے عربی 'مَعَ' کے، سندھی لفظ جو (=کا) اور جا (= کے) دونوں اضافت کے مفہوم کے لئے ہیں۔ یہ کُل (اوضاع) پانچ ہوئیں۔

۸- سندھی ''الف - ب'' کا ایک ہی صورت میں لکھا جانا اور سندھی رسم الخط کا زیادہ صحیح صورت میں رائج ہونا:

اس دور میں، خاص سندھی تلفظات پر مشتمل حروف کی صورتیں کچھ زیادہ ہی اسی ترتیب و ساخت کے ساتھ عام ہوئیں، اور اس وجہ سے سندھی الف -ب زیادہ تر اسی ہی رسم الخط میں رائج ہونے لگی۔ الف-ب کے حروف کی پہچان میں بڑھتی ہوئی آسانی کی وجہ سے سندھی کے تحریری ذخیرہ میں بڑا اضافہ ہوا اور کاتبوں اور کتابوں کی کثرت کی وجہ سے سندھی الف -ب کی اسی ترتیب کا رسم الخط نہایت سرعت کے ساتھ تحریر میں عام ہونے لگا۔

'سندھی الف -ب' کے رسم الخط کی تاریخ سے عدم واقفیت کی وجہ سے اس پچھلے قریبی دور میں عام طور پر یہی سمجھا جاتا رہا کہ یہ انگریزوں ہی کی کوشش سے تیار ہوا۔ دوسری طرف ''سندھ جی ادبی تاریخ'' کے مصنف کو کتاب 'ابوالحسن جی سندھی' کے نام سے یہ گمان ہوا کہ ٹھٹہ کے عالم میاں ابوالحسن نے ''فارسی اور عربی الفاظ کی توڑ جوڑ سے سندھی الف -ب بنائی''(۱)۔ مگر یہ خیال درست نہیں کہ میاں ابوالحسن نے کوئی خاص رسم الخط بنایا'' یا ''خالص سندھی حروف'' کے لئے اس نے کچھ ایسی ''خاص صورتیں مقرر کیں''، جو پہلے موجود نہیں تھیں اور بعد میں استعمال ہونے لگیں۔

موجودہ سندھی ـ عربی رسم الخط کی ابتداء اور ترقی کی تاریخ ابوالحسن کے دور سے آٹھ۔ نَو سو برس پہلے شروع ہوتی ہے، کیونکہ سندھی زبان کے لئے 'عربی۔ سندھی الف -ب'، عرب -اسلامی دور سے استعمال ہونا شروع ہوئی۔ چوتھی صدی ہجری (دسویں صدی عیسوی) کے نصف

(۱) مصنف نے بغیر کسی ثبوت کے محض اپنے گمان کی بنیاد پر لکھا ہے کہ: ''ابوالحسن مرحوم کو سندھی رسم الخط بنانے میں جو دشواری پیش آئی، وہ خاص طرح خالص سندھی آواز ظاہر کرنے والے حروف میں ----------------- مولوی صاحب نے خالص سندھی حروف کے لئے درج ذیل صورتیں مقرر کی تھی'' (اس کے بعد میمن صاحب نے ان حروف کی صورتیں بھی درج کی ہیں)۔ میمن محمد صدیق: ''سندھی ادب جی تاریخ، برطانیہ کان اڳ جو دور'' ص:۵٦-۵۸۔

363-الف

قلمی مخطوطات کے عکس جو برٹش میوزیم کے قلمی نسخوں سے حاصل کئے گئے۔

هي مهڙي لکيم سنڌي ۾ ڪري عربيا
تمان تين هي سهل سکن مؤمن کا
لکيم تفصيل تنهن جي سهکائي لاءِ
عربي ۽ فارسي آهي ابو جن
سنڌي ڪيم سهکي ڪڍي ڪارڻ
تمان نفع عام تيي ڪارڻ مؤمن
گهڻو تيي سهلو سکن نا موزن
ٻڌم اميد آهي تن نيڪن ڪنا
جيڪي پڙهن اڳي ڪي سکي سهکائي لاءِ
تڪرين حقيم هن عاجز جي ڪاڍيکر دعا جل اجرانھ
ڪي پڙهن تنهن جي حقيم ڪرهن فاتحا
تمان ڪرينم ٿيو ڪري هن ڪنهن جي ڪنا
بخشي موجب ٻچائي خاطي جي خطا

کتاب ”عقائد الاسلام“

وصلوات سلام حضرت رسول تي جو عالم اماما
ومتي آل اصحي ۽ ايلن صحا بتمـ [illegible]
جيڪو پڙهي هي سنڌي سو ڪري ورد ما
فقير عبداللطيف ڪئي سنڌي تصنيفا
نجو وره اينڪا سي ڪا ۽ سا سوا
منجهه حق هن عاجز جي ساري مغفر منها
۽ پن تنهن جي اولاد کي هن مائٽن لاءِ
۽ تيي خاتمو خير جو تنهنکي نصيبا
هون دنيا آخرت ۾ خوشنود خوشحالا
آمين آمين ڪرتون قبولا
لا اله الا الله
محمد رسول الله

1181ھ کے نسخے کا عکس

آخر میں ،خاص طور پر سندھ میں منصورہ کے خطے میں یہ رسم الخط عام رائج تھا ، جسے محقق بیرونی کی تحریر کے بموجب ''سیندب'' (سَیند ھو=سندھی) کہا جاتا تھا۔ اس رسم الخط میں عربی الف ۔ب کے بعض حروف پر نقاط بڑھانے کے اصول کے ذریعے خالص سندھی تلفظات ظاہر کیے گئے تھے کیونکہ محقق بیرونی نے بھی اسی نمونے پر کچھ خاص مقامی تلفظات کے حروف لکھے (۱)۔ اسکے بعد دسویں صدی ہجری تک عربی ۔سندھی رسم الخط کی تحریر کا کوئی بھی نمونہ دستیاب نہیں ہوا، جسکے متعلق کوئی رائے قائم کی جاسکتی۔

دسویں صدی ہجری (سولہویں صدی عیسوی) میں قاضی قادن (وفات ۹۵۸ھ) کے عام مقبول صوفیانہ اشعار کا بڑا ذخیرہ (جس کا کچھ حصہ دیو ناگری رسم الخط میں سلامت ہے) یقینی طور پر سندھی ۔عربی رسم الخط میں قلمبند ہوا ہوگا لیکن وہ قلمی نسخہ سلامت نہیں رہا۔ اس کے بعد ان سندھی اشعار کا دوسرا بڑا ذخیرہ وہ ہے جسے محمد رضا ٹھٹوی نے سنہ ۱۰۳۸ھ میں شاہ کریم (وفات ۱۰۳۲ھ) کے ملفوظات ''بیانُ العارفین'' میں قلمبند کیا ، جس میں دوسو تیرہ سطروں او رچودہ سو اکیاسی (سندھی یا سندھی میں استعمال ہونے والے) الفاظ پر مشتمل ایک سو چھ سندھی اشعار اور کچھ مصرعے شامل ہیں ۔محمد رضا کے ہاتھ کی لکھی ہوئی اصل قلمی کتاب اس پچھلے قریبی دورتک موجود تھی جس سے سنہ ۱۰۳۸ھ کے' سندھی رسم الخط' کا مطالعہ ہوسکتا تھا، لیکن اتفاق سے اب وہ اصل قلمی کتاب بھی باقی نہیں رہی ۔ تیسرا بڑا ذخیرہ 'انتالیس منظومات' کا ہے جو تازہ دستیاب ہوا ہے او رجسے ساتویں باب میں زیر بحث لا یا گیا ہے۔ موجودہ معلومات کے مطابق گیارہویں صدی کے ۱۰۶۷-۱۰۶۹ھ کے عرصہ میں کاتب عزت بن سلیمان کے نوشتہ اس مواد میں عربی ۔سندھی رسم الخط کا ایک پرانا نمونہ موجود ہے ، جسے سامنے رکھ کر بارہویں اور تیرہویں صدی ہجری کے کاتبوں کے رسم الخط کے ساتھ اس کا تقابل کرواکر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس دور میں کس طرح اسی ترتیب کی سندھی الف -ب اور رسم الخط کی ترقی کے لئے راہ ہموار ہوئی ۔

شروع سے ہی سندھی عبارات لکھنے کے لئے کاتبوں نے عربی الف -ب کو استعمال کیا اس لئے عربی الف-ب کے تمام حروف سندھی الف -ب میں شامل ہوگئے۔ خاص سندھی تلفظات کے لئے عربی الف-ب کے بعض حروف پر اوپر نیچے نقاط دے کر نئے حروف کا اضافہ کیا گیا ۔ تین سندھی تلفظات کے لئے فارسی کے تین حروف پ چ گ لے کر ان پر نقاط بڑھا کر دوسرے سندھی حروف بنائے گئے ۔

---

(۱) دیکھیے باب سوم ص: ۷۴-۹۷

یہ تمام ساخت ایک ہی وقت میں کسی ایک ہی سمجھدار عالم یا کاتب کی سوچ و عمل کا نتیجہ نہیں بلکہ وہ تو صدیوں کے مسلسل عمل سے وجود میں آئی ہے اس لئے اگر اس طویل عرصے کے دوران کی تمام سندھی تحریریں سلامت ہوتیں تو سندھی الف - ب کی ترتیب اور رسم الخط کی سلسلہ وار ترقی کا صحیح مطالعہ کیا جاسکتا تھا۔ فی الحال اس قسم کے مطالعہ کے لئے بارہویں اور تیرہویں صدی کی ان دستیاب شدہ(۱) قلمی کتابوں سے، جن کے اکثر نسخوں کے نقل ہونے کے سنین بھی معلوم ہیں، خاص سندھی تلفظات کے لئے مختلف کاتبوں کی طرف سے استعمال شدہ حروف کو شامل خاکہ میں واضح کیا گیا ہے۔ اس خاکہ کے اوپر کے کالم میں دیئے گئے ہندسے ذیل کے سلسلہ کی پہچان کے نشانات ہیں:

۱- ۶۹-۱۰۶۷ھ میں لکھی گئی انتالیس منظومات میں خاص سندھی تلفظات کے لئے لائے گئے حروف کی صورت

۲- ۱۱۱۵ھ میں لکھی گئی کتاب ''ابوالحسن جی سندھی'' میں سندھی حروف کی صورت

۳- برٹش میوزیم میں رکھے ہوئے ''شاہ جو رسالو'' میں سندھی حروف کی صورت

۴- انڈیا آفس میں رکھے ہوئے ''شاہ جو رسالو'' میں سندھی حروف کی صورت

۵- ۱۲۰۶ھ میں تحریر شدہ ''شاہ جو رسالو'' کے بعض اشعار کے مختصر مجموعے میں سندھی حروف کی صورت

۶- ۱۲۰۷ھ میں شاہ کے رسالہ ''گنج'' میں سندھی حروف کی صورت

۷- ۱۲۰۷ھ میں قاضی موسیٰ کے ''شاہ جو رسالو'' میں سندھی حروف کی صورت

۸- ربیع الاول ۱۲۰۸ھ میں تحریر کردہ ''منہاج المعرفت'' میں سندھی حروف کی صورت

۹- کیپٹن سٹیک کے ''شاہ جو رسالو'' میں سندھی حروف کی صورت

۱۰- مخدوم محمد ہاشم کی کتاب ''راحتہ المومنین'' میں (جو بعد میں تالپوروں کے دور میں لکھی گئی) سندھی حروف کی صورت۔

۱۱- سنہ ۱۲۶۷ھ میں تحریر کردہ ''شاہ جو رسالو'' میں سندھی حروف کی صورت

۱۲- سنہ ۱۲۶۹ھ میں تحریر کردہ ''شاہ جو رسالو'' میں سندھی حروف کی صورت

۱۳- شعبان ۱۲۷۰ھ میں میر امام بخش تالپور کے لکھوائے ہوئے رسالہ میں سندھی حروف کی صورت

(۱) اس دور کی دوسری قلمی کتابیں بھی موجود ہیں مگر ان کے فوری طور پر دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے فی الوقت ''تیرہ قلمی کتابیں سامنے رکھی گئی ہیں۔ ہر کتاب سے کاتب کی استعمال کردہ ایک یا زیادہ حروف پر مشتمل ''نئی صورتیں'' منتخب کی گئی ہیں، خواہ وہ صرف ایک یا دو مرتبہ ہی استعمال ہوئی ہوں۔

۱۴- جولائی ۱۸۵۳ھ(۱۲۶۹ھ) میں انگریزوں کی طرف سے ”ایک مقرر کردہ“ الف -ب کا رسم الخط۔

اس خاکہ کے مطالعہ سے درج ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں:

۱) گیارہویں صدی ہجری تک سندھی لکھنے کے لئے زیادہ تر عربی الف -ب استعمال ہو تی تھی۔ کاتب عزت بن سلیمان نے ۶۹۔۱۰۶۷ھ میں سندھی منظومات لکھنے کے لئے بہرحال وہی عربی الف -ب استعمال کی، البتہ 'تر' (ٹر) اور 'در' (ڈر) کو 'تر' اور 'در' کی صورت میں لکھا۔ اس کے علاوہ اسے سندھی تلفظات جھ اور چ (چھ) میں 'ھ' کے موجود ہونے کا احساس تھا، یہی وجہ ہے کہ اس نے ان دونوں تلفظات کو ”جھ“ (جیم کے آخر میں چھوٹی 'ھ') کی صورت مین تحریر کیا۔

۲) گیارہویں صدی سے جیسے ہی سندھی کے ذریعے مکتبی تعلیم شروع ہوئی اورسندھی میں لکھنے پڑھنے کا

سلسلہ وسیع ہوا تو علماء اور کاتبوں نے عربی الف -ب کے بعض حروف پر نقاط بڑھا کر اور فارسی الف -ب کے تین حروف (پ چ گ) کو شامل کرکے ان پر نقاط بڑھا کر خاص سندھی تلفظات کے لئے نئے حروف بنائے۔ خاص سندھی تلفظات والے تمام حروف کو فقط ایک ہی صورت میں لکھنے کا ”انتظامی فیصلہ“ اگرچہ سنہ ۱۲۷۰ھ (۱۸۵۳ء) میں ہوا، مگر خاص سندھی تلفظات کی پہچان رکھنے والے بہت سارے حروف اس سے پہلے ہی استعمال ہوتے آرہے تھے۔ اس خاکہ سے ذیل کے حروف کی موجودگی کا ثبوت ملتا ہے:

ٻ پ (بھ) پ ٺ (تھ) ٽ (ٹ) ڄ ڃ چ ڇ (چھ) ڌ (دھ) ڏ ڊ (ڈ) ڍ (ڈھ) ڙ (ڑ) ڦ (پھ) ڪ (ک) ک (کھ) گ ڻ (ن)۔

ٺ (ٹھ) اور ڳ حروف کی صورتیں اس خاکہ میں موجود نہیں ہیں مگر دوسری کئی کتابیں جو اس عرصے میں لکھی گئیں ان میں یقیناً یہ صورتیں موجود ہوں گی کیونکہ ایک دوسرے کے اوپر دو نقاط کی صورت ٻ میں موجود ہے۔

۳) عربی الف-ب میں 'کاف' کی دوصورتوں (ڪ اور ک) میں سے، ڪ کو واضح طور پر 'ڪ' کے تلفظ کے لیے اور 'ک' کو اس سندھی تلفظ کے لئے استعمال کیا گیا جس میں 'ڪ' کے ساتھ 'ھ' کا تلفظ شامل تھا۔

۴)'جہ' اور 'گہ' کی صورتیں ان تلفظات کے لئے استعمال کی گئیں جن میں 'ج' اور 'گ' کے تلفظات کے ساتھ 'ھ' کا تلفظ شامل تھا۔

۵)بعض کاتبوں نے 'ڄ' اور 'ڳ' کے تلفظات کو 'نج' اور نک (نکھ) (=نگ) کی صورت میں لکھا، یعنی انہوں نے 'ڄ' کے تلفظ کو 'ن+ج' کا ادغام (ملاپ) اور 'ڳ' کے تلفظ کو 'ن+گ' کا ادغام تصور کیا جس میں وہ اصولی طور پر صحیح تھے۔

۶)اس خاکہ سے یہ واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ کس طرح آہستہ آہستہ اکثر کاتبوں نے کچھ حروف اسی ایک ہی صورت میں لکھنا شروع کیے ۔ اس خاکہ کے مطابق خاص سنڌھی تلفظات والے تیئس (۲۳) حروف میں سے (نصف سے زیادہ) بارہ حروف (ٻ ڀ پ ٺ ٽ ڄ ڃ چ ڌ ڊ ڪ ک (کھ) ایسے ہیں جنہیں اکثر کاتب اسی ایک ہی صورت میں لکھتے رہے ۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس دور میں (سنہ۱۸۵۳ء کے انتظامی فیصلے سے پہلے) ایک تو سنڌھی الف-ب کے زیادہ سے زیادہ حروف جدا جدا تحریری صورتوں میں آئے ،اور دوسرا یہ کہ اکثر علماء او رکاتبوں کے آزادانہ اختیاری عمل سے خاص سنڌھی تلفظات والے حروف کو اسی ایک ہی صورت میں لکھنے کا اصول تسلیم ہونے لگا۔

سنڌھی تحریر کا زیادہ صحیح صورت میں رائج ہونا:

اس دور کی قلمی کتابوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ علماء اور اساتذہ نے سنڌھی الفاظ کے درست ہجا(۱) پر کافی توجہ دی اور تلفظات کی مختلف صورتوں کو جدا جدا نشانیوں اور نمونوں کے ساتھ ظاہر کرنے کی کوشش کی ۔ اس سلسلہ میں ذیلی ایجادات او راقدامات ،اس دور میں سنڌھی رسم الخط کو عام فہم بنانے میں معاون ثابت ہوئے۔

۱- ہر چھوٹے بڑے لفظ کو زبر زیر کے ساتھ لکھا گیا ۔ سنڌھی رسم الخط کے سلسلہ میں یہ ایک نہایت اہم اور علمی اقدام تھا ۔ اس دور میں سندھ کے علما کا علمی معیار انتہائی بلند تھا ،نیز سنڌھی ان کی ملکی یا مادری زبان تھی ۔ اگر وہ اپنی کتابیں زیر زبر کے علاوہ لکھتے تو بھی وہ انہیں بآسانی سمجھ سکتے تھے ؛ لیکن انہوں نے زبان کی صحت ،معنی ومفہوم کی اہمیت او رپڑھنے والوں کی آسانی او رسہولت کی خاطر گویا ایک علمی اصول قائم کر لیا تھا کہ 'زیر اور زبر سنڌھی رسم الخط کا لازمی جز ہیں ۔ سنڌھی رسم الخط کے اس بنیادی اصول کی اس پورے دور میں مکمل طرح پابندی کی گئی ۔

---

(۱) یعنی حروف کے درست اعراب ظاہر کرنے ۔ (مترجم)

۲- زیر، زبر، پیش، جزم، مد اور شد کے علاوہ سندھی کے دو درمیانہ (۱) طویل تلفظات کے لئے نئی علامات ایجاد کی گئیں:

(الف) 'وٗ' (زبر یا پیش کے علاوہ) کے تلفظ کے لئے اوپر الٹا پیش لایا گیا، جیسا کہ اوٗ کر، چوٗ کر، روٗ کڙ (روکڑ) وغیرہ۔

(ب) 'يٖ' (زبر یا زیر کے علاوہ) کے تلفظ کے لئے نیچے عمودی لکیر استعمال کی گئی، جیسا کہ ڪري (کرے) ھیر، ویر وغیرہ (۲)

۳-عربی 'تنوین' کے اصول کے ذریعے 'ن' غُنّہ کے 'ایں، اِیں اور اُوں' تلفظات ظاہر کیے گئے:

(الف) درمیانہ تلفظ 'ایں' (۳) اور ہٖ (میں)

(ب) زیر والا تلفظ اِیں: ڪٍ، سٍ، ڪياءٍ (ڪيائين - کیا ئیں = اس نے کیا)

(ج) پیش والے تلفظات : آءٌ (میں)، ڏناءٌ (ڏنائون = انہوں نے دیا) چياءٌ (چيائون = انہوں نے کہا)

۴- الفاظ کے آخر میں 'ھ' اور 'ءُ' کے بعد 'ن' کے غُنّہ تلفظ کو 'م' کی آواز کے ذریعے ظاہر کیا گیا، جیسا کہ:

جڏھم = جڏھن (جب) ماڳھم = ماڳھين (بالکل، قطعی)

ڪڏھم = ڪڏھن (کب) سائيم = سائينْ (صاحب، مالک، آقا، جناب)

۵-'تر' (ٹر) اور 'ڊر' (ڈر) دونوں روزمرہ کی سندھی زبان کے مخصوص تلفظ تسلیم کر کے، ان آوازوں کا رسم الخط بھی 'ر' کے اضافہ کے ساتھ قائم کیا گیا، جیسا کہ:

(الف) ٽري (تین)، ٽرئو (تیسرا)، ٽريئي (تینوں)، پٽر (بیٹا)، مائٽر (عزیز و اقارب)، اڳاٽرو (اگلا، پہلا، پرانا، اگلے زمانے کا)

(ب) ڊريگھہ (لمبائی، طول، پھیلاؤ)، چنڊر (چاند)، سمنڊر (سمندر)، جنڊر (چکی، آسیا)

۶-زبان جس طرح بولی جاتی تھی اسی طرح اسے تحریر میں لایا گیا۔ بعض عربی یا فارسی الفاظ جس طرح روزمرہ کی عام سندھی زبان میں بولے جاتے تھے ویسے ہی لکھے گئے: یعنی کہ بنیادی طور پر یہ تسلیم کر لیا گیا کہ زبان جس طرح بولی جاتی ہے ویسے ہی لکھی جائے، مثلاً

(۱) 'درمیانہ تلفظات' یعنی 'اَ' اور 'اُ' کے درمیان کا درمیانہ تلفظ 'او' یا 'اَے' اور 'اِ' کے درمیان والا درمیانہ تلفظ 'اے'۔

(۲) اس کی دوسری مثال 'ہیر پھیر' (مترجم)

(الف) 'بیان العارفین' میں بلوچی والے لاڑی لہجہ کے مطابق 'شال' (خدا اس طرح کرے) کو 'چال' (چھال) کر کے لکھا گیا۔

(ب) مخدوم عبداللطیف نے اپنے والد مخدوم محمد ہاشم کی عربی کتاب 'فرائض الاسلام' کو سندھی میں منتقل کیا تو اس میں لکھا کہ:

''فقير عبداللطيف ڪئي سنڌي تصنيفا منجهه وَرهه ايڪاسي ڪارَه سؤ پورا''

آخری سطر میں انہوں نے مروج زبان کے مطابق 'ڪاره سؤ' (=ڪارهن سؤ یعنی گیارہ سو) لکھا، يارهن سؤ نہیں لکھا(۱)۔

۹- سندھی لغات کے بارے میں تحقیقی مواد کا شائع ہونا:

اوپر چھٹے باب کے تحت تفصیل سے بیان ہو چکا ہے کہ دسویں صدی ہجری (سولہویں صدی عیسوی) سے سندھ کے علماء اور اساتذہ نے سندھی زبان کے مطالعہ اور سندھی لغات کی تحقیق کے سلسلہ میں بڑی کوشش کی۔ انہیں سندھی الفاظ، اصطلاحات اور جملوں کے معنی و مفہوم کو سمجھنے اور سمجھانے کی ضرورت، خاص طور پر تین مقاصد کی تکمیل کے لئے پیش آئی: فقہی، تعلیمی اور لغوی سماجی زندگی میں شادی اور طلاق، وصیت ناموں، قسم ناموں، پیمائش، ناپ اور وزن، مقدار لین دین کے معاملات اور وعدوں میں پرانے دور سے خالص سندھی الفاظ استعمال ہوتے آرہے تھے، جن کی اصطلاحی تشریح اور فقہی توضیح کی ضرورت پیش آئی تاکہ صحیح فتویٰ کے مطابق فیصلے ہو سکیں۔

مخدوم جعفر بوبکائی کی طرف سے طلاق کے سلسلہ میں استعمال ہونے والے سندھی الفاظ ڇڏي (چھوڑی) اور ڇڏيم (میں نے چھوڑ دیا) کی، کی گئی تشریح و توضیح اس سلسلہ کی ایک پرانی مثال ہے۔ مخدوم جعفر نے دسویں صدی ہجری کے تقریباً آخر میں وصال فرمایا لیکن لغات کی تحقیق کا سلسلہ ان کے بعد کے علماء نے بھی جاری رکھا، اور سندھی الفاظ کے نہ صرف لغوی معانی بلکہ سماجی مفاہیم کو بھی متعین کیا گیا۔ مثلاً لفظ 'یار' کے بارے میں سیوہن کے عالم مخدوم محمد عارف(۲) نے فرمایا کہ یہ لفظ 'دوست' کے ہم معنی ہے، لیکن شال اور لاڑ کے دیگر علماء خصوصاً

---

(۱) یعنی جو لفظ جس طرح بولا جاتا تھا اسے ویسے ہی لکھا گیا۔ (مترجم)

(۲) محمد عارف بن محمد حسن بن دین محمد بن مفتی عبدالواحد کبیر سیوستانی۔ اکتساب علم اپنے چچا قاضی محمد احسان المعروف مخدوم عبدالواحد صغیر سیوستانی نعمان ثانی المتوفی ۱۲۲۴ھ سے کیا۔ اس کے علاوہ سلسلہ نقشبندی مجددی میں بھی ان سے بیعت کی۔ اپنے چچا کے وصال کے بعد آپ فتھا و فتاویٰ کے مالک بنے اور مدرسہ بھی اعلیٰ انتظام کے تحت چلتا رہا۔ مخدوم محمد عارف جو فتویٰ لکھتے تھے اسے ان کے شاگرد جمع کر دیتے تھے جو بعد میں بیاض مخدوم محمد عارف کے نام سے ایک بڑی کتاب تیار ہو گئی جسے آج بھی سندھ کے علماء بطور سند استعمال کرتے ہیں۔ مخدوم محمد عارف نے ۱۲۵۸ھ میں وصال فرمایا آپ کے شاگردوں میں سے مخدوم حاجی فضل اللہ پاٹائی بڑا معروف نام ہے۔

دیکھیے: تذکرہ مشاہیر سندھ حصہ اول ص ۲۱۳ (مترجم)

مخدوم عبدالکریم متعلوی (ٹیاروی) نے اس خالص لغوی معنی پر مزید غور کرتے ہوئے، اس وقت کے سندھی معاشرے میں استعمال ہونے والے لفظ 'یار' کے اصطلاحی اور سماجی معنی پر غور و خوض کر کے اسے 'بھائی' کے مساوی قرار دیا۔ موجودہ معلومات کے مطابق بارہویں صدی ہجری (اٹھارہویں صدی عیسوی) کے آغاز ہی سے بعض علماء و اساتذہ نے علمی اور تعلیمی مقاصد کی خاطر 'سندھی لغات' کا زیادہ وسیع مطالعہ کیا۔ اس سلسلہ میں ان کی تحریر کردہ بعض کتابوں کا ذیل میں مختصر تذکرہ کیا جاتا ہے:

ا۔ نظام الدین کی کتاب انیس انجمن:

دربیلہ کے عالم نظام الدین بن عبد الرزاق نے فارسی علم صرف کے بارے میں ''شمع انجمن'' کے نام سے ایک تفصیلی کتاب لکھی اور سن ۱۱۱۲ھ (۱۷۰۱ء) میں 'انیس انجمن' کے نام سے اسکا اختصار بھی لکھا، جس کے باب اول میں ازمنہ ،افعال کی گردانوں اور رمصادر کا بیان ہے اور باب دوم میں فارسی اسماء کا سندھی میں حروف تہجی کے مطابق ترجمہ دیا گیا ہے: لیکن جیسا کہ مصنف کا اہم مقصد تھا 'سندھی الفاظ'، اس لئے انہوں نے حروف تہجی کے اصول کا التزام بھی صرف 'سندھی الفاظ' میں کیا فارسی الفاظ میں نہیں؛ یعنی باب 'الف' کے تحت بطور معنی ان ہی سندھی الفاظ کو لائے ہیں جن کا آغاز الف سے ہوتا ہے۔ مثلاً:

فارسی لفظ	سندھی لفظ 'الف' کے ساتھ	
افسانہ	آکاڻي	(افسانہ، کہانی، قصہ، حکایت)
رودہ	آنڊرو	(آنت، انتڑی)
انب	آمُون	(آم)
شِکنبہ	اوجهري	(اوجھڑی، اوجھ)
بُکاء''	اوڇنگار	(دھاڑیں مار کر یا پھوٹ پھوٹ کر رونا)
غنودن	اوجهرائڻ	(اونگھنا، جھپکیاں لینا)
دَرز	اوتي	(بخیہ، دہرا ٹانکا)
دَلمل	آپون	(گدرایا ہوا پھل، بھُنا ہوا ہرا اناج)
آبخور	آنهُ	(مویشیوں کو پانی پلانے کے لئے کنویں کے قریب بنا ہوا حوض)
دوغ	آکر	(چھاچھ، مَٹھا)

سُر ماک	اک ہوٹ (راند)	(آنکھ مچولی، کھیل)
آونگ	اُچٹ (چِڪو)	(چھینکا)
افلت	اٹ ۔ طھریو	(بغیر ختنہ)
ئی	اٹلڙ	(اکائی)

اس ترتیب سے ظاہر ہے کہ مصنف ''سندھی ۔فارسی لغات'' ہی لکھ رہے تھے ۔ اس بات کی وضاحت اسی باب کے آخر میں ان کی تحریر کردہ درج ذیل عبارت سے ہوتی ہے کہ انہوں نے 'یٰ' والے الفاظ درج ہی نہیں کیے :

''یا ی در (اول) لفظ سندی نمی آید و ہر حرف کہ در اول سندی نمی آید بمکان خود یاد کردہ ایم''

[''ی (کسی بھی) سندھی لفظ کے شروع میں نہیں آتی ؛ اس لئے ایسے حروف جو سندھی الفاظ کے شروع میں نہیں آتے انہیں میں نے اپنی اپنی جگہ پر درج کیا ہے''۔]

سندھی لغت کے مطالعہ کے حوالہ سے مصنف کا یہ بیان بہت اہم ہے کہ کوئی بھی خالص سندھی لفظ 'یٰ' سے شروع نہیں ہوتا ۔ اسی طرح 'ش' کے تحت بھی انہوں نے الفاظ درج نہیں کیے اور بتایا ہے کہ:

''کچھ حرف ایسے ہیں جو سندھی لفظ کے آغاز میں نہیں آتے اور وہ یہ ہیں :

ث ، ح ، خ، ذ ، ز ،ش ،ص ،ض ، ط ، ظ، ع، غ، ف، ق، ی''

اس میں مصنف نے سندھی لغت کے جس انوکھے پن کی طرف توجہ مبذول کروائی ہے، اسے بہت کم لوگوں نے محسوس کیا ہوگا کہ کوئی بھی خالص سندھی لفظ ش، ف یا ی سے شروع نہیں ہوتا ۔

فارسی اور سندھی کے مترادف الفاظ کی یہ مختصر مگر پہلی 'فہرست' ہے جو کتاب 'انیس انجمن' کے ذریعے ہم تک پہنچی ہے۔ اس 'فہرست' کی ایک اور خاص اہمیت یہ ہے کہ اس کے ذریعے نہ صرف بعض انوکھے سندھی الفاظ سامنے آتے ہیں بلکہ مزید دوسرے معلوم سندھی الفاظ کے صحیح معانی بھی دستیاب ہوتے ہیں ،جیسا کہ ذیل کی مثالوں سے معلوم ہوگا۔

ا- سراب = اوج (حیران ہونا)۔ عام طور پر سندھی لفظ ''رِج' (سراب ،دھوکہ) ہے ،لیکن اس فہرست سے معلوم ہوا کہ 'رِج' (سراب ،دھوکے) کو 'اوج' (حیران ہونا) بھی کہا جاتا ہے۔ بعض پرانے سندھی اشعار میں ہے کہ : 'عقل ات اوجون ٿیو، هو هليا سامهون هوءِ'(ا)۔ یعنی : وہاں پر عقل حیران ہوگئی، وہ سامنے چلے گئے ۔''اوجو ٿیو''

(ا) جامع سندھی لغات میں لفظ 'اوجو' کے معنی درج کرنے کے بعد متذکرہ بالا مصرع یوں لکھا گیا ہے:''عقل ات اوجو ٿيو، هو هليا سامهان'' جامع سندھی لغات جلد اول ص ۲۸۷ طبع ثانی ۱۹۹۵ء۔ (مترجم)

[عقل نے رہنمائی نہیں کی ، بلکہ اس نے سراب کی مانند دھوکہ دیا۔ عام طرح اس مصرع کو ''عقل ات اوچون ٿيو، هوءِ هليا سامهون هوءِ'' بھی پڑھا جاتا ہے۔(۱) مگر غالباً زیادہ صحیح لفظ 'اوجون' ہے۔]

۲-سکتہ = اوهاريو (ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہوکر بیہوش ہوا) لفظ 'اوهاريو' معلوم و مستعمل ہے:

''ڪو چوي اوهاريو ۽ ڪو چوي سر سام آ'' (اصغر)(۲) کوئی کہتا ہے کہ 'اوہاریو' یعنی اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہوگئے ہیں اور کوئی کہتا ہے کہ اسے سرسام ہوا ہے۔ مگر مؤلف نے 'اوہاریو' کے معنی فارسی میں واضح طور پر سمجھائے ہیں ۔ اسی طرح بہت سارے ایسے الفاظ بھی ہیں جو پہلے سے ہمیں معلوم ہیں ،لیکن اس 'فہرست' کے ذریعے (جس کے اصل نمبر ذیل میں درج الفاظ کے سامنے لائے گئے ہیں) ان کے معنی کی تصدیق ہوتی ہے۔ مثلاً (۴) هدف = 'آچم'۔ لفظ 'آچام' سندھی شعر میں استعمال ہوا ہے ، لیکن اس فہرست سے معلوم ہوا کہ 'آچم' خواہ 'آچام' دونوں کے معنی ہیں نشان۔ (۱۰) شکار= آهيڙو۔ ہمیں معلوم ہے کہ آہیڑی کے معنی ہیں شکاری ،لیکن اس فہرست سے معلوم ہوا کہ 'شکار' کو 'آہیڑو' کہا جاتا ہے۔ (۱۲) اڌو ٻنڌ (اُدھو بندھ) لفظ ہمیں معلوم ہے''ڪَن اڌو ٻنڌ انگيون مارو منهنجا مير'' (۳) (میرے سادہ لوح

---

(۱) ''اوچون ٿيڻ'' کے معنی ہیں: الجھن میں پڑنا، حیران ہونا، گھبراجانا، پریشان ہونا، بے قرار ہونا۔

۱- جامع سندھی لغات، جلد اول، ص:۲۸۷ ۲- سندھی اردو لغت، ص:۱۰۶ (مترجم)

(۲) سید علی گوہر شاہ اول، متخلص 'اصغر' الملقب بہ 'بنگلے دھنی' پیر پاگارا دوم بن سید صبغۃ اللہ شاہ اول بن سید محمد راشد روضے دھنی بن سید محمد بقا شاہ شہید۔ ولادت ۴ رجب بروز جمعہ ۱۲۳۱ھ کو تحصیل خیرپور کے گاؤں رحیم ڈنو کلھوڑو میں ہوئی۔ تعلیم و تربیت والد بزرگوار کے زیرِ نگرانی وقت کے فاضل و اکابر اساتذہ سے حاصل کی، طریقت میں اپنے والد سے بیعت ہوئے۔ ۵ رمضان ۱۲۴۶ھ کو والد صاحب کے وصال کے بعد پندرہ برس کی عمر میں سجادہ نشین ہوئے۔ ہر وقت جذب وسُکر کے عالم میں رہتے، سندھی اور فارسی کے قادرالکلام شاعر تھے، 'کافی' کی صورت میں آپ کا کلام بہت حد تک مرتب ہو چکا ہے جس میں سندھی کے ۵۲ حروفِ تہجی میں سے ۴۷ حروف پر مشتمل قوافی کی ۶۲۰ مکمل اور ۱۲ نامکمل کافیاں اور ۳۰ فارسی غزل شامل ہیں، باقی پانچ حروف (ص، ض، ظ، غ، ق) کے قوافی ابھی تک دستیاب نہیں ہوئے۔ آپ کے کلام میں فطری روانی ہے جو آپ کی سندھی زبان میں مہارت اور بیان کی قوت کا نتیجہ ہے۔ آپ نے ۱۱ جمادی الاول سنہ ۱۲۶۳ھ کو وصال فرمایا۔

ڈاکٹر صاحب کا درج کردہ، پیر صاحب 'اصغر' کا یہ مصرع آپ کے مطبوعہ کلام میں یوں ہے:

''ڪو چوي اَهُواريو ڪو چوي سر سام آهه''

'اصغر سائیں جو کلام' کے محقق صاحب نے 'اَھُواریُو' کے معنی لکھے ہیں:

اَهُوارِجڻ = ایسی بے ہوشی جس میں انسان مرا ہوا نظر آئے اور ہوشیار اور چوکنا ہونے کے بعد موت کے بعد کے مناظر سنائے۔

دیکھیے: 'اصغر سائیں جو کلام' طبع چہارم کا مقدمہ، ص:۱۰، ۲۸، ۴۰، ۱۷۲

'مخزن فیضان یعنی ملفوظات شریف اردو' ص:۴۱۰-۴۱۱ (مترجم)

(۳) اڌو ٻنڌ (اُدھو بندھ) کمر سے واپس موڑ کر گردن میں بندھی ہوئی چادر، لانگ والی تہمد، لنگوٹ۔

دیکھیے: جامع سندھی لغات جلد اول ص۱۶۲ طبع دوم ۱۹۹۵ء، سندھی اردو لغت، ص:۶۷ (مترجم)

دیہاتی ادھو بندھ اَنگیا (چولی یا سینہ بند وغیرہ) پہنتے ہیں)

لیکن اس فہرست کے ذریعے یقینی طور پر معلوم ہوا کہ 'اَدو ہند' (اَدھو بَندِھ) کے معنی ہیں ساڑھی کی طرح کا لمبا کپڑا جس کا نصف نیچے اور نصف اوپر باندھا جائے۔ (۲۲) پاہوھ =تبسم۔ لفظ پاہوھڻ اور پاہوھ(۱) ہمیں معلوم ہیں لیکن اب تصدیق ہوگئی کہ: پاہوھ =مسکرانا۔

۳- کچھ سندھی الفاظ ایسے ہیں جو پرانے زمانے میں زیادہ استعمال ہوتے تھے۔ مثلاً (۹) ایرانون =کدو (۱۱) اوٖلَ = مخالف حکمرانوں کے وہ افراد جنہیں بطور ضمانت اپنے پاس رکھا جائے ۔ نادر شاہ سندھ سے میاں محمد مراد یاب ،میاں غلام شاہ او رجام ننده ناپور کو 'اوٖلَ' بنا کر ساتھ لے گیا تھا ۔ (۲۱) برون = ٻُلھڻ (بھینس کے بچھڑے کی مانند سیاہ آبی جانور)۔ (۲۲) چاگو ۔ قاڙھو (بارہ سنگھا) (شاخدار سینگوں والا) ۔ (۳۴) پریو = پوڙھو (بوڑھا رپیر مرد)۔

۲۔ مضمون نویسی اور عبارت آرائی (انشاء) کی تربیت کے بارے میں منشی عبد الروٗف کا لکھا ہوا کتابچہ:

انشاء او رعبارت آرائی کے متعلق سنہ ۱۱۷۴ھ(۱۷۶۰ء) میں اس فن کے ماہر منشی عبد الروٗف نے ایک مختصر مگر جامع کتابچہ لکھا (۲) جس میں ایک نئے سیکھنے والے کوفنِ انشاء کی تعلیم دینے کے لئے عبارت نویسی کے فارسی الفاظ ،اصطلاحات او رمحاورات جمع کیے گئے ہیں جنہیں ہم معنی الفاظ اور اصطلاحات کے ذریعے ذہن نشین کرایا گیا ہے: یعنی فارسی انشاء کی تعلیم سندھی کے ذریعے دی گئی ہے۔ فارسی الفاظ کے معنی سمجھانے کے لیے ذیل کے طور پر ہم معنی سندھی الفاظ دیے گئے ہیں:

گذران = حال چال
پیوستہ = ملا ہوا، چپکا ہوا
دوستار = بَھتار (معاون)
جنبیدن = بے قراری/ بے چینی
رفتنیھا = راہ، راستہ، منزل، رفتار، پیادہ
کد خدائي زن = بیاہ، شادی، نکاح، عقد
کشمکش = کھینچا تانی

ظرف = برتن
تمہیدات = تیاری/ تیاریاں
واژگون (واڑگوں) = الٹا، برعکس
دار =سولی، پھانسی - میر بحر ملاح
لرزہ =لرزش، کپکپی، تھرتھراہٹ
بدل =تبدیل ہونا، متغیر ہونا، بدل جانا
نیام = میان، تلوار رکھنے کا غلاف

(۱) پاہوڻ مصدر ہے جس کے معنی ہیں مسکرانا ، پھولنا ،خوش ہونا ، پیار کرنا۔ پاہوھ اسی مصدر سے اسم ہے جس کے معنی ہیں مسکراہٹ ،تبسم ،خوشی ، پیار۔ دیکھیے: سندھی اردو لغت ،ص:۳۲۳ (مترجم)

(۲) راقم کے سامنے سات قلمی اوراق پر مشتمل یہ کتابچہ موجود ہے جس پر منشی عبد الروٗف کی مہر لگی ہوئی ہے اور اس میں سال ۱۱۷۴ھ درج ہے۔

خسوف = چاند گرہن
مجمع = انبوہ، ہجوم، اجتماع
معدہ = پوٹا
محک = کسوٹی
تعلق = لگاؤ، واسطہ، ناتا، رشتہ
مَجْمَر = بھٹی، تنور، بھاڑ، چولہا۔
مشرب = گھاٹ، تالاب، کنواں
نمونہ = خبر، سُدھ، سراغ، بھنک، آہٹ، رنگ، نمونہ، قسم
بلندی = چوٹی
ہالہ = چاند کا ہالہ یا حلقہ
سبکسار = ہلکا، کم وزن

۳- آخوند عبدالرحیم عباسی کی ''جواہر لغات سندھی اکچار'':

آخوند عبدالرحیم ولد محمد وفا عباسی نے یہ لغت یقینی طور پر ۷۰-۱۲۶۹ھ (۵۴-۱۸۵۳ء) سے قبل لکھی، کیونکہ اس عرصے (۱۸۵۳ء) میں سندھی الف - بے کی تختی (مشق کرنے کے حروف) سرکاری طور پر مقرر ہو چکی تھی؛ لیکن آخوند عبدالرحیم نے اس تختی سے جداگانہ رسم الخط کی الف -ب استعمال کی اور سندھی الفاظ بھی اسی کے مطابق الف - ب کی ترتیب پر لکھے۔ اس تصنیف کی یہ خصوصیت ہے کہ ایک تو یہ سندھی کی قدیم ترین اور مکمل الف-ب والی لغت ہے اور دوسرا اس میں سندھی الفاظ کی معانی، فارسی میں لکھی گئی ہیں۔ اس لحاظ سے مصنف نے سندھی لغت کو سمجھانے کے لئے فارسی زبان کو ذریعہ بنایا ہے۔ اگرچہ ''جواہر لغات'' کے آغاز میں بعض صرفی اور نحوی تشریحات اور کچھ الفاظ کے معنی درست نہیں ہیں، اس کے باوجود بھی سندھی لغت نویسی کے سلسلہ میں یہ پہلا اعلیٰ علمی کارنامہ ہے۔

علماء کی طرف سے لغت نویسی کا یہ سلسلہ اس دور کے بعد بھی جاری رہا جس کی مثالیں درج ذیل تصانیف ہیں:

۴- آخوند محمد حسن سانونی کی کتاب ''حسن الفوائد و احسن تعلیم الصبیان'':

ہالا پرانا کے عالم اور استاد آخوند محمد حسن سانونی نے یہ کتاب خاص طور تعلیم و تدریس میں آسانی کی خاطر یکم رمضان سنہ ۱۲۹۳ھ کو لکھ کر مکمل کی۔ اس کتاب کے لکھنے کا مقصد یہ تھا کہ سندھی کے ذریعے فارسی الفاظ کی معانی کو بآسانی سمجھایا جائے۔

راقم نے اس کا جو مخطوطہ دیکھا تھا وہ گویا کتاب کا ابتدائی مسودہ تھا جس میں الفاظ حروف تہجی کی ترتیب پر نہیں تھے بلکہ بغیر ترتیب کے لکھے ہوئے تھے۔ یہ سندھی لغت کا اچھا خاصا بڑا ذخیرہ ہے، جس سے بعض سندھی الفاظ کی ماہیت و معنی زیادہ وضاحت کے ساتھ معلوم ہوتی ہے، مثلاً

نرغول = نرہانپ، (ریچھ کی قسم کا ایک بدصورت جنگلی نر جانور)

ممول = ملهالي (ممولا پرندہ)

خرتن = بڙو یا ٻلهڻ (بھینس کے بچھڑے کی مانند سیاہ آبی جانور جو مچھلیاں کھاتا ہے اور اس کی چربی کشتیوں کے لگانے میں کام آتی ہے)

محصول = رائڙ (۱) (وہ محصول جسے حاکم جائز خواہ ناجائز طور پر وصول کرے)

دلمل = آپون (نیم پختہ اناج، اناج کی پکی بالی جسے بھون کر کھاتے ہیں)

دلمل نیم پختہ = ڏدور آپون ('ڏدور' کے لحاظ سے یہ خاص نام ہے۔ مٹروں کی 'ڏدڙي' کا یعنی آگ پر پکی ہوئی مٹر کی پھلیوں کا)(۲)

نیلوفر = کوٽي (کنول، گٹھ شاخ)

۵-عبدالغفور ہمایونی صاحب کی ''الفاظ ادویہ'' (۳)

علمِ طب کا شغل سندھ میں پرانے زمانے سے مقبول عام رہا ہے، جس کی وجہ سے جڑی بوٹیوں، دوب اور دوائیوں کے نام بھی سندھی میں پرانے زمانے سے ہی رائج تھے۔ چوتھی صدی ہجری (دسویں صدی عیسوی) میں عبدالوہاب فزاری اور پانچویں صدی ہجری (گیارہویں صدی عیسوی) میں ابو ریحان البیرونی نے اپنی کتابوں میں جڑی بوٹیوں اور دوائیوں کے متعلق لکھتے وقت کئی جڑی بوٹیوں اور دوائیوں کے سندھی نام بھی درج کیے۔ بعد میں مرور ایام کے ساتھ سندھ میں غالباً طبی علم کا کوئی زیادہ عروج نہیں رہا جس کی وجہ سے سندھی میں طبی نام بھی زیادہ عام رائج نہیں رہے اور اکثر عربی، فارسی ناموں ہی سے کام لیا جاتا رہا۔ پچھلے قریبی دور میں سندھ کے طبیبوں نے پھر سے سندھی لغات کی طرف توجہ دی اور 'فرہنگ جعفری' جیسی کتابوں میں جڑی بوٹیوں اور دوائیوں کے سندھی نام بھی درج کیے گئے۔

ہمایونی صاحب کی کتاب ''الفاظ ادویہ'' (دوائیوں کے نام) اس لیے اہم ہے کہ مصنف نے یہ کتاب لکھی ہی اس لیے تھی کہ عربی اور فارسی ناموں کے ساتھ دوائیوں کے سندھی نام بھی معلوم ہوسکیں۔

ہمایونی صاحب نے آغاز کتاب میں بتایا ہے کہ: ''بعض مصنفین نے (طب کی) عربی،

---

(۱) جامع سندھی لغات جلد سوم، ص۱۴۲۳ پر یہ لفظ 'راڙ' ('ڙ' کے بجائے 'ڙ' کے ساتھ) لکھا ہوا اور اس کے معنی کے استشہاد کے طور پر شاہ صاحب کے شعر کا ایک مصرع بھی درج ہے: ''[illegible]'' (مترجم)

(۲) جامع سندھی لغات جلد سوم ص: ۱۳۱۳ پر لفظ 'ڏڏڙي' کے معنی میں لکھا ہے: چنے یا مٹر کی پکی ہوئی یا اُبلی ہوئی پھلیاں۔ گویا لغت کی رُو سے 'ڏڏڙي' صرف مٹر کی پکی ہوئی پھلیوں کو ہی نہیں کہتے بلکہ چنے اور مٹر کی ابلی ہوئی پھلیوں کو کہتے ہیں۔ (مترجم)

(۳) مولانا دین محمد وفائی اور علامہ محمد قاسم گڑھی یاسینی نے مولانا ہمایونی صاحب کی اس کتاب کا نام ''فرہنگ ہمایونی'' بتایا ہے۔ دیکھیے: تذکرہ مشاہیر سندھ حصہ اول، ص۲۳۳ اور مہران سوانح نمبر، ص۸۷ (مترجم)

یونانی اور فارسی لغات کو ہندی (اردو) میں ترجمہ کیا ہے، مگر اہلِ سندھ کو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہو رہا۔ اس کے باوجود بھی آج تک کسی نے یہ کوشش نہیں کی کہ فارسی، یونانی لغات کا سندھی میں ترجمہ کریں تاکہ یہاں بھی عام فائدہ ہو۔ اس لیے بعض ہمدرد اصحاب کے مطالبہ پر۔ اللہ کرے وہ سلامت رہیں۔ اس فقیر حقیر نے اس کام میں قدم آگے بڑھایا ہے"۔

ہمایونی صاحب کی اس مختصر طبی فرہنگ کا آغاز 'الف' کے ساتھ اس طرح ہوتا ہے:

آرغیس = یہ 'زرشک' درخت کی جڑ ہے جسے سندھی میں بھی زرشک کہا جاتا ہے [راقم کو اسکا علم نہیں] (۱)

آلسن = ھرمل (حرمل، کالا دانہ، اسپند) سندھی میں اسے ہرملو بھی کہتے ہیں۔

آطِر ایلال = ایک قسم کا گھاس، سندھی میں 'کانُو پیرُ' (۲) (مکو)

---

(۱) مخزن المفردات تالیف حکیم کبیر الدین مطبوعہ شرکتہ الامتیاز، اردو بازار لاہور، ص۲۳۷ پر لکھا ہے: زرشک (عربی) انبر باریس (فارسی) زرشک - زرک (انگریزی) □ BERBERIS VULGARIS ماہیت: ایک خاردار پہاڑی درخت کا پھل ہے جو کشمش سے چھوٹا رنگت میں سرخ سیاہی مائل اور مزہ میں میخوش (کھٹ مٹھا) ہوتا ہے اس کے درخت کی لکڑی ہی دارہلد کہلاتی ہے جس کا عُصارہ (رس، فضلہ، نچوڑا ہوا) رَسوت (رَسوٗلِ) ہے۔ اسی کتاب کے ص ۲۱۶ پر 'دار ہلد' کے متعلق لکھا ہے کہ: دار ہلد لاطینی BERBARIS VULGARE (ہندی) چترا یا کشمل (پنجابی) کسملو (فارسی) دار چوبہ (بنگالی) دہر درا (پہاڑی) کشمل (کشمیری) کیلو (انگریزی) بربریس ROOT BERBERIS BARBERRY ماہیت: دار ہلد درخت زرشک کی لکڑی ہے زرد رنگ ہوتی ہے۔ رَسوت اسی لکڑی کا عُصارہ ہے۔ ازانسواء فرہنگ عامرہ کے مؤلف محمد عبداللہ خان خویشگی نے لکھا ہے: زرشک - زِرِش، ک نام دوا۔ دیکھیے فرہنگ عامرہ طبع اول جون ۱۹۸۹ء مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ص۳۰۹، نیز غیاث اللغات تالیف محمد غیاث الدین رامپوری، مطبوعہ منشی نول کشور، کانپور، نومبر ۱۸۷۱ء کے ص۲۰۸ پر لکھا ہے:
زرشک بکسرتین وسکون شین معجمہ وکاف عربی نام دوائے کہ میوہ باشد کوچک برابر نخود ترش مزہ سیاہ رنگ مائل سرخی۔
ترجمہ: زرشک، پہلے دونوں حروف پر زیر اور شین پر جزم اور کاف عربی کے ساتھ (زِرِشک) ہے، دوائی کا نام ہے جو چنے کے برابر میوہ ہوتا ہے، اس کا ذائقہ کھٹا اور اس کا رنگ سرخی مائل سیاہ ہوتا ہے۔ (مترجم)

(۲) جامع سندھی لغات جلد چہارم ص۱۹۹۸ پر لفظ 'ڪانوَلِ' کے تحت لکھا ہے: (عِنَبُ الثعلب) دوائی کے طور پر کام آنے والا ایک قسم کا گھاس اور پودا۔ اسے 'ڪانئيل پيرونُ' بھی کہتے ہیں۔ اور ہندی میں 'مکو' بولا جاتا ہے۔ نیز جامع سندھی لغات جلد دوم ص۱۷۷ پر لفظ 'پٽ پيرُون' (پٹ پیرُوں) کے تحت لکھا ہے کہ: پنساریوں کی اشیاء کی ایک قسم ہے، اسے سندھی میں 'ڪانئل پيرُونُ' بھی کہتے ہیں۔ جامع سندھی لغات کی ان تصریحات سے ثابت ہوا کہ اسے سندھی میں 'کانُولِ پیرُوں' اور 'پَٹ پیرُوں' بھی کہا جاتا ہے، جہاں تک متن میں اس کے لکھے ہوئے سندھی نام 'کانُو پیرُ' کا تعلق ہے تو میرے گمان کے مطابق یہ طباعت کی غلطی کی وجہ سے ہوا ہے، ورنہ درحقیقت اسے 'کانئیل پیروں' نیز 'کانُولِ پیرُوں' اور محض 'کانُولِ' بھی کہتے ہیں۔ نیز اسے 'پَٹ پیرُوں' بھی کہا جاتا ہے، جیسا کہ مخزن المفردات ص۲۹۵ پر عنب الثعلب کے تحت درج ہے کہ: Blakc NightShad (لاطینی) Solanum Nigrum (عربی) الثعلب (فارسی) اوباہ تریک (بنگالی) کاک ماچی (پشتو) کو ماجو تجنکے (ملتانی) کڑ ویلوں (سندھی) پَٹ پیروں (پنجابی) کانوں کوٹھی - گاچ ماچ (سنسکرت) کاک ماچی، ماہیت: عنب الثعلب کا پودا نصف گز سے لے کر ایک گز تک بلند ہوتا ہے۔ شاخیں بکثرت ہوتی ہیں شاخوں اور پتوں کی رنگت سبز سیاہی مائل ہوتی ہے، پھول چھوٹا سا سفید ہوتا ہے، پھل خوشوں میں لگتے ہیں جو کہ دانہ نخود (چنا) کے برابر اور سبز رنگ ہوتے ہیں اور پختہ ہونے پر سرخ رنگ ہوجاتے ہیں ان کے اندر تخم خشخاش کے برابر چھوٹے چھوٹے تخم بھرے رہتے ہیں۔ خام ہونے کی حالت میں ان کا مزہ تلخ اور پختہ ہونے پر

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اس کتاب کے آخر میں 'ھ' اور 'ی' کے الفاظ اس طرح لائے گئے ہیں:

ہیضہ = سندھی میں 'ڏاڪي' جسے عام طرح سے 'وبا' کہتے ہیں - (کالرا، قے اور دست کی وبائی بیماری)

یرقان = 'ڪامڻ' [نیز اسے 'سائی' بھی کہتے ہیں] (پیلیا)

یرقان = 'صفر هيدرو ڪامڻ' (زرد پیلیا)

یرقان اسود = 'ڪارو ڪامڻ' (سیاہ پیلیا)

۱۰- سندھ کے روایتی ادبی ذخیرہ میں تفصیلی اور تخلیقی اضافہ:

اوپر چوتھے باب کے تحت بیان ہو چکا ہے کہ سومرہ دور قصوں اور داستانوں کا بنیادی دور تھا، جس میں سسئی - پنہوں، سورٹھ - رائے ڈیاچ، مومل - رانو، لیلاں - چنیسر، عمر - مارئی، مورڑو - مگر مچھ اور دودو - چنیسر کے قصے شروع ہوئے۔ اس کے بعد سمہ دور میں نوری - جام تماچی کی نئی داستان نمودار ہوئی اور بھاٹوں اور بھانڈوں کو انعام و اکرام ملے جنہوں نے پرانے دور کے 'جاموں' میں سے جام سپڑ اور جام جکھرو کی سخاوت کی تعریف کی۔ نیز لاکھو - اور اوڈ قوم کی عورت، اور اُڈھو - ہوتھل پری کے قصوں کو از سر نو بیان کیا۔

دُولہہ دریا خان - ہموں راٹھوڑ کی داستان سمہ دور کے بالکل آخر میں نمودار ہوئی، اور بعد میں بڈامانی - پُنرو کی دلیری کا واقعہ ارغون - ترخان - مغل دور میں ہوا: یہ دونوں حکایتیں (جن میں مغلوں کے خلاف واقعات کا ذکر تھا) غالباً مغل حکومت کے خاتمہ کے بعد سندھ کے مقامی حکمرانوں کلہوڑوں اور تالپوروں کے عہد میں بیان کی جانے لگیں۔ مغل دور میں موکھی - متارا (ساقی عورت اور میخوار) داستان نمودار ہوئی اور ٹالپور دور میں 'سندھ رانی - میر باگو' کی داستان مشہور ہوئی۔

ان میں سے اکثر داستانیں پہلے بھی مشہور تھیں اور بیان ہوتی تھیں لیکن انہیں تالپور عہد

(گزشتہ سے پیوستہ) کسی قدر شیریں ہوجاتا ہے، خام پھل (خشک شدہ) اور ہرے پتے دواء مستعمل ہیں۔ مخزن المفردات کی تشریحی عبارت میں اسے عربی میں محض 'الثعلب' لکھا گیا ہے، جو یقیناً کتابت کی غلطی ہے کیونکہ عنوان میں اسے ''عنب الثعلب'' اور اس کی ماہیت بیان کرتے ہوئے بھی 'عنب الثعلب' ہی لکھا گیا ہے۔ دوسرا یہ کہ اس کا فارسی نام 'اوباہ تریک' بتایا گیا ہے۔ اس نام کے املا میں بھی کتابت کی غلطی رہ گئی ہے۔ اس کے عربی نام 'عنب الثعلب' (ثعلب بمعنی لومڑی) کی مناسبت سے فارسی میں اس کا نام ''روباہ تریک'' 'ر' (رے) سے ہے، الف سے نہیں۔ جیسا کہ 'غیاث اللغات' ص: ۲۰۰ پر لکھا ہے: روباہ تریک بضم فوقانی بمعنی مکوی کہ آنرا بعربی عنب الثعلب گویند۔ روباہ تریک 'ت' کے پیش کے ساتھ، اس کے معنی 'مکو' کے ہیں جسے عربی میں 'عنب الثعلب'' کہا جاتا ہے۔ (مترجم)

میں بڑے اہتمام سے بیان کیا گیا اور سنایا گیا۔ ۱۹۹۰ -۱۹۵۷ء کے دوران لوک ادب کے تفصیلی مطالعہ سے معلوم ہوا کہ ان حکایات، قصوں اور داستانوں کے متعلق موجودہ دور میں رائج حکایات اور منظوم روایات زیادہ تر بارہویں صدی (اٹھارویں صدی عیسوی) سے شروع ہوئیں اور اس وقت سے لے کر اس روایتی ذخیرہ میں 'تفصیلی' اور 'تخلیقی' اضافے ہوتے رہے۔

(الف) بیان کی تفصیل میں اضافے:

ہر کہانی، قصہ یا داستان کا آغاز علامات اور بیانات سے ہوا، لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا ویسے ویسے سُگھڑ افراد اور شعراء نے ان قصہ، کہانیوں کو نظم یا نثر میں بیان کرنا شروع کر دیا اور ہر ایک نے اپنی سُن گُن اور ذاتی ذوق کے مطابق کوشش کر کے ان کی نوک پلک درست کر کے زیادہ تفصیل سے بڑھا کر انہیں بیان کیا۔

اوپر چھٹے باب کے تحت بیان ہو چکا ہے کہ شروع میں ارغون - ترخان- مغل دور میں لیلاں - چنیسر، سسئی - پنہوں، عمر- مارئی، مومل - رانو اور دودو- چنیسر کی داستان کو فارسی نظم یا نثر میں بیان کیا گیا۔ اس کوشش و کاوش میں فارسی داستان - گوئی کے زیرِ اثر ان قصوں اور داستانوں کے بیانات میں اضافہ ہوا۔ اس کے بعد بارہویں صدی (اٹھارویں صدی عیسوی) سے لے کر جب شعراء اور سُگھڑ افراد نے انہیں سندھی منظوم مصرعوں میں بیان کیا تو ان میں مزید تفصیل کے ساتھ اضافہ کیا اور ان کے معنی و مطلب پر غور و فکر کیا گیا۔ نیز اس دور میں بعض بیرونی قصوں مثلاً یوسف - زلیخا، سکندر بادشاہ، شاہ بہرام، شیریں - فرہاد، لیلیٰ - مجنوں، سیف الملوک، تمیم سلطان وغیرہ کو، جو اس سے پہلے عربی فارسی شاعری کے ذریعے مشہور ہوئے تھے، اس دور کے سُگھڑ شعراء نے از سرِ نو سندھی منظوم بندوں، اشعار اور مثنویوں میں بیان کیا مثلاً:

۱- لیلیٰ - مجنوں: یہ عشقیہ داستان علاقہ کَچھ کے سید فاضل شاہ نے بارہویں صدی کے آغاز میں (۲۷

رمضان ۱۱۲۶ھ) میں سندھی میں منظوم کی۔ بعد میں خلیفہ عبداللہ نظامانی نے سنہ ۱۲۰۸ھ میں اسے منظوم کیا۔

۲- سسئی - پنہوں: یہ عشقیہ داستان پہلے پہل غالباً محمد عارف کلہوڑو اور بعد میں موریہ

فقیر نے سنہ ۱۲۹۰ھ میں طویل سندھی ابیات میں منظوم کی۔ دوسری طرف خلیفہ نبی بخش صاحب (۱) نے سنہ ۱۲۵۰ھ میں سرائیکی مثنوی میں اور محمد واصل نے سنہ ۱۲۹۹ میں سندھی مثنوی میں تفصیل کے ساتھ اسے منظوم کیا۔

۳- مورڑو اور مگر مچھ: یہ قصہ بارہویں صدی (اٹھارویں صدی عیسوی) میں امین دھوبی نے طویل سندھی ابیات میں بیان کیا۔

۴- لیلاں - چنیسر: 'قصہ کوئرو چنیسر' کے عنوان سے میر شیر محمد خان کے ہندو منشی موریہ فقیر نے طویل سندھی ابیات میں ٦ ربیع الثانی ۱۲۹٦ھ کو مکمل کیا۔

۵- مول - رانو: بارہویں صدی میں یعقوب دھوبی نے یہ قصہ طویل سندھی ابیات میں منظوم کیا۔ بعد میں

---

(۱) نبی بخش بن بالاچ خان لغاری تحصیل ٹنڈو باگو ضلع بدین کے گاؤں 'مٹھی' میں سنہ ۱۱۹۰ھ/۱۷۷٦ء میں پیدا ہوئے، اس زمانے کے دستور کے مطابق فارسی تعلیم حاصل کی، پچیس سال کی عمر میں ایک پری پیکر کی محبت مین گرفتار ہوگئے، بالآخر گوہر مقصود ہاتھ آیا اور اپنی محبوبہ سے شادی کرلی لیکن کچھ ہی عرصے بعد ان کی زوجہ فوت ہوگئی اور یوں خلیفہ صاحب کی دنیا میں تاریکی چھا گئی۔ آخرکار اپنے دوست اور خالہ زاد بھائی قاسم کے مشورے پر سندھ میں سلسلہ قادریہ کے علمبردار، برگزیدہ اور با شرع عالم اہل دل ولی کامل حضرت سید محمد راشد روضے دھنی (مورث اعلیٰ پیر پاگارہ) سے سنہ ۱۲۳۰ھ میں بیعت ہوگئے، جس سے آپ کو روحانی فیض اور اطمینان قلب حاصل ہوا اور آپ کے مجازی عشق کو حقیقی عشق کی طرف مہمیز ملی۔ آپ کو مرشد کی طرف سے پہلے ہی دن خلافت عطا ہوئی، تین سال تک مرشد کی صحبت فیض اثر میں رہ کر عبادت و ریاضت میں مصروف رہے جس سے آپ کو تصوف میں اعلیٰ مقام حاصل ہوا۔ آپ کی صحبت اور کیمیا اثر نظر سے ہزاروں غیر مسلم دولتِ ایمان سے مالا مال ہوئے۔ آپ نے سندھ، کاٹھیاواڑ اور گجرات میں قادری سلسلہ کی تبلیغ و ترویج میں نمایاں کردار ادا کیا اور عقیدت مندوں کا ایک بڑا حلقہ پیدا کیا۔ حضرت سید محمد راشد روضے دھنی کے سنہ ۱۲۳۴ھ میں وصال کے بعد خلیفہ صاحب ۴٦ برس زندہ رہے اور آپ نے تین سجادہ نشینوں سید صبغت اللہ شاہ اول المعروف تجر دھنی متوفی ۱۲۴٦ھ، سید علی گوہر شاہ اول المعروف بنگلہ دھنی متوفی ۱۲٦۳ھ اور سید حزب اللہ شاہ المعروف تخت دھنی متوفی ۱۳۰۸ھ کا دور دیکھا۔ آپ نے شاہ عبداللطیف بھٹائی کی تقلید میں 'رسالو' منظوم کیا، بقول ڈاکٹر بلوچ صاحب آپ کے اس 'رسالو' کو بعض خصوصیات کی وجہ سے ایک انفرادی حیثیت حاصل ہے۔ آپ نے سنہ ۱۲۵۴ھ (سندھ میں اردو شاعری، ص:۱۳۹ پر یہی سال تحریر ہے) میں ''داستان سسئی - پنہوں'' کو سرائیکی زبان میں مثنوی میں منظوم کیا جو ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ آپ کی شاعری میں خدا پرستی، سچائی، سلوک، عشق و محبت، مجاز و حقیقت، شریعت و طریقت، وحدت و کثرت کے اسالیب نمایاں ہیں، نیز آپ کے کلام میں جذبۂ وطنیت، ہمت و حوصلہ، مسلسل کوشش اور محنت، خود اعتمادی اور امید نمایاں خوبیاں ہیں۔ آپ نے سندھی کے علاوہ ہندی، فارسی، سرائیکی، اردو اور ڈھاٹکی میں شاعری کی، آپ کی اردو شاعری سلوک و مناجات و غزلیات، وائی، ریختہ، راگ، ٹپہ، راسوڑہ، سہرا، بھجن اور ہوری پر مشتمل ہے۔ چونکہ خالہ زاد بھائی قاسم نے انہیں مرشد کی طرف متوجہ کیا تھا، ان کے اس احسان کے سبب خلیفہ صاحب نے قاسم تخلص اختیار کیا، آپ نے سنہ ۱۲۸۰ھ/۱۸٦۳ء میں وصال فرمایا۔ دیکھیے:

۱- سندھ میں اردو شاعری تالیف ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ ص ۱۳۸-۱۳۹

۲- مکتوبات شریف اور سوانح حیات سید محمد راشد روضے دھنی (سندھی) تحقیقی مقالہ ڈاکٹر نذر حسین سکندری ص ۱۴٦-۱۵۱

۳- 'سندھ میں اردو' تحقیقی مقالہ ڈاکٹر شاہدہ بیگم ص ۲۴۵-۲۴٦ (مترجم)

بھٹائی صاحب کے چھوٹے معاصر اور لس بیلہ کے شاعر شیخ ابراہیم سندھی نے اسے سندھی ابیات میں بیان کیا۔ اس کے علاوہ اس قصہ کو پیر ڈنہ گاذر (دھوبی) نے منظوم کیا۔ (جس کا حوالہ خدا داد خان نے ''وقائع جیسلمیر'' میں دیا ہے) اور بعد میں لعل بخش عرف حفیظ تیونہ (۱۸۱۰-۱۸۸۵/۹۰ء) نے اس قصہ کو طویل سندھی ابیات میں بیان کیا، جو بہت زیادہ مشہور ہوا۔

۶- یوسف - زلیخا: تین شعراء: غلام محمد بُگائی،(۱) محمد ملوک (وفات ۱۱۸۹ھ) اور احمد نے یہ قصہ قرآن شریف کی مثالی روایت کے مطابق منظوم کیا۔ اس قصہ سے متعلق غلام محمد بُگائی کے جتنے بھی سندھی ابیات دستیاب ہوئے ہیں وہ اعلیٰ معیار کے ہیں(۲)۔

۷- سیف الملوک اور بدیع الجمال: بَہار پُرڑ' نے تقریباً بارہویں صدی کے درمیانی عرصہ میں سندھی ابیات میں اسے لکھا اور بعد میں ۱۱۹۹ھ میں لطف علی نے اسے نہایت پُرلطف سرائکی ابیات میں منظوم کیا۔

۸- بانکا بہرام: چُھتہ دھوبی نے تقریباً بارہویں صدی کے درمیان میں اسے طویل سندھی ابیات میں بیان کیا، اور بعد میں تیرہویں صدی کے آغاز میں لس بیلہ کے شاعر شیخ ابراہیم نے اسے بعنوان ''قصہ شاہ بہرام گوز اور حُسن بانو کا'' سندھی ابیات میں منظوم کیا۔

۹- مجمہ سلطان کا قصہ: بارہویں صدی کے آغاز میں تیار کردہ برٹش میوزیم لائبریری لندن میں قلمی صورت میں موجود ہے۔ بعد میں عبدالرحمٰن شاعر نے ''بروز بدھ ۵ جمادی الآخر سنہ ۱۲۲۶ھ'' میں اس قصہ کو منظوم کیا۔

ان تمام قصوں اور داستانوں کی مختلف روایات کو، نیز دودو - چنیسر کی مشہور حکایت اور دیگر کہانیوں میں موقعہ کے دوہوں کے ساتھ گائی گئیں دیگر حکایات کو بڑی تحقیق کے ساتھ سندھی لوک ادب کی مختلف تیرہ (۱۳) جلدوں میں شائع کیا گیا ہے، جنہیں مزید تفصیلی معلومات کے لئے دیکھنا چاہئے۔

تالپور عہد میں قصوں کی عام مقبولیت اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ سندھ پر قبضہ کرنے کے بعد بعض انگریز مصنفین نے بھی سندھی قصوں کی اشاعت کی طرف توجہ دی۔ کیپٹن سٹک نے

---

(۱) تحصیل مورو ضلع نوشہرو فیروز کے گاؤں ''بُگا'' کے بڑے نامور عالم تھے، شاہ عبداللطیف بھٹائی کے ہمعصر تھے، بڑے کُہنہ مشق، پختہ اور بے باک شاعر تھے۔ ان کی شاعری کا ایک بہت بڑا حصہ نبی پاک اور آپ کی آل و اصحاب کی تعریف اور معجزات کے بیان پر مشتمل ہے، سنہ ۱۱۸۸ھ تک ان کے زندہ موجود ہونے کے علمی آثار ملتے ہیں، صحیح طرح سے تاریخِ وفات کسی بھی ماخذ میں مذکور نہیں ہے۔ (مترجم)

(۲) راقم کو یہ اشعار مولانا جامی کی ''یوسف - زلیخا'' کے ایک مخطوطہ کے حاشیہ پر لکھے ہوئے ملے ہیں اور آجکل زیرِ مطالعہ ہیں جنہیں عنقریب شائع کیا جائے گا۔ (نبی بخش ۲۹ جولائی ۱۹۹۰ء)

۱۸۴۹ء میں شائع ہونے والی اپنی ''سندھی گرامر'' میں رائے ڈیاچ کے قصہ کے ابیات بطور مثال درج کیے؛ ٹرمپ نے سنہ ۱۸۵۸ء میں فاضل شاہ کا ''لیلیٰ مجنوں'' طبع کروایا؛ گولڈ سمڈ نے سنہ ۱۸۶۳ء میں ''سسئی پنہوں'' کی ایک روایت کا متن انگریزی ترجمہ کے ساتھ شائع کیا؛ رچرڈ برٹن نے تالپوروں ہی کے عہد میں ''سسئی پنہوں'' کی ایک داستان کو اپنی کتاب ''سندھ میں آباد قومیں'' میں مختصر طور پر قلمبند کیا۔ تالپور عہد کے قصہ گوؤں، گانے والوں اور سگھڑ حضرات کی محافل کی روایت پچاس ساٹھ سال بعد، انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے آغاز تک بڑے ذوق کے ساتھ قائم رہتی ہوئی آئی(۱)۔

(ب) تخلیقی اضافے:

اس دور میں جیسے ہی قصوں اور داستانوں کو عام محافل اور مجالس میں بیان کرنے اور انہیں دلچسپی کے ساتھ سننے کا سلسلہ وسیع ہوا تو ایک طرف ہنر مند قصہ گو افراد پیدا ہوئے جنہوں نے ''حکایات گانے'' کا فن عروج پر پہنچایا تو دوسری طرف سگھڑ حضرات پیدا ہوئے جنہوں نے قصوں اور داستانوں کے آثار و علامات کو پرکھنے کے لئے ''بجھارت'' (پہیلی) کے فن کو ترقی دی اور ان کے معنوی بھید کو پرکھنے کے لئے تمثیل و تلمیح پر مشتمل شاعری 'ڈوڑ'(۲) شروع کی۔ بلکہ دیگر بڑے سگھڑ حضرات نے اس دور میں ''ہنر'' (بجھارت کی ایک قسم) کی تجنیسی شاعری اور ''سندھی سینگار شاعری'' کو تخلیق کیا۔ یہ تمام فنی تخلیقات، روایتی ادبی ذخیرہ کی پرکھ اور پہچان اور اعلیٰ آگہی کے نتیجے کے طور پر شروع ہوئیں اور علمی سلسلوں سے باہر عوامی سطح پر عام محافل میں عروج کو پہنچیں۔ کاریگروں اور پیشہ وروں خاص طور پر دھوبیوں، کمہاروں، لوہاروں اور ترخانوں کی دکانیں سگھڑ حضرات اور سیانوں کی محافل کے مراکز بنے جہاں پر روایتی ادب کے موضوعات پر تبادلۂ خیالات ہوتا تھا اور تمثیل و تلمیح پر مشتمل شاعری 'ڈوڑ' پہیلی، ہنر اور سینگار کی اصناف ترقی کرتی رہیں۔

• ان میں سے ہر ایک موضوع پر لوک ادب سلسلہ کی مختلف جلدوں میں تفصیل سے روشنی

---

(۱) انگریزوں کے قبضہ کے بعد سندھ کے مقامی علماء، کاریگروں، ہنر مندوں، موسیقاروں، قصہ خوانوں اور سگھڑ حضرات کی قدر دانی اور داد و دہش کے ذریعے ان کی حوصلہ افزائی کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ ۱۹۳۰ء کے بعد بیراجی نہروں کے رواں ہونے اور ۱۹۳۷ء میں سیاسی کشمکش شروع ہونے کے بعد پہلے والی فراغت یا انعقادِ محافل کے ذریعے باہمی محبت کے اظہار کی رسم کمزور پڑ گئی، جس کی وجہ سے لوک ادب کے سرچشمے خشک ہونے لگے۔

(۲) ڈوڑ: معمہ یا بجھارت (پہیلی) کی ایک قسم جو 'دوہوں' میں ہوتی ہے۔ ایک قسم کا ''بیت'' (شعر) جس کے ظاہری معنی تو کچھ اور ہوتے ہیں لیکن اصل میں وہ کسی خاص واقعے کے متعلق ہوتا ہے۔ وہ ''بیت'' جس میں تمثیل و تلمیح ہو۔

جامع سندھی لغات، جلد۳، ص:۱۲۳۷

سندھی-اردو لغت، ص:۵۵۵ (مترجم)

ڈالی گئی ہے، جس سے ان کی ادبی اور فنی اہمیت واضح ہوتی ہے۔

اب تک راقم کی لوک ادب پر کی گئی تحقیق کی روشنی میں بڑے وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ جلال دھوبی جو کہ شاہ عبداللطیف کے بڑے معاصر تھے، وہ بارہویں صدی ہجری میں سندھ کے سُگھڑ حضرات کے سرتاج تھے، جنہوں نے سگھڑپن کے فن کو عروج پر پہنچایا۔ خاص طور پر ''ہنر کی شاعری'' اور ''سندھی سینگار شاعری'' کی تخلیق کا سہرا ان ہی کے سر ہے۔ جلال دھوبی قریہ مُوندر (تحصیل دادو) کے رہائشی تھے اور غالباً بھٹائی صاحب سے کچھ ہی پہلے ۶۰-۱۱۵۰ھ کے عرصے میں فوت ہوئے اور ''پیر ٹرہو کے قبرستان'' میں دفن ہوئے۔ لوک ادب سلسلہ کی ''سندھی سینگار شاعری'' (مطبوعہ سنہ ۱۴۰۶ھ/۱۹۸۶ء) میں سُگھڑ حضرات کے سرتاج جلال کی سوانح اور شاعری پر کافی تحقیق کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے، مزید معلومات کے لئے اس کا مطالعہ مفید ثابت ہوگا۔

۱۱- سندھی اساسی شاعری کی بنیادوں کا استوار ہونا:

سندھی اساسی (کلاسیکی) شاعری کی بنیاد اور اساس اعلیٰ انسانی اقدار پر مشتمل فہم و فکر ہے: جس میں محض کسی قصہ اور واقعہ کے بیان یا محض شاعرانہ خوبیوں کے اظہار کے بجائے کسی اعلیٰ مقصدیت کے معنی سمائے ہوئے ہیں۔ اس اعلیٰ سندھی شاعری کی اساس، خالقِ کائنات کی وحدانیت پر کامل یقین، انسان کے ساتھ محبت اور انسانی وحدت پر یقین اور معاشرے میں اعلیٰ خوبیوں کے شخصی کردار کے مفہوم پر مشتمل ہے۔

مجموعی طور پر، سندھی اساسی شاعری انسان کے ایمان اور ارادے کی سچائی اور عملی کردار کے اعلیٰ معیار کی تشریح و تعبیر ہے۔ اور یہ تشریح بڑی حد تک اسلامی تصوف و طریقت کے اس پاک صاف دستور کی روشنی میں ہے، جو سندھ میں قدیم دور سے مقبول عام تھا۔

سندھی اساسی شاعری، باخبر صوفی سالکوں، وسیع النظر اور اہل دل دانا اور صاحب درد لوگوں کا کلام اور پیغام ہے جس میں انسان کی عارضی زمینی زندگی اور اس کی دائمی بقا کے ساتھ منسلک حقائق کے آثار پوشیدہ ہیں۔ جن میں سے بعض نہایت اہم حقائق یہ ہیں: خالقِ کائنات کی یکتائی، خالق و مخلوق کے تعلق کی حقیقت، کائنات کی تخلیق میں وحدت اور کثرت، انسانی وحدت کے لئے عقیدہ توحید اور ایمان کی سچائی کی ضرورت، عملی زندگی میں انسان کے لئے اعلیٰ مقصد اور اس مقصد تک پہنچنے کے لئے مسلسل کوشش کی اہمیت، زندگی کے مشکل مراحل یا سماجی تعلقات اور پیار کے رشتوں کے نازک مراحل پر انسانی اخلاق اور کردار کی عظمت۔

اساسی شاعری میں ہر صوفی، عارف اور دانشمند نے اپنے اپنے علم کے مطابق ان حقائق

کو دلائل، اشارات اور علامات کے ساتھ سمجھانے کی سعی کی ہے۔

موجودہ معلومات کی رُو سے قاضی قادن اساسی شاعری کی عمارت کے بانی مبانی تھے۔ وہ سندھی زبان کے پہلے بڑے شاعر اور اساسی شاعری کے باوا آدم تھے۔

دسویں صدی ہجری میں قاضی قادن (وفات ۹۵۸ھ) نے اعلیٰ سندھی شاعری کی بنیاد رکھی اور میاں شاہ کریم (وفات ۱۰۳۲ھ) نے اس بنیاد کو مستحکم کیا اور وہ کسی حد تک قاضی قادن کی سالکانہ فکر کے شارح بھی تھے۔ گیارہویں صدی کی آخر اور بارہویں صدی میں شاہ لطف اللہ قادری، میاں شاہ عنایت اور شاہ عبداللطیف کے مجموعہ کلام (رسالوں) میں اساسی شاعری کی عمارت، ہیئت اور صورت کے لحاظ سے تکمیل کو پہنچی۔ اعلیٰ فکر اور مضامین کی تقسیم کے لحاظ سے شاہ عبداللطیف نے اس عمارت کو مزید خوبصورت بنادیا، نیز آپ نے ایسی شاہراہ متعین کی جس کے ذریعے اسے آراستہ کرنے کا سلسلہ چودھویں صدی تک جاری رہا۔ خاص طور پر عبدالوہاب سچل، صوفی فقیر محمد صدیق، قنبر علی شاہ بھاڈائی، خلیفہ نبی بخش اور آخر میں غلام محمد خانزئی نے اعلیٰ اساسی شاعرانہ 'مجموعوں' کے اس ایوان کو نہ صرف آراستہ کیا بلکہ اسے اور وسیع کردیا۔

اس دور کی اساسی شاعری کی تاریخ میں ایک نہایت ہی مفید رجحان یہ پیدا ہوا کہ: ''سلوک و طریقت پر مشتمل ابیات (اشعار) کی روایت'' اور ''عوامی ابیات (اشعار) کی روایت'' میں معنوی طور پر ملاپ ہوا۔ یہ ملاپ میاں شاہ عنایت کے کلام میں واضح طور پر نظر آتا ہے۔ اس سے قبل سندھی ابیات کے دو مختلف سلسلے رائج تھے: ایک طرف سالک صوفیاء، عارفین اور علماء اپنے ''معنوی ابیات'' میں توحید و طریقت، ایمان اور اخلاقیات کے اسباق سمجھاتے تھے تو دوسری طرف قصہ خواں اور سگھڑ شعراء عوامی قصوں اور کہانیوں کو ''بیانی ابیات'' کے ذریعے دہراتے اور گاتے تھے۔ میاں شاہ عنایت (وفات ۱۱۳۳ھ) کے کلام میں پہلی مرتبہ ان دونوں سلسلوں میں اشتراک اور ان کی بہتات نظر آتی ہے۔ ان سے پہلے کچھ عارفوں اور سالکوں نے توحید و طریقت کے اعلیٰ معنوی آثار و علامات کو عوامی عنوانات کے ذریعے اپنے بعض اشعار میں بیان کیا، لیکن وہ ابھی آغاز ہی تھا۔ مثلاً میاں علی شیرازی، میاں شاہ کریم اور بعض دیگر حضرات کے کچھ اشعار سندھ کے عام قصوں اور داستانوں، مثلاً مورڑو - مگر مچھ، سسئی - پنہوں، عمر - مارئی، لیلاں - چنیسر، مومل - رانو، سوہنی - میہنوال کے آثار و علامات میں سمائے ہوئے ملتے ہیں۔

میاں شاہ عنایت اعلیٰ اساسی شاعری کے پہلے شاعر تھے جنہوں نے اس رجحان کو اپنے کلام کے ذریعے پختہ کرکے مقبول عام بنایا۔ اور انہوں نے مندرجہ بالا عوامی قصوں کے ساتھ

(الف) سورٹھ - رائے ڈیاچ اور منگتے، نوری اور جام تماچی اور لاکھو اور ریباریوں کی داستانوں،

(ب) سمندر اور ناخداؤں، جوگیوں اور پوربیوں(۱) - سامیوں(۲) کی کاوشوں،

(ج) پیشہ ور- کاتنے والیوں (۳)، اور

(د) سورماؤں اور سخی لوگوں مثلاً ابڑو، جکھر و اور کرن (۴) کے کرداروں کو اپنے اشعار میں بیان کیا۔ اسی طرح میاں شاہ عنایت نے اپنے کلام میں اعلیٰ فکری روایت اور عوامی روایت، دونوں کو یکجا کیا۔ اس کے بعد شاہ عبداللطیف نے اپنے اشعار اور وائی (۵) میں دونوں روایتوں کے رخ اور جوہر کو ملا کر ایک کر دیا، یہاں تک کہ آئندہ کے لئے یہ پگڈنڈی اعلیٰ اساسی شاعری کی شاہراہ بن گئی۔

مقدار کے لحاظ سے اس دور میں اساسی شاعری کا سرمایہ بہت ہی وسیع ہوا اور 'رسالوٗ' کے خاص نام سے اعلیٰ معنوی اشعار کے ذخائر وجود میں آئے۔ شاہ لطف اللہ قادری پہلے شاعر تھے جنہوں نے توحید اور طریقت کے بارے میں اپنے معنوی ابیات کے مجموعہ کو 'رسالوٗ' کا نام دیا۔ شاہ لطف اللہ سمیت اعلیٰ اساسی شاعری کے آٹھ بڑے شاعر ایسے ہو گزرے ہیں جنہیں 'صاحبِ رسالہ' (صاحبِ دیوان) کہا جا سکتا ہے۔ ذیل میں مختصر طور پر ان کا ذکر کیا جاتا ہے:

۱- شاہ لطف اللہ قادری اگھم کوٹی:

سنہ ۱۰۲۰ھ/۱۶۱۱ء کے لگ بھگ قدیم تاریخی شہر اگھم کوٹ (موجودہ نام اگھامانو) میں پیدا ہوئے اور سنہ ۱۰۹۰ھ (۱۶۷۹ء) کے لگ بھگ فوت ہوئے۔ وہ اپنے دور کے عالم اور عارف تھے۔ طریقت اور تصوف کے انہوں نے متعلق دو کتابیں ''تحفۃ السالکین'' اور ''منہاج المعرفت'' فارسی میں تصنیف کیں۔ 'منہاج المعرفت' جسے سنہ ۱۰۷۸ھ میں تصنیف کیا تھا وہ قلمی صورت میں

---

(۱) لفظی معنی پورب کا رہائشی، فقیروں کا ایک گروہ مراد ہے۔ (مترجم)

(۲) سُوامی: فقیروں کی قسم، سَنت، فقیر، درویش، اللہ لوک، گیرو رنگ کے کپڑے پہن کر گھومنے پھرنے والے فقیر، بیراگی (مترجم)

(۳) متن میں لفظ 'کاپاتیُن' جمع فاعلی حالت میں ہے۔ 'کاپاتی' یا 'کاپائتی' کے معنی ہیں کاتنے والی، جسے 'کاتار' بھی کہا جاتا ہے اس کے معنی ہیں روئی یا سوت کاتنے والا۔ اس سے مراد ہے اللہ تعالیٰ کے نام کی مالا جپنا، اس اعتبار سے سالک 'کاپاتی' یا 'کاتار' ہے۔ روئی یا سوت سے مراد ہے روحانی کمائی یعنی عبادت، اس سُر میں اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے والوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ (مترجم)

(۴) ایک سمہ جام کا نام ہے۔ (مترجم)

(۵) وائی: سنسکرت زبان کا لفظ ہے جس کے لفظی معنی ہیں: بات، کہاوت، کہت، سخن۔ وائی (کافی) راگ اور نظم کی ایک صنف ہے۔ پیر حسام الدین راشدی کلھوڑہ عہد کے سندھی ادب کے متعلق لکھتے ہیں: اس دور کا اہم کارنامہ 'وائی' (کافی) ہے جسے اس دور کی مقبول ترین صنف کہا جا سکتا ہے۔ شاہ لطیف اور شاہ عنایت نے اسے ایجاد کیا اور دوہوں کے درمیان میں لا کر گائی جانے لگی، جس کی وجہ سے سندھی ادب کو چار چاند لگ گئے۔

دیکھیئے سندھی ادب، ص:۳۸ (مترجم)

موجود ہے اور اس کے اکیس ابواب میں سے بعض ابواب کے آخر میں ایک یا دو سندھی 'بیت' بھی درج ہیں۔ اس کے بعد تصوف اور طریقت کے خاص خاص موضوعات اور معانی کو سمجھانے کی خاطر انہوں نے سات ابواب پر مشتمل سندھی نظم میں 'رسالہ' تصنیف کیا۔ جس کے اصل نسخے میں تین سو اناسی (۳۷۹) ابیات تھے۔ اس طرح دونوں کتابوں (منہاج المعرفت اور رسالہ) میں شاہ لطف اللہ قادری کے سندھی ابیات کی تعداد چار سو ہے، جو ایک بڑا ذخیرہ ہے۔ موجودہ معلومات کی بناء پر شاہ لطف اللہ قادری کا 'رسالہ' سندھی نظم کی تاریخ میں پہلی بڑی کتاب ہے جو بہت ہی با معنی سندھی ابیات پر مشتمل ہے: یہ رسالہ راقم کی تصحیح اور تحقیقی مقدمہ کے ساتھ 'سندھیالاجی' کی طرف سے سنہ ۱۳۸۸ھ/ ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا اور مزید تفصیلی مطالعہ کے لئے موجود ہے۔

۲- میاں شاہ عنایت رضوی نصرپوری:

سنہ ۳۵-۱۰۳۰ھ (۲۶-۱۶۲۱ء) کے لگ بھگ پیدا ہوئے اور سنہ ۱۱۳۳ھ (۱۷۲۱ء) میں وصال فرمایا(۱)۔ شاہ خیر الدین قادری سکھر والے کی خانقاہ کے ساتھ انہیں عقیدت تھی اور تصوف میں قادری طریقہ کے بزرگ تھے۔

میاں شاہ عنایت نے اپنے کلام میں ''سندھی وائی'' کی ترتیب کو تکمیل پر پہنچایا جو ایک تخلیقی کارنامہ تھا۔ انہوں نے عام سندھی قصوں اور داستانوں کے آثار اور دیگر علامات کو اپنے اعلیٰ معنوی ابیات کا موضوع بنایا جس سے اعلیٰ سندھی شاعری کا دائرہ وسیع ہوا اور اس میں ''موضوع'' یا ''سُر'' کی ترتیب پر ابیات اور وائی کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس سے قبل شاہ لطف اللہ قادری کا رسالہ صرف تصوف و طریقت کے ایک ہی موضوع سے متعلق اعلیٰ معنوی ابیات پر مشتمل رسالہ تھا۔ مختلف موضوعات کے متعلق ابیات اور وائیوں پر مشتمل پہلا رسالہ میاں شاہ عنایت کا مجموعۂ کلام ہے جس میں بائیس مختلف موضوعات یا سُروں پر مشتمل ۱۷۴ ابیات اور چالیس وائیاں موجود ہیں۔

میاں شاہ عنایت کا کلام راقم کی تصحیح اور تحقیقی مقدمہ کے ساتھ سندھی ادبی بورڈ کی طرف سے سنہ ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا جس کا مزید تفصیلی مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

۳- شاہ عبداللطیف بھٹائی: (۱۱۰۲-۱۱۶۵ھ/ ۱۶۸۹-۱۷۵۲ء)

شاہ کریم نے (۱۰۳۰ھ میں) وصال فرمایا(۲) تو میاں شاہ عنایت پیدا ہوئے اور میاں

(۱) میاں شاہ عنایت کے کلام کو مرتب کرتے وقت ان کی وفات اندازے کے مطابق لکھی گئی تھی بعد میں ایک قدیم قلمی عبارت کے ذریعے تصدیق سے معلوم ہوا کہ انہوں نے سنہ ۱۱۳۳ھ میں وصال فرمایا۔

(۲) ڈاکٹر عبدالغفار سومرہ کی تحقیق کے ساتھ شائع شدہ بیان العارفین کے اصل فارسی متن کے ص ۳۷۸ پر شاہ کریم کا سن وفات یوں تحریر ہے: تاریخ وفات وقتِ نمازِ شام یک شنبہ ہفتم شہر ذی قعدہ سنہ ہزار و سی و دو در موضع مسکن خود بقرب جوار حق پویستند۔ یعنی آپ نے بروز اتوار ۷/ ذی القعد سنہ ۱۰۳۲ھ میں نمازِ مغرب کے وقت اپنے گھر میں وصال فرمایا۔ (مترجم)

شاہ عنایت نے وصال فرمایا تو بھٹائی صاحب جوان ہوئے۔ میاں شاہ عنایت نے عوامی موضوعات اور اعلیٰ معنوی مضامین کو یکجا کرنے کا آغاز کیا اور شاہ عبداللطیف نے دونوں کو ملا کر ایک کردیا، وہ اس طرح کہ آپ نے عوامی موضوعات میں اعلیٰ فکری روح پھونکی اور اعلیٰ معنوی موضوعات کو عوام الناس کے عقل وشعور کی سطح تک آسان بنادیا۔

میاں شاہ عنایت کا کلام بائیس موضوعات پر مشتمل تھا لیکن شاہ صاحب نے ان کے علاوہ بھی کئی مزید موضوعات پر اشعار کہے۔ ''شاہ جو رسالو'' میں تقریباً انتیس سُر ایسے ہیں جو زیادہ تر شاہ صاحب کے اپنے ابیات اور وائیوں پر مشتمل ہیں۔ ان میں سے بعض سُر ایسے بھی ہیں جن میں ایک سے زیادہ موضوعات شامل ہیں۔ شاہ صاحب نے عوامی زندگی کے عام دھندوں پیشوں مثلاً خانہ بدوشوں اور مویشی چَرانے والوں، کمہاروں اور لوہاروں، جولاہوں اور ہنرمندوں، منگتوں اور میراثیوں (ڈوم)، جنگلی غذا تلاش کرنے والوں اور دیہاتی لوگوں کے رَہن سَہن کے آثار و علامات کو بھی اپنے اعلیٰ معنوی ابیات میں ذکر کیا۔

تعداد کے لحاظ سے 'شاہ جو رسالو' کے مختلف قلمی نسخوں میں تقریباً دوسو 'وائیاں' اور تین ہزار ابیات ایسے ہیں جو اکثر و بیشتر صحت اور معیار کے لحاظ سے شاہ صاحب ہی کے کہے ہوئے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ''شاہ کا کلام'' شعر، فکر، معنی اور بیان کے لحاظ سے اعلیٰ اساسی سندھی شاعری کے آسمان کا سورج ہے۔ شاہ صاحب کی ایک بڑی عظمت یہ ہے کہ آپ نے اعلیٰ فکری و اخلاقی نِکات کو آشکار کرنے کے ساتھ ساتھ مختلف سُروں اور داستانوں میں زندگی کے مشکل اور صبر آزما مواقع اور مراحل پر مختلف کرداروں کی نفسیاتی کیفیات کو بھی نمایاں کیا ہے۔

انسانی شعور اور لاشعور کے بارے میں ان کی گہری بصارت اور توجہ سے ظاہر ہے کہ شاہ صاحب انسان کی نفسیاتی کیفیات کے فطری شارح ہیں۔

۴۔ عبدالوہاب سچیڈنو عرف سچل:

آپ کی تاریخِ پیدائش یقینی طور پر معلوم نہیں، تاہم ایک روایت کی رُو سے آپ بھٹائی صاحب کی وفات (۱۱۶۵ھ) سے قبل پیدا اور سنہ ۱۲۴۲ھ (۱۸۲۷ء) میں وصال فرمایا۔ شاہ عبداللطیف کے بعد، 'رسالۂ کے ابیات اور وائیوں کی صورت میں اعلیٰ فکر پر مشتمل کہا گیا کلام ''رسالوں'' کی صورت میں مرتب ہوا، علاوہ سچل کے کلام کے، جو کہ مقدار، معنی اور سُروں کی ترتیب پر موضوعات کے لحاظ سے 'رسالۂ کی صورت میں مرتب ہونے کے لائق ہے۔

آپ کے کلام میں دیگر سُروں کے ساتھ سوہنی، پورب، ڈھر، بروی، رامکلی سُروں کے ابیات موجود ہیں مگر وہ ان سُروں کے عنوانات کے ساتھ شائع نہیں ہوئے۔ اس پچھلے قریبی دور (۱۹۵۹ء) میں سچل کا سندھی اور سرائیکی کلام دو مختلف مجموعوں میں سندھی ادبی بورڈ کی طرف سے شائع ہو چکا ہے، اگرچہ ان رسالوں میں اکثر کلام شامل ہے لیکن اب بھی بہت سارا کلام میں شامل ہونے سے رہ گیا ہے جسے تحقیق و تصحیح کے ساتھ جمع کرنے کی ضرورت ہے۔ شعر کی کسوٹی کے لحاظ سے، سچل اپنی سرائیکی قافیوں میں زیادہ بڑے 'شاعر' ہیں اور باقی کلام میں 'نظم - گو'؛ اگرچہ اس منظوم ذخیرہ میں بھی شاعری کی جھلکیاں موجود ہیں مگر وہ زیادہ تر سادہ ترتیب اور سادہ بیان پر مشتمل ہے۔

سچل کے کلام سے مجموعی طور پر یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ فارسی خواندہ، لکھے پڑھے شاعر ہیں اور صوفیانہ فکر یا اس کے بیان میں موجود تلمیحات اور آثار و علامات کے حوالہ سے آپ پر سندھی روایت سے زیادہ فارسی روایت کا اثر ہے۔ کبھی کبھار آپ کی عشقیہ عبارت پر فارسی غزل کی روایت غالب آ جاتی ہے اور محبوب کو شرمسار کر دیتے ہیں۔

سندھ کی روایت میں محبوب بے قصور ہے۔ 'حال' اور 'خیال' دونوں سچل کے کلام میں نمایاں ہیں، مگر ان کے 'حال' پر ان کی 'قال' غالب ہے۔ 'خیال' اور 'دم' (۱) بھی سچل کی فکر کے خاص نِکات ہیں، مگر وہ 'خیال' کو 'دم' سے اونچا تصور کرتے ہیں۔ 'وحدت الوجود' اور ابن العربی کی عینیت والی فکر ان کے فکر کی اصل اور بنیاد ہے تاہم آپ ماضی سے جاری 'ادب'، 'اطاعت' اور 'تقلید' کی رسم و روایت سے باہر نکلنے کی ترغیب دیتے ہیں۔

وہ 'صفات' سے زیادہ 'ذات' والی فکر و معنی کو دہراتے اور 'خودی' خواہ 'بے خودی' کے رخ سے خود آگاہی اور خود اعتمادی کا درس دیتے ہیں۔

۵- فقیر محمد صدیق سومرو عرف صوفی صادق شاہ:

شاہ عبداللطیف کی وفات کے کچھ سال بعد پیدا ہوئے اور سنہ ۱۲۶۵ھ (۱۸۴۷ء) میں قریہ 'اُبڑ' (تحصیل عمر کوٹ) میں وصال فرمایا۔ آپ جھوک کی قادری خانقاہ کے درویش صوفی فضل اللہ شاہ قلندر کی نظر کیمیا اثر سے صاحبِ فکر و فیض بنے۔ اپنے مرشد کے 'ارشاد نامہ' سے متاثر ہو کر سلوک و طریقت میں 'درد نامہ' تصنیف کیا اور طریقت و توحید پر مشتمل کلام کہا۔ شاہ قلندر کے وصال کے بعد جھوک میں خانقاہ پر رسمِ راگ کی بنیاد ڈالی جس کے لئے ''راگ نامہ'' مرتب ہوا، جس میں ابیات اور وائیوں کا بڑا ذخیرہ شامل ہے۔

اس مجموعہ میں کئی اشعار وہی ہیں جو 'شاہ جو رسالو' میں شامل ہیں۔ باسٹھ ابیات اور پانچ

---

(۱) دعویٰ کرنا، شیخی بگھارنا۔ (مترجم)

صدائیں (وائیاں) دیگر انیس ایسے شعراء کی ہیں جن کی اکثریت گزشتہ دور کی ہے۔ اس کے باوجود بھی ایک اچھا خاصا حصہ خود فقیر صاحب کے اپنے ابیات کا بھی ہے، حالانکہ ان کے کلام کا تمام ذخیرہ 'راگ نامہ' میں شامل نہیں ہے۔

'راگ نامہ' میں شامل کلام ستائیس سُروں میں منقسم ہے جن میں سے وہاگڑو (وہاگ)(۱)، موکھی اور سوزڑو اس راگ نامہ کے خاص سُر ہیں۔

راگ نامہ میں کل ۱۴۰۶ ابیات اور ۱۴۸ صدائیں (وائیاں) شامل ہیں، جو کہ اعلیٰ اساسی شاعری کا ایک بڑا اور قیمتی ذخیرہ ہے۔

۶-قنبر علی شاہ بھاڈائی:

قنبر علی شاہ بخاری سنہ ۱۲۰۷ھ کے لگ بھگ 'بھاڈِ' (۲) تحصیل جاتی میں پیدا ہوئے اور اس جگہ کی نسبت سے 'بھاڈائی' کہلائے۔ سنہ ۱۲۶۴ھ (۱۸۴۶ء) میں آپ نے 'گدبالی' تحصیل گھوڑا باری میں وصال فرمایا، اپنے وقت کے بڑے عابد و زاہد، قلندر طبع درویش (۳) اور صاحب توکل شخص تھے۔ آپ کے روحانی رہبر بھٹائیؒ صاحب تھے انہی کی راہ اختیار کرتے ہوئے آپ نے 'شریف' تخلص سے اپنا کلام رسالہ کی صورت میں سُروں کی ترتیب پر کہا۔ آپ کے فرزندوں میں سے عبدالقدوس شاہ اور مریدین میں سے فتح محمد فقیر کلہوڑو اور غلام حیدر فقیر تھیبو (جنہوں نے اپنا تخلص ''تیرہیوٗ رکھا تھا) نے بھی رسالہ کا کلام کہا۔

ان چاروں حضرات کا بہت سارا کلام 'رسالوٗ' کی صورت میں سنہ ۱۲۸۴ھ میں قلمبند ہوا۔ قنبر علی شاہ 'شریف' کا کلام 'رسالوٗ' کے چھبیس سُروں میں ہے اور کچھ کلام ضائع ہوجانے کے باوجود بھی ان کے ۱۲۶۸ ابیات اور ۱۱۲ وائیاں سلامت ہیں جو کہ اعلیٰ سندھی اساسی شاعری کا ایک

---

(۱) دیپک راگ کی ایک راگنی کا نام ہے جو صبح کے وقت گائی جاتی ہے، اسے پربھاتی بھی کہتے ہیں۔ (مترجم)

(۲) تحصیل جاتی ضلع ٹھٹہ میں ایک دیہہ کا نام ہے۔ (مترجم)

(۳) قلندر: فارسی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی ہیں آزاد، رِند، بے پروا، مست، فقیر۔ جواہر اللغات اردو ۵۴۶ فرہنگ عامرہ میں ہے: قلندر-قلَن - دَر- بے پروا اور مست فقیر ص ۴۷۷۔ کریم اللغات ص ۱۷۳ پر ہے کہ: قلندر- معرّب کلندر کا، ایک قسم ہے فقیروں کی، مست، بے پرواہ اور لغوی معنی کندۂ نا تراشیدہ (اَن گھڑ لکڑی، احمق، بدتہذیب، بے تمیز)۔ غیاث اللغات ص ۳۴۴ پر ہے کہ: قلندر در اصل کلندر بود بکاف عربی بمعنی کندہ ناتراشیدہ کہ در پس در اندازند تا زود کشادہ نگردد، پس تغیر السنہ بسبب اختلاف عرب و عجم قلندر بقاف شدہ، بعضے معرّب گفتہ اند اول صحیحست۔ از خیابان و در جواہر الحروف نوشتہ کہ در اصل غلندر بغین معجمہ بود۔

یعنی قلندر اصل میں کلندر تھا، جس کے معنی ہیں اَن گھڑ لکڑی، کاٹھ جس سے زندان کی سزا دیتے ہیں تا کہ جلد رہائی حاصل نہ کر سکے، عرب و عجم کے اختلافِ زبان کی وجہ سے کلندر سے قلندر ہوگیا۔

بعض لوگوں نے اسے معرّب شمار کیا ہے، جبکہ پہلی بات درست ہے۔ جواہر الحروف میں ہے کہ یہ لفظ اصل میں غین کے ساتھ غلندر تھا۔ (مترجم)

بڑا ذخیرہ ہے۔ شاہ 'شریف' کے ابیات میں توحید و معرفت کے ساتھ غنائی رنگ بھرپور طور پر موجود ہے، کیونکہ وہ دوسرے کی بات کرتے ہوئے بھی اپنا حال زیادہ بیان کرتا ہے۔

شاہ عبداللطیف کے ابیات ان کے پیش نظر ہیں جن کے تتبع مین ابیات کہتے ہوئے وہ بھٹائی صاحب کے بنیادی خیال کو مختلف طریقوں سے اس طرح دہراتا اور اس کے معنی پر غور و فکر کرتا ہے کہ گویا وہ شاہ صاحب کا شارح ہے۔

شاہ 'شریف' کا رسالہ راقم کی تصحیح و تحقیق کے ساتھ ادارۂ سندھ شناسی (سندھیالاجی) کی طرف سے سنہ ۱۳۹۲ھ/ ۱۹۷۲ء میں شائع ہو چکا ہے جسے مزید تفصیلی مطالعہ کے لئے دیکھا جاسکتا ہے۔

۷- خلیفہ نبی بخش صاحب:

آپ سنہ ۱۱۹۰ (۱۷۷۶ء) کے لگ بھگ پیدا ہوئے اور بڑی عمر میں سنہ ۱۲۸۰ھ (۱۸۶۳ء) کے لگ بھگ وصال فرمایا۔ آپ نے عمدہ مکتبی تعلیم حاصل کی اور فارسی زبان سے اچھی خاصی واقفیت حاصل کرلی تھی۔ آپ ذاتی طور پر بڑے باہمت اور حوصلہ مند تھے؛ میر ٹھارو خان کے درباری تھے اور میر باگو خان کے ساتھ دوستانہ تعلق تھا۔ عشقِ مجازی کے سبب اور اس کے بعد جناب پیر محمد راشد (روضے دھنی) کی نظر فیض اثر سے فقیری اور معرفت کی طرف مائل ہوئے۔ عشق، درد اور فراق کے حال کے ساتھ ۱۲۴۶- ۱۲۵۰ھ کے چار سالہ عرصے میں مثنوی ''سسئی - پنہوں'' منظوم کی۔ یہ داستان خلیفہ صاحب کے اپنے 'حال' کا آئینہ اور ان کے شاعرانہ شعور اور تخلیق کا نمایاں کارنامہ ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ ''سسئی - پُنہوں'' خلیفہ صاحب کی سرائیکی شاعری کا شاہکار ہے۔ بولیوں کے لحاظ سے خلیفہ صاحب نے سندھی کے علاوہ سرائیکی، ہندی، ریختہ، ڈھاٹکی اور اردو میں شاعری کی۔

خلیفہ صاحب کا سندھی رسالہ اعلیٰ اساسی شاعری کا بڑا قیمتی سرمایہ ہے۔ شاہ عبداللطیف اعلیٰ سندھی شاعری کے آسمان پر سورج بن کر چمکے؛ ان کے بعد کے کچھ نامور شعراء گویا ستاروں کی مانند چمکے؛ مگر خاص طرح رسالہ کی شاعری میں خلیفہ صاحب نے اپنے بلند حوصلہ، انفرادیتِ فکر، تخلیقی رنگ اور اُسلوبِ بیاں کی دلپذیری کی وجہ سے چودھویں کے چاند کی مانند روشنی کی۔

خلیفہ صاحب کے اشعار میں بلندی فکر کے ساتھ ساتھ فصاحت و بلاغت اور موسیقی و ترنم کی صلاحیت نمایاں ہے۔ آپ کے رسالہ میں انتیس سُر ہیں جن میں کُل ۷۴۵ ابیات اور ۱۰۱ وائیاں ہیں (جن میں آپ نے اپنے نام کے بجائے اپنے عزیز ترین خالہ زاد 'قاسم' کا نام استعمال کیا)۔

بھٹائی صاحب کے بعد جب انہی سُروں اور موضوعات کو بعد کے شعراء نے دہرایا تو معنوی لحاظ سے انہوں نے گویا حروف ہجا کی مشق کی، مگر خلیفہ صاحب نے اپنے رسالہ کے

سُروں میں بڑی تخلیقی ندرت پیدا کی، مثلاً سُر کلیان، سارنگ، مومل - رانو، مارئی، رپ اور سُر گھاتو کے مضامین پر دیگر شعراء اور خلیفہ صاحب کے ابیات کے تقابل سے یہ حقیقت واضح طور پر نظر آتی ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ خلیفہ صاحب کی فکر میں سندھ کی عظمت کا احساس اور وطنیت کا پختہ جذبہ سمایا ہوا ہے۔ اسی جذبے کے تحت خلیفہ صاحب نے سُر 'کیڈارو' (۱) میں 'کھر ڑی' کی جنگ میں(۲)، افغانیوں کے حملہ کا دفاع کرتے ہوئے شہید ہونے والے سندھ کے سورماؤں کو سراہا اور سندھ کی سرفرازی کے لئے ہمت اور حوصلہ بڑھایا۔ خلیفہ صاحب کو سندھ اور سندھ کے غریب عوام کے ساتھ دلی محبت تھی، اسی وجہ سے 'رسالہ کی شاعری' میں بھی عوام کے ساتھ محبت و ہمدردی کا اظہار جس قدر خلیفہ صاحب کے اشعار میں زوردار نمونے سے موجود ہے اس قدر دوسرے شعراء کے کلام میں نمایاں نہیں ہے(۳)۔

۸- غلام محمد خانزئی:

غلام محمد خانزئی سنہ ۱۲۵۰ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے اور تقریباً ۳۲-۱۳۲۲ھ (۱۹۰۴-۱۹۱۴ء) کے دوران وفات پائی۔ آپ نے 'چوٹیاریوں' کی مشہور درسگاہ کے استاد میاں عبدالحکیم کے زیرِ تربیت تعلیم کی تکمیل کی۔ اس کے بعد بحیثیت عالم و استاد پیشۂ تدریس اختیار کیا۔ سندھی میں شعر، قافی اور نظم اور فارسی میں غزلیں کہیں۔

شاہ عبداللطیف کے رسالہ کا آپ نے گہرا مطالعہ کیا اور اس سے متاثر ہو کر اپنا رسالہ ترتیب دیا۔ سلوک و طریقت کی طرف مائل ہونے کے بعد انہوں نے تصوف کے فکر اور تربیت پر

---

(۱) کیڈارو (کیڈارو) کے لفظی معنی ہیں لڑائی، جنگ، معرکہ، قتلِ عام، ماتم۔ یہ ایک سُر کا نام ہے۔ ایک سندھی راگنی ہے جس میں جنگ اور شہداء کے مضامین گائے جاتے ہیں۔ دیکھیے: جامع سندھی لغات جلد چہارم، ص۲۱۸۴ اور سندھی - اردو لغت، ص۶۵۹ (مترجم)

(۲) 'کھرڑی' سکھر شہر کی حدود میں ایک جگہ کا نام ہے۔ اس زمانے میں حیدرآباد میں میر مراد علی خان بن میر صوبدار خان اور خیر پور میں میر رستم خان بن میر سہراب خان کی حکومت تھی۔ میر مراد علی کی حیاتی کے آخری سال افغانستان کے بادشاہ شجاع الملک نے شکارپور اور اس کے آس پاس کے علاقے پر قبضہ کیا اور لوٹ مار مچائی، جس کا مقابلہ میرانِ حیدرآباد اور میرانِ خیرپور نے مل کر کیا، پرانے سکھر کے باہر 'کھرڑی' کے میدان میں جنگ ہوئی، جس میں میر صاحبان کے کئی نامور سردار مارے گئے اور کامیابی شجاع الملک کو نصیب ہوئی۔ یہ جنگ ۴۹-۱۲۴۸ھ / ۳۳-۱۸۳۲ء میں ہوئی۔ پیر حسام الدین راشدی نے حدیقۃ الاولیاء کے مقدمہ میں ''صبح السطین'' محررہ سنہ ۱۳۱۸ھ سے نقل کیا ہے کہ: ''در ۱۲۴۹ھ جنگ کرڑی واقع شد کہ میران تالپور و سمندر خان افغان وزیر شجاع الملک بادشاہ در سکر باہم بجنگ آمدند۔ آخر لشکر میران شکست خوردہ گریختند، بعضی از آنہا در دریائے کرڑی غرق شدند و بعضی از دریا عبور نمودہ در لوہری رسیدند۔

دیکھیے: ۱- تاریخ سندھ حصہ دوم، ص۱۵۵ - ۲۶۵

۲- لب تاریخ سندھ، ص۱۷۳-۱۷۴ (مترجم)

(۳) 'خلیفہ صاحب کا رسالہ' راقم کی تحقیق و تصحیح کے ساتھ سندھی ادبی بورڈ کی طرف سے سنہ ۱۹۶۶ء میں شائع ہو چکا ہے، جسے مزید تفصیل کے لئے دیکھنا چاہیے۔

علمی انداز سے غور و فکر کیا۔ سنہ ۱۳۰۲ھ میں 'منہاج العاشقین' کے عنوان سے فارسی میں ایک کتابچہ تصنیف کیا جس کا بعد میں انہوں نے سندھی ترجمہ بھی کیا۔ اس میں 'شاہ جو رسالو' کے مختلف سُروں اور داستانوں میں مذکور کرداروں اور دیگر معنوی علامات و آثار کو آپ نے تصوف کے راز و رموز اور مثالوں اور تمثیلوں کے ذریعے سمجھایا۔ ان کا یہ کتابچہ سندھی میں سلوک و تصوف کے فکر و فلسفہ کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن خاص بات یہ ہے کہ غلام محمد خانزئی چھتیس سُروں کے ۲۵۹۰ ابیات اور ۱۷۴۷ وائیوں پر مشتمل 'رسالۂ' کا شاعر ہے جو اعلیٰ سندھی اساسی شاعری کی تاریخ میں آخری رسالہ اور سندھی اساسی شاعری کی رسالوں میں بڑا رسالہ ہے۔ موضوع، مقصد خواہ معنیٰ کے لحاظ سے غلام محمد خانزئی کا رسالہ 'شاہ جو رسالو' کی شرح و تفسیر ہے۔ یہ رسالہ راقم کی تصحیح و تحقیق کے ساتھ، شاہ عبداللطیف بھٹ شاہ ثقافتی مرکز کی طرف سے ۱۴۰۵ھ/ ۱۹۸۵ء میں طبع ہو چکا ہے، اور مزید تفصیلی مطالعہ کے لئے موجود ہے۔

کلام کی مقدار اور معیار کے لحاظ سے مذکورہ بالا آٹھوں 'صاحبانِ رسالۂ اعلیٰ اساسی سندھی شاعری کے روشن منار ہیں۔ ان کے علاوہ بعض دیگر حضرات کے اشعار کا ذخیرہ اگرچہ مقدار میں کم ہے تاہم معنوی معیار کے لحاظ سے بہت اعلیٰ ہے، اور اس لحاظ سے وہ بھی سندھی کلاسیکی شاعری کا قیمتی سرمایہ ہے۔ اس قسم کے تمام شعراء کے تفصیلی بیان کا یہ موقع نہیں، مگر اس باب کے خاتمہ سے پہلے بطور مثال بعض ایسے عارفوں اور فقیروں کا ذیل میں ذکر کیا جاتا ہے جن کے ابیات نہ صرف اچھی خاصی مقدار میں دستیاب ہیں بلکہ فکر کے لحاظ سے بھی وہ خاص خصوصیات کے حامل ہیں۔

۹- خواجہ محمد زمان لواروی:

لواری کی طریقۂ نقشبندیہ کی خانقاہ کے بانی اور عقیدت مندوں کے لئے ''سلطان الاولیاء'' کے اعلیٰ مقام کے صاحب ۱۱۲۵ھ (۱۷۱۳ء) میں پیدا ہوئے اور ۱۱۸۸ھ (۱۷۷۵ء) میں واصل بحق ہوئے۔ آپ کا کلام 'ابیات سندھی' کے عنوان سے شائع شدہ ہے (۱) جس میں کل چوراسی (۸۴) اشعار ہیں۔ کلام کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ ابیات خاص طور پر تصوف کے اعلیٰ فکر و فلسفہ اور سالکانہ شعور و معرفت کے آئینہ دار ہیں اور معنوی لحاظ سے قاضی قادن کے ابیات سے مشابہ ہیں۔

خواجہ صاحب کے عرفان میں یکتائی اور معرفت کے اعلیٰ مقام پر پہنچنے کے بعد سالک کے نزدیک مسجد اور مندر میں فرق باقی نہیں رہتا۔ ایسے اعلیٰ فکر و عرفان میں انسان ذات کی وحدت کا درس سمایا ہوا ہے۔ آپ کے ایک مثالی شعر کے مصرع ''جزي جائز ناه، ڪُل ري ڪٽڻ ڏينهڙا'' (کُل کے بغیر دن بسر کرنا یعنی زندگی گزارنا، ذرہ برابر بھی جائز نہیں۔) سے 'کُل' کا عرفانی فلسفہ شروع ہوا جس کی تشریح گرہوڑی صاحب نے اپنے فارسی رسالہ ''کُل نُما'' میں کی ہے (۲)۔

۱۰- فقیر عبدالرحیم گرہوڑی:

سنہ ۱۱۵۲ھ (۱۷۳۹ء) کے لگ بھگ پیدا ہوئے اور چالیس برس کی عمر میں سنہ ۱۱۹۲ھ (۱۷۷۸ء) میں شہید ہوئے۔ 'چوٹیاریوں' کے بڑے استاد میاں مبین کے زیرِ تربیت تعلیم کی تکمیل کی، جنہیں آپ از راہِ محبت و عقیدت 'اڈو مبین' کہہ کر مخاطب کرتے اس طرح آپ بڑے ادیب، بڑے ذہین اور روشن دماغ عالم بن کر ابھرے۔

فارسی اور عربی میں مکمل مہارت حاصل تھی اور آپ کی فارسی نظم اور عربی نثر کی معیاری مثالیں موجود ہیں۔ اس کے باوجود جب گرہوڑی صاحب نے سندھی میں 'منظومات' اور ابیات کہے تو خالص دیہاتی سندھی زبان میں کہے۔ آپ کا کمال یہ ہے کہ کبھی کبھار گہرے فلسفہ، اعلیٰ فکر اور ارفع فہم کی علامات کو بھی نہایت ہی آسان عام سندھی زبان میں بیان کر دیتے ہیں۔ مثلاً:

اسم ساڻ اللہ جي، سيئي ٿوڪ ٿيا

[اللہ کے نام کے طفیل، سبھی کام کی چیز بنے]

اڏوهي کي آب ڏئي، جتي آب نہ آ

[جہاں پر پانی نہیں وہاں دیمک کو پانی فراہم کرتا ہے]

گُڙ نہ سڃاپي ڳالهين، جان جان ڳڙ نہ کاء

[باتوں سے گُڑ پہچانا نہیں جاتا، تا وقتیکہ گُڑ کھایا نہ جائے]

ڪپڙ پٿو ڪُٽبو، جاسين ميرو آه

[جب تک کپڑا میلا کچیلا ہوگا اسے کوٹا جاتا رہے گا]

هنر ڏاران هڏهين ڇيٽون نہ ڇُرجن

[فن اور جوہر کے بغیر چھینٹ کا کپڑا کبھی بھی رنگا نہیں جاسکتا]

هيءَ ڳنڍ هٿين نہ ڇُڙٽي، جا ڏني پاڻ پرين

[یہ گرہ ہاتھوں سے کھلنے والی نہیں، جو محبوب نے اپنے ہاتھوں سے لگائی ہے۔]

گرہوڑی صاحب کا تمام کلام غالباً محفوظ نہیں رہا، مگر اس کے باوجود، اعلیٰ فکر و معنی پر مشتمل 'منظومات' کے علاوہ بھی رسالہ کے سترہ سُروں (کلیان، یمن، رامکلی، آسا، بروو، سسئی، سوہنی، مومل - رانو، کاموڈ، کیڈارو (۳)، سارنگ، رِپ، ڈھر، کاپائتی (۴)، پربھاتی، کارایل، دھنا

(۱) شمس العلماء ڈاکٹر مرحوم عمر بن محمد داؤد پوتہ کی تصحیح و تحقیق کے ساتھ پہلی مرتبہ سنہ ۱۹۳۹ء میں کراچی سے طبع ہوا اور اس کے بعد بھی چھپ چکا ہے، جسے مزید تفصیلی مطالعہ کے لئے دیکھنا چاہیے۔
(۲) آج تک مریدین و معتقدین اِسے ''کُل - نما'' سمجھتے رہے ہیں لیکن صحیح نام ''کل - نما'' ہے، یعنی فلسفۂ ''کُل'' کا راہ نما۔
(۳) دیکھیے متن ص ۴۶۸، حاشیہ ۱، باب ہشتم، ص ۷۲
(۴) دیکھیے متن ص ۴۶۰، حاشیہ ۳، باب ہشتم، ص ۶۶

سری)(۱) میں آپ کے ایک سو پینسٹھ (۱۶۵) ابیات موجود ہیں(۲) جو آپ کے اعلیٰ انفرادی فکر اور انوکھے، موٴثر اسلوب بیان پر گواہ ہیں۔

---

(۱) کلیان: سنسکرت کا لفظ ہے، جس کے معنی ہیں سُکھ، شانتی۔ یہ سُر دیپک راگ کے آٹھ پدوں میں سے ایک ہے، اسے رات کے پہلے پہر اور بعض کے بقول رات کے آخری پہر میں گایا جاتا ہے۔
یمن: یمن کے معنی ہیں من کو روکنا۔ یہ کلیان ہی کی قسم ہے۔ اس سُر میں نفس پر قابو پانے کا مضمون سمویا ہوتا ہے۔
کھنبھاٹ: ہنڈول راگ کی پانچ استریوں میں سے ایک ہے، اس سُر میں جوگ اور بیراگ (فقیری اور نفس کُشی) کا خیال سمایا ہوتا ہے۔
آسا: یہ آدھی رات کے بعد گایا جانے والا راگ ہے۔ بعض افراد کا کہنا ہے کہ 'آسا' ایک راجکماری کا نام ہے، جو سَحر کے وقت خدا کی تعریف میں گیت گاتی تھی، جس سُر میں وہ گاتی تھی اس پر 'آسا' نام پڑ گیا۔
برود: (بروہ) اس کے معنی ہیں مریض، بیمار، گھائل۔ ہندوستانی گائن ودیا کی رُو سے 'برو' ایک راگنی کا نام ہے، جس میں زیادہ تر مجازی عشق کا بیان ہوتا ہے البتہ اس میں محبوب حقیقی کا بھی ذکر کیا جاتا ہے۔
سسئی: یہ خالص سندھی راگنی ہے، جس میں سسئی - پنہوں کے عشق و محبت، ان کے وصال، آخرکار ان کی جدائی اور پنہوں کی تلاش میں سسئی کی درماندگی وغیرہ کا بیان ہے، یہ ایک تمثیلی سُر ہے جس میں سسئی سے مراد انسان اور بھنبھور سے مراد دنیا اور پنہوں سے مراد مطلوب حقیقی اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول ہے۔
سوہنی: اس سُر میں سوہنی - میہنوال کے عشق و محبت کا تذکرہ ہوتا ہے۔ محبت کی تیزی مہران ندی کی طغیانی سے بھی زیادہ ہوتی ہے، جس طرح سوہنی کو دریا میں مگرمچھوں اور گھڑیالوں نے گھیر لیا تھا، اسی طرح روحانی طالب کو بھی حقیقی راہ میں نفسانی خواہشات کے اژدہاؤں سے پالا پڑتا ہے۔ اس سُر میں سوہنی - میہنوال کی تمثیل میں انہی حقائق کو بیان کیا جاتا ہے۔
مومل - رانو: اس سُر میں راجا نند گجر کی بیٹی مومل اور علاقہ تھر کے حاکم ہمیر سومرو کے دوست اور سالے 'رانو مہندرو' اور کاک نہر کے کنارے پر بنے ہوئے طلسماتی محل کو گایا جاتا ہے۔ یہ راگنی بھی خالص سندھی راگنی ہے۔
مومل کو حاصل کرنے کے لئے تمام خطرات کا مقابلہ کرتے ہوئے ہر قسم کے طلسم اور فریب کی اصلیت و حقیقت سے آگہی اور ان سے اپنے دامن کو بچا کر گوہر مقصود کو حاصل کرنے اور پھر سچی محبت کی راہ میں معمولی لغزش اور فریب کاری کے خطرناک نتائج و عواقب کو تمثیلی انداز میں گایا جاتا ہے، مومل نے غلطی کرتے ہوئے مردانہ لباس میں اپنی بہن کو (مہندرو کی یاد اور محبت کا تصور جماتے ہوئے) ساتھ سُلا لیا، جسے دیکھ کر رانو مہندرو ہمیشہ کے لئے اس سے روٹھ گیا۔ اس سُر میں اللہ تعالیٰ کی ذات کو رانو مہندرو، اس کے طالب کو مومل اور اس دنیا کو کاک کے کنارے بنے ہوئے طلسماتی محل کے ساتھ تمثیل دی گئی ہے۔
کاموڈ: یہ دراصل 'کاموڈ' کا بگڑا ہوا روپ ہے، جس کا مطلب ہے پریم کے اختیار میں یا پریم کے ہاتھوں مجبور۔ یہ دیپک کی پانچ استریوں میں سے ایک ہے اور سمپورن (کامل) راگنی ہے، مالکوس ہی کی ایک قسم ہے۔ اسے دوپہر کے وقت گایا جاتا ہے۔ سندھی شاعری میں اس راگنی میں نوری مچھیرن کی نیازمندی اور بادشاہ وقت جام تماچی کے اُس پر فدا ہونے کو گایا جاتا ہے۔
سارنگ: سنسکرت کا لفظ ہے، جس کے معنی ہیں میگھ (بادل) اور ملار، یعنی موسم بارش، متواتر بارش، قوس و قزح (دھنک)۔ ایک راگنی یا سُر کی قسم اور نام، جسے دوپہر کے وقت گایا جاتا ہے۔
رِپ: سنسکرت کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں دشمن، آفت، بڑی مصیبت وغیرہ اس سُر میں محبوب کے ہجر و فراق اور درماندگی کو گایا جاتا ہے۔
ڈھر: (ڈہر) کے لفظی معنی ہیں دو ریتیلے ٹیلوں کے درمیان ہموار میدان، جہاں کی زمین پکی اور برسات ہونے پر قابل کاشت ہو۔ اس سُر میں دنیا کی بے ثباتی اور مردانِ خدا کی کیابی کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے اور دنیا کے اقبال و زوال کا ذکر کرکے اصلی مطلوب (اللہ تعالیٰ) کی بقا کا بیان کرتے ہوئے اُسے ہی (لائق ستائش باور کرایا جاتا ہے۔ اس میں دنیا کو اس ہموار زمین کے ساتھ تمثیل دی گئی ہوتی ہے جس پر ادبار و نکبت اور خوشحالی و ہریالی آتی جاتی رہتی ہے۔
پربھاتی: پربھات سنسکرت کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں صبح سویرے، سَحر کا وقت۔ ایک راگنی کا نام ہے جو صبح صادق کے وقت گائی جاتی ہے۔ اس سُر میں انسان کو منگتے کے ساتھ تمثیل دے کر داتا (اللہ تعالیٰ) کے دروازے پر صدائیں لگاتے ہوئے دکھایا جاتا ہے، اور خود داتا منگتوں پر اس قدر مہربان کہ وہ ان سے گلہ شکوہ کرتا ہے کہ تم میرا دروازہ چھوڑ کر دوسروں کے دروازوں پر کیوں صدائیں لگاتے ہو؟ مجھ سے کیوں نہیں مانگتے؟ اس سُر میں انسان کو خدا کی بندگی کی تاکید کی جاتی ہے اور اس کی سخاوت و دین کو سراہا جاتا ہے کہ وہ ایسا سخی ہے کہ کمزور اور میلے کچیلے منگتوں پر بھی انعامات کی برکھا برسا دیتا ہے۔ (بقیہ اگلے صفحے پر)

۱۱- بھائی چنن راء شکار پوری:

وہ گروہڑی صاحب کے بعد ہوئے، ان کے اشعار (سلوک) کثرتِ تعداد کے اعتبار سے اہمیت کے حامل ہیں۔ چــنـنــراء کی زندگی کا احوال تفصیل یا تصدیق کے ساتھ معلوم نہیں، لیکن غالباً وہ اٹھارویں صدی کے نصف آخر میں پیدا ہوئے (۱) اور سنہ ۱۸۵۰ء میں فوت ہوئے۔ ان کا جنم شکار پور کے دولت مند گھرانے میں ہوا۔ گرمکھی زبان کی حرف شناسی حاصل کی اور دھرمی پستک (پوتھی) پڑھنے کے بعد آبائی پیشہ سے منسلک ہو گیا۔ بھائی چنراء لنڈ کو اگرچہ 'سامی' کے نام سے مشہور کیا گیا ہے مگر وہ سامی سنت (۲) تھے اور نہ ہی عام سامیوں کے رنگ و لباس ہی میں تھے۔ وہ ایک دولت مند (سیٹھ) شخص تھے، تجارت میں مشغول رہے اور عمر بھر امرتسر میں آبائی کوٹھی چلاتے رہے۔ ان کے گرو (مرشد) پنڈت مینگھراج تھے جو ایک مہا پُرش سوامی (بہت بڑا اللہ لوک انسان) تھا، جس کی نصیحت و تربیت کا اس پر اس قدر اثر ہوا کہ اس نے مایا کی مستی سے منہہ موڑ کر پرماتما (بھگوان خدا) کی ہستی میں دھیان ٹکایا۔ مگر چونکہ اس نے تمام جوانی تجارت میں سود اور لالچ اور مایا کے فسوں میں بسر کی تھی اس لئے مذہبی عقیدے کی رُو سے اُس پر

(گزشتہ سے پیوستہ)

کارایل: سنسکرت کا لفظ ہے، جس کے معنی ہیں مور یا ہنس پرندہ۔ اس سُر میں خدا کے سچے عاشقوں اور اس کی راہ کے طالبوں کو ہنس اور مور پرندہ کے ساتھ تمثیل دی گئی ہوتی ہے جو حقیقت کے موتی چنتے رہتے ہیں، جبکہ عام انسان بگلا، اُلو اور کوے کے مشابہ ہے جو میلے کچیلے پانی اور کیچڑ سے کیڑے مکوڑوں اور چھوٹی مچھلیوں پر گزارہ کرتے ہیں، دوسری طرف اس ہنس کو شکار کرنے کے لئے شکاری ہر وقت اس کی گھات میں رہتا ہے، گویا انسان کی روح ہنس ہے اور اس کا نفس شکاری اور دنیا میلا کچیلا پانی اور کیچڑ۔ اس سُر میں انسان کو اپنی نفسانی خواہشات ترک کرنے اور شکاری کی گھات سے خبردار رہنے کا بیان کیا جاتا ہے۔

دھنا سری: سنسکرت کا لفظ ہے، جس کے معنی ہیں الٹی سیدھی بات، چالاکی، چالبازی، حرفت، فریب، دغا۔ ایک سندھی راگنی، مالکوس راگ کی ایک قسم ہے، اس میں مرشد کی مدح گائی جاتی ہے۔ (مترجم)

(۲) تفصیل کے لئے دیکھیے مرحوم ڈاکٹر داؤد پوتہ کی تصحیح و تحقیق کے ساتھ سنہ ۱۳۷۶ھ/ ۱۹۵۶ء میں کراچی سے شائع شدہ ''کلام گرہوڑی''

(۱) یہ گمان درست معلوم نہیں ہوتا کہ وہ سنہ ۱۷۴۳ء میں پیدا ہوئے۔

(۲) سوامی: سنسکرت زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں سالک، سُنت، فقیر، اللہ لوک، گیرو رنگ کے کپڑے پہن کر گھومنے والے فقراء، ہندوؤں میں ایک گھومتے پھرتے رہنے والے فقیروں کی قسم، بیراگی۔ ہندی اور اردو لغت کی رُو سے 'سامی' کا لفظ 'سوامی' کا مخفف ہے، جس کے معنی ہیں: خاوند، شوہر، پتی۔ اور سنسکرت میں سُوامی کہتے ہیں: آقا، مالک، خدا، گرو، پیر، حضور، قبلہ، حضرت کو۔

دیکھیے:

۱- جامع سندھی لغات، جلد ۴، ص: ۱۵۴۴

۲- فیروز اللغات اردو، ص: ۷۶۷، ۸۱۷ (مترجم)

''چوراسی جنم'' (ا) کا خوف مسلط ہوا جس سے نجات کے لئے دبستان مذاہب کا مصنف اپنی کتاب کے دوسرے باب بعنوان ''ہندوؤں کے عقائد کے بیان میں'' کی دوسری فصل میں ''ابداع و آفرینش سے متعلق اس فرقہ (یعنی متشرع ہندوؤں، جن کو سمارتکان کہتے ہیں) کی بیان کردہ چند باتوں کے بارے میں جن کو پُران یعنی ان کی تاریخ نے ذکر کیا ہے'' کے زیرِ عنوان لکھتا ہے: ''علاوہ ازیں ان کا قول ہے کہ جو لوگ بدکار ہیں وہ اس دنیا میں شیر، چیتا، بھیڑیا، کُتا، سور، ریچھ، حشرات الارض، نباتات اور معدنیات کے اجسام سے مل جاتے ہیں اور اپنے اعمال کی سزا پاتے ہیں۔ اور جو لوگ حد درجہ گنہگار ہیں، ان کو دوزخ میں لے جاتے ہیں۔ یہ لوگ دوزخ میں ایک عرصہ تک رہتے ہیں اور اپنے گناہ کے مطابق عذاب برداشت کرنے کے بعد پھر اس دنیا میں آتے ہیں۔ ان کے عقیدہ کے مطابق بہشت کا ایک بادشاہ ہے، جس کو 'اِندر' کہتے ہیں، جو شخص سو بار 'اسومید' کرتا ہے [اسومید کے معنی ہیں ایک مخصوص رنگ اور نشان کے گھوڑے کی مخصوص رسومات کے ساتھ قربانی کرنا، ص:۱۵۶] وہ 'اِندر' ہو جاتا ہے اور ایک معیّنہ مدت تک بہشت میں حکمرانی کے ساتھ وقت گزارتا ہے۔ جب وہ مدت ختم ہو جاتی ہے تو پھر اس دنیا میں اُتر کر اپنے اعمال کے مطابق سزا پاتا ہے''۔

دیکھیے: دبستان مذاہب، اردو ترجمہ، تصنیف کیخسرو اسفندیار، تعلیقات رشید احمد جالندھری، ص۱۵۵، ناشر ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور، طبع اول ۲۰۰۲ء

اس نے بہت کوشش کی۔ زندگی کے آخری دور میں یہ عقیدہ اور غور و فکر (یعنی تناسخ یا آواگوَن) ہی اس کے قلب و روح اور زبان پر چھایا رہا۔ بھائی چَنرا ء کی جنم بھومی سندھ اور آبائی شہر شکارپور تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سندھ کے سالک درویشوں کے ابیات سے آگاہ تھا۔ اس لیے انہوں نے بھی شاعری 'سندھی ابیات' میں کی جنہیں مذہبی 'وائی' (بولی، زبان) کے لحاظ سے 'سِلوک' کہا جاتا ہے۔

(ا) اس سے مراد تناسخ ہے، جو کہ عربی لفظ ہے، جس کے معنی ہیں: روح کا قالب بدلنا، زمانہ بدلنا، روح کا ایک جسم سے دوسرے جسم میں منتقل ہونا۔ دیکھیے المنجد عربی اردو ص۱۰۱۱ اور فرہنگ عامرہ ص۱۶۷۔ اس کے لیے ہندی زبان کا لفظ ہے ''آواگوَن'' جس کے معنی ہیں آنا جانا، مر کر پھر جنم لینا، بار بار جنم لینا۔ دیکھیے جواہر اللغات اردو ص۲۸، فیروز اللغات اردو، ص:۴۶ پر اس کے لفظی معنی کے بعد لکھا ہے: ہندوؤں کے اعتقاد کے مطابق بار بار مرنے اور جنم لینے کا سلسلہ، تناسخ۔

ابو الریحان محمد بن احمد البیرونی اپنی عربی کتاب ''ماللہند'' اردو ترجمہ 'کتاب الہند' کے پانچویں باب میں ''ارواح کی حالت اور بطور تناسخ دنیا میں ان کی آمد و رفت'' کے زیرِ عنوان لکھتے ہیں: ''جس طرح کلمۂ اخلاص (لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ) مسلمانوں کے ایمان کا شعار، تثلیث عیسائیوں کی علامت اور سَبت [ہفتہ کا دن] منانا یہودیوں کی خصوصیت ہے، اسی طرح تناسخ (کا عقیدہ) ہندو مذہب کا امتیاز ہے۔ جو شخص تناسخ کا قائل نہیں وہ ہندو نہیں ہے اور اس کا شمار ہندوؤں میں نہیں ہوسکتا''۔ دیکھیے کتاب الہند، جلد اول، ص۴۴ ترجمہ سید اصغر علی، طبع لاہور، اکتوبر ۱۹۹۴ء

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بھائی چنڑاء نے ان ابیات یا سلوکوں میں اپنے نام کے بجائے اپنے گرو کا نام 'سامی' بانیڑ (برہمن، پنڈت) یا 'مینگھو' استعمال کیا ہے۔ اصل میں یہ ابیات اس کے اپنے دستخطی (خود نوشتہ) رقعات پر گرمکھی میں لکھے ہوئے تھے، اور ان کے متعلق نہیں کہا جاسکتا کہ چنڑاء کے بعد

(گزشتہ سے پیوستہ)

ڈاکٹر تارا چند اپنی کتاب ''تمدنِ ہند پر اسلامی اثرات'' میں ''راما نند اور کبیر'' کے تذکرے میں لکھتا ہے: ''یہ بتانا مشکل ہے کہ کبیر، نظریۂ تناسخ ارواح سے کہاں تک وابستہ تھا۔ بہت سی ایسی عبارات ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کبیر نے اس نظریے کو رد کردیا تھا''۔ اس سلسلہ میں اس کی دو عبارتیں پیش کرنے کے بعد ڈاکٹر تاراچند لکھتے ہیں کہ: ''ایسی عبارات بھی ہیں جن میں کبیر چوراسی لاکھ جنم اور مسلسل موت و زیست کے چکر کا بیان کرتا ہے۔ بہرصورت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کبیر موت کے خوف اور اس کے بے درد چکر کو کم و بیش بطور تنبیہہ کے بیان کرتا ہے تاکہ لوگ اپنی ناپاک زندگی بسر کرنے سے باز آئیں''۔
دیکھیے: تمدن ہند پر اسلامی اثرات، ص۲۵۴، ناشر مجلس ترقی ادب لاہور، طبع دوم، جون ۲۰۰۲ء
اس کے بعد ڈاکٹر تارا چند ''سولہویں صدی عیسوی کے رشی'' کے زیرِ عنوان دادو دیال کی تعلیمات اور عقائد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے: '' دادو کا عقیدہ ہے کہ انسان ایک ہی زندگی میں موت و زیست کے تمام چکر سے گزر جاتا ہے۔ کہتا ہے: اے انسان! ۸۴ لاکھ جنموں کی حقیقت تو تجھی میں مخفی ہے۔ انسان ایک دن میں کئی مرتبہ پیدا ہوتا ہے مگر اس حقیقت سے بہت کم لوگ واقف ہیں''۔ اور ''روح انسانی جتنے تغیّرات سے گزرتی ہے اتنی ہی اوتار ہیں، بس یہی تناسخ ارواح ہے جس سے خالق قادر نجات عطا فرماتا ہے''۔
''روح کو اپنے بار بار جنم کا علم نہیں ہوتا، کیونکہ یہ عمل لحہ بہ لحہ جاری رہتا ہے۔ روح ۸۴ لاکھ بار پیدا ہوتی ہے مگر اس کو اس کی خبر تک نہیں ہوتی''۔
آگے چل کر کہتا ہے: ''سور، کتے، گیدڑ، چیتے اور ناگ سب دل میں رہتے ہیں مگر پنڈت ان کو نہیں جانتا''۔ حوالہ سابق ص ۳۸۹-۳۹۰
کتاب الہند اور دبستان مذاہب کی تصریحات سے ثابت ہوا کہ تناسخ ہندوؤں کا بنیادی عقیدہ ہے۔
اس کے علاوہ یہ بھی ثابت ہوا کہ کبیر (جس کے بارے میں دبستانِ مذاہب کے مصنف کا کہنا ہے کہ: ''وہ ہندوستان کے مشہور توحید پرستوں میں سے ہے'' ص۲۰۶۔ اور بقول ڈاکٹر رشید احمد جالندھری: ''کبیر (وفات ۱۵۱۸ء) ان چند عارف شاعروں میں سے ہے جو ہندو مسلم وحدت کی علامت ہیں۔ برہمن نژاد کبیر کی تربیت ایک مسلم گھرانے میں ہوئی''۔ دبستانِ مذاہب ص۲۰۶، تعلیق نمبرا) اور دادو دیال اپنی مخصوص فلسفیانہ فکر کی وجہ سے اکثر شرکیہ عقائد سے بیزار تھے (جیسا کہ ڈاکٹر تارا چند نے لکھا ہے کہ: وہ (دادو دیال، کبیر کے بیٹے) کمال کا چیلا تھا اور کمال غالبًا اوروں کی نسبت اسلامی اندازِ فکر کی طرف زیادہ مائل تھا، یہ شاید اس لیے کہ مغربی ہند، احمد آباد اور اجمیر کے مسلم صوفیاء نے ہندو مسلم طالبانِ حق کے اذہان پر مشرقی ہند کے صوفیاء سے زیادہ گہرا اثر ڈالا تھا۔ دیکھیے تمدن ہند پر اسلامی اثرات ص۳۸۵، اور بقول مصنف دبستانِ مذاہب : ''اکبر بادشاہ کے عہد میں اس نے درویشی اختیار کی اور ایک جماعت اس کی گرویدہ ہوگئی۔ اس نے اپنے پیروؤں کو بت پرستی سے منع کیا اور جلالی حیوانات کا گوشت چھوڑنے کا حکم دیا اور جاندار کو تکلیف دینے سے احتراز کیا لیکن عورت اور بیوی کو چھوڑ دینے اور دنیاوی کاموں سے کنارہ کش ہونے کا حکم نہیں دیا بلکہ لوگوں کو ترک اور تعلق کے بارے میں اختیار دے دیا''۔ دیکھیے دبستانِ مذاہب ص۲۲۳)، ان دونوں نے تناسخ کا انکار کیا ہے، یا پھر اس کی مخصوص فلسفیانہ توجیہ کی ہے۔ نیز یہ بھی ثابت ہوا کہ چند مخصوص مصلحین کے علاوہ مجموعی طور پر ہندو تناسخ کے قائل تھے اور تناسخ ان کا بنیادی عقیدہ تھا، اور ان کے بقول یہ تناسخ روح کا ۸۴ لاکھ مرتبہ ایک جسم سے دوسرے جسم میں منتقل ہونا ہے جس میں روح اپنے عمل کے مطابق اعلیٰ سے اعلیٰ اور ادنیٰ سے ادنیٰ (حقیر) روپ اختیار کرتی ہے۔ متن میں محض ''چوراسی جنم'' کا ذکر ہے، مندرجہ بالاحوالہ جات کی روشنی میں میرا گمان یہ ہے کہ یہاں متن میں ''لاکھ'' کا لفظ کتابت کی غلطی کی وجہ سے رہ گیا ہے۔ درست جملہ ''چوراسی لاکھ جنم'' ہے۔ (مترجم)

انہیں کس قدر توجہ و احتیاط کے ساتھ عربی- سندھی رسم الخط میں لکھا گیا۔ اس طرح کے کُل دو ہزار سات سو پچاس 'سلوک' ہیں لیکن تمام کے تمام بھائی چینراء کے نہیں ہیں: ان میں ایسے ابیات بھی شامل ہیں جو روحل، لطیف، کرم علی، امین، بادل، کھیمو، پتھو، تنو، لکھو اور دوسروں کی طرف منسوب ہیں(۱)۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی بغیر نام ابیات ہیں جن میں بھائی چینراء کی زبان اور بیان کا رنگ ڈھنگ (اندازِ بیان) نظر نہیں آتا۔

بھائی چینراء کی زبان بڑی حد تک سندھ کے دیگر سالکوں اور درویشوں کی سندھی زبان سے مختلف ہے اور اُس پر بطور خاص دھرمی پستکوں کی سنسکرتی زبان کا رنگ نمایاں اور غالب ہے۔ اس کے بیان میں زور اور تاثیر اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب وہ سنسکرت کے الفاظ اور دھرمی اصطلاحات استعمال کرتا ہے۔ اس کے برعکس فقیر عبدالرحیم گرہوڑی یا ان سے قبل مخدوم محمد ہاشم اور دیگر عربی کے بڑے علماء حضرات نے جب سندھی میں نظم کہی تو انہوں نے خالص سندھی الفاظ و اصطلاحات استعمال کیں۔

بھائی چینراء کے افکار پر زیادہ تر ہندومت کے ''چوراسی جنم'' کا اندیشہ چھایا ہوا ہے۔ بھٹائی صاحب نے اعلیٰ انسانی عظمت اور وحدت کی خوشخبری سناتے ہوئے کہا کہ: ''ڪانہ پڇي تو ذات، آيا سي اگھيا'' یعنی: ذات پات نہیں پوچھتا جو بھی آئے وہ مقبول و منظور ہوگئے(۱)، لیکن بھائی چینراء کے نزدیک اب بھی چوہڑا اور چمار کا تذکرہ موجود ہے۔ وہ 'چوراسی جنم' سے نجات کے لئے پانچ بھوتوں - کام، کرودھ، لوبھ، موہ، اھنکار(۲) سے اپنے آپ کو باز رکھنے کی بار بار

---

(۱) دیوان گوڑومل چندن مل کِھلنانی نے گزشتہ صدی میں ''سامی جا سلوک'' چار حصوں میں چھپوائے، جن کے تین حصے راقم کے پیش نظر ہیں، تیسرا حصہ سنہ ۱۸۹۲ء میں طبع ہوا جس میں ۱۳۰۲ سے لے کر ۲۱۰۰ سلوک شامل ہیں۔ ان تین حصوں میں بھی انہی ناموں سے منسوب ابیات یا سلوک شامل ہیں۔ اور ممکن ہے کہ چوتھے حصے میں بھی بعض دوسروں کے ناموں سے منسوب سلوک شامل ہوں۔

(۲) مول - رالو کلام کی ساتویں فصل میں مکمل شعر یوں ہے:

نئون نياپو آئيو، راڻي مُلا راتِ،
لڏيسون لطيف چَي، ڪَنان ڏاترَ ڏاتِ
ڪھڙي پڇين ذات، آيا سي اگھيا.

دیکھیے 'شاہ جو رسالو' تحقیق و تصحیح ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ، ناشر بھٹ شاہ ثقافتی مرکز، بھٹ شاہ، طبع اول مارچ ۱۹۷۴ء، ص ۳۹۵ ترجمہ: راجا کے ہاں سے رات ایک نیا پیغام آیا ہے، لطیف کہتا ہے کہ ہمیں داتا کے ہاں سے دَین عطا ہوئی کہ ''تو ذات پات کا کیا حساب پوچھتا ہے، اس دروازے پر تو جو بھی (کمائی کرکے) آئے وہ مقبول بارگاہ ہوگئے''۔ (مترجم)

(۲) ان میں سے 'کام' بمعنی شہوت اور نفسانی خواہش۔ اور 'کرودھ' بمعنی غصہ اور غضب۔ 'لوبھ' بمعنی حرص و لالچ، کنجوسی۔ 'موہ' بمعنی جادو، سحر (مقصد فریب دینا)۔ اور 'موہ روپی' فریب دینے والے کو کہتے ہیں۔ اور 'اہنکار' بمعنی ابھمان، غرور، گھمنڈ، تکبر، انانیت ہے۔

دیکھیئے: فیروز اللغات اردو، ص: ۹۷۷، ۱۰۰۵، ۱۱۶۷، ۱۳۱۹
جامع سندھی لغات ۱/۳۱۶ (مترجم)

تاکید کرتا ہے۔ اس موضوع پر مشتمل اس کا مؤثر کلام خاص طور پر ہندو جاتی (ہندو قوم) کی نصیحت کے لیے کہا گیا ہے۔

سندھ کے تمام بڑے شعراء کے برعکس بھائی چیئراء کے ابیات اور سلوک سندھ کے قصوں، داستانوں کی عام روایت سے وابستہ ہیں نہ ہی سندھ کی عوامی زندگی یا سندھ کے ماحول ہی سے منسلک ہیں۔ ان کا ایک اہم موضوع 'مذہبی عقیدہ کی تربیت' اور دوسرا اہم موضوع ''سادھ سنگت'' (۱) ہے جس میں نصیحت کے مضامین درج ہیں (۲)۔ اور یہ سلوک عمدہ خیالات اور معانی پر مشتمل ہیں۔ بھائی چیئراء کی اعلیٰ فکر اسی میں ہے کہ وہ 'اُودیا' (لاعلمی اور غلط تربیت) اور 'مُورکھائی' (حماقت اور بے وقوفی) کو لوگوں میں گمراہی اور الجھن کی جڑ (اصل وجہ) تصور کرتا ہے۔

نتائج:

۱- اس دور میں مادری زبان سندھی کے ذریعے ابتدائی تعلیم دینے کی تحریک کی بنیادیں مضبوط ہوئیں۔

معیاری درسی کتاب ''ابوالحسن جی سندھی'' کی عام مقبولیت سے سندھی میں تعلیم دینے کی تحریک کامیابی سے ہمکنار ہوئی اور 'سندھی' کے خاص نام کے ساتھ کئی درسی کتابیں شائع ہوئیں اور آسان سندھی میں کتابیں لکھنے کے نظریہ کو فروغ حاصل ہوا۔

۲- سندھی درسی نصاب کی بنیاد مستحکم ہوئی: نصابی نظام میں دینی اور اخلاقی تعلیم و تربیت اور عام مطالعہ وسیع کرنے کو مرکزی حیثیت حاصل رہی۔

۳- مختلف موضوعات پر فارسی کے بجائے سندھی میں کتابیں تالیف ہوئیں۔ تفسیر، حدیث، فقہ، دین اسلام، ایمان وعقیدہ، ریتوں اور رسموں کے بارے میں وضاحت، سوانح اور تاریخ، تصوف اور اخلاق، سماجی اصلاح، طب وغیرہ کے موضوعات پر بڑی تعداد میں کتابیں لکھی گئیں۔

۴- تصنیف و تالیف کے ساتھ، کتابوں کے تراجم کا بھی سلسلہ شروع ہوا اور سندھ کے علماء نے نہ صرف عربی اور فارسی سے سندھی میں کتابوں کے تراجم کیے بلکہ انہوں نے سندھی کے

(۱) سادھوؤں، سنتوں اور اللہ لوک افراد کی صحبت اور دوستی۔ (مترجم)

(۲) ہر پڑھنے والا ان کے سلوکوں کو اس طرح کے مختلف مضامین میں تقسیم کرسکتا ہے۔ مثلاً واڈھومل مولچند نے سب سے پہلے چھ سو سے زائد سلوک منتخب کرکے انہیں بیالیس مضامین میں تقسیم کیا (''سامی جا سلوک'' منتخبہ واڈھومل مولچند، گوڑومل سندھی ساہتیہ منڈل، حیدرآباد، ۱۹۴۶ء)

اعلیٰ فکری مواد کو بھی عربی اور فارسی میں منتقل کیا۔

۵- موضوع کی علمی آگہی اور اس کے ساتھ عربی اور فارسی خواہ سندھی زبان میں مہارت کی وجہ سے، علماء سندھ کا اس دور میں تحقیقی معیار بلند رہا اور ان کے تجرباتی اور تحقیقی نتائج سندھی زبان میں شائع ہوئے۔

۶- سندھی نثر میں عبارات اور کتابیں لکھنے کا آغاز ہوا۔

۷- سندھی الفاظ اور صَرف - نحو (گرامر) زیرِ مطالعہ آئے۔ زبان کی ابتدائی تربیت کے لئے 'دو- وایۂ اور 'سِہ وایۂ مرتب ہوئے اور سندھی کے ذریعے فارسی، عربی اور سندھی گرامر کا مطالعہ کیا گیا۔

۸- سندھی 'الف - ب' کے زیادہ سے زیادہ حروف ایک ہی صورت میں لکھے جانے لگے اور سندھی رسم الخط زیادہ سالم صورت میں رائج ہونے لگی۔

۹- سندھی لغات کے بارے میں تحقیقی مواد شائع ہوا۔

۱۰- سندھ کے روایتی ادبی ذخیرہ میں 'تفصیلی' اور 'تحقیقی' نگاہ سے اضافہ ہوا۔

۱۱- سندھی اساسی (کلاسیکی) شاعری کی عمارت مکمل ہوئی۔ سندھی ابیات اور وائیوں کے ذخائر 'رسالۂ کے خاص نام سے وجود میں آئے۔ اس دور میں صاحبانِ اعلیٰ فکر عارف اور بڑے دیدہ ور دانا اور شاعر پیدا ہوئے جنھوں نے اپنے سندھی ابیات کے ذریعے اعلیٰ انسانی اخلاق و کردار کا درس دیا۔

تمت بالخیر

۵/ جمادی الاول ۱۴۲۶ھ مطابق ۱۳ جون ۲۰۰۵ء بوقت ۳:۱۷ بجے ترجمہ اختتام پذیر ہوا۔

فلله الحمد و المنة علی احسانه.

فہارس

فہرست اسمائے رجال

(ت)

(ی)

ملک، شہر، قصبہ، تاریخی مکان

(آ)

(ا)

(ب)

(ش)

(ط)

(ع)

(غ)

(ف)

(ق)

(ک)

(کھ)

(گ)

(گھ)

(ل)

کتابیات

(ب)

(پ)

(ج)

(چ)

(ح)

(ش)

(ص)

(ع)

(ن)

(و)

(ہ)

(ی)